منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ

(جلد دوم)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : منتخبات نظام الفتاویٰ (جلد دوم)

صفحات : ۴۹۶

قیمت : ۴۷۰/روپے

طبع اول : مارچ ۲۰۱۳ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublication@gmail.com

فون: 26981327 - 011

اجمالی فہرست

فہرست

باب الحج عن الغیر

کتاب النکاح

باب مایتعلق باحکام المدارس

كتاب الحج

کتاب الحج

ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟

ایک شخص حج کی غرض سے حرمین شریفین کا ارادہ کرتا ہے ہوائی جہاز سے جانا چاہتا ہے تو احرام کہاں سے باندھے خلاصہ تحریر فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندستان کی اصل میقات یلملم ہے محاذات سے آگے بڑھنا بلا احرام کے نا جائز ہے اور اس کے قبل احرام باندھ لینا جائز ہے (۱)، اس لئے بہتر یہ ہے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ لیں ورنہ پھر یلملم یا جو بھی میقات آئے اور اس کے محاذات پر پہنچے تو احرام ضرور باندھ لے اس سے آگے بلا احرام نہ بڑھیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

سمندری جہاز سے حج کے لئے جانے پر احرام کہاں سے باندھا جائے؟

اب تک حجاج کرام جو سمندری جہاز سے جاتے ہیں وہ یلملم کے محاذات (جو سمندر کے اندر ہیں اب تک ذی الحور کے موافق پڑتا ہے) احرام باندھ لیتے ہیں، لیکن اب چند سال سے اچھے لوگ یعنی علماء کا طبقہ جو سمجھدار ہے وہ جدہ سے احرام ہر دو صورت میں جائز بتلاتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہوا ہے، تو کیا جدہ سے احرام باندھ سکتے

۱- ”وحرم تاخیر الاحرام عنها كلها لمن ای لآفاقی وقصد دخول مكة يعنی الحرم ...... ولايحرم التقديم للإحرام عليهابل هو الأفضل إن في أشهر الحج وأمن على نفسه“ (الدر مع الرد ۳/ ۴۸۳)۔

ہیں، جدہ سے احرام ہر دو صورت یعنی بذریعہ طیارہ اور بذریعہ سمندری جہاز جائز ہے یا نہیں؟

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ابتدائی دور میں جب تک یہ بڑے بڑے جہاز جاری نہ ہوئے تھے اس وقت ہندوستان سے جانے والے عموماً حجاج سورت کی بندرگاہ سے چھوٹے جہازوں یا بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سمندر پار کر کے عدن کے آس پاس پہونچ جاتے تھے، پھر وہاں سے سمندر کے کنارے کنارے آگے بڑھتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔

اس درمیان میں بعض جگہ اس خط میقاتی کو عبور کرنا پڑتا تھا یا یلملم اور قرن منازل کے درمیان واقع اسی خطہ سے جب تجاوز کرنے کا وقت آجاتا تھا تو جہاز والا اعلان کر دیتا تھا اور لوگ احرام باندھ لیتے تھے اور اب ایسا نہیں ہے، اب یہ بڑے بڑے جہاز میقات سے باہر ہی آفاق میں گذرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں اور جحفہ اور جدہ کے درمیان جو خط میقاتی ہے وہ جدہ سے آدھ میل آگے مقام شمشیہ پر سے گذرتا ہے وہاں چونکہ کوئی نشان یا علامت نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر ٹھہرے اور بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی آفاقی آفاق میں گذرتا ہوا بغیر کسی میقات سے آگے گذرتے ہوئے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچنے لگے تو جب مکہ مکرمہ صرف دو منزل باقی رہ جائے تو احرام باندھ کر آگے بڑھے، بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے، یہ مسئلہ عالمگیری اور البحر الرائق وغیرہ میں مصرح ہے(۱)۔

البتہ عوام میں ایک پرانا ڈھرا پڑا ہوا ہے کہ اب بھی سمندر کے اندر آفاق ہی میں بغیر شرعی محاذات کے پیدا ہوئے احرام باندھ لیتے ہیں اور چونکہ میقات سے قبل بلکہ اپنے گھر سے احرام باندھ کر جانا منع یا مکروہ نہیں ہے، اس لیے علماء اس پر نکیر نہیں فرماتے۔

پانی کے جہازوں کے ذریعہ آج کل جانے والوں کے لیے یہی حکم ہے اس کو احقر نے ایک طویل جواب میں جو کہ رسالہ جیسا ہو گیا ہے اور رد مواقیت خمسہ کے نام سے ہے، رسالہ دار العلوم میں شائع ہو چکا ہے اگر وہ مل جائے تو وہ رسالہ

۱- "ثم الآفاقي إذ انتهى على قصد دخول مكة عليه أن يحرم قصد الحج أو العمرة عندنا، أولم يقصد لقوله صلى الله عليه وسلم: لايجاوز أحد الميقات إلا محرماً ولو لتجارة، ولأن وجوب الإحرام لتعظيم هذه البقعة الشريفة، فيستوي فيه التاجر والمعتمر وغيرهما" (فتاویٰ شامی، ص ۱۳۹ ج ۲ کتاب الحج) (مرتب)۔

دار العلوم سے طلب فرما کر ملاحظہ فرمالیجئے!

باقی ہوائی جہاز سے جانے والوں کو یہ شبہ ہو کہ یہ جہاز کسی خطِ میقاتی سے تجاوز کرکے اور خطِ میقاتی کے اوپر سے گذرے گا تو انہیں چاہیے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ کر احتیاطاً سوار ہوں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱۱/۱۴۰۱ھ

اگر کوئی شخص آفاق میں چلتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے:

مکہ مکرمہ کے مشہور و معروف روزنامہ ''الندوۃ'' (۲۰ ذی قعدہ ۱۳۹۹ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کے آخری صفحہ پر مملکت سعودیہ عربیہ کے بڑے بڑے علماء کرام کی مجلس نے میقات احرام اور رمی جمرات پر ایک فتویٰ صادر کیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ ''جواً، بحراً و براً'' میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کرکے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں ہے اور مجلس نے دوسرا فتویٰ یہ صادر کیا ہے کہ گیارہویں بارہویں، تیرہویں تاریخ کو ایام تشریق میں قبل الزوال رمی جمرات جائز نہیں ہے، صرف دسویں ذی الحجہ یعنی یوم النحر کو قبل الزوال رمی جمرہ عقبہ (بڑا شیطان) کی درست ہے، عورتیں اور بوڑھے ضعیف اور عاجزین کے لئے رمی جمرہ عقبہ کی دسویں تاریخ کی آدھی رات کے بعد درست ہے۔

علماء کرام سے استدعاء ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کرام کی رہبری فرمائیں۔

ممتاز احمد جاوید شافعی (بھٹکل، کرناٹک)

الجواب وباللہ التوفیق:

۲ نومبر ۱۹۷۹ء کے صدق جدید میں علماء سعودیہ کا دو مسئلوں پر ایک فتویٰ شائع کرکے علماء کرام سے یہ استدعاء کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کی رہبری فرمائیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس فتویٰ سے کچھ خلجان یا اشتباہ پیدا ہوگیا ہے، اس لئے ان کے اشتباہ وخلجان کو رفع کرنے کی غرض سے بطور وضاحت وتشریح کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

مسئلہ ۱: یہ جواً، بحراً، براً حرم میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کرکے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ حرم میں جانے کے لئے حدود میقات سے کسی کو بغیر احرام باندھے ہوئے تجاوز کرنا اور آگے بڑھ جانا جائز نہیں، اس لئے جو لوگ حدود میقات تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھیں گے تو یہ فعل ان کے لئے جائز نہ ہوگا۔

باقی آج کل ہندوستان و پاکستان سے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، بلکہ مشرق کے کسی خطہ سے بحر ہند میں ہوتے ہوئے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، خواہ ملیشیا و انڈونیشیا کے ہوں یا کسی اور خطہ کے ہوں وہ حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ نہیں پہنچتے، بلکہ حدود میقات وخطوط میقات سے بالکل باہر باہر حل کبیر و آفاق ہی میں گذرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں، اور خود جدہ بھی مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کچھ زائد فاصلہ (تقریباً ۳۶ میل انگریزی میل سے) پر حل کبیر اور آفاق میں واقع ہے اور حدود میقات وخط میقاتی جدہ سے تقریباً ایک منزل مکہ مکرمہ کی جانب آگے بڑھ کر اس خط مستقیم پر واقع ہے جو یلملم سے چل کر سیدھا رابغ وجحفہ کو پہنچتا ہے اور وہی خط مستقیم خط میقاتی ہے اور محاذاۃ میقات اسی خط پر واقع ہوتی ہے۔

کیونکہ اس خط کا مقام اور جگہ معلوم ومتعین نہیں ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حدود میقات سے تجاوز کئے بغیر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ جائے اور میقات ومحاذات میقات کا علم ویقین نہ ہو تو کعبۃ اللہ کی تشریف وتکریم کے پیش نظر مکہ مکرمہ سے دو منزل کی دوری پر ہی احرام باندھ لے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے نہ بڑھے۔ کما فی الدر المختار علی حامش الشامی:

"وإن لم يكن بحيث يحاذي فعلى مرحلتين وحرم تأخير الإحرام عنها"، وهكذا في الهندية والبحر وغيرهما من الكتب المعتبرة للفتاوىٰ عند الاحناف"(۱)۔

اور اسی وجہ سے حجاج کرام کو جو مشرق سے بحری جہاز سے بحر ہند میں سفر کرتے ہوئے آج کل جدہ پہنچتے ہیں تو ان پر جدہ سے احرام باندھنا واجب وضروری ہو جاتا ہے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے بڑھنا جائز نہیں رہتا، اور جدہ سے قبل چونکہ کسی میقات سے یا کسی میقات کی محاذات سے تجاوز نہیں ہوتا اور نہ دو منزل سے کم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے کہیں ہوتا ہے، اس لئے جدہ پہنچنے سے قبل احرام باندھنا واجب ولازم نہیں ہوتا، جدہ سے قبل کی جگہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کم نہ ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے کہ جدہ سے قبل تقریباً تمام جگہوں کا سمندری کنارہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کم کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور حدود میقات سے کسی جگہ تجاوز نہ ہوا اس لئے صحیح ہے کہ تجاوز کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ

۱- درمختار کتاب الحج ۳/ ۴۸۲۔

جانے والاکسی میقات سے یا کسی میقات کے محاذ اۃ سے،یعنی دومیقاتوں کےدرمیان خط میقاتی سے آگے بڑھ کرحل صغیر میں داخل ہوجائے، **كما دلت عليه هذه العبارة من الهندية: "وإن سلك بين الميقاتين في البحر والبر، اجتهد وأحرم إذاحاذى ميقاتا منها (إلى قوله) فإن لم يكن بحيث يحاذى فعلى مرحلتين إلى مكة الخ**"(۱)جہاز کے اس پورے سفر میں آجکل ایسا کہیں نہیں ہوتا۔حل صغیر کے معنی تو ظاہر ہے کہ حدودحرم سے باہر اورمیقات آفاقی کے اندر کا علاقہ حل صغیر کہلاتا ہے اورمحاذات میقات کامفہوم مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عین میقات کل پانچ ہیں:یلملم،جحفہ،رابغ،ذوالحلیفہ،ذات عرق،قرن المنازل۔انہیں کومواقیت خمسہ کہتے ہیں اوران میقاتوں میں سے ہرایک میقات سے جوخط مستقیم چل کرسیدھا دوسری میقات تک پہنچتا ہے وہ خط میقاتی کہا جاتا ہے اورانہیں خطوط میقاتی کا مجموعہ حرم شریف کو ہر طرف سے محیط ہے اورگھیرے ہوئے ہے۔باہر سے کوئی آنے والا جب حدودحرم میں جانا چاہےتواس کوعین میقات پر سے یا کسی خط میقاتی پر سے گذرنا ضروری ہوتا ہے،بغیراس کے حدودحرم میں داخل ہوناممکن نہیں،پس جب اس خط میقاتی پرکوئی جانے والاپہنچ جائے تو کہا جاتا ہے کہ محاذاۃ میقات پرپہنچ گیا اوراسی وجہ سے اس خط میقاتی کوخط محاذاتی بھی کہا جاتا ہے اوراب اگر اس جانے والے کاارادہ مکہ مکرمہ جانے کاہےتوبغیر احرام باندھے اس خط میقاتی سے آگے بڑھ گیا اوراس پر جنایت لازم آگئی،پس یلملم سے دائیں جانب یلملم سے جوخط مستقیم چل کرسیدھا دوسری میقات (جحفہ ورابغ) تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ سے نہیں گزرتا،تاکہ شبہ بھی کیا جاسکے کہ جدہ جانے والا جہاز اس خط سے متجاوزہوگیا،بخلاف یلملم کے بائیں جانب جوخط مستقیم یلملم سے چل کرسیدھاقرن منازل تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ پرگذرتا ہے اوراسی وجہ سےقدیم زمانہ میں جب کہ مشرقی ممالک ہندوستان وغیرہ سے کشتی یا چھوٹے جہاز کےذریعہ سمندرکوپارکر کےمسقط وغیرہ پرآجاتے تھےپھرسمندر کے کنارے آگے بڑھتے تھےتوخط میقاتی کا وہ حصہ سمندر ہی میں آجاتا تھا اوربغیر احرام باندھےکوئی حاجی آگےنہیں بڑھتا تھا،اسی مسئلہ ہندیہ(۲۲۱/۱،وبحر) وغیرہ میں،بایں عبارت:"**ومن حج في البحر فوقته إذا حاذى موضعا من البر لا يتجاوز إلا محرما**"(۲)بیان کیا ہےاوراسی مرحلہ پرپہنچ کرجہازراں محاذاۃ میقات پرپہنچ جانے کا اوراحرام بندھوادینے کا اعلان کردیتا تھا،مگراب مشرقی ممالک (ہندوستان وغیرہ) سےآنے والا حاجیوں کا جہازمسقط وعمان وغیرہ کہیں نہیں جاتا اورنہ سمندر کے اس حصہ سےگزرتا ہے جو

۱- فتاوی ہندیہ ۲۲۱/۱۔
۲- حوالہ سابق۔

خط میقاتی کے اندر واقع ہے، بلکہ اس خط سے باہر باہر حل کبیر میں چلتا رہتا ہے۔

قولہ حل کبیر: حل کبیر و آفاق ایک ہی چیز ہے، مواقیت خمسہ سے باہر کا کل علاقہ اقصائے عالم تک سب آفاق اور حل کبیر ہے۔

حل کبیر اور آفاق میں ہی گذرتا ہوا سیدھا جدہ پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے محاذاۃ میقات کا اور اس کے اعلان وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، مگر اب بھی وہی قدیم ڈھرہ چلا آرہا ہے اور اسی قدیم ڈھرہ وطریقہ پر اب بھی ایک مقام پر پہنچ کر اگرچہ وہ مقام حل کبیر اور آفاق ہی میں ہو محاذات میقات پر آجانے کا اعلان ہوجاتا ہے، حالانکہ محاذات میقات پر آجانے کا احتمال بھی نہیں رہتا اور چونکہ عوام میں بھی وہی سابقہ حالات ومعاملات معروف ومشہور ہیں، اس لئے عوام اس اعلان پر عمل بھی کر لیتے ہیں، اگر بات یہیں تک رہتی تو چونکہ میقات سے قبل بھی احرام باندھ لینا درست ہے، اس لئے انگیز کرلیا جاتا ہے، مگر اس اعلان پر عمل نہ کرنے والے پر لعن طعن بھی کرنے لگتے ہیں، یہ غلط ہے اور اس کے اصلاح کی ضرورت ہے، اصلاح کی جو بہتر تدبیر ہو اختیار کرنا چاہیے۔

مندرجہ ذیل نظری نقشہ سے میقات وحدود میقات وحل صغیر وحل کبیر وآفاق وغیرہ سب باوضاحت طریقے سے انشاء اللہ ذہن میں آجائیں گے اور حدود میقات سے تجاوز نہ کرنے کا مفہوم بھی واضح ہوجائے گا۔ نیچے دیئے ہوئے نقشے میں دو میقاتوں کے درمیان میں جو خطوط ہیں انہیں خطوط میں سے کسی خط پر پہنچنے سے میقات کی محاذاۃ صادق آتی ہے اور دائیں یا بائیں جو میقات قریب ہوتی ہے اسی میقات کا وہ شخص میقاتی کہا جاتا ہے اور اسی خط سے بغیر احرام کے آگے جانا ممنوع ہے، بلکہ اگر جانا ہے تو احرام باندھ کر آگے جانا جائز ہوتا ہے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کوئی جہاز یا قافلہ کسی میقات کے سامنے خواہ حل کبیر ہی میں ہو اس طرح پہنچ جائے کہ اگر بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر اس میقات سے گزرتا ہوا اس جہاز یا قافلہ تک پہونچ جائے تو وہ محاذات میقات پر آجائیں گے اور ان کو وہیں سے بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، یہ شبہ غلط ہوگا اس پر تفصیلی گفتگو اگلے صفحات پر ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

حدود میقات یا محاذات میقات کا اگر کوئی شخص یہ مفہوم لے کہ بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر کسی میقات پر سے گذرتا ہوا سیدھا آگے بڑھتا ہوا حل کبیر وآفاق میں سمندری علاقہ میں گزرتا ہوا چلا جائے تو وہ سب خط میقاتی ہے اور اس خط پر بغیر احرام باندھے ہوئے آگے بڑھنا اور تجاوز کرنا حدود میقات سے تجاوز کرنا شمار ہوگا تو یہ مفہوم بچند وجوہ غلط ہے۔

جوابات شبہ:

اول: اینکہ اس تقدیر پر یہ خط انقصائے عالم تک جاسکتا ہے، اور درمیان میں کسی متعین حد پر ختم کردینا یا ختم مان لینا نہ منصوص ہے نہ معقول ہے، پس اس مفہوم کی بنیاد پر انقصائے عالم تک حل کبیر وآفاق میں لاکھوں مقامات ومکانات ایسے آجائیں گے جو خط میقاتی پر واقع ہوں گے اور محاذات میقات پر آجائیں گے، اور اس خط کے آگے بغیر احرام باندھے ہوئے آگے جانا جائز نہ ہوگا، ورنہ تجاوز عن حدود المیقات لازم آجائے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگوں کا جب ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا ہوتو اپنی آبادی بلکہ اپنے گھر سے ہی اور آفاق میں ہی احرام باندھ کر نکلنا واجب ہوجائے گا اور بغیر احرام باندھے ہوئے آفاق کے اندر بھی اپنے گھر یا آبادی سے باہر نکلنا جائز نہ ہوگا، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

ثانیا: اسی طرح اس خط کے اطراف منزل دومنزل کے فاصلے سے مکہ مکرمہ کی سمت سے چل کر جب کوئی اس خط پر آجائے تو اس کو بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ رہے گا، حالانکہ وہ بھی آفاق ہی میں ہے اور شریعت کا مسئلہ ہے کہ مکہ مکرمہ آنے کے باوجود بغیر احرام کے جہاں تک چاہے جاسکتا ہے اور یہ اس کے خلاف ہے۔ کمافی الہندیۃ (۲۲۱/۱)۔

ثالثا: اس لئے کہ اس تقدیر پر میقاتی اور آفاقی کا فرق ہی ختم ہوجائے گا، جو منشاء شرع سے متضاد اور خلاف ہی نہیں، بلکہ ایسے احکام شرعیہ کو منہدم کردینے والا بھی ہے۔

رابعا: اس لئے کہ شریعت مقدسہ نے حدود حرم کے ہر چہار طرف کچھ فاصلہ پر پانچ سمتوں میں ایک ایک مقام نامزد کر کے میقات حرم قرار دیا ہے، اس لئے کہ بمقتضائے: ''ومن دخله كان آمنا''(۱) پورا خطہ وحرم دربار محبوب حقیقی کا محل سرائے شاہی ہے اور اس کے ہر طرف ان میقاتوں تک اس محل سرائے شاہی کا جلو ہے جو بمنزلہ پائیں باغ اور پورا حجاز بلد امین کے لئے بمنزلہ فنائے مصر ہے، اس لئے منشاء شرع یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم فنائے بلد میں آجاؤ اور محل سرا میں داخلہ کی نیت کرو تو دربار کے آداب شاہی بجالا کر داخل ہوا کرو، اپنے محبوب حقیقی کے عشق ومحبت کی کیفیت طاری کرو، بلکہ محبت میں فنا کی کیفیت طاری کر کے کفن کے کپڑے (احرام) پہن کر آؤ اور جب دربار شاہی میں داخل ہوجاؤ آداب سلامی بجالاؤ اور فور عشق ومحبت میں سرشار ہوکر محبوب حقیقی کے گھر کا چکر (طواف قدوم) لگاؤ۔

مناسک حج کے تمام ہی احکام دیکھ جائیے تقریبا سب ہی اسی عشق ومحبت کی سرشاری کے ترجمان ومظہر نظر آتے ہیں، ان سب باتوں کا بھی تقاضا یہ ہے کہ کم از کم محل سرائے شاہی کا پائیں باغ (حدود میقات) ہر طرف سے مثل بستان کے

۱- سورہ آل عمران: ۹۷۔

احاطہ بند اور گھرا ہوا ہوتا کہ کوئی داخل ہونے والا دربار شاہی کے آداب کے ادا کئے بغیر محل سرا میں داخل ہی نہ ہو سکے۔

مگر محبوب حقیقی کی شانِ کریمی ورحیمی ہے کہ دیواروں سے احاطہ بندی کے بجائے محض خطوط بین المواقیت سے احاطہ بندی قرار دے کر حدود میقات کی تعیین وتحدید کردی اور آداب شاہی کے بجالانے کے طریقے بھی خود ہی بتلادیئے حدود میقات کی اور محاذ میقات کی اس ترجمانی اور مفہوم میں جو ایک شبہ اور اس کا ازالہ کے تحت بیان کیا گیا ہے اس میں ان فوائد اور حکم کا کہیں دور دور تک بھی پتہ ونشان نہیں ہے، بلکہ ان مذکورہ خرابیوں کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو اس ترجمانی کی تردید کرتی ہیں، بغرض اختصار ذکر نہیں کیا جاتا۔

غرض حدود میقات ومحاذات میقات کی مذکورہ بالا ترجمانی جن کو صاحب اشکال وشبہ نے بیان ہے وہ اصول شرع، اصول فقہ اور ضوابط عقل ونقل سب کے ہی خلاف ہے اور غلط ہے۔

خشکی وبحر کے راستے سے جانے والے حجاج کے لئے یہ سب تفصیل ہے اگر کوئی ہوائی جہاز سے جانا چاہے تو اس کے لئے مزید تفصیل بھی ہوگی کہ اگر کوئی ہوائی جہاز محض اتنی بلندی پر پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر کسی دوربین وغیرہ آلہ کے مدد کے وہ نظر آتا ہے تو وہ زمین کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے حجاج کو کسی میقات اور خط میقاتی سے بغیر احرام کے آگے بڑھنا اور تجاوز کرنا جائز نہ رہے گا اور اس پر جانے والے حجاج کو اگر یہ ظن غالب ہو کہ صرف تھوڑے ہی وقفہ میں کسی میقات یا کسی خط میقات سے آگے بڑھ جائیں گے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ سوار ہونے سے قبل ہی احرام باندھ کر سوار ہوں یا سوار ہوتے ہی فوراً احرام باندھ کر تیار ہوجائیں، مثلاً ہندوپاک سے جانے والا ہوائی جہاز اگر قرن منازل ویلملم کے درمیان سے گزرتا ہوا جدہ یا حدود عرب میں کسی جگہ جاتا ہے تو وہ قرن منازل یلملم کے درمیان خط میقاتی سے یقیناً گزرے گا، اور اس حال میں اس خط (خط میقاتی بین قرن ویلملم) سے بغیر احرام باندھے ہوئے اس کے کسی مسافر کو آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، اور جو ہوائی جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر دوربین وغیرہ آلہ کی مدد کے نظر نہیں آتا ہو، جیسا کہ اکثر دور دراز مقامات (لندن، امریکہ، کنیڈا، افریقہ وغیرہ) سے آنے والے ہوائی جہازوں کا عموماً یہ حال ہوتا ہے، تو وہ زمین کے تابع نہیں قرار دیئے جائیں گے، بلکہ جس وقت وہ زمین سے قریب آکر نظر آئے گا تو اس وقت زمین کے تابع قرار دیئے جائیں گے، اور صرف اسی وقت سے احرام وغیرہ کے مذکورہ بالا احکامات اس میں آنے والے مسافروں پر لاگو ہوں گے، یا یہ کہ اس مسافر کو اس جہاز کا روٹ (راستہ) معلوم ہو، راستہ کے اور مقامات کا نقشہ بھی معلوم ہو اور جانتا ہو کہ فلاں میقات سے یا اس کی محاذات سے فلاں وقت گزرے گا تو اس وقت کے آنے سے کچھ قبل احرام باندھ لینا ضروری ہوجائے گا۔

لہذا ان کو ان امور کا مزید لحاظ رکھ کر اپنے احرام وغیرہ کا نظم رکھنا ضروری ہوگا، مثلاً چھ گھنٹہ مسلسل پرواز میں رہے گا اور جب اترے گا تو میقات کے اندر اترے گا تو اترنے سے محض گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے احرام باندھ لینا کافی ہوگا، اور اگر یہ معلوم ہے کہ وہ میقات سے باہر ہو جائے گا اور میقات کے باہر اترے گا، جب تو کوئی اس کا اشکال ہی نہیں، اتر کر پھر خشکی کے مسافروں کی طرح احرام باندھنے کا اہتمام و انتظام کرے گا۔

(نوٹ) حضرت مولانا شیر محمد صاحب نے جو ان مسائل میں امام مانے جاتے تھے ان کی بھی اپنی مشہور تصنیف عمدۃ المناسک فی شرح زبدۃ المناسک میں بھی اس انداز کی تحقیق کی ہے جو احقر نے پیش کی ہے۔

مسئلہ ۲: حنفیہ کے نزدیک بھی ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ کو رمی جمرات قبل الزوال جائز نہیں اور دس ذی الحجہ کو قبل الزوال رمی کرنا محض درست اور مباح ہی نہیں ہے، بلکہ افضل اور بہتر ہے اور بعد الزوال غروب تک مباح ہے، اور غروب آفتاب سے صبح صادق کے طلوع ہونے تک مکروہ ہے اور اس تفصیل کا ثمرہ محض یہ نکلے گا کہ ۱۱ رکی صبح صادق سے پہلے اگر کوئی رمی جمرہ کرے گا تو تارک نہ قرار پائے گا، باقی افضل یہی ہے کہ دسویں تاریخ کو زوال سے قبل قبل کر لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱۲/۹۹ ۱۳ھ

نقشہ نظری میقات خمسہ

جحفہ و رابغ — خط میقاتی حل کبیر و آفاق

خط میقاتی حل کبیر و آفاق — تنعیم — یلملم

ذوالحلیفہ — حدود حرم — کعبہ — مسجد حرام — خط میقاتی حل کبیر و آفاق

خط میقاتی حل کبیر و آفاق — حل صغیر — حل صغیر — قرن منازل

کراچی بمبئی........سمندر راستہ جہاز..

(خط میقاتی حل کبیر و آفاق ہندوستان و پاکستان) — سمندر راستہ جہاز..........

سمندر راستہ جہاز..........

جدہ

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت بغیر محرم کے حج کرے گی تو حج بکراہت تحریمی ہوگا:

میں یہاں طائف کے سرکاری دواخانہ میں کام کرتا ہوں، میری بیوی یہاں آئی ہوئی ہے، مکہ کی قربت کی وجہ سے ان پر حج فرض ہوجاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں مشکل یہ ہے کہ حج کے دوران جب کہ تمام ملک میں چھٹی ہے، ڈاکٹروں کو حج کی خصوصی ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، مجھے یا تو مکہ مکرمہ میں حج کی بولنگ ہوگی یا کسی اور جگہ پر ہوگی۔

اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کے محرم کے لیے کیا کیا جائے، کیا میری موجودگی حدودِ حرم کے اندر ہونے کی وجہ سے اور بیوی کے ساتھ محرم شرعی کے نہ ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہوجائے گا، یا پھر مجھے احرام باندھ کر ان کے ساتھ حج کے درمیان مستقل رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ بغیر محرم شرعی کے میری بیوی کا حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

ڈاکٹر سید انور حسین (ہوسپٹل طائف، سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

بخاری شریف ومسلم شریف میں روایت ہے: **"لاتسافر المرأة ثلاثا إلا ومعها ذو محرم أو كما قال عليه السلام"** (۱)۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسافتِ قصر یا اس سے زائد کا سفر عورت کو بغیر محرم کے یا شوہر کے کرنا جائز نہیں ہے، یہ عام اور مطلق ہے، سفرِ حج میں جانے والی عورت کے لیے بھی ہے، اس لیے آپ طائف سے تو حج کرنے کے لیے بغیر اپنے ساتھ لیے ہوئے یا کسی محرم کے ساتھ گئے ہوئے تنہا نہ بھیجیں، البتہ آپ یہ کرسکتے ہیں کہ جب آپ کی ڈیوٹی مکہ مکرمہ یا منیٰ میں یا حدودِ حرم کسی جگہ میں ہونے والی ہے، آپ مکہ مکرمہ یا منیٰ میں یا حدودِ حرم میں کہیں بھی اپنی ایک قیام گاہ کرایہ پر یا عاریۃً لے لیجیے اور وہاں ساتھ لاکر اہلیہ کا قیام کرادیجیے، پھر ۸ رذی الحجہ کو جو مناسک حج ادا کرنے کے لیے جانا وغیرہ پڑے گا وہ مسافتِ قصر سے بہت کم ہوگا اور مخالفت والا حکم جو اوپر حدیث پاک سے منقول ہے لاگو نہ ہوگا، کیونکہ منیٰ کا سفر ہوگا تو وہ صرف چار میل کا ہوگا، پھر منیٰ، عرفات، مزدلفہ کا سفر ہوگا وہ ۸/۹ میل سے زیادہ کا نہ ہوگا، اسی طرح حدودِ حرم کے ہر مقام سے کہیں سے بھی مسافتِ قصر نہ ہوگی، البتہ چونکہ اس سفر میں راتیں بھی گذریں گی، اس لیے اگر ممکن ہو تو آپ رات کو ان کے پاس خود رہ لیا کریں، یا ایسی معتبر اور حج کو جانے والی عورتوں کے ساتھ ان کو کردیں جن کے محرم یا شوہر ساتھ ہوں اور وقتاً فوقتاً

۱- صحیح مسلم ۱/۴۳۳۔

آپ بھی نگرانی کرتے رہیں، تو اس طریقہ سے اہلیہ کا حج بھی ادا ہو جائے گا اور کوئی شرعی قباحت یا خرابی بھی لاحق نہ ہوگی، ورنہ اگر عورت مسافتِ قصر کا سفر یا اس سے بھی زیادہ کا سفر طے کر کے تنہا حج ادا کرے تو حج کا فریضہ ادا تو ہو جائے گا مگر اس طرح سفر کا گناہ بھی ہوگا اور حج بکراہت ادا ہوگا، باقی مقبولیت کا مدار اخلاص پر ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-حقیقی خالہ کو حج میں ساتھ لے جانا:

حاجی اپنی سگی وحقیقی خالہ کو ساتھ لیجا سکتا ہے یا نہیں؟

۲-سردی کی وجہ سے سر میں کپڑا لپیٹنا:

آجکل موسم حج میں سخت جاڑا ہوتا ہے تو کیا سر میں کوئی کپڑا لپیٹ سکتا ہے کیونکہ سردی کی وجہ سے بیماری ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً اگر بیماری پڑ جائے تو پھر کیا سر میں کپڑا باندھ سکتا ہے اور اگر باندھے تو کیا قربانی واجب ہوگی اور اگر قران کا احرام ہو تو کیا دو قربانیاں جرمانہ کی واجب ہوں گی، یا ایک پھر یہ حکم ایک دن باندھنے کا ہے یا پورے ایام بھر باندھنے کا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-لے جا سکتا ہے (۲)۔

۲-اگر ممنوعِ احرام عذر سے بھی کرے گا تو جزا دینی واجب ہوگی، لیکن قانون یہ ہے کہ سر ڈھانکنے میں دم تب ہے جبکہ سارا دن ڈھانکے (۳)، اور اس سے کم ڈھانکنا اگرچہ گھنٹہ بھر ہو تو صدقہ دے نصف صاع اور گھنٹہ سے کم میں ایک مشت

۱- ”ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة، قال الشامي قوله مع الكراهة أي التحريمية للنهي في حديث الصحيحين: لاتسافر امرأة ثلثا إلا ومعها محرم“ (فتاویٰ شامی ۲/۲۰۰ کتاب الحج)۔

۲- اس لئے کہ حقیقی خالہ محرم ہے ”حرمت عليكم امهاتكم وبناتكم واخواتكم وعماتكم وخالاتكم“ (سورہ نساء ۲۳)۔

۳- ”أو ستر رأسه بمعتاد اما بحمل اجانة أو عدل شئ فلا شئ عليه يوما كاملا أو ليلة كاملة وفي الأقل صدقة“ (الدر المختار ۳/۵۷۷)۔

گندم دے اور دن سے زیادہ میں بھی ایک ہی دم ہے اگر چہ کئی دن پہنے رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

حجر اسود اور اس کی اہمیت:

کہتے ہیں کہ حجر اسود کو حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے، اگر یہ سب درست ہے تو پھر کیا جنت میں مادی اشیا موجود ہیں، اگر یہ دنیاوی سنگ ہے تو پھر ہمارے رسول اللہ ﷺ نے اتنی اہمیت کیوں دی؟

کوئی مسلمان اگر اس کو ایک معمولی سا پتھر سمجھ کر اس کا بوسہ نہ لے تو اس کا حج درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ممکن ہے کہ جوہر مجردہ میں سے رہا ہو اور جب دنیا میں اتارا گیا تو متصف بالمادہ کر دیا ہو، کیونکہ دنیا عالم مادیات سے ہے اور جوہر مجردہ کا اتصاف بالمادہ ممکن ہے، جیسا کہ روح جوہر مجردہ سے ہے لیکن اس کا اتصاف با جسام الحیوان ہوتا ہے حالانکہ اجسام کا مادی ہونا ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حجر اسود دنیاوی سنگ نہیں ہے کہ اس کو اس پر قیاس کیا جاوے، بلکہ یہ جنت کی ایک محبوب و معظم شے ہے، اسی لیے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی اہمیت دی ہے، پھر آپ کو حکم خداوندی اسی طرح کا تھا اور یہ ایک امر تعبدی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں اور جب اس کا شئے محترم ہونا عقلاً ممکن ہے اور حضور ﷺ نے معاملہ احترام کا حکم دیا ہے تو اس کی تحقیر کرنا رسول اللہ ﷺ کی اور اصل احکم الحاکمین کے حکم کی نافرمانی ہوگی، جو اپنے اندر شانِ بغاوت رکھے گی، اس لیے یہ حرکت جائز نہ ہوگی، اور اس کا تقاضا بے شک یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حج ہی ادا نہ ہوگا۔

لیکن حضور ﷺ کی شانِ رحیمی کا ظہور ہے کہ اس کا بوسہ نہ لینے سے کفارہ جنایت بھی لازم نہ آئے گا(۱)، اور فریضہ

۱- "قال: واستلمه إن استطاع من غير أن يوذي مسلماً، لماروي أن النبي ﷺ قبل الحجر الأسود ووضع شفتيه عليه، وقال لعمر رضي الله تعالىٰ عنه إنك رجل أيد تؤذي الضعيف فلا تزاحم الناس على الحجر، ولكن إن وجدت فرجة فاستلمه وإلا فاستقبله وهلل، وكبر، ولأن الاستلام سنة والتحرز عن أذى المسلم واجب" (الهدايه مع فتح القدير، ص ۳۵۳، کتاب الحج) (مرتب)۔

حج ادا ہو جائے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حجر اسود کے استیلام کے وقت پیر نہ موڑنا:

حجر اسود کے استیلام کے وقت حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ نے معلم الحجاج میں لکھا ہے کہ ہاتھ سے استیلام کے وقت صرف چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو حجر اسود کی طرف کرنے پر پیر نہ موڑے کہ یہ بہت برا ہے۔

بعض اچھے علماء کا خیال یہ ہے کہ شاید یہ سہو ہے، اس لیے کہ پیر اس طرف نہ کرنے میں ذرا لاپرواہی معلوم ہوتی ہے تو صحیح کیا ہے؟

حضرت مفتی صاحب نے جو لکھا ہے وہ صحیح ہے، یا بعض علماء کا خیال جو ہے کہ پیر بھی حجر اسود کی طرف کرے یہ صحیح ہے، ذرا اس پر روشنی ڈالیں مہربانی ہوگی!

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ ممبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ضابطہ کی اور اصل بات وہی ہے جس کو حضرت مفتی سعید احمد صاحب نے معلم الحجاج میں لکھا ہے، اس لیے کہ یہ استیلام طواف کرتے ہوئے ضمناً کرنا ہوتا ہے۔

لہٰذا طواف کرتے ہوئے جو قدم جس طرح رہتا ہے اسی طرح رہنے دیں، اس رخ سے قدم پھیرنے میں انقطاع فی الشوط کا ایہام ہوتا ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱۱/۱۴۰۹ھ

عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوگا:

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟ میں عمرہ کر کے جب واپس ہوا تو ہر شخص کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ تم پر حج فرض ہو گیا، اب تم نے حج نہیں کیا تو دوزخ میں جاؤ گے، پھر میں اس پر پریشان ہوا اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

محض عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بلکہ حج کی فرضیت لقولہ تعالیٰ: **"من استطاع إلیه سبیلا"** (۱) سے ہوتی ہے کہ جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت ہونے سے متحقق ہوتا ہے، لقولہ تعالیٰ: **"الحج أشهر معلومات فمن فرض فیهن الحج فلا رفث الخ"** (۲) جیسے نماز پنجگانہ کی نفس فرضیت عقل وبلوغ کے تحقق سے ہوجاتی ہے اور سبب وجوب صلوٰۃ اوقات صلوٰۃ سے متحقق ہوتا ہے کہ جب وقت صلوٰۃ آگیا، سبب وجوب متحقق ہوگیا کہ اگر بسبب وجوب (اوقات صلوٰۃ) پاکر نماز ادا نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، پس اس طرح چونکہ عمرہ میں طواف وسعی ہوتا ہے، پس جب کوئی شخص اشہر حج میں سعی وطواف بیت اللہ کرے گا تو وجوب کا سبب اشہر حج پائے جانے کی وجہ سے اب حج نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، نہ کہ محض عمرہ کرنے سے، پس اشہر حج سے قبل کوئی عمرہ کرے تو سبب وجوب حج متحقق نہ ہونے سے وجوب حج نہیں ہوگا، کیونکہ سبب وجوب کے پائے جانے سے پہلے وجوب نہیں ہوتا، جیسا کہ نماز کے بیان کردہ مسائل سے واضح ہوچکا۔

پس اگر اشہر حج میں عمرہ کرے گا تو حج بھی ادا کرنا اسی سال فرض ہوجائے گا اور اگر اشہر حج سے قبل عمرہ کرے گا تو وجوب کا سبب (اشہر حج) نہ پائے جانے کی وجہ سے اسی سال حج فرض نہ ہوگا، بلکہ اصل فرضیت **"فمن حج البیت من استطاع إلیه سبیلا"** (۳) کے حکم کے مطابق جس سال بھی ادا کرے گا حج ادا ہوجائے گا، کیونکہ اگرچہ بعض ائمہ کے نزدیک استطاعت ہوتے ہی پہلے ہی سال ادائے گی بھی فرض ہوجاتی ہے، مگر مفتیٰ بہ قول میں پہلے ہی سال ادائے گی لازم نہیں رہتی، بلکہ بعد میں بھی جس سال ادا کرے گا حج ہوجائے گا، قضا کرنا نہ کہا جائے گا، خلاصہ یہ کہ اشہر حج سے قبل محض عمرہ کرلینے سے اسی سال حج کا ادا کرنا فرض نہ ہوگا، پورا مسئلہ ذہن میں نہ آنے سے اس قسم کا خلط پیدا ہوجاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۱/۱۴۱۰ھ

۱- اگر ہوائی جہاز کے ذریعہ بغیر احرام باندھے جدہ پہنچے تو دم دینا ہوگا:

ہم لوگ سعودی عرب میں شہر جبیل میں کام کرتے ہیں، ہمارا ارادہ ہوا کہ عمرہ کرکے آئیں، ہمارا ایک عزیز جدہ

۱- سورۃ آل عمران: ۹۷۔

۲- سورۃ بقرۃ: ۱۹۷۔

۳- سورۃ آل عمران: ۹۷۔

میں کام کرتا تھا، ہم ظہران سے بذریعہ ہوائی جہاز جدہ بغیر احرام باندھے پہونچے اور جدہ میں ہم اپنے عزیز کے یہاں پہنچے، وہاں قریب ۴/۵ گھنٹہ ٹھہرے اور وہاں سے پھر ہم احرام وغیرہ باندھ کر مکہ معظّمہ گئے اور وہاں جا کر ہم لوگوں نے عمرہ کیا، عمرہ کرنے کے بعد جب ہم لوگ تبھیل آئے تو ہم نے سنا کہ چونکہ ہوائی جہاز ظہران سے جدہ میقات پر سے گذرتے ہوئے پہونچتا ہے، اس لیے ہم پر دم واجب ہوتا ہے، جب کہ ہمارا ارادہ پہلے اپنے عزیز سے ملنے کا تھا، اس کے بعد ہم لوگوں کا عمرہ کرنے کا ارادہ تھا، اس لیے پہلے تو ہمیں چند لوگوں نے بتایا کہ چونکہ تمہارا ارادہ اپنے عزیز سے ملنے کے بعد عمرہ کرنے کا ہے، اس لیے تم احرام جدہ سے پہلے بھی باندھ سکتے ہو۔

یہ لوگ جنہوں نے ہمیں پہلے اور بعد میں یعنی عمرہ سے پہلے احرام جدہ میں باندھنے کو اور عمرہ کے بعد دم واجب ہونے کو کہا یہ کوئی اچھے یعنی مولوی یا مفتی وغیرہ نہیں تھے، اس لیے اب ذہن نے یہ طے کرلیا کہ اس کا صحیح جواب معتبر علماء سے معلوم کیا جائے، برائے کرم بذریعہ ڈاک جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

۲- بحالت احرام اگر خود بخود بال ٹوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟

میں نے حج قران کیا، جب میں عرفات کے میدان میں پہنچا تو شام کے قریب ۳ بجے تھے، چونکہ تکان پوری تھی اور میرے ساتھ ایک چھتری بھی تھی عرفات سے واپسی میں، یعنی نماز ظہر کے وقت امام صاحب کے ساتھ ظہر اور عصر ادا کر کے ہم لوگ جبل رحمت کے قریب گئے تھے۔

(اور وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس چلتے ہوئے میدان عرفات میں ٹھہر گئے تاکہ وقت غروب میں مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں، وہاں تو شام کے قریب ۳ بجے تھے اور میں سر کو چھتری سے لگائے ہوئے یعنی چھتری کے سہارے اس طرح بیٹھا تھا کہ سر میرا چھتری کی اس جگہ تھا جہاں ہاتھ لگا کر چھتری کھولتے ہیں، ہوا یہ کہ اچانک ایک آدمی میرے پیچھے سے گذرا اور میں چونک گیا، اس اچانک چونکنے پر مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر کے بال کچھ ٹوٹ گئے، اب جو چھتری کا وہ حصہ دیکھا تو اس میں ایک حصہ بال کا لگا ہوا تھا، یہ بال میں نے جان کر توڑ نہیں، آپ اس بارے میں بھی لکھیں کہ اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا یا نہیں؟ یعنی دم یا کفارہ وغیرہ۔

۳- بیماری کی وجہ سے رمی میں نیابت:

میں نے حج کیا میں جب طواف زیارت یعنی ۱۰ تاریخ کو شیطان کو کنکریاں مارنے اور قربانی کرنے کے بعد شام کو طواف زیارت کر کے آیا تو مجھے بخار ہوگیا اور میں ۱۱ تاریخ کو تینوں شیطانوں کو کنکری مار کر آیا اور پھر جب ۱۲ تاریخ آئی تو

چونکہ بخار کی وجہ سے میری حالت بہت خراب تھی، مجھ سے چلنا دشوار ہورہا تھا، میرے ساتھ میرا بھائی بھی تھا، جب میں کچھ دور چلا اور ساتھیوں نے دیکھا کہ اس سے چلنا دشوار ہے اور رش یعنی پبلک بھی تو پوری طرح ہے، انہوں نے کہا کہ اپنی کنکریاں بڑے بھائی کو دے دو یہ اپنی کنکریوں کے بعد تمہاری کنکریاں بھی ماردیں گے، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے انہوں نے اپنی کنکریاں ماریں اور پھر بعد میں میرا نام لے کر میری طرف سے شیطانوں کو کنکریاں ماریں، اب لکھیں کہ اس بارے میں کفارہ وغیرہ دینا چاہیے یا نہیں؟

۴-کفارہ یا دم کہاں دینا ضروری ہے؟

ہم بمبئی جارہے تھے، اتفاق سے جدہ ایک رات کے لئے رکے، ہمارا ارادہ ہوا کہ مکہ مکرمہ جاکر کم از کم طواف کرآئیں، چنانچہ ہم نے جاکر طواف کرلیا، کیا ہم نے صحیح کیا یا نہیں اگر نہیں تو کیا ہم کو اس صورت میں کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

نوٹ: میں حنفی ہوں اگر آپ یہ لکھیں کہ ہم پر کچھ کفارہ یا دم واجب ہوتا ہے تو ہم وہ کفارہ یا دم انڈیا جاکر ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ یا مکہ وغیرہ میں کرنا ضروری ہے۔ جزاکم اللہ خیراً انشاء اللہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا آخرت میں اچھا بدلہ دے گا۔

شکیل احمد (سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر آپ کا جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرتا ہوا خطِ میقاتی پر سے گذرا ہے کہ وہ زمین سے نظر نہیں آسکتا تو آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہے اور اگر آپ کا ہوائی جہاز اتنا نیچے نیچے پرواز کرکے گیا ہے کہ زمین پر سے نظر آسکتا ہے تو ایک دم دینا واجب ہوگا، دم دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بھیڑ، یا دنبہ یا بکری خرید کر حرم شریف کی حد میں ذبح کرکے یا ذبح کراکے فقراءِ حرم پر صدقہ کردے اور اس میں خود یا غنی کو نہ دے، ہوائی جہاز کے محکمہ سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ ہوائی جہاز کتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے (۱)۔

۲-اس صورت میں آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ صدقہ دینا واجب ہے، البتہ آپ اگر احتیاطاً سیر آدھ پاؤ گیہوں وغیرہ صدقہ کردیں تو بہتر ہے۔

۱- ''فإن علیهما أي مكي ومتمتع دما لمجاوزة میقات المكي بلا إحرام (الدرالمختار الشامی ۲۲۶، ج۲)۔

۳-اس صورت میں بھی کوئی کفارہ یا دم وغیرہ دینا لازم نہیں ہے (۱)۔

۴-سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جمیل میقات سے باہر آفاق میں ہے اور وہیں سے جدہ آئے اور بغیر احرام باندھے طواف کرآئے یہ غلط ہوگیا، احرام باندھ کر جانا ضروری تھا، پھر عمرہ و طواف وغیرہ کرنا چاہیے تھا، ایک دم جنایت دینا واجب ہوگیا، یعنی ایک بھیڑ یا بکری یا دنبہ خرید کر حرم میں ذبح کرانا اور اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، نیز ایک عمرہ بھی احرام باندھ کر کرنا ضروری ہوگیا (۲)۔

نوٹ: ہم لوگ بھی سنی حنفی ہیں اور سب جوابات فقہ حنفی سے دیے گیے ہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دم جنایت کی ادائیگی حدود حرم میں ضروری ہے؟

(الف) سائل نے سابقہ فتوی (۹ ۳۳۳ الف) جواب ۹۶۰ الف کا حوالہ دیا ہے نیز تحریر کیا ہے کہ ہم لوگوں کو قربانی انڈیا میں بھی کرنا درست ہے یا یہاں پر ہی کرنا ضروری ہے جہاں پر ہم قیام پذیر ہیں مطلب صرف یہ ہے کہ ہم یہاں حصول معاش کے لئے آئے ہوئے ہیں اگر کوئی گنجائش ہو اور کوئی راستہ ہو تو تحریر کریں۔

کیوں کہ یہاں پر قربانی کرنے سے کافی خرچ آتا ہے اور انڈیا میں کم آئے گا، عمرہ کی قضاء ہم لوگوں نے کر لی ہے، مگر قربانی ابھی تک نہیں کی ہے، صرف آپ کی جانب سے جواب آنے کی دیر ہے، براہ کرم اگر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

(نوٹ) اور اب سے تقریباً دو ماہ دس دن کے بعد حج آرہا ہے، لہذا اس وقت تو قربانی کرنا ہے، لہذا اگر کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ہو تو کیا ایک ساتھ اونٹ، گائے، وغیرہ وغیرہ میں جس جانور میں سات حصے ہوتے ہوں تو ایک ساتھ دو

۱- "ومن كان مريضا لايستطيع الرمي يوضع في يده ويرمي بها أو يرمي عنه غيره وكذا المغمى عليه، ولو رمى بحصاتين إحدلهما لنفسه والأخرى للآخر جاز" (البحر الرائق، ص ۳۱۵، ج ۲ باب الاحرام) (مرتب)۔

۲- "وكل شي فعله القارن فعليه دمان: دم لحجته، ودم لعمرته، إلا أن يتجاوز الميقات غير محرم بالعمرة أو الحج فيلزمه دم واحد، لما ان المستحق عليه عند الميقات إحرام واحد وبتاخير واجب واحد لايجب إلا جزاء واحد" (ھدایہ اولین، ص ۲۲۷، کتاب الحج) "ويجب أي الدم على من دخل مكة بلا إحرام لكل مرة" (الدر المختار علی ھامش الشامی، ص ۳۲۴، ج ۲ کتاب الحج (مرتب)۔

حصے کر سکتے ہیں، یعنی ایک قربانی تو حج کی اور ایک قربانی عمرہ کی قضاء کی، آیا ان سب کی مجبوری میں گنجائش ہوگی؟ اگر کوئی گنجائش ہو تو تحریر کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عمرہ میں غلطی کی وجہ سے یہ قربانی جو لازم آئی ہے اس قربانی کو دم جنایت کہتے ہیں اور دم جنایت والی قربانی کا حدود حرم میں ذبح کرنا واجب ہے، حدود سے باہر کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں ایسا کر سکتے ہیں کہ حج میں جو قربانی کی جاتی ہے اس میں بجائے بکرا دنبہ کے گائے یا اونٹ (ایسا جانور جس میں سات حصے ہوتے ہیں) خرید یں اور اس میں جتنے حصے چاہیں اس دم جنایت والی قربانی کے بھی رکھ لیں تو یہ جائز رہے گا(۱)، بلکہ یہ بھی کر سکتے ہیں ساتوں حصہ دم جنایت کا سات آدمیوں کے عمرہ کا ہو اور سب مل کر ایک گائے یا ایک اونٹ خرید کر ساتوں حصہ دم جنایت کی نیت سے ذبح کر دیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حج کی قربانی کہاں کی جائے؟

ریڈیو کویت اور پاکستانی رسالہ ''اخبار جہاں'' سے معلوم ہوا کہ دوران حج قربانی منیٰ میں نہ کر کے اپنے ملک یا گھروں میں کر سکتے ہیں۔

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۲۴، ریاض، سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسئلہ بھی غلط بتایا اور وجہ بھی غلط بتائی یا پھر ادھوری بات بتائی، مسئلہ اس طرح ہے کہ قربانی دو طرح کی ہوتی ہے:

ایک قربانی تو وہ ہے جو صاحب نصاب مقیم پر واجب ہوتی ہے، خواہ حج کرنے جائے یا نہ جائے۔

۱- "لو ذبح سبعة عن أضحية متعة، وقران واحصار وجزاء الصيد والحلق والعقيقة والتطوع فإنه يصح في ظاهر الأصول" (شامی ۹/۳، ۴۷۲، مطبع زکریا)۔

اگر حاجی صاحب نصاب ہے اور مکہ مکرمہ یا مدینہ طیبہ کا مکین بھی پندرہ دن سے زیادہ قیام کی نیت کرے تو اس پر قربانی واجب ہوجائے گی، اس کے بارے میں اختیار ہے کہ چاہے تو مکہ مکرمہ میں یا مدینہ طیبہ میں یا گھر پر ہی کرنے کا انتظام کرے، یا اپنے وطن میں قربانی کے لیے رقم بھیج دے کہ وطن کے لوگ وطن میں اس کی طرف سے کردیں اور اس قربانی کے بارے میں مذکورہ مصلحت سوچی جاسکتی ہے۔

اور دوسری قربانی حاجی پر بوجہ حج واجب ہوتی ہے، اس قربانی کا منیٰ میں کرنا واجب ہے اس میں گوشت کے اضاعت وعدم اضاعت پر نظر نہ ہوگی، بلکہ اس میں صرف اراقۃ دم شرعاً مطلوب ہے، اس میں مذکورہ مصلحت بیان کرنا غیر شرعی بات ہوگی، اسی طرح دم احصار اور دم جنایت کا بھی حکم ہے، کہ اس کا بھی حدود حرم میں کرنا واجب ہوتا ہے، اس کے بارے میں بھی مذکورہ مصلحت صحیح نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

منیٰ کی قربانیوں کا گوشت اور چمڑا قابل استعمال بنانے کی اسکیم:

ادارہ ہذا نے منیٰ کی قربانیوں کے جانوروں کے چمڑے، گوشت وغیرہ کو سائنٹفک طریقہ پر کارآمد بنا کر اس کی آمدنی سے مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشرتی پستی کی امداد کے لیے سفارت خانہ حکومت سعودی عربیہ دہلی سے درخواست کی معزز سفیر نے رابطہ عالم اسلامی کانفرنس سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔

نیز حکومت ہند نے مذہبی موانعات کا جواز ظاہر کرکے اس میں حصہ لینے سے مجبوری کا اظہار فرمایا۔

ان حالات میں ہمارے اس منصوبہ کی تکمیل وکامیابی کے لیے آپ کی اصابت رائے اور فتویٰ کافی اہمیت کا حامل ہے، براہ کرم اس تعلق سے فتویٰ صادر فرماکر ممنون فرمائیں!

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ قربانی کا گوشت وچمڑ قربانی کرنے والا خود استعمال کرڈالے یا کسی غریب کو صدقہ کردے یا کسی غنی کو تحفہ یا ہدیہ کردے یہ سب جائز ہے (۱)، بشرطیکہ وہ واجب التصدق نہ ہو (جیسا کہ نذر کی قربانی یا میت کی طرف سے اس کی

۱- ”ویتصدق بجلدها لأنه جزء منها أو یعمل منه آلة تستعمل فی البیت کالنطع والجراب والغربال ونحوها“ (ھدایۃ

وصیت کے مطابق کی ہوئی قربانی یا دم جنایت) ورنہ اس کا حکم دوسرا ہوگا۔ پھر وہ غنی وغریب اس کا مالک ہونے کے بعد خود استعمال کرے یا کسی کو دیدے حتیٰ کہ چمڑے کو اگر فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے مصرف میں صرف کر دے اس کا بھی اختیار اس کو حاصل ہے۔

ہاں قربانی کرنے والا اگر خود تحفہ، ہدیہ یا صدقہ کرنے کے بجائے فروخت کردے تو اس پر اس کی قیمت کا تصدق کرنا لازم ہوگا، یہی حکم منیٰ کی قربانی اور مناسکِ حج کے اضحیہ کا بھی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ مناسکِ حج کا اضحیہ خالص اور اعلیٰ شعائر اسلامیہ میں سے ہے اور اس میں محض اظہارِ تعبد بشکل اراقۂ دم ہے، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی موقعہ پر ستر اونٹ اور کسی موقعہ پر سو اونٹ کی قربانی کرنے سے ظاہر ہے، کیونکہ نفسِ وجوبِ اضحیہ تو ایک بکری یا اونٹ کے ساتویں حصہ سے بھی ادا ہوسکتا ہے۔

اور یہ اسکیمیں اگرچہ بظاہر خوشنما ہی نہیں قدرے مفید بھی معلوم ہوتی ہیں مگر اظہارِ تعبد کے منافی ہیں اور اس مقصد کو فوت کرتی ہیں جو مشکوٰۃ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طرزِ عمل سے ظاہر ہو رہا ہے، کیونکہ اس طرح کار بند ہونے پر بعد چندے یہ عمل (اراقۂ دم) محض ایک سیاسی، تجارتی، معاشی مقصد ہو کر رہ جائے گا اور اظہارِ تعبد فنا ہوکر قلبِ موضوع، قلبِ ماہیت اور مسخِ مذہب کا ذریعہ وسبب بن جائے گا، اس لیے اس اسکیم کو اختیار کرنا شریعت مطہرہ کے ایک اہم مقصد کو فوت کرنا ہے!

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پستی کے ازالہ کی اس سے آسان اور بے کھٹکے دوسری بہت سی صورتیں موجود ہیں اور ان میں سے یہ صورت بہت ہی آسان ہے کہ ایسا نیک جذبہ رکھنے والے اگر خود صاحبِ نصاب نہ ہوں جب بھی اپنے گردوپیش بسنے والے اغنیاء سے پوری پوری رقم زکوٰۃ ادا کرنے اور اس قسم کے پریشان حالوں کی پریشانی رفع کرنے میں کرائیں اور اگر خود بھی صاحب نصاب ہیں تو ان پر اور بھی حکم متوجہ ہے کہ اپنی رقم کی پوری پوری زکوٰۃ صحیح طریقہ اور ان مصارف میں صرف کر کے ایسے لوگوں کی پریشان حالی دور کریں اور دور کروائیں اور ان کا باقاعدہ نظم فرمائیں۔
اسی طرح حکومتوں کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں کہ اموالِ باطنہ وظاہرہ دونوں کی زکوٰۃ کا صحیح نظم اور صحیح استعمال ہونے لگے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۲/ ۹۹ ۱۳ھ

اخرین، ص ۳۴ ۳۳۴ کتاب الاضحیہ) (مرتب)۔

بدرجہ مجبوری خواتین کے لئے بحالت حیض طواف زیارت کا حکم:

۱-حیض کی وجہ سے عورت طواف زیارت نہیں کرسکی یہاں تک کہ جہاز کے چلنے کا وقت آ گیا اور وہ ابھی تک پاک نہیں ہوئی دور دراز مسافت اور قلتِ نفقہ وغیرہ کے سبب مکہ مکرمہ میں لوٹ کر آنا ممکن نہیں یا بہت متعذر ہے، اور ظاہر ہے کہ اس رکن کے ترک سے حج نامکمل رہتا ہے، یہاں تک کہ فقہا حضرات نے لکھا ہے کہ واپس آکر طواف کرنا ہی پڑے گا۔

یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالات سفر میں ملکی قوانین کی رو سے اور زیادہ مشکل ہوگیا ہے، چونکہ متعین تاریخ پر جہاز کی روانگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسرا جہاز نہیں مل سکتا۔

نیز ویزا بھی نہیں مل سکتا تاکہ قیام میں ذرا تاخیر ہو اور پھر واپس آنا بھی مشکل ہے، بہت سے لوگوں کو دوبارہ سفر نصیب نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چند مہینہ یا چند سال کے بعد اتنی دراز مدت کے لیے الگ رہنا طواف رکن ادا نہ کرنے کی وجہ سے دشوار ہے، مسئلہ ہذا کے متعلق چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱)"في الشامي نقل بعض المحشين عن مسلك ابن امير حاج: لوهم الركب على القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف أم لا؟ قالوا: يقال لها: لايحل لک دخول المسجد، وإن دخلت وطفت أثممت وصح طوافک، فعليک ذبح بدنة وهذه المسئلة كثير الوقوع يتحير فيها النساء"(۱)۔

(۲)"في المبسوط السرخسي وإن كان طاف للزيارة جنباً حتىٰ رجع إلى أهله فإنه يعود إلى مكة ليطوف طواف الزيارة وإن لم يرجع إلى مكة فعليه بدنة لطواف الزيارة وعلي الحائض مثل ذالک، وليس عليها لترک الصدر شئي الخ"(۲)۔

(۳)"في البحر الرائق: بعد قول الكنز: طاف للركن محدثابدنة لوجنبا ويعيد والإعادة هي الأصل مادام بمكة وأما إذا رجع إلى أهله ففي الحدث الأصغر اتفقوا إن بعث الشاة أفضل من الرجوع، واختلفوا في الحدث الأكبر فاختار في الهداية أن العود إلى الإعادة أفضل واختار في المحيط إن بعث الدم أفضل"(۳)۔

۱- شامی ۲/ ۱۸۴۔

۲- مبسوط السرخسی ۴/ ۴۱۔

۳- البحر الرائق ۳/ ۲۰۔

(۴)"في الهداية: وإن لم يعد وبعث بدنة أجزأه لمابينا أنه جابر له (أي بعد أن طاف للزيارة جنباً "(۱)۔

(۵)"وفي فتح القدير: لو طاف المرأة للزيارة حائضاً فهو كطواف الجنب الخ" (۲)۔

عبارت مرقومہ سے ظاہر ہے کہ جنبی یا حائضہ کا طواف صحیح ہوسکتا ہے، لیکن عدم اعادہ کی صورت میں منجبر بالبدنہ ہو جاتا ہے اور عدم اعادہ کی صورت یہی ہے کہ وہ وطن لوٹ آئے۔

البتہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اثم کا ہونا بھی محقق ہے گو بدنہ سے اس کا انجبار ہوجاتا ہے تو ہمارے مسئلہ میں جب ایسے قوی اعذار موجود محقق ہیں، کیا پھر بھی وہ عورت گنہگار ہوگی؟ حاصل یہ ہے کہ ان عبارات کے پیش نظر جو عورت حائضہ ہے اور بوقت روانگی جہاز اب تک پاک نہیں ہوئی وہ طواف رکن کرکے بدنہ ادا کرسکتی ہے یا نہیں؟ اور اعذار مذکورہ کی بناپر اثم کا تحقق ہوگا یا نہیں؟

کیا بحالت مجبوری رمی قربانی اور حلق کے درمیان کی ترتیب ساقط ہوجائے گی؟

عند الحنفیہ متمتع اور قارن کے لیے یوم نحر میں ترتیب بین الرمی والذبح والحلق ہے، یعنی پہلے رمی جمرہ عقبہ پھر ذبح پھر حلق کرائے ترتیب میں تقدیم وتاخیر یا تبدیل ہوتو دم واجب ہوجاتا ہے، یہ مسئلہ مسلم ہے کہ آج کے احوال کے پیش نظر ترتیب کا باقی رکھنا ایام حج میں مشکل ہے بلکہ نہایت ہی متعذر ہے الا ماشاء اللہ، متعذر ہونے کی یہ وجوہات ہیں:

(۱) بے حد ازدحام وہجوم۔

(۲) مذبح کا قیام گاہ سے بہت دور ہونا یعنی منیٰ میں۔

(۳) گرمی کی شدت، ان تینوں باتوں کے سبب قیام گاہ سے مذبح تک جانا گو ممکن ہے مگر بہت دشوار ہے۔

(۴) وکلاء یعنی جو لوگ وکالۃً دوسروں کی طرف سے قربانی کرتے ہیں، اس میں بہت ہی کوتاہیاں کرتے ہیں، کبھی رمی سے پہلے ہی قربانی کردی یا حلق کے بعد ہی کردی اور بعض غیر مقلد تو یوم نحر سے پہلے ہی قربانی کر بیٹھتے ہیں۔

(۵) جہالت عامہ کی بناپر اکثر لوگ ان وکلاء پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ترتیب رمی، حلق وذبح کے درمیان کوئی چیز ہی نہیں یا ان کو خبر ہی نہیں کہ ترتیب ٹوٹ گئی۔

۱- ہدایہ ۱/ ۲۷۳۔
۲- فتح القدیر ۲/ ۲۶۴ کتاب الحج۔

(۶) ضعیف وبوڑھے کے حق میں تو یہ اعذار نا قابلِ تردید ہیں۔

(۷) آج کل کوپن سے جو جانور خرید ے جاتے ہیں ان میں بھی زیادہ وثوق نہیں، اس لیے کہ یہ حکومتِ سعودیہ کی طرف سے فروخت کئے جاتے ہیں اور غیر مقلدین کی بناپر وہ بھی اس ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتے بعض لوگ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قربانی ہوئی، یا نہیں ہوئی اب وہ حلق کب کرے، اگر کرلیا تو خلجان اورشبہ ضرور رہے گا۔

(۸) خود مذبح میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ لوگوں کے ہجوم اور جانوروں کی کثرت کی بناپر طبیعت گھبرا جاتی ہے، اور چوٹ لگنے کا بھی اندیشہ ہے، اور اوپر سے تین میل گرمی میں پیدل چلنا پڑتا ہے، اس موقع پر گاڑی ملنا بھی مشکل اور غریب لوگوں کے پاس کرایہ بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا ان وجوہات کے ماتحت ضرورت سمجھ کر کیا کسی حنفی کو حق ہے کہ اس خاص مسئلہ میں شوافع کے مسلک پر عمل کرے کہ ان کی کتابوں سے عدم وجوبِ ترتیب ظاہر ہے، تو مذہب شوافع پر عمل کرنے سے یہ سہولت ہوگی کہ اب کسی حاجی کو اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری نہ ہوگا اور کسی قسم کا خلجان یا پریشانی نہیں ہوگی، اگر ضرورت سے قربانی پہلے کی گئی یا حلق پہلے اور قربانی بعد میں کی تو کچھ واجب نہیں ہوگا۔

اس ضروری امر میں حضرات علماء کرام سے رہنمائی مطلوب ہے۔

سراج احمد غفرلہ (جنوبی افریقہ، ۱۰/شعبان/ ۹۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی طواف زیارت بالکل نہ کرے نہ بحالت طہارت نہ بحالت غیر طہارت بلکہ بالکل ترک کر دے اور وطن کو رجوع کر جائے اور میقات سے باہر تک پہونچ جائے تو جب تک جدید احرام کے ساتھ واپس آ کر طواف زیارت کا ارادہ نہ کرے، احرام حج سے باہر نہ ہوگا، اور مدت العمر تک عورت اس پر حلال نہ ہوگی، لیکن اگر طواف زیارت کر کے خروج عن المیقات کیا ہے خواہ حالت جنابت میں احرام جدید کے ساتھ واپس آ کر اعادہ تو افضل ضرور ہے لیکن اگر واپس نہ آئے بلکہ دم جنایت (بدنہ) بھیج دے تو بھی کافی ہوجاتا ہے، اور انجبار ہوجاتا ہے یعنی واپس آ کر طواف کرنا واجب نہیں رہتا ہے۔

اپنی پیش کردہ عبارت کو سے ذرا پہلے پڑھ لیجئے تو اس سے یہ مسئلہ واضح ہوجائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالات سفر وغیرہ سے واپسی بسا اوقات دشوار ہوجاتی ہے۔

پھر شامی کی عبارت سے عورت کے گنہ گار ہونے کا جو اشکال پیش کیا ہے، اس پر یہ عرض ہے کہ اس عورت کے فتویٰ لے لینے اور اس کا جواب لاتحل دخول المسجد مل جانے کے باوجود مکہ میں رہتے ہوئے فتویٰ کے خلاف کر کے مسجد حرام میں داخل ہوگئی تو یہ معصیت لازم آئے گی کما اشار الیہ قول المفتی، وان دخلت و طافت آثمت۔

بہر حال خلاف فتویٰ داخل ہوکر اگر چہ گنہگار ہوگئی تو اس پر اس کا توبہ کرنا لازم ہوگا لیکن اس کا یہ طواف صحیح ہوجائے گا اور انجبار نقصان کے لیے ذبح بدنہ لازم ہوجائے گا اور جب توبہ و ذبح بدنہ کرے گی تو انجبار مکمل ہوکر معصیت بھی ختم ہو جائے گی۔ ”لأن التائب من الذنب کمن لا ذنب له او کما قال علیه الصلوٰۃ و السلام“ (۱)۔

یہ حکم ایسا ہے جیسا کہ نماز میں کسی واجب کے سہواً ترک ہوجانے پر ارتکاب معصیت ہوجاتی ہے اور جب سجدۂ سہو کر لے تو اس سے انجبار ہوکر معصیت مرتفع ہوجاتی ہے، اسی طرح یہاں بھی حکم ہوگا، کیونکہ جس طرح ترک واجب سہواً میں سجدہ سہو منجبر ہوتا ہے ایسا ہی یہ ذبح بدنہ بھی منجبر ہوتا ہے۔

اور فرق یہ ہوگا کہ نماز میں ترک واجب سہواً میں کوئی مذکر نہیں تھا، اس لیے معصیت نہ ہوگی اور یہاں فتویٰ مفتی مذکر موجود تھا، اس لیے معصیت اور اس پر توبہ کا حکم ہوگا۔

نیز آپ کی پیش کردہ عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر حائضہ نے بحالت حیض طواف زیارت کرلیا مکہ میں رہتے ہوئے تو اس پر یہ حکم تھا کہ توبہ اور اعادہ کرے، یعنی دوبارہ بحالت پاکی طواف کرے، لیکن اگر اعادہ نہ کرے، اور وطن لوٹ آئے تو اعادہ کے لیے لوٹ کر آنا واجب نہیں رہتا، بلکہ صاحب ہدایہ کے نزدیک اگر چہ عود الی الاعادہ افضل ہے، لیکن صاحب محیط کے نزدیک صرف بدنہ (برائے دم جنایت) بھیج دینا افضل ہے، لہٰذا اگر عود الی الاعادہ کرے گی تو فضیلت ہوگی۔

نیز البحر الرائق کی عبارت اور شامی کے سیاق وسباق سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بحالت حیض طواف کرنے کے بعد اگر مکہ میں رہتے ہوئے پاک ہوکر طواف کرنے کا موقع نہ ملے اور پاکی کے انتظار میں مکہ میں رہنا اختیار میں نہ رہے، مثلاً قافلہ اس کا چل دے گا یا اس کا جہاز چھوٹ جائے گا اس مجبوری سے بغیر اعادہ وطن چلی گئی تو حسب نص شرعی ”لایکلف اللہ نفساً الا وسعها“ (۲) اس کے چلے جانے پر مواخذہ نہ ہوگا۔

۱- مشکوٰۃ المصابیح/۲۰۶۔

۲- سورۂ بقرہ/۲۸۶۔

تقریب فہم کے لیے چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱)"وأما ترک الواجبات بعذر فلا شئي عليه ، ثم مراد هم بالعذر مايكون من الله تعالىٰ، فلو كان من العباد فليس بعذر (إلى قوله) بخلاف ما إذا منعه خوف الازدحام فإنه من الله تعالىٰ فلا شئي عليه" (۱)۔

(۲)"وفي الشامية: إن ترک الواجب بعذر مسقط للدم" (۲)۔

(۳)"وتجوز أي النيابة في الرمي عند العذر" (۳)۔

(۴)"ولو طاف المفرد وغيره قبل الرمي والحلق لاشئي عليه ويكره لترک السنة" (۴)۔

(۵)"وليس أن يبيت بمنى ليالي أيام الرمي، فلو بات بغير ها متعمدا كره ولاشئي عليه" (۵)۔

(۶) جو شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہو یا جمرات تک پیدل یا سوار ہو کر آنے میں سخت تکلیف ہو یا مرض بڑھ جانے کا یا مرض پیدا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو تو وہ معذور ہے (۶)۔

(۷) اگر معذور کا عذر دوسرے سے رمی کرانے کے بعد ایام رمی کے رہتے ہوئے زائل ہو جائے تو بھی دوبارہ خود رمی کرنا ضروری نہیں رہتا (۷)۔

(۸) ذبح میں نیابت کا ثبوت عام اور شائع ہے، جیسا کہ آپ کی پیش کردہ عبارت ۲ سے بھی اخذ ہوتا ہے۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ترتیب بین الرمی والذبح والحلق اگرچہ واجب فی نفسہ ہے لیکن عذر شرعی کی وجہ سے اگر چھوٹ جائے یا ٹوٹ جائے اور اس پر عمل نہ ہو سکے تو اس پر دم جنایت وغیرہ یا کوئی وزر یا کفارہ وغیرہ نہ آئے گا بلکہ ادائیگی حج بلا کراہت مکمل ہو جائے گی۔

اور جناب کے ذکر کردہ اعذار مذکورہ میں ۱ کے عذر کا مبیح للترک ہونا تو ظاہر ہی ہے اور باقی غیروں میں بھی ایسا

۱- غنیۃ الناسک فی بغیۃ المناسک ۱۳۸۔

۲- ۲۰۶/۲۔

۳- غنیۃ ۱۰۰۔

۴- شرح مسلک ۱۵۵۔

۵- غنیۃ ۹۵۔

۶- زبدۃ المناسک ناقلاً عن اللباب ۱۶۵۔

۷- زبدۃ المناسک ۱۶۶۔

شخص جو ضعیف و بوڑھا ہو یا اتنی لمبی مسافت تک چلنے کا عادی نہ ہو اور شدید گرمی و دھوپ میں چلنے میں ظن غالب ہو کہ بیمار ہو جائے گا یا مرض بڑھ جائے گا یا چوٹ وغیرہ نا قابل تحمل پیدا ہو جائے گی اور سواری نہ ملے گی تو اس کے حق میں یہ ترتیب واجب نہ رہے گی بلکہ محض حسب استطاعت امتثال کا حکم رہے گا، اور وہ اعذار کی وجہ سے اپنے نائب کے ذریعہ رمی وذبح دونوں کرا سکے گا، اور نائب کے ذریعہ کرانے کے بعد خود عذر صحیح زائل ہو جائے جب بھی دوبارہ خود عمل کرنا اس پر لازم نہ رہے گا۔

اور ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں احتیاط سے کام لینے کا حکم متوجہ ہو جائے گا، مثلاً اپنی جماعت و گروہ سے جو متدین اور محتاط ہو اور اس امر پر قادر ہو اور اس سے یہ ظن غالب ہو کہ صحیح وکالت و نیابت انجام دے دے گا تو اس سے یہ کام کرا لیا جائے اور اس کو ہدایت کر دی جائے کہ قربانی سے فارغ ہو کر جلد سے جلد اطلاع کرے، پھر جب تک اچھی طرح مقررہ وقت کے ساتھ قربانی ہو جانے کا ظن غالب نہ ہو جائے حلق نہ کرائیں، البتہ طواف و حلق میں نیابت درست نہ ہوگی۔ نیز طواف زیارت کا ان سب چیزوں کے بعد ہونا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف سنت ہے **كما في العبارة الرابعة**۔

اس لیے طواف زیارت کا ان چیزوں سے پہلے کر لینا علماء نے صرف مکروہ لکھا ہے اور کوئی دم یا صدقہ وغیرہ لازم ہونا نہیں لکھا ہے، خاص کر ایسی مجبوری کی حالت میں کراہت بھی نہ ہوگی، لہذا ایسی معذوری کی حالت میں اگر بآسانی ہو سکے تو خود طواف کے لیے چلا جائے اور طواف کرے، اور پھر قربانی ہو جانے کی اطلاع مل جائے تو حلق کرائے، حلق کرا لینے کے بعد عورت بھی حلال ہو جائے گی۔

اور جب ان تمام مسائل میں بوقت معذوری فقہ حنفی سے بھی مذکورہ گنجائش نکل آتی ہے تو اب تقلید حضرت امام شافعیؒ کرنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۹/۱۴۰۸ھ

عمرہ میں بال قصر کرانے کی مقدار (سر کے ایک طرف کا بال کٹانا درست نہیں):

۱- جدہ سعودی عرب میں مقیم اکثر حضرات فرصت اور چھٹی کے دنوں میں بیت اللہ شریف جا کر ایصال ثواب کے لئے اپنے خاندان کے مرحومین کی طرف سے عمرہ ادا کرتے ہیں، عمرہ میں طواف اور سعی کے بعد بالوں کو ترشوانے یا قصر کروانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کتنی مقدار میں بال نکلوانے چاہئیں جبکہ حسب ذیل صورتیں واقع ہوں:

۱- ایک شخص کے کافی لمبے بال ہوں۔

۲-ایک شخص کے مختصر سے بال ہوں۔
۳-ایک شخص کے مکمل صاف ہوں۔
مندرجہ بالا صورتوں میں ایک ہی حکم کا اطلاق ہوگا یا علیحدہ صورتیں ہیں۔

۲-کیا ایک شخص مسلسل عمرہ کر کے ¼ کے حساب سے چار عمروں میں اپنا سر صاف کروا سکتا ہے؟ جبکہ بعض فقہ کی کتب میں یہ بات درج ہے کہ حضور ﷺ نے اس طرح کے عمل کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور بجائے مسلسل عمرہ کے طواف کی فضیلت بتلائی ہے، براہ کرم اس سلسلہ میں شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

۳-سعودی، مصری، سوڈانی، اور یمنی حضرات بعد سعی کے چاروں طرف سے مختصر سے بال قینچی سے نکال لیتے ہیں، ان میں اکثر شافعی مسلک کے ہیں، اگر ایسی سہولت دوسرے مسلک میں ہو تو کیا اسے حنفی مسلک والے اپنا سکتے ہیں یا نہیں؟ براہ کرم اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

محمد نور اللہ شریف (پوسٹ بکس ۹۰۲ جدہ سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

قرآن پاک میں ہے:" **محلقین رؤسکم و مقصرین لا تخافون** "(۱)، محلقین رؤس پورے سر کے بال کٹانے والے کو کہتے ہیں، نیز حدیث پاک میں مثلاً مسلم شریف میں سر کا کچھ حصہ مونڈانا اور کچھ چھوڑ دینا اس طرح کچھ حصہ کا بال کٹانا اور کچھ حصہ کا بال چھوڑ دینا منع ہے (۲)، اس لئے آیت کریمہ اور احادیث کی روشنی کے بعد یہی حکم دیتے ہیں کہ یا تو پورے سر کا حلق کرائے یا پورے سر کا قصر کرائے اور اگر سر پر بال ہی نہ ہوں خواہ مونڈا لینے سے یا بال پیدا نہ ہونے یا جھڑ جانے سے تو سر پر ہلکے ہاتھ سے محض استرا پھیروالیں اس طرح پر کہ جلد کو نقصان نہ پہنچے (۳)، غرض آیت کریمہ اور

۱- "لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق، لتدخلن المسجد الحرام إن شآء اللہ امنین محلقین رء وسکم ومقصرین لاتخافون ط فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذلک فتحا قریبا" (سورۃ الفتح: ۲۷)۔

۲- "نافع عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نهی عن القزع قال: قلت لنافع وما القزع؟ قال: يحلق بعض رأس الصبي ويترک بعض" (مطبع اصح المطابع مسلم کتاب اللباس باب کراہیۃ القزع ۲/ ۲۰۳، ابن ماجۃ ۲۵۹، مکتبہ تھانوی)۔

۳- "فأما إذا كان لم يكن (أي الشعر) أجرى الموسىٰ على رأسه لأنه إذا عجز عن تحقيق الحلق فلم يعجز عن التشبه بالحالقين وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم من تشبه بقوم فهو منهم" (بدائع کتاب الحج بیان الحلق والتقصیر: ۲)۔

احادیث مرفوعہ کی متابعت میں تینوں صورتوں کا یہی حکم ہے البتہ عورت کو مردوں کی مشابہت جائز نہیں ہے (۱)، اس لئے عورتوں کا بال مونڈ دینا یا سارے بال منڈا دینا جائز نہیں بلکہ چوٹی کی انتہاء سے صرف دو تین انگل بال کٹوا لینا کافی ہے (۲)۔

۲-حنفیہ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں ہے۔ آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے بلکہ وہ طریقہ ہے جو اوپر مذکور ہوا، طواف وعمرہ میں کون زیادہ افضل ہے اس میں تفصیل ہے عمرہ تو عمر میں صرف ایک مرتبہ بشرط استطاعت و قدرت واجب ہے (۳)، اور طواف زیارت فرض عین ہے اس لئے یہ طواف تو یقیناً عمرہ سے افضل ہے، باقی نفلی طواف اور نفلی عمرہ میں بعض علماء نے کہا ہے کہ طواف افضل ہے مگر قول محقق آفاقی کے لئے یہ ہے کہ عمرہ میں جتنا وقت لگتا ہے اگر اس تمام وقت کو طواف نفلی میں مشغول رکھے تو یہ طواف بے شک عمرہ سے افضل ہے ورنہ عمرہ افضل ہے اور پانچ دنوں (۹رذی الحجہ تا ۱۳رذی الحجہ) میں عمرہ کرنا ممنوع اور مکروہ ہے (۴)، باقی اور تمام سال ان میں حنفیہ کے نزدیک عمرہ کرنا آفاقی کے لئے مستحب ہے جب موقع ملے اور جتنا موقع ملے عمرہ کر سکتا ہے اور افضل ہے، البتہ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک سال میں صرف ایک مرتبہ عمرہ کر سکتا ہے (۵)، اور حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک کچھ بحث ہے **كما اشار إليه ابن عابدين بقوله:**

۱- "عن ابن عباسؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المتشبهات بالرجال من النساء والمتشبهين بالنساء من الرجال" (ترمذی ابواب الاستیذان والادب باب ماجاء فی کراہیۃ المتشبہات بالرجال من النساء ۱۰۶/۲، مکتبہ اشرفی بکڈپو)۔

۲- "عن عائشةؓ ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى ان تحلق المرأة رأسها" (ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی کراہیۃ الحلق للنساء ۱۸۳/۱)، "وعن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس على النساء حلق إنما على النساء التقصير، وقال في البذل وأمر التقصير فإنه بقدر الأنملة. قال الشوكاني فيه دليل على ان المشروع في حقهن التقصير وقد حكى الحافظ الاجماع على ذالک" (بذل المجہود فی حل ابوداؤد کتاب الحج باب الحلق والتقصیر ۱۸۴/۳، مکتبہ اشرفیہ)، "قال في البدائع لأن الحلق في النساء مثلة ولهذا لم تفعله واحدة من نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكنها تقصر فتأخذ من اطراف شعرها قدر الأنملة. لكن اصحابنا قالوا: يجب أن يزيد في التقصير على قدر الانملة لأن الواجب هذا القدر من اطراف جميع الشعر واطراف جميع الشعر لايتساوى طولها عادة بل تتفاوت، فلو قصر قدر الانملة لايصير مستوفيا قدر الانملة من جميع الشعر بل من بعضه، فوجب ان يزيد عليه حتى يستيقن باستيفاء قدر الواجب فيخرج عن العهدة بيقين" (بدائع کتاب الحج باب حکم الحلق ۳۲۹/۲-۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔

۳- "قال أصحابنا: إنها واجبة كصدقة الفطر والأضحية والوتر ومنهم من أطلق اسم السنة، وهذا الإطلاق لاينافي الواجب وشرائط وجوبها فهي شرائط وجوب الحج لأن الواجب ملحق بالفرض في حق الاحكام" (بدائع کتاب الحج والعمرۃ ۴۷۸/۲-۴۷۹، مکتبہ زکریا)۔

۴- "وعند أبي حنيفة يكره العمرة في خمسة أيام، يوم عرفة، والنحر، وأيام التشريق" (عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب العمرۃ: جلد ۱۰۴/۷، مکتبہ زکریا)۔

۵- "وقال مالک واصحابهٗ: يكره أن يعتمر في السنة الواحدة أكثر من عمرة واحدة" (عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب العمرۃ

ونظيره ما أجاب العلامة القاضي ابراهيم بن ظهيره المكي حيث سئل هل الأفضل الطواف او العمرة، من ان الارجح تفضيل الطواف على العمرة إذا شغل به مقدار زمن العمرة (شامي ٢ تحت مطلب العمرة أفضل من الطواف وهو أفضل من العمرة)۔ باقی امام ابو حنیفہ کا مسلک اوپر لکھ دیا گیا کہ پانچ مذکورہ دنوں کے علاوہ ہمیشہ عمرہ کرنا مستحب ہے۔

۳-سعودی، مصری، سوڈانی وغیرہ جو کرتے ہیں کہ مختصر بال چاروں طرف سے کٹوا لیتے ہیں، پورے سر کا نہ تو حلق کراتے ہیں نہ قصر کراتے ہیں آیت کریمہ اور احادیث کے مطابق نہیں ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک وہی طریقہ ہے کہ اگر منڈانے کے بعد سر پر بال نہ رہیں تو بار بار زمی سے استرہ پھیر والیں اور بس۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر کوئی شخص ارکان حج کی ادائیگی کے بعد حلق وقصر نہ کراتا ہو؟

۱-ایک صاحب چھ ۶ سال سے ریاض میں مقیم ہیں ہر سال حج بھی کرتے ہیں اور ممکن ہے دوران سال کبھی عمرہ بھی کرتے ہوں بدقسمتی سے حلق یا قصر نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ چار پانچ جگہ سے چٹکی چٹکی بال قینچی سے کاٹ لئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کا فتوی ہے کہ پہلے حج کے بعد حلق یا قصر ضروری نہیں حج کے دو تین ماہ بعد یا جب ضرورت ہو جہاں بھی ہو تو بال کٹواتے ہیں اب اگر وہ تلافی مکافات پر آمادہ ہو تو کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ ان کے سابقہ حجوں کی تکمیل صحیح طریقہ پر ہو جائے اور گناہ بھی معاف ہو جائیں، اس سال بھی حج کے لئے ایسا ہی کیا، لیکن ۱۵ پندرہ ذی الحجہ کو اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ حدود حرم میں جا کر حلق یا قصر کے بعد بکری یا بھیڑ ذبح کرتا ہوں اگر وہ ایسا کر لے تو کیا اس سال حج صحیح ہو جائے گا، ایسا شخص حلق یا قصر کر کے حلال نہیں ہوا جب احرام کی پابندیوں سے باہر نہیں۔

الف-تو کیا سلے ہوئے کپڑے پہنیں، داڑھی منڈانے، ناخن کٹوانے اور خوشبو لگانے، میل صاف کرنے، بیوی کے پاس جانے کی وجہ سے جنایات کے ارتکاب کی بنا پر اس کی جزا ادا کرنے کا پابند ہے؟

ب:-جزاء کی مقدار (دم یا صدقہ) کیا ہوگی؟

ج:-اگر صدقہ واجب ہو تو اپنے وطن میں مساکین کو دے سکتا ہے یا حرم شریف کے اندر دینا ضروری ہے؟

۷/ ۱۰۴، مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سر پر بال باقی نہ رہیں تو صرف استرہ پھیر لینا یا پھیرالینا بھی کافی ہو جائے گا (۱)، اور قصر جڑ سے کاٹنا ضروری نہیں رہتا بلکہ ایک انگلی یا اس سے زیادہ لمبا کاٹنا کافی ہو جاتا ہے (۲)، سالہائے گذشتہ کی ان غلطیوں سے چھٹکارے کے لئے یہ کرے کہ میقات سے احرام باندھ کر آئے اور طواف بیت اللہ کر کے دم دیدے یعنی قربانی کر دے اور اصل تو یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ایسی غلطی کی ہے سب کے لئے الگ الگ دم دیدے اگر اتنی قدرت نہ ہو تو جتنے دم کی قدرت ہو ان کے دم دیدے یا کم از کم ایک دم دیگر بقیہ کی تلافی کے لئے توبہ و استغفار کرے اور سال کے اندر کی غلطیوں کے لئے ہر ایک کے عوض میں ایک دم دینا واجب ہے پس اس سال جو غلطی کی ہے اس میں میقات سے احرام باندھ کر طواف کر کے دم دینا واجب ہے پھر ہر دم میں ایک بھیڑ یا بکری کا حرم کے حدود میں ذبح کرنا لازم ہے (۳)، اس طریقہ سے حج صحیح ہو جائے گا اور اگر خود جا کر ایسا نہ کر سکے تو دم کی قیمت بھیج کر حرم میں قربانی کرادے حرم کے باہر قربانی کا اعتبار نہ ہوگا۔

الف: ہاں ان صورتوں میں جزا ادا کرنے کا پابند ہے۔

ب: جزاء کی مقدار دم ہے۔

ج: ۔صدقہ حرم شریف میں خود دینا یا کسی کے ذریعہ بھیج کر وہاں ہی دینا واجب ہے جنایت کا دم یا صدقہ جو بھی ہو اس کو حرم میں دینا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-بحالت احرام بنیان یا سلی ہوئی چادر پہننے کا حکم:

کیا بنیان پہن سکتا ہے، نہ بندیا احرام کی چادر کہیں پھٹی ہو تو کیا سل کر باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

۲-ارکان چھوٹنے یا ترتیب میں تقدیم وتاخیر کا حکم:

کوئی نسک چھوٹ گیا یا ترتیب میں تقدیم وتاخیر ہوگئی تو کیا قران کی حالت میں دو قربانی کرے یا ایک کرے؟

۱- "من لم یکن علی رأسه شعر فعلیه ان یمر الموسی علی رأسه " (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانویہ دیوبند)۔

۲- "والتقصیر ان یأخذ من رؤس شعره مقدار الانملة" (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۳- ہدیا بالغ الکعبۃ، سورۃ المائدہ ۹۵۔

۳- بحالت احرام خون نکلنے سے کیا دم واجب ہوگا؟

احرام کی حالت میں مرض کی وجہ سے ڈاکٹر نے سوئی لگائی جس سے قدرے خون نکلا تو کیا دم واجب ہوگا، ایسے ہی اگر مسواک کیا جس سے دانتوں سے خون نکلا تو کیا واجب ہوگا؟

۴- قران کے حج کا احرام باندھنے والے کے لئے عمرہ کرنا:

قران کے حج کا احرام باندھنے والا مکہ میں جا کر عمرہ کرے گا، پھر احرام کے ساتھ مکہ میں مقیم رہے گا پھر نفلی طواف کرتا رہے اسکے بعد آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ جائے پھر وہاں سے عرفات جائے پھر مزدلفہ آ کر رات گذارے پھر ذی الحجہ کو آ کر کنکری مارے اور قربانی کرے اور حجامت بنوا کر زیارت کرے اور سعی صفا و مروہ کرے پھر منیٰ جائے اور ۱۱-۱۲ ذی الحجہ کو قیام کر کے کنکریاں مار کر واپس آئے اور طواف الوداع کر کے مکان ہندوستان آوے تو کیا اس صورت میں حج مکمل ہوگیا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- بنیان پہننا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں آستین ہوتی ہیں اور آستین میں ہاتھ ڈالکر پہننا منع ہے جس پر جزا لازم ہوگی، احرام کی سلی ہوئی چادر پہننا جائز ہے لیکن ترک اولیٰ ہے۔

۲- قران کی حالت میں بھی ایک جنایت پر ایک ہی دم واجب ہوگا۔

۳- دونوں صورتوں میں کوئی جزا لازم نہیں، خون کا نکالنا محظور احرام نہیں، جیسے فصد لینا، مسواک کرنا ہر حالت میں سنت ہے۔

۴- یہ ترتیب صحیح ہے، اس سے حج مکمل ہوگیا، کوئی نسک نہیں چھوٹا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن سید، احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

عمرہ کے احرام کی چادر کا کفن میں استعمال:

عمرہ کے لئے جو دو کپڑے استعمال کرتے ہیں وہ کیا مرنے کے بعد کفن میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

محمد شفیع (الجزب سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

عمرہ میں جو دو ۲ رکپڑے استعمال ہوتے ہیں ان کو کفن میں بلاشبہ استعمال کرنا جائز ہے، بلکہ ان کا کفن میں استعمال کرنا افضل ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

باب الحج عن الغير

حج بدل کے لئے آمر کے نفقہ اور اس کے وطن سے جانا ضروری ہے؟

ایک صاحب استطاعت اور صاحب نصاب میاں بیوی نے ۱۹۷۶ء میں حج کے لیے درخواست دی تھی، مقدر کی بات اس سال قرعہ اندازی میں نام نہیں آیا، بینک ڈرافٹ جو حج کمیٹی بمبئی نے واپس کر دیا تھا وہ بینک میں محفوظ کر دیا۔

پھر ہوا یہ کہ ان ہی کے ایک بیٹے نے والدین کے بغیر علم و اطلاع کے ایک درخواست حج کے لیے دی تھی تا کہ حج کے بعد ملازمت مل جائے تو اختیار کر لیں، بیٹے کا نام قرعہ میں آنے اور اپنا نام نہ آنے پر بڑے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں پر حج فرض ہے ان کا نام قرعہ میں نہیں آیا، لیکن جو حج کے عنوان پر ملازمت کرنا چاہتے ہیں ان کا نام آ گیا، دوسرے سال صاحب موصوف کو موتیا بند کا آپریشن ہونے والا تھا، اس لیے آپریشن بعد آئندہ سال یعنی تیسرے سال حج کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، اسی عرصہ میں صاحب موصوف کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔

چوتھے سال وہ خود علیل رہنے لگے جس کی وجہ سے دوبارہ حج کے لے درخواست نہیں دی جا سکی۔

صاحب موصوف نے دوران علالت ان دو بیٹوں میں سے جو مدینہ منورہ میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم ہیں، ان میں سے ایک کو خط لکھا کہ میری صحت دن بدن علالت کی وجہ سے گرتی جا رہی ہے، تم اپنے بھائی سے کہہ دو کہ وہ میری طرف سے حج بدل کر لیں اور اس کے اخراجات تم خود اپنے پاس سے ادا کر دو۔

چنانچہ ایک بیٹے نے والد کی اجازت سے حج کر لیا، صاحب موصوف کا انتقال ہو گیا ہے، اب ان کے بیٹوں کا کہنا ہے کہ مدینہ منورہ میں رہنے والے بیٹے نے حج بدل کر لیا ہے اب پھر حج بدل کرانے اور کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن دیگر عزیز و اقارب کا کہنا ہے کہ جس کا حج بدل ہو اس کی طرف سے دوسرا حج بدل کرنے والا شخص اس کے وطن سے حج بدل کو جائے۔ اب سوال یہ در پیش ہے کہ صورتِ مذکورہ میں حج بدل ہوا کہ نہیں، اگر نہیں ہوا ہے تو پھر حج بدل کرنے والا شخص صاحب موصوف کے وطن سے ہی حج کے لیے سفر کرے، اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب موصوف کے چھوڑے

ہوئے مال ہی سے حج بدل پر خرچ کیا جائے۔

سید امیر حسن (مکان ۵۶ ۱۱۔ ۱۶ کلاس جدید، جدید حیدرآباد)

الجواب وبالله التوفيق:

زندگی میں حج بدل کرانے کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج بدل کرنا ہو اس کے نفقہ سے اور اسی کے وطن سے کیا جائے: **"ومن شرائط النفقة من مال الآمر كلها أو أكثرها ، قال الشامي: قال في البحر: وبهذا علم أن اشتراطهم أن تكون النفقة من مال الأمر احترازاً عن التبرع، لامطلقا الخ"** (۱)۔

صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہوا ہے، اس لیے ازروئے قیاسِ جلی تو یہ حج بدل جس کو لڑکوں نے اپنے پیسے سے باپ کے حکم کی بنا پر اور صرف مدینہ طیبہ سے کردیا کافی نہ ہوگا، البتہ ازروئے استحسان وقیاسِ خفی اور مطابق حدیث خثعمیہ رضی اللہ عنہا امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیں (۲)۔

بہر حال لڑکے کا یہ حج کردینا لغو و بے کار نہیں ہوگا، بلکہ تقرب الی الاجابۃ والقبولیۃ ہوگا، مرنے کے بعد مورث کے تہائی مال سے اور اس کے وطن سے حج بدل کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والے پہ حج فرض رہا ہو اور وہ وصیت بھی حج بدل کروانے کی کرجائے اور یہاں یہ بھی نہیں ہے، یعنی موصی نے اپنے مرنے کے بعد حج بدل کرانے کی وصیت نہیں کی ہے، اس لیے وارثین پر حج بدل کرانا واجب نہیں ہے۔

البتہ اگر وارثین اپنے طور پر خود والدین کی جانب سے حج کردیں یا کرادیں تو بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہوگا اور والدین پر سے سقوطِ فرض بھی ہوجائے گا (۳)۔

۱- فتاویٰ شامی ۲/۲۴۰ کتاب الحج۔

۲- "ثم ظاهر المذهب أن الحج يقع عن المحجوج عنه يعني امر وبذالك تشهد الآخبار الواردة في هذا الباب، فإنه صلى الله عليه وسلم قال للخثعمية: رضي الله عنها حين قالت: إن أبي شيخ كبير لا يستطيع أن يستمسك على الراحلة أفيجزيني أن أحج عنه؟ قال : نعم حجي عن أبيك واعتمري "(فتح القدير، ص ۶۶ ج ۳ باب الحج عن الغير فان كان علی أحدهما حج الفرض وأوصی به لا يسقط عنه تبرع الوارث عنه بمال نفسه)۔

۳- "وإن لم يوص به تبرع الوارث عنه بالاحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة رحمه الله: يجزيه إن شاء الله تعالى، لقوله عليه السلام للخثعمية: أرأيت لو كان على أبيك دين؟ الخ" (شامی، ص ۲۴۵، ج ۲ کتاب الحج)۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ لڑکے اگر اب حج بدل نہ کرائیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں، البتہ جب اللہ نے موقع میسر فرمایا ہے تو والدین میں سے ہر ایک کی جانب سے حج پھر کرڈالیں مزید فضیلت اور اجر وثواب کے مستحق ہوں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حج بدل کرنے والا آمر کی اجازت کے بغیر تمتع کرسکتا ہے یا نہیں؟

۱- حج بدل کرنے والا تمتع کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں باذن لآمر اور بغیر اذنہ دونوں کا حکم یکساں ہے یا اذن کے بعد کرسکتا ہے، اگر اذن کے بغیر کرسکتا ہو تو جس صورت میں حج عن المیت کیا جارہا ہو، ورثہ کی اجازت کیا اس حج کے لیے جانے والے شخص کے لئے کافی ہوجائے گی یا نہیں؟

۲- اور یہ حج بوصیت حج یا تبرع وارث ہو اس مسئلہ میں دونوں کا ایک حکم ہوگا یا مختلف؟ براہِ کرم سب صورتوں کا واضح جواب مرحمت فرمایا جائے تاکہ سمجھنے میں خلجان نہ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- محجوج عنہ آمر پر اگر حج فرض تھا اور بوجہ معذوری خود نہیں جاسکتا ہے بلکہ اپنی نیابت میں کسی کو حج بدل میں بھیجنا چاہتا ہے تو اس صورت میں حج بدل کے صحیح ہونے کے لیے بیس سے زائد شرطیں ہیں، جو باب المناسک وغیرہ میں تفصیل سے مذکور ہیں:

منجملہ ان کے جو شرطیں ماموریج بدل کے لیے جانے والے شخص سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

الف: جب تک محجوج عنہ (آمر) ماموری کو حج قران یا تمتع کی اجازت نہ دیدے، ماموری کو حج قران یا تمتع کرنا جائز نہ ہوگا، اگر کرے گا تو حج بھی آمر کا نہ ہوگا بلکہ ماموری کا ادا ہوگا اور اس صورت میں ماموری پر ضمان لازم آئے گا، جو حج بدل کے لیے گیا ہے (۲)۔

ب: اور اگر آمر محجوج عنہ نے قران اور تمتع کی اجازت دے دی ہے خواہ مجملاً ہی دی ہو، مثلاً بایں طور کہ تم کو اختیار

۱- "من حج عن أبيه فقد قضى عنه حجته له ولو كان له فضل عشر حجج" (فتح القدیر ۳/۱۸، باب الحج عن الغیر) (مرتب)۔

۲- "الرابع: الأمر أي بالحج فلا يجوز حج غيره بغير إذنه" (شامی ۲/۲۳۹، باب الحج عن الغیر)۔

ہے کہ میری طرف سے جس طرح چاہو حج بدل کرا دو تو اس صورت میں مامور کو حج تمتع اور قران دونوں کرنا جائز رہے گا، لیکن دم قران، تمتع، جنایت یہ بذمہ مامور رہے گا، مامور کو اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا، "**كما في الدر المختار: ودم القران والتمتع والجناية على الحاج إن أذن له الآمر...... وإلا فيصير مخالفا فيضمن**"(۱)، معلوم ہوا کہ باذن آمر اور بغیر اذن دونوں کا حکم یکساں نہیں بلکہ دونوں کے حکم میں فرق ہے۔

الف (۲ و ۳) اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کر کے انتقال کیا ہے اور تہائی ترکہ بعد ادائیگی قرض وغیرہ حقوقِ متقدمہ مکان آمر (محجوج عنہ) سے حج بدل کے لیے کافی ہے تو اگر کسی متعین شخص کو بھیجنے کی وصیت فرمائی ہے تو جب تک وہ متعین کردہ شخص اظہار معذوری یا انکار نہ کردے یا ایسا مہمل ہو کہ اس سے حج بدل ادا ہی نہ ہوگا، اس وقت تک اس متعین کردہ شخص کو بھیجنا ورثا پر ضروری رہے گا، اگر کسی شخص کو آمر نے متعین نہ کیا ہو تو ورثا جس کو مناسب سمجھیں بھیج سکتے ہیں، بھیجنا ضروری رہے گا۔

ب: اگر وصیت تو کی ہے مگر تہائی ترکہ بعد ادائے گی حقوق متقدمہ (قرض وغیرہ) محجوج عنہ (آمر) کے مکان سے حج بدل کے لیے کافی نہ ہوگا مگر خارجِ میقات سے بھیجنے کے لیے کافی ہو تو خارج میقات سے بھیجنا اگر ورثاء کی قدرت میں ہے تو خارج میقات سے ہی جہاں سے کافی ہو بھیجنا واجب رہے گا، ہاں اگر ورثا اپنے ذاتی مال سے تبرع کر کے اور پہلے سے بلکہ مکان آمر سے ہی کسی کو بھیج دیں تو درست ہوگا، بلکہ بہتر و افضل رہے گا وصیت کی ان تمام صورتوں میں مامور کو حج قران و تمتع کرنا درست نہ ہوگا اور نہ ورثا کی اجازت منجانب موصی کافی ہوگی، بلکہ حج افراد کرنا ہر حال میں ضروری رہے گا۔

ج: وصیت تو فرمائی ہے مگر اتنا ہی چھوڑا کہ اس کا تہائی حصہ خارجِ میقات سے حج کے لیے کافی ہو تو وہ رقم مکہ مکرمہ بھیج کر مکی سے حج کروانا ضروری ہوگا۔

د: اور اگر وصیت تو کی ہے لیکن بالکل کوئی ترکہ نہیں چھوڑا کہ مکی ہی سے حج کرایا جا سکے یا ترکہ کافی چھوڑا مگر وصیت نہیں کی تو اگر چہ اس پر (آمر و محجوج عنہ) پر حج فرض باقی رہا ہو مگر اس صورت میں ورثا پر کسی قسم کا حج مکی یا میقاتی کرانا ضروری نہ رہے گا، البتہ اگر ورثا اپنی طرف سے تبرع کردیں تو بہتر و احسن ہوگا اور اللہ نے وسعت دی ہو تو کرانا چاہیے۔

ھ: اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہیں تھا لیکن حج کرانے کی وصیت فرمادی اور حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد تہائی ترکہ کی مقدار اتنی ہے کہ آمر (محجوج عنہ اور موصی) کے مکان سے نہ سہی راستہ ہی کے کسی حصہ سے حج بدل میقاتی کرایا

۱- الدر المختار ۳/۳۲۲۔

جا سکتا ہے اور وہاں سے حج کرانا ورثا کی قدرت میں ہو تو ورثا پر وہیں سے حج کرانا ضروری ہوگا اور اس حج بدل کرنے والے (مامور) کے لیے قران وتمتع کرنے کی اجازت نہ رہے گی اور موصی کے ورثا کی اجازت منجانب موصی کافی وصحیح نہ ہوگی۔

و: اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہ رہا ہو اور نہ اس نے حج کی وصیت فرمائی ہو یا وصیت کی ہو مگر تہائی بعد ادائیگی حقوقِ متقدمہ علی الوصیت جیسے قرض ومہر وغیرہ اتنی مقدار کا بھی نہ چھوڑا ہو کہ جس سے حج مکی ہی سہی (وہ حج جو خارج میقات سے آکر کیا جائے) کیا جا سکے تو اس صورت میں کسی وارث پر حج بدل کرانا ضروری نہ رہے گا، حج بدل کرا دے تو کرا سکتا ہے بلکہ مستحسن ہے اور ایسے حج بدل میں قران وتمتع کرا سکتا ہے(۱)۔

ز: اگر صورت نمبر ہ میں تہائی ترکہ کی اتنی مقدار ہو کہ مکی حج (جو اندرونِ میقات والوں پر ہوتا ہے) کرایا جا سکتا ہے اور ورثہ کی قدرت میں ایسا حج کرانا ہے تو اس کا بھی ادا کرا دینا ضروری رہے گا اور اس صورت میں حج بدل کرنے والا (مامور) قران، تمتع، افراد سب کر سکتا ہے، البتہ دم قران ودم جنایت خود بذمہ مامور رہے گا مامور کو یہ دم اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا ہٰکذا **یستفاد من جمیع مباحث الحج عن الغیر**۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- حج بدل میں کس کی طرف سے حج کی نیت کرے؟

زید حج بدل کرنا چاہتا ہے تو حج بدل کے احرام میں نیت اس شخص کی طرف سے کرے جس کی طرف سے حج کرنے جا رہا ہے یا اپنی طرف سے کرے اور اس کا ثواب بخشے۔

۲- حج بدل کرنے والا قارن جنایت کس طرح ادا کرے؟

حج بدل کرنے والا جب قران کا احرام باندھے گا تو اگر اسے جنایت ہو جائے تو یہ ایک قربانی کرے گا یا ہر جنایت پر دو قربانی کرے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جس کی طرف سے حج کرنے جا رہا ہے اس کی طرف سے حج کی نیت کرنا ضروری ہے کما فی الشامی(۲)۔

۱- ''قال: وإن لم یوص أي بالاحجاج فتبرع عنه الوارث وكذا من هم أهل التبرع فحج أي الوارث ونحوه بنفسه أي عنه أو غیره جاز، والمعنیٰ جاز عن حجة الإسلام ان شاء الله تعالیٰ''، کما قال فی الکبیر (فتاویٰ شامی، ص۹ ۲۳ ج۲ باب الحج عن الغیر)۔

۲- ''ویشترط نیة الحج عنه ای عن الآمر'' (الدر المختار مع الرد ۴/ ۱۵، مکتبہ زکریا)۔

۲-اگر محجوج عنہ نے حج فراد کے لئے مامور کیا ہے تو حج قران کا احرام غیر آمر کی جانب سے باندھنے میں ضامن ہوجائے گا اس لئے کہ ''**کما في الغنية إذا أمره غيره بإفراد بحجة أو عمرة فقرن فهو مخالف ضامن في قول أبي حنيفة وقال أبو يوسف و محمد: يجزي عن الآمر استحساناً وهذا الخلاف فيما إذا قرن عن الآمر أما لو نوى بأحدهما عن شخص آخر أو عن نفسه فهو مخالف ضامن بلا خلاف**''(۱)۔

مشورہ: آپ نے چند جزئیات دریافت کئے ہیں حج بدل کرنے میں ان سے یا اسی طرح اور استفتاء کے محض مسائل معلوم کرنے سے آپ کا کام نہیں چلے گا، حج بدل کرنے والا تمام امور میں اپنے آمر کی ہدایت کا پابند ہوگا حتی کہ اگر حج قران کیلئے نہیں کہا ہے اور قران کرلیا ہے جب بھی ضامن ہوگا کما مر مفصلاً، اسی طرح حج فراد میں اس نے میقات سے فقط عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے کہ بعد عمرہ حلال ہوکر کچھ دن مثلاً رمضان میں مکہ مکرمہ رہ کر پھر مکہ مکرمہ سے حج کا احرام باندھ لیگا تو بھی غلط کیا ہے کما مر غرض حج بدل کے بہت سارے مسائل ہیں آپ چند جزئیات کا استفتاء کرکے کہاں تک کام چلا سکتے ہیں، اس طرح آپ کا کام نہیں چل سکتا ہے، اگر آپ صحیح طور پر ارکان حج بدل ادا کرنا چاہتے ہیں تو معلم الحجاج مصنفہ مفتی سعید احمد صاحب سہارنپوری یا اس کے متبادل کوئی معتبر کتاب جس میں مسائل حج معتد بہ درجہ میں درج ہوں خرید کر بار بار مطالعہ کر لیجئے اور مستحضر کر لیجئے جب کام چلے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید عفی عنہ

۱-حج بدل کرنے والا کس حج کا احرام باندھے؟

حج مفرد کا احرام باندھے یا قران کا اور کس طرح نیت کرے، یعنی مرنے والے کی طرف سے احرام باندھنے کی نیت کرے یا اپنی طرف سے نفل حج کی نیت کرکے ثواب بخشے۔

۲-حج بدل کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟

کیا رمضان شریف میں یلملم کے میقات سے حج بدل کا احرام باندھ سکتا ہے یا ایام حج مثلاً شوال، ذی قعدہ وغیرہ میں احرام حج باندھنا شرط ہے اور اگر رمضان میں مکہ پہنچنے کا قصد کرے تو پھر حج بدل کا احرام مکہ شریف سے باندھے یا کسی دوسرے میقات سے باندھے۔

۱-　ہدایہ ہندی ۱/ ۲۹۴۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جس قسم کے احرام کا آمر نے حکم دیا قران یا افراد میں سے اسی کا احرام باندھے، البتہ تمتع کرنا کسی حال میں درست نہیں اگر چہ آمر نے اذن دیا ہو بہتر یہ ہے کہ آمر (حج کرانے والا) مامور (حج بدل کرنے والا) کو عام طرح اجازت دے دے کہ میری طرف سے یا میرے فلاں عزیز کی طرف سے جا کر حج کرو جس طریقہ سے بھی تیری مرضی ہو اور تجھے سہولت ہو، افراد یا قران یا تمتع جو بھی کرو تو اس سے آمر کا حج جائز ہو جائے گا اگر چہ تمتع ہی کرے، کیونکہ آمر کے امر کی مامور نے مخالفت نہیں کی، لیکن اس اجازت عام کے باوجود احتیاط اس میں ہے کہ حج بدل میں تمتع نہ کیا جاوے، احرام باندھنے کے وقت نیت آمر کے حج کی کرے، اگر زبان سے کہے لبیک عن فلان مثلاً تو بہتر ہے ورنہ نیت دل سے بھی کافی ہے بلکہ اب کو چاہئے کہ اپنے میت کیطرف سے حج کی نیت اس طرح کرے تو افضل ہے: **"اللھم انی ارید الحج عن فلان واحرمت به لله تعالیٰ عنه لبیک لحجتی عنه وبشرط نیة الحج عنه ای الآمر فیقول احرمت عن فلان ولبیت عن فلان ولو نسي اسمه فنوی عن الآمر صح وتکفی نیة القلب"** (۱)۔

۲-جس کے امر سے یا جس کے لئے حج کر رہا ہے احرام اس کے میقات سے باندھے(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار نپور ۲۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

جس نے حج نہیں کیا اس کا حج بدل کرنا:

کوئی غریب آدمی جس کے اوپر حج فرض نہیں اور نہ اس سے قبل کوئی حج کیا، ایسا شخص اور کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حنفیہ کے نزدیک ایسا شخص بھی حج بدل کر سکتا ہے جو خود اپنا حج نہ کئے ہو، لیکن یہ افضل نہیں ہے حج بدل ایسے شخص

۱- درمختار ۲/۲۹ س

۲- ’’الثانی عشر ان یحرم من المیقات‘‘ (شامی ۲/ص ۳۲۹)۔

سے کرانا بہتر ہے جو اپنا حج کر چکا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

سعودی سے حج بدل کرنا:

اگر کسی کے ماں باپ زندہ ہوں اور حج کے لئے آنے کی انہیں استطاعت ہو، تندرست بھی ہیں پھر بھی نہیں آتے تو ان دونوں کی طرف سے ان کا کوئی بڑا لڑکا یا کوئی رشتہ دار وغیرہ، جو غیر ممالک (سعودی، قطر، بحرین، دوبئ، وغیرہ) میں ہو اور وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کرنا چاہے، اور اگر والدین اجازت دے دیں تو وہ حج بدل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص میں خود حج میں آنے کی استطاعت وطاقت ہو اور تندرست بھی ہو اس کی طرف سے حج بدل کرنے سے اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا (۲)، چاہے اس کی طرف سے حج بدل اس کا لڑکا کرے یا کوئی رشتہ دار، چاہے اس کی اجازت سے کرے یا بلا کسی اجازت کے ہر صورت میں یہی حکم ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی اپنا حج کر کے اس کا ثواب ان کو پہنچا دے تو ثواب اس کو پہنچ سکتا ہے باقی حج فرض کرنے سے ادا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۴/ ۱۴۰۳ھ

۱- ''فجاز حج الصرورة بمهملة من لم يحج وغيرهم أولى لعدم الخلاف'' (الدر مع الرد ۱/۲۱)۔

۲- ''وجود العذر قبل الإحجاج فلو أحج صحيح ثم عجز لايجزيه'' (شامی ۲/۳۲۹ مکتبہ نعمانیہ)، ''تقبل النيابة عند العجز فقط لكن بشرط دوام العجز إلى الموت، لأنه فرض العمر حتى تلزم الإعادة بزوال العذر'' (الدر المختار علی الرد ۴/۱۴-۱۵، مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

كتاب النكاح
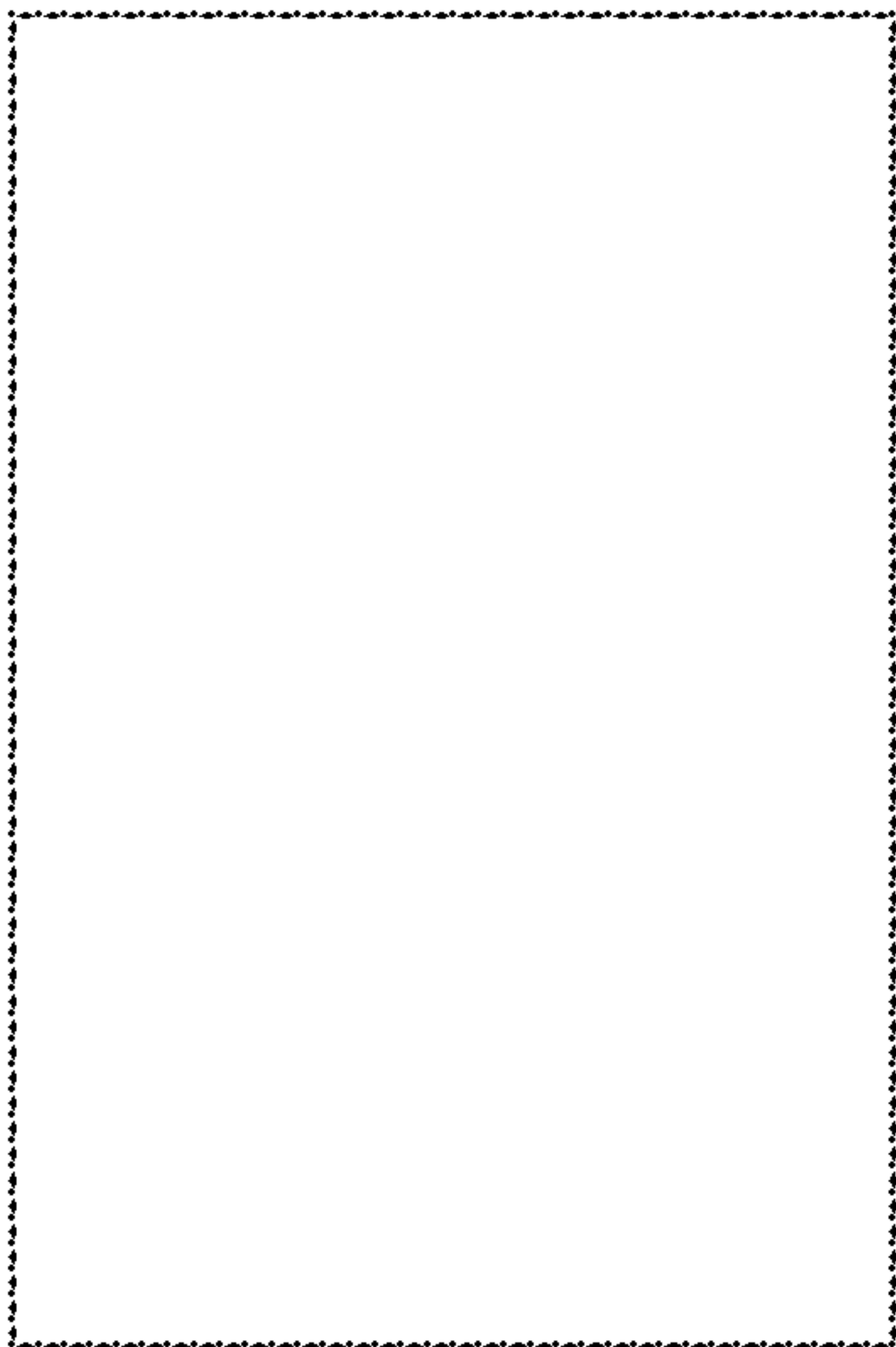
کتاب النکاح

آپ ﷺ سے پہلے نکاح کا طریقہ

آپ ﷺ کے دور سے پہلے نکاح کا کیا طریقہ تھا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جاہلیت کے نکاح کئی طرح رائج تھے (۱)، شریعت نے صرف ایک طریقہ جو آج کل رائج ہے باقی رکھا اور بقیہ سب کو ختم کردیا تو اب اس سے کیا کام۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۴ھ

۱- ایجاب وقبول کی ایک خاص صورت:

میں نے یہاں لندن میں ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ یہاں کے قانون کے مطابق سول میرج کی، جسکا خلاصہ یہ ہے: میں نے یہاں کی کورٹ میں تین مسلمانوں کے سامنے یہ قرار کیا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بناتا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرتا ہوں، اسی طرح میری بیوی نے بھی اسی مجلس میں یہ قرار کیا کہ وہ مجھے بحیثیت شوہر قبول کرتی ہے، مگر ابتک ہم لوگوں کا اسلامی نکاح نہیں ہوا ہے تو آیا یہ ہمارا نکاح ہوگیا ہے یا نہیں؟

۲- صرف بیوی کے بیان پر تفریق کا حکم:

اگر یہ نکاح ہوگیا ہے تو اگر کسی وجہ سے یہاں کا قانون صرف بیوی کی بات سن کر علیحدگی کرادے (بیوی اپنی خوشی

۱- "عن عروۃ ابن الزبیر ان عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبرتہ ان النکاح فی الجاھلیۃ کان علی أربعۃ انحاء فنکاح منھا نکاح الناس الیوم الخ" (بخاری ۲/ ۷۶۹، مطبع یاسر ندیم دیوبند)۔

سے علیحدگی چاہے) تو یہ طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ (جبکہ یہاں کے کورٹ میں تمام وکیل وجج غیر مسلم ہیں)۔

محمد شعیب (فلیٹ ۵۴۱-۱۶۰، واٹ کنسٹن روڈ، لندن)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- اگر تین مسلمانوں کے سامنے مرد نے یہ کہا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بناتا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرتا ہوں اور پھر اس لڑکی نے بھی اسی مجلس میں ان لوگوں کے سامنے یہ اقرار کرلیا کہ میں اس مرد کو بہ حیثیت شوہر قبول کرتی ہوں تو شرعاً نکاح منعقد ہوگیا اور دونوں شرعاً بھی میاں بیوی ہوگئے(۱)۔

۲-جب شرعاً بھی دونوں میاں بیوی ہوگئے تو جب تک شوہر خود طلاق نہ دیدے یا شوہر سے طلاق دینے کے الفاظ نہ کہلوائے جائیں یا ضابطۂ شرع کے مطابق خلع یا تفریق شرعی واقع نہ ہوجائے محض عورت کا یا ن یک طرفہ منکر تفریق وعلیحدگی کرا دینے سے شرعاً طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ شرعاً دونوں حسب سابق میاں بیوی باقی رہیں گے(۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۱۴۰۱ھ

دوسری شادی سے قانوناً روکنے کا کیا مقصد ہے(۳)؟

الجواب وبالله التوفيق:

اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ دوسری شادی کرنے سے فی زمانہ عموماً پہلی بیوی کے ساتھ ناانصافی یا ظلم ہونے لگتا

۱- ''النكاح ينعقد بالإيجاب والقبول (ہدایہ ۲/۲۸۵)، وأما ركنه فالإيجاب والقبول كذا في الكافي والإيجاب ما يتلفظ به أولا من أي جانب كان والقبول جوابه هكذا في العناية" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۲۶۷)، ''ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين حرين عاقلين بالغين مسلمين رجلين أو رجل وامرأتين عدولا كانوا أو غير عدول أو محدودين في القذف" (ہدایہ ۲/۲۸۶)۔

۲- ''عن عصمة قال: جاء مملوك إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله إن مولاي زوجني وهو يريد أن يفرق بيني وبين امرأتي قال فصعد رسول الله ﷺ المنبر فقال: يا أيها الناس إنما الطلاق بيد من أخذ بالساق، وفيه الفضل بن المختار وهو ضعيف" (مجمع الزوائد ۴/ ۳۳۴)، نیز زوجین کے درمیان حاکم یا قاضی کے ذریعہ تفریق کے لئے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہوں، کیونکہ ''لا ولاية لكافر على مسلم لقوله تعالى: لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا" (فتح القدیر ۵/۲۱۲)۔

۳- حضرت مفتی صاحب سے تعدد ازدواج کے نقصانات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوال کیا گیا تھا، سوال کے مندرجات محفوظ نہیں رہ سکے، اس لئے صرف جواب کو بغرض افادہ شائع کیا جارہا ہے۔

ہے یا ان میں سے کسی ایک کے حقوق کی ادائے گی میں کوتاہی اور حق تلفی ہونے لگتی ہے، اس لئے قانوناً روک تھام کی ضرورت ہے تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس روک تھام سے کیا مقصد ہے؟ اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک سے زائد نکاح کرلینا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے کسی شخص کی ایک بیوی رہتے ہوئے دوسرا نکاح کرنے کی قانوناً اجازت ہی نہ ہو اگر کوئی کرے، تو قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار دیا جائے۔تو یہ چیز، ناجی مقصد ومصالح کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی غلط اور ناقابل عمل ناقابل قبول ہوگا اور ناقابل نفاذ۔

اس لئے کہ نکاح کے اہم مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے عورت اور مرد دونوں کو عفت وپاک دامنی اور پاکیزہ زندگی نصیب ہو، اور ایک صالح وخوشگوار معاشرہ جنم لے اور پاکیزہ توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوکر آپس میں مودت ومحبت کا خوش آئند ماحول وجود پذیر ہو۔ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بسا اوقات تعدد ازواج لازمی اور ضروری ہوگا۔ تعدد ازواج کی اباحت واجازت کے بغیر ان مقاصد کی تکمیل بچند وجوہ نہیں ہوسکتی:

● تعدد ازواج ضروری ہے، اس لئے کہ عورتیں اپنی خلقت کے اعتبار سے عموماً مردوں کے بہ نسبت کمزور اور بارد المزاج واقع ہوئی ہیں، ان میں جنسی خواہشات کا ہیجان بھی مردوں کے اعتبار سے کم ہوتا ہے، بالخصوص پاک نگاہ عورتوں میں، بخلاف مردوں کے کہ یہ باعتبار خلقت کے عورتوں کی بہ نسبت قوی اور حار المزاج ہوتے ہیں اور ہر قسم کے مجامع میں آمدورفت کی وجہ سے، نیز بعض دیگر وجوہ کی وجہ سے ان میں جنسی خواہشات کا ہیجان بھی زیادہ ہوتا ہے، تجربہ اس پر شاہد ہے، ان باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ محض ایک ہی عورت پر ہر مرد کو محبوس نہ کیا جائے، ورنہ اس کا قدم حد اعتدال سے متجاوز ہوکر بدکاری کی طرف بڑھ جانے کا قوی خطرہ ہے، بالخصوص طاقت ور لوگوں کے لئے، اور یہ چیز انسانیت سوز ہونے کے ساتھ ساتھ مقاصد نکاح میں بھی مخل ومضر ہوگی۔

● اس لئے کہ عورت بسا اوقات تیس چالیس سال کی عمر میں دس پانچ بچے جن کر بوڑھیا یا مثل بوڑھیا ہوچکی ہوتی ہے، اور مرد کے لئے یہ عین جوش قوت کا وقت ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ عورت ہر وقت اس قابل نہیں ہوتی کہ خاوند اس سے ہمبستر ہوسکے، مثلاً لازمی طور پر ہر عورت کو ہر مہینہ کچھ دن حیض (ماہواری) آتا ہے، اسی طرح ولادت کے بعد کچھ دن وہ نفاس میں رہتی ہے جن میں صحبت کرنا ممنوع ہے۔اور طبعاً بھی عورت کے لئے اس حالت میں صحبت ضرر رساں ہے۔

اسی طرح ایام حمل وایام رضاعت (بچہ کو دودھ پلانے والے دن) میں صحبت کرنا بھی کبھی مضر ہوتا ہے جن میں حمل

کی حفاظت کے لئے صحبت ذہمبستری سے پرہیز کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر مردوں کو ایک پر مجبور کرنا بالخصوص قوی مردوں کو اور گرم ملک اور گرم مزاج والوں کو جن کے لئے ایک روز بھی بغیر جماع کے اپنی عفت مآبی کو محفوظ رکھنا دشوار ہوتا ہے اور چین نہیں آتا، ان پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، بلکہ حرام کاری کے اسباب مہیا کرنے کے مترادف ہوگا، یہاں مرطوب اور بلغمی لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ عقل وشرع کے ان احکام کو بھی پیش نظر رکھئے کہ حرام کاری ایسی گھناؤنی بیماری ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کسی دوسری عورت کو بری نظر سے بھی نہ دیکھو اور نہ کسی غیر محرم کو ہاتھ لگاؤ، اس سے تخلیہ میں بات چیت بھی نہ کرو اگر باز نہ آؤ گے اور ملوث ہوجاؤ گے تو بدترین سزا کے مستحق ہوگے۔ ستم بالائے ستم نہ ہوگا، تو اور کیا ہوگا؟

● اس لئے کہ بعض مرتبہ عورت ٹی بی یا کسی دوسرے مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے اور ایسی کمزور ہوجاتی ہے کہ خدمت کرنے کے بجائے خود خدمت لینے کی محتاج ہوجاتی ہے اور اس کی سابقہ خدمتیں اور بھلا برتاؤ ایسا ہوتا ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کردینا شوہر کی نگاہ میں انتہائی ناانصافی ہوتی ہے، اس کی غیرت ومحبت کسی طرح طلاق دینے کو قبول نہیں کرتی، کبھی عورت بے سہارا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کردینا اس کو زندہ درگور کردینے کے مترادف ہوتا ہے، کبھی وہ عورت (مریضہ) دو چار بچوں کی ماں بھی ہوچکی ہوتی ہے اور وہ بچے بھی کسی ایسی عورت کے محتاج ہوتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرے۔ ایسی حالتوں میں عقل وانصاف کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرد ایک ایسی شادی کرے جس سے خود اس کی عفت مآبی بھی محفوظ رہے اور ساتھ ہی اس بے بسی اور مجبور عورت کی بھی بطور حسن مکافات کے خدمت ہوسکے اور بچوں کی بھی نگہداشت وپرداخت ہوسکے۔

اور کبھی ایسی عورت شوہر سے خود اصرار کرتی ہے کہ کسی عورت سے شادی کرلو جو تمہاری اور میری دونوں کی خدمت بھی کرے اور گھر بھی آباد رکھے، اور ان بچوں کی پرورش بھی کرے، خاص کر جب عورت سمجھدار ہوتی ہے تو اکثر ایسا اصرار کرتی ہے اور بسا اوقات ان حالات میں لازم ہوجاتا ہے کہ اس قابل رحم پر رحم کھا کر اس کی درخواست پوری کی جائے اور اس کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرلی جائے، تاکہ پرسکون زندگی کا راستہ کھلے اور صالح معاشرہ بھی نصیب ہو۔

● اسی طرح کبھی عورت بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو گھر کے ناچراغ ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ بانجھ بھی ایسی سلیقہ مند اور مناسب مزاج ہوتی ہے کہ اس کو علیحدہ بھی کرنا نہیں چاہتا یا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے (مثلاً اس کے میکہ وغیرہ میں کوئی نہیں ہوتا) کہ اس کو علیحدہ کردینا اس کو ہلاک کردینے کے مترادف ہوتا ہے یا وہ عورت خواہش کرکے شوہر کو اپنے علاوہ

ایک اورعورت سے نکاح کرنے پرمجبورکرتی ہے۔

ان حالات میں تعدد ازواج کو یکسر روک دینے کا قانون کس قدر تنگی کا باعث ہوگا؟ اور کس قدر عقل ودانش سے دور ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان ملکوں کے حالات کا اور ان لوگوں کا مشاہدہ کیجئے اور جائزہ لیجئے جن ملکوں میں، جن لوگوں میں عورت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا دستور نہیں ہے، بلکہ ایسی بوڑھیا بدشکل، کج خلق یا بیمار بدوضع کوتاہ اندیش مخالف مزاج ہی کو گلے باندھے رکھنے کی تاکید ہے، ان کو کیا کیا مصائب پیش آتے ہیں، بلکہ مطابق بیان صاحب ''تفسیر حقانی'' کہیں عورت کو زہر دے کر مارا جاتا ہے، کہیں اسے ہلاک کرنے کی سعی کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

● اس لئے کہ بسا اوقات ملکی اور حکومتی سطح پر کوئی بڑی جنگ چھڑ جاتی ہے اور اس ترقی آلات کے دور میں ایک معمولی جنگ کے اندر بھی محض چند دنوں میں لاکھوں نوجوان کام آتے ہیں اور ان کے بے شمار بچے یتیم و بے سہارا ہوجاتے ہیں اور لاکھوں عورتیں اچانک بیوہ اور بغیر شوہر کے رہ جاتی ہیں جس کا اندازہ آج کی دنیا میں مشکل نہیں ہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے لے کر ۱۹۷۱ء کی متعدد جنگوں کے اندر کام آنے والے اور مرنے والے جوانوں کی تعداد سے اس کا بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے ہم نے مانا کہ حکومت وقت ان بے سہاروں کے کھانے پینے رہنے سہنے، بلکہ روزگار کا انتظام کرتی ہے، لیکن کوئی بتائے کہ ان بے شمار نوجوانوں اور اچانک بیوہ ہوجانے والی عورتوں کی عفت وعصمت کا کیا علاج ہے؟ تعدد ازدواج کے علاوہ کیا اس کا کوئی اور انتظام ہوسکتا ہے؟

غرض تعدد ازدواج کو قانونا بند کردینا اور اس کو جرم قرار دے دینا عقل سلیم کے تو خلاف ہے ہی سماج کے لئے بھی بے حد مضر اور تباہ کن ثابت ہوگا۔ تعدد ازدواج کو روکنا صریح مداخلت فی الدین ہے، رہ گئی اس مسئلہ کی شرعی حیثیت تو یہ قانونا خلاف شرع ہے، بلکہ ایسا قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ رب العزت نے حسب ضرورت ومصلحت چار تک نکاح کرلینے کی سہولت اور صریح اجازت واباحت مرحمت فرمادی تو اب اس کے خلاف قانون بنانا مداخلت فی الدین نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وإن خفتم ان لاتقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع، فان خفتم ان لاتعدلوا فواحدة أو ماملکت أیمانکم ذالک أدنیٰ الاتعولوا"(۱)۔

اگر غور کیا جائے تو علی الاطلاق اس سے روک دینے کا قانون بنانا مداخلت فی الدین کے ساتھ ساتھ اس میثاق اور

۱- سورۂ نساء ۳۔

قانون کے بھی خلاف ہوگا جس میں حکومت نے ہر مذہب کو آزاد رہنے کی ضمانت دی ہے، بلکہ غور کرو تو سیکولر اسٹیٹ کے لئے بھی یہ ایک بدنما داغ ہوا۔

شوہر کے ظلم سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

اور اگر عدم تعدد ازدواج کے اس قانون سے مقصد یہ ہو کہ بالکلیہ ختم نہ کیا جائے، بلکہ کچھ ایسے قیود وشرائط کے ساتھ اجازت دی جائے جس سے ان لوگوں کو جو متعدد نکاح کر کے پہلی بیویوں کو پریشان کرتے ہیں، پریشان کرنے کا موقع نہ ملے، انسداد ہوجائے تو اس کا لحاظ تو خود نص میں موجود ہے، یہی نہیں، بلکہ یہ قید مذکورہ فی النص اس ذات کی لگائی ہوئی ہے جو تمام جذبات انسانی کو محض جاننے والی ہی نہیں، بلکہ ان کی خالق ومالک بھی ہے اور سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے، اس ذات سے اچھی وجامع مانع قید کون لاسکتا ہے؟! اس مذکورہ فی النص قید کے ذریعہ سے ان تمام مذکورہ مظالم کا انسداد علی وجہ الکمال ہوجائے گا، البتہ اس کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنا اور برتنا شرط ہے، پھر اس بحث کے اٹھانے کے کیا معنی؟

اگر یہ کہا جائے کہ نص میں مذکورہ قید کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ متعدد نکاح کر لینے کے بعد جب کچھ دن گزر جائیں اور تجربہ ہوجائے جب جا کر معلوم ہوسکتا ہے کہ ان دونوں میں عدل ہو رہا ہے یا نہیں اور اگر عدل نہ ہوتا ہو تو اب روکا جائے، جیسا کہ بعض مضمون نگاروں نے یہ لکھا بھی ہے، تو یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے، نص میں (**وإن خفتم ان لا تعدلوا**) ہے "**ان لم تعدلوا**" نہیں ہے کہ اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ بعد نکاح اگر عدل نہ کرے تو فقط ایک پر قناعت کرے، بلکہ نص کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ثانی سے قبل ہی اگر تم کو خوف غالب ہو کہ بعد نکاح عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی عورت پر قناعت کرو، یا "**ماملکت ایمانکم**"(۱) سے کام لو الخ جس کا کھلا ہوا مفہوم صرف یہ ہے کہ نکاح سے قبل اپنے حالات اور اس عورت کے حالات اور اپنی پہلی بیوی کے حالات پر خوب غور کرے اور پھر ان میں عدل نہ کرنے کی صورت میں دنیا میں جو نتائج بد عموماً پیش آتے ہیں ان پر بھی نظر کرے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دیانت سے آخرت کی باز پرس کو بھی مستحضر کرے کہ عدل نہ کرنے کی صورت میں خدا کے حضور میں جب سوال ہوگا تو کیا جواب ہوگا اور پھر اس کی سزا سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی، غرض آخرت کو بھی پیش نظر رکھ کر خوب سوچ لے کہ ان سب کے نان ونفقہ ولباس وپوشاک وغیرہ میں عدل وانصاف اور ان سب کے حقوق کی ادائے گی اور ان سب کے نفسیاتی تقاضوں کی سرانجام دہی ہوسکے گی یا نہیں، اگر نہ ہونے کا اندیشہ غالب ہو تو نکاح ثانی پر قدام نہ کرے۔

۱- 　سورۂ نساء: ۳۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب فی زمانہ پابندیوں کا وجود نہیں ہے اور طاقتیں بھی کمزور ہو چکی ہیں، ان مذکورہ امور میں غور وخوض کرنے میں کوتاہی متوقع اور قریب الوقوع ہے جس کالازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے انصافی کا صدور ہوگا، اس لئے یکسر روک دینے کے قانون کی ضرورت ہے کہ ایسے احتمالات تو پہلے نکاح کو بھی بند کر دینے کا حکم یا اس کو قانوناً جرم قرار دے دینے کا مشورہ دیا جائے گا۔

اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر یہاں کیوں مشورہ دیا جاتا ہے اور ایسا عمل کیوں تجویز کیا جاتا ہے جس سے نص میں تغیر وتبدیلی اور مداخلت فی الدین کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص ایسا عمل کیوں نہیں تجویز کیا جاتا ہے جس میں نص کے اندر بغیر کسی تبدیلی وتغیر یا ترمیم وغیرہ کے ان کے بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا انسداد ہو سکتا ہے؟ مثلاً یہ کہ نکاح ثانی کرنے والے سے ایک اقرار نامہ (کابین نامہ) نکاح ثانی سے قبل ہی لکھوالیا جائے جس کا مضمون وعنوان یہ ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کابین نامہ

امابعد میں .... کہ .... پسر .... قوم .... ساکن .... ضلع .... کا ہوں میرا نکاح مسماۃ .... دختر .... قوم ساکن ضلع .... کے ساتھ شرائط ذیل پر بعوض مہر .... روپیہ سکہ رائج الوقت کے قرار پایا ہے۔

لہٰذا میں بدرستی ہوش وحواس بلا کسی جبر واکراہ کے مندرجہ ذیل اقرار نامہ لکھتا ہوں، تاکہ میں اس کا پابند رہوں اور درصورت عدم پابندی مسماۃ سے نکاح کروں تو نکاح کرنے کے بعد جب کبھی اس کو نکاح میں رکھتے ہوئے شرائط ذیل (جس کو دیندار اور سمجھدار لوگوں کے مشورہ سے مرتب کیا جائے) میں سے کسی شرط کے خلاف کروں اور اس خلاف ہونے کو اور ہم دونوں میں علیحدگی کو مندرجہ ذیل اشخاص میں سے کم سے کم دو شخص تسلیم کر لیں تو اس کے بعد مسماۃ مذکورہ کو اختیار رہوگا کہ خلاف شرط ہونے سے ایک ماہ کے اندر اندر جب چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہو جائے اور جب کبھی کسی شرط کے خلاف واقع ہو ہر بار ایک ایک ماہ کے لئے یہ اختیار رہے گا۔ مگر یہ اختیار ایک ہی نکاح تک محدود رہے

گا۔ اگر کسی وقت فرقت اور علیحدگی کے بعد نکاح کا اعادہ ہو تو اس کے بعد یہ اختیار اور یہ شرائط نہیں رہیں گی، بلکہ اس وقت جو کچھ دوبارہ طے ہو جائے گا اس کے مطابق عمل درآمد ہوگا۔

شرائط یہ ہیں ———— نیچے یہ لکھا ہو:

اس کابین نامہ کو میں نے منظور کیا اور لکھوا کر سنتے دیکھتے اور تسلیم کرنے کے بعد آج بتاریخ ماہ ———— سنہ میں دستخط کرتا ہوں ———— نشان انگوٹھا ———— گواہ شدہ

———— گواہ شدہ ———— گواہ شدہ

فائدہ: اسی کابین نامہ سے (شرطوں میں تھوڑی مناسب ترمیم کے بعد) پہلے نکاح کے بعد جو مظالم بعض شوہروں کی جانب سے یا جو نشوز سرکشی بعض عورتوں کی جانب سے رونما ہوتی ہے اس کا انسداد بھی ہو سکتا ہے۔

نیز کابین نامہ میں مندرجہ ذیل شرط بڑھا کر اس تلوار سے بھی حفاظت کی جا سکتی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے لئے نصوص قطعیہ میں تغیر وتبدیلی تک کر ڈالنے کا منصوبہ گانٹھ رکھا ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس موقع کی تعبیر شریعت مطہرہ کے ساتھ نہایت گستاخانہ اور خطرناک قسم کی جرأت ہے، اگر قہار مطلق کی شمشیر قہری کا تصور بھی صحیح معنی میں ہو جائے تو اس کے احکام کی تعبیر اس طرح کرنے پر کبھی جرأت نہ ہو، بہر حال اضافہ کی ہوئی شرط بہ الفاظ ذیل ہوگی:

''اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں گا تو اس کو تین طلاق نہ دوں گا۔ اور اگر میں نے بلا وجہ شرعی اس کو تین طلاق دے دیں تو جب تک وہ عورت اپنا نکاح کسی سے نہ کرے گی اس کا نان ونفقہ اس مقدار سے برابر دیتا رہوں گا جس مقدار پر مندرجہ بالا دونوں فریق کے کم از کم تین اشخاص متفق ہو جائیں گے اور دینے کا حکم کر دیں گے''۔

اگر میں کسی ماہ نان ونفقہ نہ دوں تو ایک ماہ گزر جانے کے بعد عدالت مجاز کے ذریعہ وصول کر سکتی ہے۔

دو شبہات اور ان کا حل:

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ شریعت جب خود نکاح میں بطور عوض کے مہر کو لازم قرار دے چکی ہے اور طلاق میں عدت کا نفقہ واجب قرار دے چکی ہے تو اب مزید نفقہ کا بار شرط لگانا اور لازم کرنا یہ ظلم بھی ہوگا اور حکم شرعی پر زیادتی بھی ہوگی۔ جس کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت ہو سکتا ہے جب حکومت کی جانب سے قانونا یہ شرط لگا دی جائے یا کسی بھی دوسرے شخص کی جانب سے شوہر کی مرضی کے خلاف یہ شرط اس پر لازم قرار دے دی جائے، یا عقد نکاح کی صلب حقیقت میں یہ شرط داخل کر لی جائے کہ بغیر اس شرط وقید کے شرعا بھی اس نکاح کو

منعقد تصور نہ کیا جائے اور جب ایسا نہیں ہے، بلکہ شوہر خود اپنی صواب دید سے اپنی مصالح کے پیش نظر نکاح سے الگ اور مستقل طور پر از خود اس قید کو اپنے اوپر لازم کر رہا ہو تو مثل دیگر اقرار، تعلیق، عہود اور عقود معلقہ کے یہ شرط بھی صحیح و معتبر ہوگی۔

(۲) دوسرا شبہ یہ ہے کہ طلاق کے بعد زمانہ عدت کے علاوہ پھر کوئی نفقہ لازم کرنا یہ از قبیل جرمانہ مالی ہوگا جو جائز نہیں۔

اس کا جواب بھی وہی ہے جو شبہ اول کا جواب ہے، اس لئے کہ جرمانہ مالی یا تعزیر مالی لازم کرنے کا حق کسی دوسرے شخص کو تو بے شک نہیں ہوسکتا صریح نص کے خلاف ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"لایحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفسه"(۱)۔

لیکن اسی نص کے استثناء کے مطابق ہر شخص کو خود اپنے اوپر جرمانہ مالی اور تعزیر مالی اس حد تک کہ اس سے دوسرے کے حق کا تلف نہ ہو جائز ہے، جیسا کہ حالت حیض میں بیوی سے مباشرت کر لینے کی صورت میں صدقہ کی ایک مقدار ادا کر دینا روایات میں ملتا ہے اور مثلاً اگر کوئی شخص نماز قضاء ہو جانے کے جرم میں بطور جرمانہ اپنے اوپر ایک روپیہ کا صدقہ کر دینا یا ایک دن کا روزہ رکھ لینا لازم کرلے تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس ترمیم یا نام نہاد اصلاح سے کسی حکم شرعی میں تغیر یا تبدیلی یا کسی اطلاق میں تقیید لازم آتی ہو اس کا پیش کرنا، یا قبول کرنا بلکہ اس کا سوچنا بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، بلکہ قطعاً حرام و ناجائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۱/ ۹۲ ۱۳ھ

نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کے لئے ایک دوسرے کو دیکھنا:

کیا نکاح کرنے کے قبل مرد عورت کو اور عورت مرد کو دیکھ سکتی ہے اور کس قدر اگر یہ جائز ہے تو سند میں حدیث حضور ﷺ اور امام اعظمؒ کا قول تحریر کریں۔

۱- دار قطنی ۳/ ۲۶، کتاب البیوع حدیث: ۹۱ عن انس بن مالکؓ۔

الجواب وبالله التوفيق:

تنہائی میں بالکل ایک دوسرے کونہیں دیکھ سکتے ہیں، البتہ دوسرے لوگ بھی وہاں موجود ہوں تو صرف چہرہ دیکھ سکتے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے نکاح کرنا اوران کا نکاح پڑھانا:

کنیڈا اورامریکہ میں اکثر مسلمان لڑکے نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کررہے ہیں، یہ لڑکیاں اکثر اپنے دین پر عمل نہیں کرتی ہیں بعض دفعہ اللہ ہی کے وجود سے انکار کرتی ہیں، تو کیا ایسی صورت میں ہم ان کی شادی کراسکتے ہیں؟

اسلامک سینٹر آف عرب، کناڈا

الجواب وبالله التوفيق:

اگر یہ لڑکیاں اللہ کی وجود سے انکار کرتی ہیں یا اپنے دین (نصرانیت ویہودیت) سے منکر ہیں تو پھر یہ اہل کتاب ہی نہیں ہیں بلکہ دہری ہیں اوران سے نکاح قطعاً جائز نہیں ہے (۲) اوراگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ انجیل یا توریت کو آسمانی کتاب مانتی ہیں اورخدا کی قائل ہیں تو وہ اہل کتاب میں سے شمار ہونگی اورفی نفسہ ان کے ساتھ اباحت نکاح میں کلام نہیں ہوگا، البتہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں اورنسل کی حفاظت اوران کی صحیح تعلیم وتربیت کی خاطر نکاح نہ کرنا چاہئے، اس عمل کی

۱- ”قال رسول الله ﷺ إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر منها إلى مايدعوه إلى نكاحها فليفعل“ (رواه احمد ورجاله ثقات وصححه الحاكم بلوغ المرام مع السبل ۳/ ۹۷۶، ولو أراد أن يتزوج المرأة فلا بأس أن ينظر إليها (رد المحتار ۲/ ۵۳۲ مکتبہ زکریا)۔

۲- درمختار میں ہے: ”وحرم نكاح الوثنية بالإجماع وصح نكاح كتابية وإن كره تنزيها“، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: "نسبة إلى عبادة الوثن..... وفي الفتح: ويدخل في عبدة الأوثان عبدة الشمس والنجوم والصور التي استحسنوها والمعطلة والزنادقة والباطنية والإباحية وفي شرح الوجيز: وكل مذهب يكفر به معتقده“ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۴/ ۱۲۵)، ”ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ولأمة مؤمنة خير من مشركة ولو أعجبتكم ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا، ولعبد مؤمن خير من مشرك ولو أعجبكم....“ (سورہ بقرہ ۲۲۱)۔

تائید حضرت عمر فاروقؓ کے رجحانات سے بھی ہوتی ہے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

اہل کتاب عورتوں سے نکاح:

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں، اور کیا آج کل کے عیسائی یہودی اہل کتاب میں داخل ہیں یا نہیں؟

دینی معاملات میں بیوی کی تنبیہ کا حکم:

اپنی بیوی کو دینی یا دنیوی معاملات میں مارا جا سکتا ہے یا نہیں، اور کس حد تک مارنے کی اجازت ہے؟

نابالغہ اولاد کو مارنے کی حد:

اپنی اولاد کو نابالغہ ہو یا بالغہ مارنے میں شریعت نے کتنی حد مقرر فرمائی ہے؟

متعہ کا حکم شرعی:

متعہ کے بارے میں اگر قرآنی آیات ہوں تو تحریر فرما کر مشکور فرمائیں!

پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنے سے دوسری بیوی مستحق وراثت ہوگی یا نہیں؟

ایک شخص نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرلی کچھ عرصہ کے بعد شوہر کا انتقال ہوگیا، پہلی بیوی کا دعویٰ ہے کہ مرحوم نے میری اجازت کے بغیر دوسری شادی کی تھی، اس لئے دوسری بیوی حقِ وراثت سے محروم ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ دونوں بیویوں کو پوری پوری وراثت ملے گی یا صرف پہلی کو؟

حافظ محمد صفدر خاں

الجواب وباللہ التوفیق:

کتابیہ عورت سے خواہ نصرانیہ ہو یا یہودیہ مسلمان مرد سے نکاح کی اجازت نص قرآنی سے معلوم ہوتی ہے اور کتابی

۱- "ویجوز تزوج الکتابیات والأولی أن لایفعل" (رد المحتار علی الدر المختار ۴/ ۱۳۴)، "والمحصنات من الذین أوتوا الکتاب من قبلکم إذا آتیتموھن أجورھن..." (سورہ مائدہ ۵)۔

سے مراد یہ ہے کہ اپنے نبی مرسل اور کتاب منزل من السماء (تورات وانجیل) پر ان کا اعتقاد ہو تو ان سے نکاح درست ہے، لیکن فقہائے کرام نے دوسرے دلائل سے حربی کتابیہ سے نکاح کرنے کو مکروہ (تحریمی) فرمایا ہے، اس لئے کہ اس سے فتنہ کے دروازے کھلنے کا خوف ہے، اس لئے اگر ہو سکے تو مسلمہ بنا کر نکاح کرے، ورنہ احتیاط کرنا اولیٰ ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اگر سرکشی کرے یا نافرمانی کرے تو سب سے اول طریقہ وعظ ونصیحت کا ہے، اگر وہ محض وعظ ونصیحت سے باز نہ آئے تو بستر سے الگ کردے، شاید اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضگی کا احساس کر کے اپنے فعل پر نادم ہو اور عبرت پکڑے، اس کے باوجود بھی راہ راست پر نہ آئے تو پھر مارنے کی اجازت دی ہے، لیکن حدیث شریف میں اس کا بیان ہے کہ چہرہ ومذاکیر پر جائز نہیں ہے، نہ اس طرح مارے کہ بدن کہیں سے الگ ہو جائے یا کہیں کی ہڈی ٹوٹ جائے یا سیاہ دھبے پڑ جائیں یا ایسی مار جس کا اثر قلب پر پڑتا ہو یہ بھی ناجائز ہوگا۔

بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ مارے، نیز ہاتھ سے مارے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسواک وغیرہ جیسی چیز سے مارے، **"عن ابن عباس أنه الضرب بالسواک ونحوه"** (۱) اگر حد مذکور سے تجاوز کر کے مارا، یا چہرہ یا مذاکیر پر مارا خواہ ایک ہی ہاتھ سے کیوں نہ مارا ہو گنہگار ہوگا۔

اگر شوہر نے بیوی کو مارا (خواہ ترک نماز کے سبب ہو یا گھر سے بلا اجازت باہر نکلنے پر اور کسی وجہ سے مارا) اور وہ اس سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا۔ "عالمگیریہ" میں ہے:

"اگر شوہر نے اپنی بیوی کو بسبب ترک نماز کے، یا بسبب بے مرضی شوہر کے گھر سے باہر نکلنے کے تعزیر دی۔ پس وہ عورت اس تعزیر سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا" (۲)۔

بعض علماء کے نزدیک عورت کو ترک نماز پر بھی مارنا جائز نہیں۔ شامی میں ہے: **"وذکر الحاکم لایضرب امرأته علی ترک الصلوٰة"** (۳)۔

سو ابتدائی دو سزائیں وعظ ونصیحت اور بستر ے کا الگ کرنا ملحوظ رہے کہ جدائی صرف بستر میں ہو مکان کی جدائی نہ کرے، یعنی اس کو گھر سے باہر نکالے، بلکہ خود عورت کو تنہا مکان میں چھوڑ کر چلا جائے یہ شریفانہ سزائیں ہیں، مگر تیسری سزا مار پیٹ کو (اجازت کے باوجود) حضور ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

۱- روح المعانی ۴/ ۲۷۔
۲- فتاویٰ عالمگیریہ ۳/ ۳۸۱۔
۳- شامی ۳/ ۲۶۲۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:"ولن یضرب خیارکم" (یعنی اچھے مرد بیمار بیٹ کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے)۔
ضرب الصبیان کا بھی وہی حکم ہے جونمبر ۵ پر گذرا کہ چہرہ و مذاکیر کے سوا بدن پر مارے، زیادہ نہ مارے، نہ لکڑی سے مارے، اور یہ بھی نماز کے ترک پر آیا ہے اور عمر دس سال یا اس کے قریب ہو، شامی میں ہے:

"والمراد ضرب به بیده لا بخشبه" حدیث میں جو آیا ہے کہ بچے کو نماز پر مارے تو اس سے مراد ہاتھ سے مارنا ہے، لکڑی یا ڈنڈے سے نہیں، باقی امور دینیہ اور دنیویہ کے لئے مارنا درست نہیں، زبانی کلام پر اکتفاء کیا جائے اور اگر لڑکی بالغہ ہو تو باپ کا اس کو مارنا درست نہیں۔

حرمت متعہ پر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ صریح ہے: "والذین هم لفروجهم حافظون الاعلی أزواجهم أوماملكت أيمانهم فانهم غير ملومين فمن ابتغىٰ وراء ذالك فاؤلٰئك هم العدون" (۱)۔

(اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامے ہیں، مگر اپنی ازواج پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر سو ان پر کچھ الزام نہیں، پھر جو کوئی اس کے سوا ڈھونڈے سو وہی ہے حد سے تجاوز کرنے والا)۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے متعہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا حرام ہے اور میں تو اس کی حرمت کو صریح قرآن کریم سے پاتا ہوں، پھر مذکورہ بالا آیت تلاوت کی "تفسیر مواهب الرحمن" (۲)۔

اس کے علاوہ حضرت امام مالکؒ موطا میں حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن متعة النساء يوم خيبر (انتهىٰ)" (۳)۔ اسی طرح فرقہ امامیہ کی ایک معتبر کتاب "الاستبصار" میں حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "قال حرم رسول الله ﷺ: لحوم الحمر الأهلية ونكاح المتعة" نیز شیعوں کے امام علامہ احقاق الحق لکھتے ہیں کہ متعہ کے حرام ہونے پر ائمہ اربعہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے پتہ چلا کہ متعہ کے حرام ہونے پر اہل سنت کے علاوہ شیعہ کی کتابوں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں، اس کے باوجود اگر اس میں کوئی کلام کرے تو اس کی بدبختی اور بدنصیبی کی انتہا ہے۔

۱۔شوہر کے نکاح ثانی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت لازمی اور فرض نہیں۔ كما أشار إليه قوله تعالىٰ:

۱۔ سورہ مومنون: ۵-۷۔

۲۔ ص ۶ پ ۱۸۔

۳۔ موطا باب نکاح المتعۃ حدیث: ۱۹۲ عن علی بن طالب ۶۔

"فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع"(۱) دوسری بیوی شرعاً اس کی بیوی ہے، اس کے انتقال کے بعد دوسری بیوی کو بھی پہلی کی طرح پورا پورا حق وراثت ملے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شادی کے موقع پر عورتوں کا گیت گانا یا نظم پڑھنا:

۱۔ بعض جگہ شادی بیاہ میں یہ رواج ہے کہ عورتیں جمع ہو کر گیت گاتی ہیں اور ایسے لوگ جمع ہوتے ہیں کہ جن میں اکثر غیر محرم مرد ہوتے ہیں۔

۲۔ بعض جگہ ایسا ہے کہ گیت وغیرہ تو نہیں گاتے، لیکن غیر محرم مردوں کے مجمع میں خصوصاً جبکہ بارات آتی ہے تو بارات کے سامنے مکان کے اوپر عورتیں کھڑی ہو جاتی ہیں اور نعت اور نظمیں وغیرہ خوش الحانی سے اور خوب سریلی آواز سے پڑھتی ہیں ہر مصرع کے بعد لاالہ الا اللہ وغیرہ الفاظ کہتی ہیں اس کو جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔

۳۔ ایسے ہی مجالس میں اکثر ایسے الفاظ پڑھتی ہیں، حسنؓ کے لئے میں نے مہندی منگائی مہندی لگالو، جناب رسول اللہ ﷺ یا حسنؓ کے لئے میں نے گانا بنایا گانا گانا پہن لو جناب رسول اللہ ﷺ، اس قسم کے اشعار وغیرہ پڑھتی ہیں اور تمام مجمع کو سناتی ہیں اور گرماتی ہیں۔

دریافت ہے کہ ایسے امور جائز ہیں یا کہ نہیں اور حضور ﷺ کی طرف مہندی گانا اور گانا وغیرہ کا اس طرح انتساب اور شادی وغیرہ کے مجمع میں پڑھنا آیا یہ توہین نبوت ہے کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ ہر گانا بجانا جو محض کھیل وتماشہ کے لئے کیا جاتا ہے شرعاً جائز نہیں ہے، ان الملاہی کلہا حرام اور پھر جو طریقہ آپ نے عورتوں کے گانے کا بیان کیا ہے یہ تو بالکل حد سے گذرا ہوا ہے یہ گیت گانا اور انکو شوق سے سننا اور اس سے لذت حاصل کرنا سب حرام ہے۔

"قال ابن مسعودؓ وصوت اللهو والغناء ينبت النفاق كما ينبت الماء النبات، قلت وفي

۱۔　　سورۂ نساء: ۳۔

البزازية استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام لقوله عليه الصلوة والسلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر بالنعمة" (۱)۔

۲-مذکورہ طریقہ پر غیرمحرم مردوں کے مجمع کے سامنے چاہے وہ برات ہو یا غیر برات بلند مقام پر مع زیب و زینت کے جوان عورتوں کا بلا پردہ کامل کے کھڑا ہونا یا گانا اور نعتیں وغیرہ یا لا الہ الا اللہ مذکورہ طریقہ پر خوش الحانی کیساتھ پڑھنا، غیرمحرم مردوں کو سنانا اور ان کا سننا تمام قطعاً حرام ہے، کیونکہ یہ خلاف شرع طریقہ ہے اور شادی میں اختیار کرنا داعی الی الفتنہ بھی ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور آزاد مسلمان عورتوں کو بلاضرورت شرعیہ کے بلند آواز کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت کی آواز میں بھی فتنہ ہے: **"صوت المرأة عورة بلا ضرورة شرعية تمنع المرأة الشابة عن كشف الوجه بين الرجال، لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة"**(۲)،**لقوله تعالىٰ:" ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" ولقوله تعالىٰ:"غير متبرجات بزينة"** (۳)**"ولا يبدين زينتهن"**(۴)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ جوان عورتوں کو بلا پردہ کامل غیرمحرم کے سامنے آنا یا غیرمحرم کے مجمع میں مذکورہ طریقہ پر گانے وغیرہ کا اختیار کرنا قطعاً حرام ہے، غیرمحرم عورتوں سے تو قرآن بھی غیرمحرم مردوں کو سننا جائز نہیں ہے، تو سریلی آواز سے نظم میں لا الہ الا اللہ غیرمحرموں کو سنانا کیسے جائز ہوسکتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ثواب سمجھ کر سنتے ہیں یا سناتے ہیں یہ غلط کہتے ہیں یہ محض اپنے نفس کو تباہی کے گڑھے میں ڈالنا ہے، مسلمان عورتوں کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، انکو زمین پر زور سے چلنے کی بھی ممانعت ہے۔

"كما قال الله تعالىٰ:"ولا يضربن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن" (۵)،**قال تعالىٰ:"يدنين عليهن من جلابيبهن "**(۶)،**وقال ابن عباس وابو عبيدة:" امرت النساء المومنات ان يغطين رؤسهن ووجوهن بالجلابيب الا عيناً ليعلم انها حرائر"**۔

۱- درمختار ۲/۲۳۸۔
۲- درمختار۔
۳- سورۃ النور ۱۸/۶۰۔
۴- سورۃ النور ۱۸/۳۱۔
۵- سورۃ النور ۱۸/۳۱۔
۶- سورۃ الاحزاب ۲۲/۵۹۔

مندرجہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مذکورہ طریقہ اختیار کرنا اور مردوں کو یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے عورتوں کو پردہ میں رہنا چاہئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: **"المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشیطان"** (۱)۔

۳۔ حضور ﷺ کی طرف سہرا گنگنا وغیرہ کی نسبت کر کے گا گناہ ہے مسلمانوں کی شان یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ شعار کفار کا ہے، جو مسلمان یہ رسم ادا کرے گا یا اسکو اچھا جانے گا وہ رسم کفار کی تائید کرتا ہے اور پھر ان رسموں کو حضور ﷺ کی طرف نسبت کرنا سراسر توہین نبوت ہے، مسلمانوں کو ایسی حرکتوں سے قطعاً باز رہنا چاہئے، نیز اور لوگوں کو بھی باز رکھنا چاہئے، **قال علیه الصلوة والسلام: "من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان"** (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۱۰/۱۳۸۵ھ

قرآن کریم کی تلاوت سے روکنے اور اس کی بے حرمتی کرنے والے شوہر کے ساتھ بیوی کا سلوک:

ایک لڑکی ہمیشہ پنج وقتی نماز ادا کرتی ہے اور قرآن شریف فجر کی نماز کے بعد تلاوت کیا کرتی ہے، ایک دو مرتبہ اپنے شوہر کے مکان گئی بھی اور آئی بھی ہے، اس کے شوہر کا اخلاق اچھا نہیں ہے، امسال رمضان شریف میں اپنے شوہر کے گھر تھی، ایک روز لڑکی بعد نماز قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی اس کا شوہر آیا اور اس نے کہا جو پوتھی تم پڑھ رہی ہو تمہارا پاؤں اور ہاتھ میں مار کر توڑ دوں گا اور اس پوتھی کو پھاڑ ڈالوں گا، لڑکی نے قرآن شریف کا پڑھنا بند نہیں کیا، پھر دوبارہ بولا بند کر دو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو میں آگ لگا کر جلا دوں گا اور کلام پاک کی بڑی بے حرمتی کی اور کلام پاک کو گالی دیکر کہا کہ میں اس کو جلا دوں گا تو ایسے خاوند کے ساتھ لڑکی کا کیسے گذر بسر ہو سکتا ہے کیسے رہن سہن ہو سکتا ہے؟

شہاب الدین خاں (اسلامیہ اسکول چھواپوسٹ پرتھی گنج ضلع پرتاپ گڑھ یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

سوال کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی میں لڑکی کے بھی سخت رویہ کو دخل ہے، جیسا کہ سوال کے اس

۱- رواہ الترمذی ۱/۲۲۲، فیصل پبلیکشنز دیوبند۔
۲- مسلم ۱/۵۱، مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

خط کشیدہ جملہ (پھر دوبارہ بولا بند کرو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی شوہر نے تلاوت بند کرنے کا حکم دیا ہوگا اور نہ ماننے پر اس تشدد پر اتر آیا ہے، حالانکہ بعینہ اسی وقت تلاوت کرنا واجب شرعی نہیں تھا، بہت سے بہت مباح یا مستحب تھا اور شوہر کے حکم کی تعمیل واجب تھی (۱)، اس لئے لڑکی پر واجب تھا کہ شوہر کے حکم کی تعمیل کر لیتی اور پھر بعد میں شوہر کا غصہ جب اتر جاتا تو اسکو سمجھا لیتی، غرض دونوں کی غلطی کو اس جرم میں دخل ہو گیا، اور دونوں ہی (میاں بیوی) اس گناہ کے کم وبیش سبب بن گئے، اس لئے دونوں ہی کو مل جل کر نباہ کرنے کی تلقین کرنی اور مسائل سیکھنے کی اہمیت اور قرآن پاک کی عظمت وعزت کے بتلانے کی ضرورت ہے، اگر دونوں تائب ہو کر اپنے حالات سدھار لیں تو **التائب من الذنب کمن لا ذنب له أو کما قال علیه السلام** (۲) کی فضیلت وثواب کے عند اللہ مستحق ہو جائیں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۱/۱۴۰۰ھ

مباشرت سے قبل ولیمہ:

بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ولیمہ کا کھانا تب تک درست نہیں ہوتا جب تک کے پچھلی رات دلہا دلہن آپس میں مباشرت نہ کر لیں، یہ دعویٰ شرع سے کس حد تک قریب ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ جب تک زوجین مباشرت نہ کر لیں دعوت ولیمہ کا کھانا درست نہیں ہوتا ہے، یہ بالکل غلط اور لغو ہے، بلکہ دعوت ولیمہ کا مطلب یہ ہے کہ زوجین کی پہلی شب کی ملاقات کے بعد جو دعوت کی جاتی ہے اس کو ولیمہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

"قال أولم رسول الله ﷺ حين بنى زينب بنت جحش فأشبع الناس خبزاً ولحما" رواه

۱- حدیث میں ہے: "لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لأحد لأمرت النساء أن يسجدن لأزواجهن لماجعل الله لهم عليهن من الحق" (سنن ابوداؤد ۲/ ۲۴۴، کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ حدیث ۲۱۴۰)، "وعن النبي ﷺ إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فلم تأته فبات غضبان عليها لعنتها الملائكة حتى تصبح" (حوالہ سابق حدیث ۲۱۴۱)۔

۲- سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۴۲۰ کتاب الزہد باب ذکر التوبہ حدیث: ۴۲۵۰۔

البخاری (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/۱۴۰۱ھ

شادی و بارات میں شرکت کا شرعی حکم:

۱-آج کل جو ہمارے یہاں شادیاں ہوتی ہیں ان میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

۲-زید کہتا ہے بارات میں شرکت حرام ہے، کیونکہ بارات ہنود کی رسم ہے۔ بارات نکلا ہے بری سے اور بری کہتے ہیں ہندوانی رسم کو، دلیل میں بہشتی زیور پیش کرتا ہے۔ کیا زید کا مذکورہ بیان صحیح ہے، اگر نہیں تو پھر حکم کیا ہے؟

۳-بارات میں جانا کیسا ہے اگر لڑکی والا بارات لانے کی اجازت دے تو کیا حکم ہے اور اس کے اندر رہا جا وغیرہ نہیں ہے؟

۴-زید کہتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی میں اعزہ وقارب کو کھلانا درست نہیں ہے اور دلیل میں حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرہؓ رضی اللہ عنہا کی شادی کو پیش کرتا ہے تو کیا زید کا مذکورہ بیان اور استدلال صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اگر وہ شادی منکرات ورسومات سے پاک ہو اور طریق مسنون پر ہورہی ہو تو اس میں شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ نکاح میں شرکت باعث ثواب ہے۔

۲-بارات بری سے نکلا ہے یہ تحقیق اگر زید کی ہے تو اس کی دلیل مطلوب ہے۔ اور اگر مولانا تھانویؒ کی نقل کی ہے تو حوالہ درکار ہے، کیونکہ مولانا تھانویؒ نے بہشتی زیور یا اصلاح الرسوم میں شادی کے رسوم کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات کہیں نہیں ہے کہ بارات بری سے نکلا ہے اور یہ اہل ہنود کی رسم ہے، صرف اتنی بات ہے کہ ''بری'' بارات کا اصل مقصد اور اہم رکن ہے، جس کو اہل زمانہ نے خواہ مخواہ اپنے ذمہ لازم کرلیا اور اس سے پہلے یہ بات کہی ہے کہ کسی زمانے میں چور ڈاکو کے خطرے سے حفاظت کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی کہ دولہا کے ساتھ اور لوگ بھی رہیں، لہٰذا اس زمانے میں بھی باراتیوں کی تعداد ضرورت واستطاعت کی حد تک میں تو کوئی حرج نہیں ہے جس سے لڑکی والوں پر بار نہ پڑے اور جب

۱- صحیح بخاری مع فتح الباری ۸/ ۵۲۸ کتاب التفسیر، باب لاتدخلو بیوت النبی... الخ حدیث: ۴۷۹۴۔

ضرورت سے بڑھ کر ریا یا نمو کے لئے ہو یا غیر مشروع چیزوں کی شمولیت ہو تو ایسی بارات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳-چونکہ اس زمانہ میں شادیوں میں عام طور سے تکلفات کا التزام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، اگر لڑکی والے نہیں پوچھتے تو شکایت کی جاتی ہے، بعض جگہ اس سے بڑھ کر نیوتہ وغیرہ دینے کا رواج ہے جس میں بدلہ اور ریاء وافتخار کا پورا التزام کیا جاتا ہے یہ سب چیزیں ناجائز ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، ورنہ اعزہ واحباب کو حد شرع میں رہتے ہوئے کھانا کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کے وقت حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ دعوت کا انتظام کریں، اور اس دعوت کو دعوت مسنون ہونے کی خواہش ظاہر کی، لہٰذا زید کا اطعام طعام عند النکاح کے عدم جواز پر حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کو پیش کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے۔آپ ﷺ کے اس اطعام طعام سے دعوت ولیمہ ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی، اس واسطے کہ دعوت ولیمہ کی مدت شب زفاف کے بعد ہے، اور یہاں زفاف کے پہلے عند النکاح فوراً دعوت کا تذکرہ مل رہا ہے جیسا کہ اس روایت میں ہے:" **(قال علي)يا رسول الله ﷺ متى تبتني، قال: الثالثة إن شاء الله ثم دعا بلالا فقال: يا بلال إني زوجت ابنتي ابن عمي و أنا أحب أن يكون من سنة أمتي إطعام الطعام عند النكاح فأت الغنم فخذ شاة وأربعة امداد أو خمسة فاجعل في قصعة لعلي أجمع عليها المهاجرين والأنصار، فإذا فرغت فاذني بها فانطلق ففعل ما أمره ثم أتاه بقصعة فوضعها بين يديه فطعن رسول الله ﷺ في رأسها ثم قال: ادخل على الناس زفة زفة (الى قوله)وإني دافعها إليه (اى إلى علي)الآن إن شاء الله" (روى الحديث بطوله عبد الرزاق في مسنده بسنده)**"، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لازمی رجسٹریشن نکاح کا شرعی حکم:

حکومت یوپی نے مرکزی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ایک مرکزی نکاح رجسٹریشن ایکٹ بنادیا جائے تاکہ اس قانون کے مطابق پورے ملک میں ہونے والے نکاحوں کا اندراج وغیرہ مکمل ہوسکے، حکومت یوپی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نکاح کے رجسٹریشن کو ابھی تک حکومت نے لازمی قرار نہیں دیا ہے، جس کی وجہ سے حکومت عدلیہ اور عوام کے پاس کسی بھی نکاح کا موثق ریکارڈ کا موجود رہنا ضروری نہیں ہے، جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جب زن وشوہر میں تعلقات خراب ہوتے ہیں اور معاملات کی تحقیق کی نوبت آتی ہے تو اطمینان بخش گواہی نہیں مل پاتی، اکثر وبیشتر دین مہر کا مسئلہ بہت اختلافی

بن جاتا ہے اور صحیح طور پر دین مہر نہ گواہوں کو یاد رہتا ہے یا دوسرے حاضرین مجلس نکاح کو، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گواہ اکثر بوڑھے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد گواہی اور مہر کے ثبوت کا مسئلہ قانونی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ حکومت یوپی کا خیال ہے کہ ان دشواریوں کو دور کرنے اور نکاح کے مکمل ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے نکاح کے اندراج کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے، تا کہ ہر ایک نکاح کی تفصیلات کا معتمد علیہ وثیقہ موجود رہے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرکزی حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن ایکٹ ایسا بنایا جائے کہ رجسٹریشن کی حیثیت نکاح کے لئے شرط کی سی ہو جائے اور اس قانون سازی کے بعد ہونے والا وہی نکاح حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں معتبر ہو جس کے اندراجات حکومت کے قانون کے مطابق کرائے جاچکے ہوں اور نفاذ قانون کے بعد وہ سارے نکاح جو رجسٹریشن کے بغیر ہوں حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں غیر معتبر سمجھے جائیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کو ایک دوسرا مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن قانون اس طور پر بنایا جائے اگر اس قانون کے نفاذ کے بعد کوئی شخص رجسٹریشن کے بغیر نکاح کرلے تو وہ نکاح تو صحیح اور حکومت اور عدلیہ کے نزدیک قابل قبول ہوگا، لیکن رجسٹریشن نہ کرانے کو ایک جرم قرار دیا جائے اور جو بھی اس جرم کا مرتکب ہو اس کے لئے جرمانہ یا جیل کی سزا تجویز کردی جائے، گویا اس طور پر رجسٹریشن نہیں کرانے سے نکاح تو متاثر نہیں ہوگا، لیکن نکاح کی تفصیلات کے اندراج اور کسی بھی اٹھنے والے اختلاف کے لئے شہادت وثبوت کی خاطر رجسٹریشن کا نہ کرنا ایک مستقل جرم قرار دیا جائے گا جس کی سزا کی جاسکے گی، ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ نکاح کے رجسٹریشن کے سلسلہ میں حکومت یوپی کس انداز پر غور وفکر کررہی ہے اور حکومت میں موجودہ کچھ اور لوگوں کا نقطہ نظر کیا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ معاملہ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور فیصلہ کیا جائے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کالعدم سمجھا جائے تو فقہی لحاظ سے یہ رجسٹریشن قابل قبول ہوگا، رجسٹریشن کو اگر نکاح کیلئے شرط قرار نہیں بنایا جائے، لیکن شہادت اور ثبوت کی خاطر رجسٹریشن نہیں کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور اس کے لئے کوئی سزا تجویز کی جائے تو فقہی لحاظ سے ایسے رجسٹریشن کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مسئلہ کی نزاکت واہمیت کے پیش نظر آپ سے جلد سے جلد جواب دینے کی درخواست ہے ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں مسئلہ کی قانونی اور فقہی جہتوں پر غور ہوگا اس لئے براہ کرم ماہ ۲۵/نومبر تک اپنی رائے ضرور ارسال فرمائیں تاکہ فکر وبحث میں آپ کی گرانقدر رائے سے استفادہ کیا جاسکے۔

منت اللہ (جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خانقاہ مونگیر، ۶/محرم ۱۴۰۲ھ ۴/نومبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وباللہ التوفیق:

امور مستفسرہ کے متعلق عرض ہے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کالعدم سمجھا جائے تو شرعاً یہ صحیح نہیں اور نہ ایسی شرط شرعاً قابل قبول ہوسکتی ہے(۱)، اسی طرح رجسٹریشن نہ کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور رجسٹریشن نہ کرانے پر کوئی سزا یا جرمانہ تجویز کیا جائے تو شرعاً یہ بھی درست نہ ہوگا، بلکہ ہندوستان کی مسلم پسماندہ اقوام پر بے پناہ ظلم کا دروازہ بھی کھل جائے گا اور امن برباد ہوگا۔ فقط والسلام مع الاحترام

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۴۰۲ھ

نا قابل مجامعت لڑکی سے نکاح کا حکم:

ہندہ کو لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا تھا کہ یہ لڑکی شادی کے قابل نہیں ہے، پھر بھی اس کے ماں باپ نے اس کی شادی زید کے ساتھ کردی، جب ہندہ سسرال آئی تو راز کھلا کہ یہ صحبت کے لائق نہیں ہے وہ دوبارہ اپنے میکہ چلی گئی ہندہ کے باپ زید سے طلاق مانگتے ہیں اور زیورات وغیرہ زید کا لے لیا ہے، زید کے کسی سامان کو واپس نہیں کرنا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا حکم ہے کہ ان کا نکاح ہوا ہے یا کہ نہیں اگر نکاح کرنا صحیح ہے تو زید طلاق دینے میں گنہگار تو نہیں ہوگا، اگر نکاح درست نہیں ہے تو ایسی صورت میں ایسا نکاح پڑھنا پڑھانا اور مجلس کی شرکت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا ہے، اگر مقصد زوجیت کے قابل نہیں ہے تو طلاق دیدینے میں زید گنہگار نہ ہوگا، ہندہ کے والد کو چاہئے کہ زید کے زیورات وغیرہ سب واپس کردے، اس لئے کہ قصور ہندہ کی طرف سے ہے، بلکہ ہندہ کے والد کو مناسب ہے کہ مہر بھی معاف کرادے بالخصوص جب خود ہی طلاق چاہتا ہے یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ لیڈی ڈاکٹر نے لڑکی عورت (مؤنث ہی) سمجھ کر کہا ہے اور اگر لڑکی کی حقیقت میں مونث عورت نہ ہو بلکہ خنثی مشکل ہو تو اس کا حکم دوسرا ہوگا(۲)، لہٰذا لیڈی ڈاکٹر سے تحقیق کی جائے اگر وہ خنثی مشکل بتائے تو پھر لکھ کر حکم معلوم کیجئے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۸/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ

۱- ”النکاح ینعقد بالإیجاب والقبول بلفظین یعبر بھما عن الماضی“(ہدایہ ۲/ ۲۸۵)۔

۲- ”وفی العنایة محله المرأة لم یمنع من نکاحھا مانع شرعی فخرج الذکر والخنثی مطلقا“ (ردالمحتار ۴/ ۶۰، مکتبہ زکریا)۔

بلا اجازت نکاح ہوا اور لڑکی رخصت ہوکر سسرال چلی گئی تو کیا نکاح ہوگیا؟

ایک لڑکی جس کی عمر ۲۴ سال ہے، شادی ہوئے آٹھ سال ہوا، لیکن اب تک شوہر بیوی کا تعلق قائم نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ اپنی مرضی سے سسرال گئی ہے، ایک آدھ بار خلوت بھی ہوئی مگر وہ اس طرح کہ لڑکی اپنے میکے گھر کے اندر سوئی ہوئی تھی، لڑکا جھٹکے سے اندر داخل ہوگیا، جب لڑکی بیدار ہوئی تو چھپکا چھوری کر کے باہر بھاگ گئی لڑکا ناکامیاب رہ گیا، کبھی کبھار ماں باپ اور دیگر رشتہ دار کے دباؤ سے ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی، صرف دن بھر کے لئے رات کو اپنی ماں کے یہاں سوتی تھی، لیکن اب تک وہ جانے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عقد کے وقت مجھ سے اجازت لئے بغیر نکاح پڑھا دیا گیا ہے، لہذا میری شادی ہی نہیں ہوئی، میں جاؤں ہی کیوں لڑکا جس سے شادی ہوئی ہے وہ لڑکی کا ممیرا بھائی ہے اور ایک ہی آنگن میں رہتا ہے، صرف کمرہ الگ الگ ہے، لڑکی شادی کے قبل ہی سے یعنی جب سے شادی کی بات چلی اشارے کنائے سے اپنی نارضامندی ظاہر کرتی رہی ہے کہ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کروں گی، اس کے ولی اور تمام رشتہ دار بھی اس بات کو دیکھ رہے تھے، لیکن اس کے ماں باپ نے زبردستی شادی کردی ہے، اب لڑکی جانے سے برابر انکار کرتی ہے اور لڑکی پڑھی لکھی ہے اور لڑکا پڑھا ہوا تو ہے لیکن سادہ سودا ہے اور لڑکی شادی کے دن بھی سسرال نہیں گئی، یعنی خلوت اس وقت بھی نہیں ہوئی، اب لڑکا رخصتی کے لئے کہتا ہے، لیکن وہ نہیں جاتی اور انکار کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے میں نہیں جاؤنگی، اس نے شوہر کے یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کی ہے، والدین کے دھمکانے سے بھی ایک آدھ مرتبہ استعمال کرلیا، لڑکا طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، ایسی صورت میں آپ کیا کہتے ہیں لڑکی اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال اس وقت لڑکی کی عمر ۲۴ برس ہے، ۸ سال قبل شادی ہوئی تو بوقت نکاح ۱۶ سال کی بالغہ غیر شادی شدہ باکرہ تھی۔ اور نکاح باپ نے کیا۔

لہذا صورت مسئولہ میں بوقت عقد نکاح اجازت لیتے ہوئے لڑکی نے سکوت کیا تھا اس وقت انکار نہیں کیا تھا یا انکار کیا تھا مگر باپ نے زور زبردستی نکاح پڑھا دیا تھا، اس وقت انکار نہیں کیا اور رخصت کردی گئی اور وہ خاموشی کے ساتھ رخصت ہوگئی ان دونوں صورتوں میں نکاح ہوگیا ہے لڑکی کا شادی سے پہلے بوقت تذکرہ اپنی نارضامندی کا ظاہر کرنا اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔

”لوجود علة صحة النكاح وهي الرضاء أو الإكراه كما صرح به الشامي حيث قال: إذ حقيقة الرضاء غير مشروطة في النكاح لصحته في الاكراه ثم قال: عباراتهم مطلقة في ان نكاح المكره صحيح كطلاقه، ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة“ اور اگر بوقت عقد نکاح لڑکی سے اجازت ہی نہیں لی اور نہ لڑکی کو اسوقت علم ہی ہوا تو اس صورت میں یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف تھا، اگر علم ہونے پر رد کردیتی تو رد ہوجاتا لیکن لڑکی نے ایسا نہیں کیا ہے جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کبھی کبھار (متعدد بار) ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی گو با دل نخواستہ ہی گئی اور خواہ شب میں میکے آکر سوتی مگر دن میں پھر چلی گئی جیسا کہ متعدد دن کے لئے رخصتی میں جانے کی صورت میں ظاہر ہے اور گو ایک ہی مکان رہائش میں یہ صورت پیش آئی پس اس صورت میں تسلیم و اجازت ثابت ہوگئی اور نکاح نافذ ہوگیا ہے اور خاص کر جب لڑکی اتنی تمیزی ہے کہ شوہر نے اس کے ہوتے ہوئے کئی بار خلوت کیا اور چھپکا چھوری کر کے کمرہ سے باہر بھاگ گئی اگر چاہتی تو صاف انکار کردیتی اور سسرال بھی ہرگز نہ جاتی اور اگر باپ کے ڈر سے ایک دفعہ جاتی بھی تو پھر شب میکہ میں گذارنے کے بعد دوبارہ سسرال نہ جاتی اور میکہ کا کپڑا وغیرہ استعمال نہ کرتی وغیرہ وغیرہ یہ سب بہت سے بہت اس امر پر قرینہ ہیں کہ وہ اس نکاح سے خوش نہیں اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، صحت نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

لڑکی اگر اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، اپنا دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہے تو بلا وجہ شرعی ایسا کرنا سخت گناہ اور باعث عذاب خداوندی ہے، ایسی عورت پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں اور سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پڑھی لکھی ہے، ایک عزت دار گھرانے کی ہے، چال چلن بھی اچھا ہے تو شاید مسئلہ مسائل بھی جانتی ہو پھر اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اسی شوہر کے ساتھ رہکر اسلامی زندگی گذارنی چاہئے اور اگر وہ شرعی وجہ کے ساتھ تفریق کرانا چاہتی ہے تو شوہر سے طلاق حاصل کر لے یا مہر معاف کر کے یا کچھ اور بھی مال دینا پڑے دیکر خلع کرالے اور عدت (تین حیض) گذار کر اپنا دوسرا نکاح کرے بغیر اس کے نہیں، اور جب صورت حال ایسی ہے تو شوہر کے لئے خود ہی مناسب ہے کہ وہ اس کو طلاق دیکر اپنی دوسری شادی حسب منشاء کرے وہ اس میں گنہگار نہ ہوگا، ورنہ موجودہ صورت میں مقصد ازدواج (خوشگوار زندگی) نصیب ہونا دشوار ہے، علاوہ ازیں دیگر طرح طرح کے مفاسد میں ابتلاء کا سخت اندیشہ ہے جس سے بچنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی عمر کیا ہے؟

ایک پندرہ سالہ لڑکی بالغ ہے یا نابالغ ہے شرعاً و قانوناً لڑکی کس عمر میں اور لڑکا کس عمر میں بالغ ہوتا ہے۔

بالغہ ہونے کے بعد نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے:

۱۔ ایک یتیم لڑکی جسکا حقیقی باپ نہیں سوتیلا ہے اب لڑکی کا جائز وارث لڑکی کا حقیقی بھائی ہے یا چچا یا حقیقی ماں کیا بالغہ ہونے کی صورت میں کون لڑکی مذکور کے عقد کی اجازت دے گا اور اس کے بغیر اذن کے نکاح نہ ہوگا یعنی وارث کی اجازت کی کیا بالغہ ہونے پر بھی ضرورت پڑے گی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ اگر پندرہ سال کی ہو چکی ہے تو بالغ ہے معیار بلوغت شریعت مطہرہ میں یہ ہے کہ لڑکی کو اگر پندرہ سال سے پہلے حیض آجائے یا حمل ٹھہر جائے تو پندرہ سال کی عمر سے پہلے بھی بالغ قرار دی جائے گی ورنہ پندرہ سال پورے ہونے پر حکم بلوغت ہو جائے گا، اور لڑکے (مذکر) کو اگر پندرہ سال کی عمر سے قبل احتلام ہو جائے یا عورت کو حاملہ بنادے تو پندرہ سال کی عمر سے قبل بھی بالغ قرار دیں گے ورنہ پندرہ سال ہو چکنے پر بالغ شمار ہوگا، ''**وبلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال والجارية بالاحتلام والحيض والحبل......فإن لم يوجد فيهما شئ فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى**''(۱)۔

۲۔ اس یتیم لڑکی کا ولی عقد نکاح کے لئے اسکا حقیقی بھائی ہوگا، بھائی کے ہوتے ہوئے چچا یا ماں نہ ہوگی، لڑکی کے بالغ ہو جانے کے بعد غیر کفو میں یا کفوء میں مہر مثل سے کم پر نکاح تو منعقد و صحیح ہو جائے گا مگر اولیاء کو حق ہوگا کہ وہ فسخ نکاح کرالیں اور کفو میں اور مہر مثل کے مطابق نکاح کر لینے میں ولی سے نکاح کی اجازت لینا ضروری نہیں ہے خود کر سکتی ہے، ''**فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولي**'' (۲)، لیکن اجازت لے لینا بہتر ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عنہ ۱۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

۱- الدر المختار کتاب الحجر ۹/ ۲۲۵-۲۲۶۔
۲- الدر المختار ۴/ ۱۵۵۔

لڑکے نے کہا: میں نے تم سے نکاح کرلیا لڑکی نے کہا: منظور ہے تو کیا نکاح ہوگیا؟

زید نے ہندہ کو دو بالغ شخص صحیح العقل صوم وصلوٰۃ متشرع مسلم کے سامنے کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا تمکو منظور ہے، ہندہ جو ایک بیوہ عورت تھی اس نے زبانی اقرار کرلیا کہ مجھے منظور ہے، اسی طرح تین بار زبان سے اقرار کرلیا ہے، یہ واقعہ ان دونوں نے ارادۃ اور حقیقۃ کیا ہے تو کیا اس فعل سے از روئے شرع ان دونوں کا نکاح صحیح ہوجائے گا۔ بینوا توجروا

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں بشرط صحت سوال اگر اس بیوہ کی عدت وفات ۴ ماہ دس دن گذر چکی تھی تو نکاح شرعاً منعقد اور لازم ہوگیا اور دونوں عنداللہ اور عندالشرع میاں بیوی ہوگئے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود غفی عنہ

نکاح صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے:

زید اور ہندہ زن وشوہر شرعی ہیں زید کا بیان ہے کہ ہندہ بدچلن ہے، چنانچہ ایک رشتہ کے بھائی سے پکڑی گئی، بدنام ہوگئی تھی جس سے زید لاعلم تھا ہندہ اس عمل کو نباہ کے لئے متعلقین ہندہ پدر وغیرہ نے زید کو ورغلا کر اور اکھترا ۷۔ روپیہ کا لالچ جوڑے کا دیکر ہندہ کی شادی زید سے کردی اور کسی قسم کا جہیز وغیرہ نہیں دیا گیا ہے، زید درس وتدریس کا کام کرتا ہے، پدر ہندہ اپنی سابقہ بیوی کے فوت ہونے پر بیوہ سے دوسرا عقد کرلیا، پدر ہندہ ہندہ کے ساتھ اپنی سابقہ بیوی کے بچے خالدہ اور فرزند نابالغ کو بھی بھیجوا دیا ہے، اب زید اس ہندہ کو طلاق دیکر خالدہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو عندالشرع کرسکتا ہے یا کہ نہیں اور چند گواہوں کی موجودگی میں زید نے ہندہ کو طلاق دیدی ہے اور اس طرح چند گواہوں کی موجودگی میں عقد بھی خالدہ سے کرلیا ہے، لیکن یہ عقد سرکاری کاغذات میں درج نہیں ہے تو کیا یہ عقد عندالشرع درست ہے؟

۱- ”وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الآخر وشرط سماع كل من العاقدين لفظ الآخر ليتحقق رضاهما وشرط حضور شاهدين حرين او حر وحرتين مكلفين سامعين قولهما معاً“ (الدر مع الرد ۹/ ۶۹، ۹۱)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید نے کم ازکم دوگواہوں کے سامنے ہندہ کو واقعی طلاق دینے کے بعد اس کی عدت گذرنے کے بعد خالدہ سے نکاح کیا ہےتو خواہ سرکاری کاغذات میں درج نہیں کرایا ہے، یہ نکاح خالدہ کا شرعاً درست اور جائز ہے اور خالدہ اور زید دونوں زن وشوہر کی طرح رہ سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا یہ کہنا کہ مسئلہ ملاؤں کی ڈھونگ ہے، سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا:

مریم نے شوہر زید سے معلوم کیا کہ چچازاد بھائی کا نکاح چچازاد بہن کیساتھ درست ہے؟ زید نے جواب دیا کہ درست ہے، مریم نے کہا کہ آج دنیا میں نئے نئے مسئلہ چال گئے ہیں جو سب ملاؤں کی ڈھونگ ہیں، مریم کا یہ عقیدہ اس کے شعور کے بعد ہی سے ہےتو مریم اور زید کا نکاح درست ہوا کہ نہیں؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

نکاح قائم اور درست ہے یہ جملہ شریعت سے انکار نہیں ہے بلکہ اپنی جہالت کیوجہ سے اس مسئلہ کو غلط مولویوں کا ڈھکوسلہ بازی سمجھتی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۵/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح:

بالغ لڑکی کا نکاح بلا اس کے دریافت کئے اور اجازت لئے بغیر گواہ کے جائز ہوا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر دوگواہوں کے کوئی نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے (۱)، اور گواہوں کے ساتھ بالغ لڑکی کا نکاح اس سے بغیر پوچھے

۱- ''وشرط حضور شاهدين'' (الدرمع الرد ۳/ ۸۷)۔

پڑھائے تو اس کی اجازت پر موقوف ہوگا (۱)، اگر چاہے تو قبول کرے بشرطیکہ کفو میں ہو اور اگر غیر کفو میں ہوا ہو تو دو گواہوں کے سامنے بغیر اجازت ولی اقرب صحیح نہیں ہوتا ہے خواہ لڑکی بغیر اجازت ولی خود اجازت کیوں نہ دیدے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

زانیہ کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عورت جو شادی شدہ ہے، جس کا دماغی توازن کافی عرصہ سے ٹھیک نہیں ہے، جس کے تین بچے بھی ہیں اس کے ساتھ ایک غیر مرد نے زنا کرلیا ہے، جس کی شاہد ایک اور عورت ہے اور وہ شادی شدہ عورت خود بھی اقرار کرتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اسے اپنے نکاح میں رکھ لیا جاوے یا آزاد کردیا جاوے، اگر میں نے اپنے نکاح میں اس کو رکھ لیا تو میں گنہگار نہ ہوں گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے (۳)، البتہ ایک حیض آنے تک اس کے پاس نہ جائے اس کو نکاح میں رکھ لینے سے شوہر پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

عمر دراز عورت سے نکاح:

کسی بڑی عمر کی عورت سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں! کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

۱- ’’ولاتجبر البالغة البکر علی النکاح لانقطاع الولایة بالبلوغ‘‘ (الدر مع الرد ۴/ ۱۵۹)۔

۲- دیکھئے ردالمحتار ۴/ ۲۰۹۔

۳- ’’لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرة‘‘ (الدرالمختار ۴/ ۱۴۴ باب المحرمات)۔

خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیکر پھر آٹھ روز کے اندر نکاح کرلیا صحیح ہوا یا نہیں؟

۱۔ ایک شخص نے رخصتی سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دی اور آٹھ روز کے اندر پھر نکاح ہوگیا ہے، تو نکاح ہوا یا کہ نہیں؟ (اسی مرد سے)۔

۲۔ اس کے بعد مرد نے پھر ساس کے سامنے طلاق دی اور پانچ آدمیوں کے سامنے مرد نے خود بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی جب لڑکی کے نکاح کے متعلق دوسری جگہ بات ہونے لگی تو مرد کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے۔

۳۔ وہ شخص اپنی سسرال میں آتا جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے رہتا تھا لیکن خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہیں آئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(او ۲ و ۳) اگر میاں بیوی میں خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تھی اور تین طلاق تین لفظ سے دی تھی تو ایک طلاق بائن سے عورت مطلقہ ہوئی اور دوسرا نکاح جو محض آٹھ روز بعد ہوا وہ صحیح ہوا اور پھر جب مرد نے اپنی ساس کے سامنے خلوۃ صحیحہ کرنے سے پہلے پہلے طلاق دیدی تو عورت طلاق بائن سے ہی مطلقہ ہوگئی اور چونکہ ابھی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس پر عدت بھی نہیں ہے، بلکہ جب چاہے کسی دوسرے مرد سے اپنا نکاح کرسکتی ہے اور مرد کا یہ کہنا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے صحیح نہیں ہے، اگر یہ دونوں آپس میں تعلق زن وشوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سے جدید نکاح کرسکتے ہیں حلالہ کی ضرورت نہیں اور اگر تینوں طلاق بیک لفظ ثلاثا یا یں لفظ دی تھیں کہ میں نے تجھ کو تین طلاق دی تو تینوں طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی اور دوسرا نکاح صحیح نہیں ہوا ہے اور اس صورت میں بھی عورت اپنا دوسرا نکاح جس مرد سے چاہے کرسکتی ہے، شوہر اول کا خلل ڈالنا جائز نہ ہوگا اور اس صورت میں (تین طلاق والی) عورت بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح اور جائز نہ ہوگی (۱)۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دار العلوم دیوبند

۱- ”إذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن عليها فإن فرق الطلاق بانت بالأولىٰ ولم تقع الثانية والثالثة“ (ہندیہ ۱/ ۳۷۳)۔

کسی کو محض بیٹی کہنے سے حقیقتاً وہ بیٹی نہ ہوگی اور نکاح اس سے درست ہوگا:

زید کی ممانی کی بھتیجی کوثر کی لڑکی بانو کو زید نے اپنے چھوٹے بھائی سلیم کی شادی کے لئے منتخب کر کے سلیم اور بانو کے رشتہ کا پیغام دے ڈالا اور یہ بھی کہا کہ اگر لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرلیں تو رشتہ کرلیا جائے۔ زید اپنے ماموں کے یہاں پہلے سے دس سال سے آتا جاتا ہے، جب کہ زید کی والدہ وماموں ایک دوسرے سے کبھی ملنے جلنے نہیں جاتے۔

کیونکہ زید کی بیوی کی بیماری اور بچے زندہ نہ رہنے کی وجہ سے اور سلیم کے چھوٹا بھائی ہونے کے ناطہ زید سلیم سے محبت کرتا ہے، لہذا زید نے سلیم اور بانو کے رشتہ کا ذکر کرتے وقت بات چیت کے درمیان یہ کہا کہ اگر بانو کا سلیم سے رشتہ ہوا تو بانو ایک رشتہ سے بھانجی ہونے کے ناطہ بیٹی کے برابر ہے اور پھر اگر چھوٹے بھائی کی دلہن بن گئی تو اس ناطے بھی بیٹی کے برابر ہوگی، اور کیونکہ میری اولاد نہیں ہے، اس لئے اس کی بیٹی کی طرح شادی کروں گا اور بانو کو بیٹی کہہ کر پکارتا اور بات چیت کرنا شروع کردیا، بانو کو سلیم نے دیکھنے کے بعد ناپسند کردیا اور اس پیغام کے چلنے کے دوران صرف عرصہ ۱/۲ ۱۱ ماہ میں بانو وزید ایک دوسرے کو اتنا پسند کرنے لگے کہ ایک دوسرے کی علیحدگی برداشت نہیں کرتے ہیں۔ زید کی بیوی صفیہ پچھلے دوسال سے زید کو دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہے اور کیونکہ صفیہ لگاتار بیمار رہتی ہے اور اولاد بھی زندہ نہیں رہتی، لہذا زید نے اولاد کی خواہش کے ساتھ اپنی جسمانی ضروریات کے لئے اپنی دوسری شادی کے لئے تیاری کررکھی ہے، بانو کو جب کہ سلیم نے ناپسند کردیا ہے اور بانو کی زید کے ساتھ بے تکلفی اور محبت کو دیکھ کر زید کی بیوی صفیہ نے زید کو مشورہ دیا کہ جب دوسری شادی ضروری ہے اور آپ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو بانو سے ہی نکاح کرلیں، بانو کا جھکاؤ بھی زید کی طرف ہے۔ مگر زید کی ممانی فاطمہ کا کہنا ہے کہ جب زید نے بانو کو بیٹی کہا ہے تو بیٹی سے نکاح حرام ہے۔

ان سب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے زید کا بانو سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ وہ بھی اس صورت میں کہ زید نے اس بانو کو بار بار بھائی، بہن اور بار بار بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے اور خطوں میں بیٹی لکھا ہے اور بانو کا اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے رشتہ کرنا چاہا ہے، سلیم کے انکار کا سبب بھی یہی لگتا ہے کہ زید کی بانو سے بے حد بے تکلفی ہے۔ اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور احکام خداوندی کا کیا فیصلہ ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید کا نکاح بلاکراہت اور بلاشبہ جائز ہے، بلکہ دونوں کی محبت کا یہ حال ہے تو یہ نکاح کردینا بہتر

ہے۔فاطمہ کا یہ کہنا کہ زید کا نکاح بانو سے حرام ہے، اس لئے کہ اس کو بیٹی کہہ چکا ہے بالکل غلط ہے اور شریعت کے حکم ومنشاء کے خلاف ہے، کسی کو منہ بولا بیٹا کہہ دینے سے یا کسی کو بیٹی یا بھانجی یا بہن وغیرہ کہہ دینے سے حقیقۃ وہ بیٹا، یا بیٹی یا بہن نہیں ہو جاتا ہے۔اس سے نہ تو ترکہ کا استحقاق ہوتا ہے اور نہ نکاح ومصاہرت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔چنانچہ اکیسویں پارہ سورۂ احزاب کے پہلے ہی رکوع میں یہ آیتیں نازل فرمائی ہیں: **قال اللہ تعالیٰ: ''وماجعل أزواجکم اللئی تظھرون منھن أمھتکم وماجعل أدعیاء کم أبناء کم ذالکم قولکم بأفواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل أدعوھم لآبائھم ھو أقسط عند اللہ فان لم تعلموا آبائھم فإخوانکم فی الدین''** (۱)۔

پس فاطمہ کو بہن، زید کو بھائی، بانو کو بیٹی وغیرہ کہنے سے ہرگز اس نکاح کے جواز میں اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ کیا جائے، اسی طرح کسی قسم کا اور کوئی شبہ ان دنیاوی معاملات ورسوم کے تعلق سے ہرگز نہ کیا جائے۔

نوٹ: صفیہ کا مشورہ بالکل درست ہے، زید کو بانو سے نکاح کرلینا انسب وبہتر ہے۔بانو کو بھانجی، بیٹی وغیرہ کہنے سے یا لکھنے سے یہ نکاح ہرگز مکروہ بھی نہ ہوگا۔تفصیلی جواب اوپر صفحہ پر گزرچکا ہے وہ دیکھئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۹۸ ۱۳ھ

حاملہ بالزنا سے نکاح اور اس کے پڑھانے والے کا حکم:

ہندہ زنا سے حاملہ ہوگئی اور اپنے حمل کا الزام تین آدمیوں پر لگائی، انکو چھوڑ کر ہندہ کا نکاح اور آدمیوں سے پڑھوادیا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ نکاح پڑھاتے وقت امام نے دولھا سے دریافت کیا کہ یہ حمل تمہارا ہے دولھا نے علیحدگی میں امام صاحب سے کہا ہاں میرا ہے، امام نے ایک زانی اور زانیہ کا نکاح پڑھوادیا ہے۔

ان کو کوئی شرعی سزا وغیرہ نہیں دی گئی ہے، کیا امام صاحب کا یہ فعل گناہ ہے کہ نہیں اگر امام کا یہ فعل گناہ ہے تو امام کے لئے شرعی کیا حکم ہے، کیا یہ نکاح صحیح ہے یا کہ نہیں اور امام کی امامت درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں ہندہ کا جو نکاح پڑھادیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے، اگر یہ حمل زنا کا اس شخص کا ہے جس سے نکاح ہوا تو وضع حمل سے پہلے بھی ہندہ کے پاس وہ جاسکتا ہے اور اگر حمل اس کا نہیں ہے تو وضع حمل سے قبل ہندہ کے پاس اس نکاح

۱-　　سورۂ احزاب: ۴-۵۔

پڑھادینے سے نکاح پڑھانے والے یا اس کے گواہان پرکوئی شرعی گرفت نہیں ہے، بلکہ اس نکاح پڑھادینے سے ایک باب زنا کا انسداد ہوگیا ہے (۱)،کوئی گرفت نہیں جب تک کہ چارعینی شہادت یا خود انکو اقرار نہ ہواور یہاں دونوں باتیں نہیں اوراب اگر وہ سب اقرار بھی کریں تو نکاح میں فرق نہیں آئے گا، زانی اورزانیہ پر لازم ہے کہ اللہ رب العزت کے سامنے نہایت ندامت اورعجز ونیاز کے ساتھ توبہ واستغفاراورآئندہ اس گناہ کے مرتکب نہ ہونے کا عہد کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اورآئندہ اپنا رویہ بطورطریقہ صحیح رکھیں، حکومت اسلامی ہوتو ایسے مجرم کی سزا شادی شدہ ہوتو سنگسار کرڈالنا ہے ورنہ سو کوڑے لگانا، مگر یہ حق محض حکومت کو ہے دوسروں کونہیں، لہذا ایسی صورت میں توبہ واستغفاربدرگاہ رب العزت ضروری ہے مجمع عام توبہ واستغفار کے لئے ضروری نہیں ہے،عوام کیلئے ضروری ہے کہ وہ بھی خواہانہ اورناصحانہ انداز سے دونوں کی اصلاح کی اس طرح کوشش کریں کہ وہ دونوں اپنے گذشتہ گناہ سے واقعی نادم وتائب ہوکرسیدھے راستہ پرجم جائیں اوربس۔

عوام الناس کوحدشرع کے اندر رہنا چاہئے جذبات سے مشتعل ہوکر حد سے تجاوزنہیں کرنا چاہئے، ہاں اگر یہ نکاح نہ ہوگیا ہوتا بلکہ وہ سب اس زنا کے مرتکب رہتے تو عوام کوحق ہوتا کہ جہاں تک ممکن ہو بلاکسی فساد اورفتنہ کے دباؤ ڈالکر باز رکھنے کی کوشش کرتے۔اب سب مرحلے ختم ہوگئے اب کسی پرکوئی حکم نہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی

حاملہ بالزنا سے نکاح اور بچہ کے نسب سے متعلق:

ایک شخص مرتکب زنا ہے اوراس سے علوق ہوگیا ہے، اہل خاندان نے مذکورہ شخص کومجبورکرکے نکاح کردیا ہے، نکاح رضامندی سے ہواہے،طرفین رضامند ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحالت حمل نکاح صحیح ہوا ہے کہ نہیں یہ بات ثابت ہے کہ اسی آدمی کاحمل ہے،عزت کے واسطے اہل خاندان نے جلدی سے نکاح کردیا ہے، یہ نکاح صحیح ہواہے کہ نہیں اورلڑکا اس کے زانی باپ سے ثابت ہوگا کہ نہیں اورلڑکے کوحرامی کہنا کیسا ہے؟

شفیق احمد (پوسٹ بکس ۲۰۲، الخبر سعودیہ عربیہ)

۱- ”وقال أبو حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى: يجوز ان يتزوج امرأة حاملا من الزنا ولايطأها حتى تضع ..... وفي مجموع النوازل: اذا تزوج امرأة قد زنا هو بها وظهر بها حمل فالنكاح جائز عند الكل وله ان يطأها عند الكل“ (الہندیہ ۲۸۰/۳ دارالکتاب دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) في الدر المختار على رد المحتار: "صح نكاح حبلى من زنا"(۱)۔

(۲) "وتحته في الرد أي عندهما وقال أبويوسف لا يصح والفتوى على قولهما"(۲)۔

(۳) "و في صفحة (۲۹۲) تحته في الدر: لو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقا" (۳)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جب کنواری غیر شادی شدہ کو حمل ٹھہر جائے تو چونکہ وہ یقیناً زنا کا حمل ہوگا اور ایسی حالت میں انکا نکاح کردینا بلاشبہ جائز ودرست ہوگا اور وہ نکاح صحیح ہوگا مفتی بقول یہی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کا حمل ہے اگر اسی کے ساتھ نکاح ہوجائے تو وہ اس کے ساتھ صحبت قربت بھی کرسکتا ہے اور میاں بیوی کی طرح رہ بھی سکتا ہے، پھر اس نکاح سے فقط چھ ماہ پورے ہونے پر بھی بچہ پیدا ہوگا تو وہ بھی حلال اور ثابت النسب ہوجائے گا اور اس کو حرامی کہنا جائز نہ ہوگا اور باپ ودادا وغیرہ کے ترکہ سے وراثت بھی پائے گا۔

اگر نکاح کے بعد چھ ماہ گذرنے سے پہلے ہی وہ حمل پیدا ہوجائے اور شوہر کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے تو اس کو ثابت النسب نہیں قرار دیں گے بلکہ اس کو منسوب الی امہ کہیں گے اور باپ دادا سے وراثت بھی نہ پائے گا بلکہ صرف ماں نانی کی جانب سے وراثت پائے گا۔

اور اگر چھ ماہ کے اندر ہی پیدا ہوا مگر باپ نے اپنا لڑکا ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنا ہی لڑکا بتایا تو اس کو اس صورت میں بھی ثابت النسب ہی کہا جائے گا اور منسوب الی امہ نہیں کہیں گے، البتہ باپ دادا سے وراثت نہیں پائے گا باقی حرامی وغیرہ اس انداز سے کہنا جس میں طنز یا توہین کا یا ایذا رسانی کا پہلو نکلے جائز نہ ہوگا، بلکہ منع رہے گا (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۲/۲۴ھ

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۱۴۱/۴۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۱۴۱/۴۔

۳- الدر المختار مع رد المحتار ۱۴۲/۴۔

۴- "ولو زنى بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدت، إن جاءت به لستة أشهر فصاعداً ثبت نسبه، وإن جاءت به لأقل من ستة أشهر لم يثبت نسبه إلا أن يدعيه ولم يقل إنه من الزنا، أما إن قال إنه مني من الزنا فلا يثبت نسبه ولا يرث منه كذا في الينابيع"(فتاوی عالمگیریہ ۵۴۰/۱)۔

جس لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے شادی کرلی ہو اس سے تعلق رکھنا:

آج سے لگ بھگ دس ۱۰/بارہ سال قبل میری ایک لڑکی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہماری سخت مخالفت اور اظہار ناراضامندی کے باوجود ایک غیر مسلم لڑکے سے شادی سول میرج کر کے مجھ کو اور پورے خاندان کو بڑی پریشانی اور بدنامی میں ڈال دی ہے، اگر چہ لڑکی اپنے مذہب پر قائم ہے اس کا خاوند اس کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہ کر زندگی بسر کرسکتی ہے، لڑکی کی یہ حرکت اپنے مذہب میں ناجائز اور زنا ہے، اس وجہ سے ہم نے لڑکی کے ساتھ چند سال سے قطع تعلق کرلیا ہے، تاکہ لڑکی راہ راست پر آجائے اور لڑکے کے ساتھ ازدواجی رشتہ توڑ دے، اب ان دونوں کے درمیان تین چار بچے ہیں، اس لئے بظاہر اب ان دونوں کا بیاجائز رشتہ ٹوٹنا کچھ ناممکن سا ہے۔

اس دوران لڑکی ہمارے پاس چلی آئی اور یہ خواہش ظاہر کرتی رہی کہ ہم اس کے ساتھ کچھ تعلقات رکھیں، اب ہمارے سامنے خدشہ ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ قطع تعلق کر رکھا ہے اور اس کو کسی صورت میں اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دی تو تنگ آکر یا مجبور ہو کر تبدیل مذہب کر کے پوری طرح مرتد نہ ہوجائے، اس صورت میں ہمارے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوسکتا ہے ہمارے چند رشتہ دار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ لڑکی کے ساتھ قطع تعلق کرو اس کے ساتھ تعلق رکھنا اور اس کو اپنے گھر آنے کی اجازت دینا شرعا ناجائز ہے، میں اور میرے گھر کے دوسرے افراد ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں، اس وقت ہمارا لڑکی کے ساتھ تعلق رکھنا صرف مجبوری سے تالیف قلب کے پیش نظر ہے ورنہ لڑکی کی موجودہ زندگی کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں۔

حاجی عبدالحق

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندوستان چونکہ دار غیر اسلامی ہے، اس لئے مجبوری ومعذوری کے درجہ میں یہ حکم شرعا دیا جائے گا کہ لڑکی اور لڑکی والے انتہائی کوشش وسعی بذریعہ ترغیب وتحریض کریں کہ لڑکا مسلمان ہو کر شرعی ضابطہ کے مطابق نکاح کرلے جب تو اس کی اصلاح وتبلیغ کے درجہ میں تعلق ضروری رکھنے کی اجازت ہوگی اور اصلی بات پھر بھی یہی ہے کہ لڑکی اپنے پیدائش شدہ بچوں کو بھی قربان کر کے اگر وہ شخص مسلمان نہ ہو تو اس سے علیحدہ ہوجائے اور بالآخر جب اس کے مسلمان ہونے سے مایوسی ہوجائے تو لڑکی کے لئے یہی حکم متعین رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمد ظہیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۱/۱۴۰۲ھ

بیوہ ممانی سے نکاح:

زید کا سگا بھانجا محمود بعد وفات زید محمود کا نکاح سائرہ سے ہوسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال میں مراد سائرہ سے اگر زید کی بیوی ہے تو سائرہ محمود کی ممانی ہوئی اور اس سے زید کے انتقال کے بعد محمود کا نکاح ہوسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے نکاح کیا تو نکاح اور اولاد کا حکم:

ہندہ نے ایک ہندو مرد کے ساتھ شادی کی ہے اور اس سے اس کو اولاد بھی ہوئی ہے، اب ان اولاد سے کوئی مرجاوے تو اس کی تجہیز و تکفین مسلمانوں جیسی ہو یا کہ نہیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرسکتے ہیں یا نہیں اور ان بچوں کی شادی مسلمان کے یہاں کرسکتے ہیں یا کہ نہیں وہ عورت اب تک اسلام پر ہی قائم ہے۔

حسن شہاب الدین

الجواب وباللہ التوفیق:

مسلمان عورت کے مسلمان رہتے ہوئے اور ہندو مرد کے ہندو رہتے ہوئے شادی کیسی یہ کہئے کہ ناجائز تعلق ہوا، شادی کے عنوان سے زنا ہوتا رہا ہے اور زنا سے اولادیں پیدا ہوئیں، بہرحال یہ سب اولادیں ماں کے تابع ہوکر مسلمان شمار ہوں گی اور مسلمانوں کی طرح مرنے جینے شادی بیاہ تمام امور میں ان کے ساتھ معاملہ کیا جاوے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ ۲۹/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

۱- "ذمی تزوج مسلمۃ یفرق" (الہندیہ ۱/۳۳۷) "والولد یتبع خیر الابوین دینا" (الدرمع الرد ۴/۳۷۰ مکتبہ زکریا) وقال الشامی: یشعر التعبیر بالابوین ولد الزنا (ردالمحتار ۴/۳۷۰)۔

۱-بیوی کے لڑکے کا نکاح اپنی لڑکی سے:

اپنی زوجہ کے بیٹے سے اپنی لڑکی کا عقد نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟

۲-مطلقہ بائنہ سے نکاح:

جس عورت کو طلاق بائنہ دی گئی ہو ان کو اپنے نکاح میں واپس لانے کے لئے نکاح کی ضرورت ہے کیا؟ اب دوسری مرتبہ مہر دینا پڑے گا یا نہیں۔

ابراہیم بن محمد صالح جی افریقی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اپنی زوجہ کا لڑکا جو دوسرے شوہر سے ہو اور اس کو ساتھ لیکر آئے اس کا نکاح اپنی اس لڑکی سے جو دوسری بیوی سے ہو جائز ہے۔

قرآن پاک پ ۴ کے اخیر میں مذکور ہے کہ صرف ۱۴ ر رشتے ایسے ہیں جن سے نکاح حرام ہے اور اس کے علاوہ جو رشتے ہیں ان سے نکاح حلال ہے چنانچہ اخیر آیت میں ارشاد ہے: **"واحل لکم ما وراء ذلکم"**، چونکہ یہ رشتہ ان (۱۴) رشتوں کے علاوہ ہے، اس لئے بلاشبہ جائز ہے(۱)۔

۲- اپنی جس عورت کو صرف طلاق بائنہ دیا ہو تین طلاق نہ دیا ہو، اس کو پھر اپنے نکاح میں لانا ہو تو محض عورت کی اجازت و مرضی سے خواہ عدت کے اندر رہو یا عدت کے بعد بغیر حلالہ کے صرف دو گواہوں کے سامنے جدید نکاح پڑھا کر لا سکتا ہے، البتہ اس جدید نکاح کا مہر جو آپس کے مشورے سے بوقت نکاح طے ہو جائے دینا ہوگا،" **هكذا في الرد والبحر**

۱- "حرمت عليكم أمهاتكم وبناتكم وأخواتكم وعماتكم وخالاتكم وبنات الأخ وبنات الأخت وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة وأمهات نسائكم وربائبكم اللاتي في حجوركم من نسائكم اللاتي دخلتم بهن فإن لم تكونوا دخلتم بهن فلا جناح عليكم وحلائل أبنائكم الذين من أصلابكم وأن تجمعوا بين الأختين إلا ما قد سلف إن الله كان غفوراً رحيماً، والمحصنات من النساء إلا ما ملكت أيمانكم كتاب الله عليكم وأحل لكم ما وراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم محصنين غير مسافحين، فما استمتعتم به منهن فآتوهن أجورهن فريضة ولا جناح عليكم فيما تراضيتم به من بعد الفريضة إن الله كان عليماً حكيماً" (سورہ نساء ۲۳، ۲۴)"واما بنت زوجة ابيه أو ابنه فحلال" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۰۵)۔

وغیرهما فی باب ایقاع الطلاق"(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۶/۲۸ھ

مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح:

مسلمان کا کوئی بڑا بھائی یا چھوٹا بھائی فوت ہوجائے تو ان کی بیوہ بیوی سے نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بڑا بھائی ہو یا چھوٹا بھائی اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ سے نکاح کرسکتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ رضاعت وغیرہ کا کوئی ایسا رشتہ نہ ہو جس سے نکاح حرام ہوتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۲/۴ھ

دو سگے بھائیوں کا دو سگی بہنوں سے نکاح:

دو بھائی، دو سگی بہنوں سے نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں! دو سگے بھائیوں کا نکاح دو سگی بہنوں سے جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۲/۴ھ

مزنیہ کی بہن سے نکاح:

ایک شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب رہا ہے، اب اس عورت کی سگی بہن کی شادی زانی کے ساتھ ہورہی ہے

۱- (وینکح مبانته فی العدة وبعدها أی المبانة بما دون الثلاث لأن المحلیة باقیة(البحر الرائق ۳/ ۹۳، الدر المختار والرد علیه ۵/ ۴۰)۔

یہ شادی جائز ہے یا کہ نا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں یہ شادی جائز ہے،"**قال في البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على اصول الزاني وفروعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها وفروعها على الزاني نسبا ورضاعا كما في الوطء الحلال ويحل لأصول الزاني وفروعه أصول المزني بها وفروعها.....وتقييده بالحرمات الأربع مخرج بما عداها**"(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

عیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت:

عدالتی کورٹ میں عیسائی مجسٹریٹ کے سامنے نکاح ہو، اور مجسٹریٹ ایجاب وقبول کرائے اور دو گواہ مسلمان موجود ہوں، ایک مرد کی طرف سے اور دوسرا عورت کی طرف سے تو یہ نکاح شرعاً منعقد سمجھا جائے گا یا نہیں؟ مع دلائل جواب سے مشرف فرمائیں۔

نوٹ: ایجاب وقبول کے الفاظ انگریزی میں ہوتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

تم زید ابن عمر کہہ سکتے ہو کہ تمہاری دانست میں کسی طرح سے با قاعدہ تمہارا نکاح مسمی ہندہ بنت بکر کے ساتھ ہو جو یہاں حاضر ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے اور تم ان گواہوں کے اور حاضرین کے روبرو جو یہاں موجود ہیں، با قاعدہ ہندہ بنت بکر کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرتے ہو۔ پھر مجسٹریٹ نکاح کرنے کے لئے جو عورت وہاں حاضر ہے اس سے سوال کرتا ہے کہ "تو ہندہ بنت بکر کہہ سکتی ہے کہ تیری دانست میں کسی طرح سے با قاعدہ تیرا نکاح مسمی زید بن عمر کے ساتھ ہو جو یہاں موجود ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، تو ان گواہوں اور حاضرین کے روبرو جو یہاں موجود ہیں با قاعدہ زید بن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہے۔ مجسٹریٹ کے اس سوال کے جواب میں عورت کہتی ہے کہ "ہاں" میں زید بن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہوں۔ پھر فوراً اس ایجاب وقبول کے بعد مجسٹریٹ دونوں مرد اور عورت کے داہنے ہاتھ طلب کرتا ہے اور دونوں کی ملاقات کرا دیتا ہے اور ان الفاظ میں نکاح کرا دیتا ہے:" میں ظاہر کرتا ہوں کہ زید ابن عمر اور ہندہ بنت بکر جو

۱- رد المحتار ۳/ ۱۰۷۔

یہاں حاضر ہیں دونوں نے با قاعدہ نکاح کر لئے'' ۔مزید وضاحت کے لئے کورٹ کا جو یہاں پر طریقہ رائج ہے، اس کی انگریزی نقل ارسال ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب عقد نکاح کی مجلس میں زوجین (مرد وعورت) دونوں خود موجود تھے، تو اگر چہ عیسائی مجسٹریٹ کے کہنے سے یا پوچھنے سے مرد نے کہا: ''میں قبول کرتا ہوں'' اور عورت نے کہا: ''میں قبول کرتی ہوں'' تو چونکہ ''میں قبول کرتا ہوں'' اور ''میں قبول کرتی ہوں'' یہ دونوں قول فعل حال کے صیغے ہیں جو عقود میں مثل صیغہ ماضی کے یکساں مفید اور باعث انعقاد عقد ہوتے ہیں، خواہ کسی زبان میں ہوں، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **"وهما (أي الايجاب والقبول) عبارة عن كل لفظين ينبئان عن معنى التمليك ماضيين أو حاليين"** (۱)۔

لہٰذا پہلا قول ایجاب اور دوسرا قول قبول بن گیا اور عقد نکاح کا ایجاب وقبول دونوں جو رکن نکاح ہیں پائے گئے اور یہ دونوں (میاں بیوی) خود عاقد نکاح اور مباشر نکاح (خود اپنے نکاح کا عقد کرنے والے) ہو گئے اور جب یہ ایجاب وقبول دونوں دو مسلمان گواہوں کے روبرو ہوا تو نکاح بلاشبہ منعقد ہو کر لازم بھی ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ محض واسطہ مگر اس کے درجہ میں رہ گیا تا کہ بوقت انکار ثبوت ہو سکے جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے:

الف: **"ويصح (النكاح) بلفظ تزويج ونكاح .... وبكل ما يملك به الرقاب"** (۲)۔

ب: **"إذا كان المؤكل حاضراً كان مباشراً الخ، لأن العبارة منتقل إليه وهو في المجلس"**(۳)۔

ج: **"قوله: إنها تجعل عاقده الخ لانتقال عبارة الوكيل إليها وهي في المجلس فكانت مباشرة ضرورة"** (۴)۔

د: **"قوله: وينعقد متلبسا بإيجاب احدهما الخ أشار إلىٰ أن المتقدم من كلام العاقدين إيجاب، سواء كان المتقدم من كلام الزوج أو من كلام الزوجة والمتاخر قبول"** (۵)۔

۱- تنویر الابصار۔
۲- شامی ۳/۱۶ کتاب النکاح۔
۳- شامی ۳/۲۵ کتاب النکاح۔
۴- حوالہ سابق۔ ۵- مصدر سابق۔

۵: "وتقبل شهادة المامور عند التجاحد وإرادة الإظهار، وأما من حيث الانعقاد الذي الكلام فيه فهي مقبولة مطلقا كما لا يخفى" (۱)۔

اور جب مرد وعورت (زوجین) دونوں نے مجلس عقد نکاح میں خود موجود رہتے ہوئے ایجاب وقبول کے الفاظ کہہ دیئے تو اب مجسٹریٹ کو مندرجہ بالا عبارت کی بناء پر شرعاً قاضی نکاح اور عاقد نکاح نہیں قرار دیا جائے گا، اسی طرح خطبۂ نکاح ،نکاح کے شرائط وواجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ سنن نکاح میں سے ہے اور سنن کے ترک ہوجانے سے اصل شئی ختم یا باطل نہیں ہوتی، بیش از بیش اگر خود کسی جبر واکراہ کے اور بغیر کسی قانونی مجبوری کے محض اپنی مرضی سے ایسا عقد (یعنی بغیر خطبہ وبغیر تذکرہ مہر کے) کیا جائے تو خلاف سنت کے ارتکاب کا گناہ ہوگا، اور اگر قانونی مجبوری سے یا کسی جبر واکراہ ودباؤ سے ایسا کر لیں تو ارتکاب کا گناہ بھی نہ ہوگا، جیسا کہ عبارات ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

(۲) "أمر السلطان إكراه وإن لم يتوعده" (۲)۔

(۳) "في الحديث: إن الله تجاوز عن أمتي الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه، وفي شرحه أي وما طلب منهم من المعاصي على وجه الإكراه" (۳)۔

اسی طرح تذکرہ مہر نہ ہونے سے بھی اس عقد میں کوئی خرابی یا فساد نہیں آیا (۴) "ويصح النكاح وإن لم يسم فيه مهرا" وهكذا في الدر والرد وغيرهما۔

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال اس عقد نکاح کے صحیح ولازم ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں، بلاشبہ بالکل صحیح ہوکر لازم ونافذ ہوجاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۹۶ ۱۳ھ

بیوی کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرنا:

کیا مرد اپنی عورت کے مرتے ہی سالی کے علاوہ دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے، اس میں عورت کی عدت پوری

۱- مصدر نفسہ۔
۲- شامی ۹/۱۸۲ کتاب الاکراہ، دار الکتب العلمیہ بیروت۔
۳- مشکوۃ، ص ۵۸۴، کتاب المناقب حدیث: ۶۲۹۳۔
۴- ہدایہ ۲/۶۲ باب المہر ۲۔

ہونے کا انتظار کیا جاوے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں بیوی کے مرنے کے بعد یا زندگی میں بھی کر سکتا تھا مرنے کے بعد بھی فوراً کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بیوی کی بہن یا بیوی کی اور محرمات میں جیسے خالہ پھوپھی وغیرہ نہ ہو بلکہ اجنبی ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۳۸۵/۱۰/۲ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ممتدۃ الطہر مطلقہ کے نکاح ثانی کے لئے جواز کی ایک صورت:

ہندہ کے ساتھ بکر کی شادی ہوئی، شادی ہونے کے بعد بچی پیدا ہوئی، بکر نے اپنی منکوحہ کو طلاق بائن دیدی، بکر کی بچی تقریباً پونے دو سال کی ہے، اب تک ہندہ کو پیدائش کے بعد سے حیض نہیں آیا ہے، ہندہ اب ایک دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے، مگر حیض نہ آنے کی وجہ سے عدت پوری نہیں ہورہی ہے، اس کو لوگوں نے حیض جاری کرنے کے لئے علاج کا مشورہ دیا ہے، ایک ماہ تک علاج ہوا، مگر حیض جاری نہیں ہورہا ہے، اگر کوئی صورت شادی کرنے کی ہو تو تحریر فرمائی جائے، یا اس سلسلہ میں کوئی مشورہ تحریر فرمایا جائے۔ شادی کی سخت ضرورت ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی عورت کو دوسرے شخص سے نکاح کے لئے، حنفیہ کا مسلک مختار تو یہی ہے کہ مدت یاس تک جس کی کم سے کم مدت تیس برس کی عمر ہو جانے تک ہے، انتظار کرے، اگر تیس سال کی عمر تک حیض نہ آئے تو آئسہ سمجھ کر تین ماہ عدت گزار کر دوسرا نکاح کرے، اس لئے اگر اس کو نکاح کی ضرورت ہے تو بہتر یہی ہے کہ اسی سابق شوہر سے نکاح کرے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر سابق شوہر پھر نکاح کرنے پر تیار نہ ہو، اور یہ عورت بے سہارا ہو، نان ونفقہ کا کوئی نظم نہ ہو یا حالات ایسے ہوں کہ بغیر دوسرا نکاح کئے باعصمت زندگی گزارنا دشوار ہو تو اس کو اختیار ہے کہ جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) بنا کر جس

میں کم از کم تین دیندار با اثر معاملہ فہم معزز مسلمان ہوں، اس شرعی پنچایت کے سامنے درخواست دے کر بغیر دوسرا نکاح کئے ہوئے اپنی عصمت زندگی دشوار ہونے کو، نیز نان ونفقہ وغیرہ کی اگر مجبوری ہو بے سہارا ہو، ان باتوں کو ثابت کر کے دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت کا مطالبہ کرے۔

پس جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) اگر اس کے مطالبہ کو مبنی بر حقیقت وصحت سمجھتے ہوئے حیلہ ناجزہ میں لکھے ہوئے ان وجوہ وعلل کے مطابق جو موجب ہوتے ہیں حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق زوجہ مفقود ومتعنت وغیرہ میں فسخ نکاح کے فیصلہ کے لئے، اگر اس عورت کو بھی حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ۹/ ماہ یا ایک سال مزید حیض کے انتظار کے بعد ختم عدت کا حکم دے کر دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت دے دے، تو اس عورت کو جماعت مسلمین کے اس فیصلہ کے مطابق عمل کر لینا اور دوسرا نکاح کر لینا درست رہے گا۔

اس فیصلہ کے جواز ونفاذ کے دلائل شامی (۲/ ۸۲۹)، اور حیلہ ناجزہ (ص ۵۰، و ۶۳) سے بھی مستنبط ہوتے ہیں اور یہ مسئلہ زوجہ مفقود یا متعنت کی نظیر بن سکے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۳/ ۹۳ ۱۳ھ

شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح فسخ ہوگیا:

زید نے جو اہل سنت مسلمان تھا یا اپنے آپ کو سنی مسلمان ظاہر کرتا تھا، کئی سال پہلے ایک سنی لڑکی سے شادی کی، نکاح حنفی المذہب عالم نے پڑھایا، کچھ عرصہ کے بعد مختلف اثرات کے ماتحت زید پکا مرزائی قادیانی ہوگیا۔ اس عرصہ میں اس کی اولاد بھی ہوئی جس میں دولڑکے اور لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ اس کی بیوی بدستور سنی رہی اور ہے، کئی دفعہ اسے ربوہ جا کر مرزائی خلیفہ سے بیعت کرانے پر مجبور کیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب ملک کی نمائندہ جماعت اور جمہور اہل اسلام کے فیصلہ کے بعد جب مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے زید کو توبہ کرنے کا مشورہ دیا گیا، مگر وہ اپنے مرتد رہنے پر مصر ہے۔ کیا اس کے بعد زید کا نکاح مسلمان خاتون سے قائم رہے گا اور کیا یہ ضروری ہے کہ زید اسے طلاق دے یا طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔

الجواب وبالله التوفيق:

حاصل سوال یہ ہے کہ بوقت نکاح زوجین مسلمان تھے بعد میں شوہر قادیانی ہوکر مرتد ہوگیا، اس کا حکم شرعی اسلام میں یہ ہے کہ شوہر کے مرتد ہوتے ہی اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور منکوحہ مسلمہ اس کے نکاح سے خود بخود بالکل خارج ہوگئی، طلاق وغیرہ کے دینے کی حاجت یا شرط نہیں رہی، بلکہ منکوحہ اس کے نکاح سے نکل کر آزاد ہوگئی اور نفقہ عدت اور کامل مہر کی بھی مستحق رہی " **ارتداد أحدهما فسخ عاجل بلا قضاء فللموطوئة كل مهرها ولغيرها نصفه لو ارتد وعليه نفقة العدة**"(۱)، بالخصوص جب کہ سمجھانے اور توبہ کا مشورہ دینے کے بعد بھی وہ مرتد (قادیانی) رہنے پر مصر رہا تو یہ حکم اور بھی واضح ہوگیا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مطلقہ عورت سے نکاح:

رہنما علی اپنے قریب کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی جس کا نام انوری بیگم ہے، سے شادی کی کچھ دن بعد ان دونوں میں نا اتفاقی پیدا ہوگئی جس سے وہ دونوں لڑجھگڑ کر کے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے اور دونوں اپنے گھر جدا ہوکر رہنے لگے، اس کے بعد گاؤں والوں نے دونوں کے معاملے کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ایک میٹنگ بلائی اس میں دونوں فریق نے گاؤں کی پنچایت کو حکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہم دونوں قبول کریں گے، اس پر پنچایت نے دونوں کی زبان بندی لی، اس میں انوری بیگم نے کہا کہ میرا شوہر میرے دل کے مطابق نہیں ہے، میں اس سے خوش نہیں ہوں اس لئے میں اس سے الگ ہوجانا چاہتی ہوں، پنچایت سے التجا ہے کہ میرا سامان دلوا کر اس سے طلاق دلوادے۔ اس کے بعد پنچایت نے رہنما علی کی زبان بندی لی تو اس نے کہا کہ میری عزت پر دھبہ لگانے والی عورت کی مجھے ضرورت نہیں ہے میں اس کے جہیز کے تمام سامان واپس کردینا چاہتا ہوں، تب پنچایت نے ایک فیصلہ نامہ لکھ کر دونوں کی چاہت کے مطابق سامان کا فیصلہ کرنے کے بعد دونوں کو الگ کردیا اور انوری بیگم کو عدت گذارنے کے لئے حکم دے دیا گیا، اس کے بعد رہنما علی نے دوسری لڑکی سے شادی کرلی مگر اس سے بھی کچھ بہتر تعلق نہ رہے کچھ دن بعد یعنی قریباً دو سال بعد اس نے طلاق دیکر آزاد کردیئے اس دوسری لڑکی کے مہر اور خوراکی بابت فیصلہ ہونے کے زمانے میں رہنما علی نے کہا کہ میں اپنی پہلی بیوی جو مطلقہ ہے جس کا نام انوری بیگم

۱- الدر المختار علی هامش رد المحتار ۲/ ۳۹۳۔

ہے سے پھر دوبارہ نکاح کروں گا، یہ بات انہوں نے گاؤں کے پنچائت سے کہی، پنچائت نے کہا کہ ایک مرتبہ وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے اور تم اسے طلاق دے چکے ہو، پھر کیسے اسے لاؤ گے؟ اسے نہ لاؤ، پھر تم دوسری بیوی کا حق اب تک نہ دے سکے ہو، اسے پورا کرو تب گاؤں والوں کے دستور کے مطابق ہم دونوں گاؤں کے پنچائت کے آدمی بیٹھ کر اس کا نکاح کردیں گے، مگر رہنما علی نے بہت ہی بے چینی کا اظہار کیا اور پنچائت سے الگ ہوکر گاؤں کے طور طریقے کو چھوڑ کر الگ ایک جگہ کو جاکر وہاں اپنی پہلی بیوی انوری بیگم سے دوبارہ نکاح کرلیا، لہٰذا اب آپ سے ہم تمام لوگوں کی التجا ہے کہ آپ اس معاملہ پر پوری توجہ سے غور فرمائیں اور ہر ایک کا جواب تشفی بخش عنایت فرمائیں۔

۱۔ مطلقہ عورت سے کیا دوبارہ شادی کی جاسکتی ہے، رہنما علی کی انوری بیگم سے یہ دوسری شادی صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو طلاق کے کون قسم سے ہے جو اس کے لئے صحیح طریقہ ہو، اور اگر صحیح نہیں ہے تو بھی وجوہات کی وضاحت فرمائیں۔

۲۔ گاؤں والوں کے مشورے کو نہ مان کران کو اور گاؤں والوں کے دستور کو چھوڑ کر الگ جگہ شادی کرلینا کیا درست ہے؟ اگر نہیں تو اس کے اپنے لئے کیا سزا ہے اگر ہے تو جواز کے وجوہات بیان فرمائیں۔

روشن علی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال، پہلی بیوی کو فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی، اس لئے کہ سوال کا خط شدہ جملہ طلاق کنائی کا ہے، اور بہ نیت طلاق کہا ہے اور بہ نیت طلاق کہنے سے ایسے جملہ سے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے اور طلاق بائن میں عدت کے اندر ہو یا بعد عدت دونوں کی آپسی رضامندی سے بغیر حلالہ نکاح درست ہے کما صرحت بہ الفقہاء عامۃ (۱)، پس یہ نکاح جو رہنما علی نے کیا ہے شرعاً صحیح ہے، اگر چہ برادری کے خلاف کیا ہے اس خلاف مرضی کر لینے سے نکاح میں شرعاً کوئی خرابی نہیں آئی، البتہ گاؤں والوں کے مشورے کے مطابق عمل کرنا اس کے لئے بہتر تھا۔

پھر دوسری بیوی کا اگر مہر یا جہیز کا سامان واپس نہیں کیا تو گنہگار بھی ہو رہا ہے، اس پر لازم ہے کہ جہاں تک جلد ہو سکے دوسری بیوی کا مہر جو باقی ہو اور جہیز کا سب سامان واپس کردے، واپس نہ کرنے کی صورت میں برادری اس پر اخلاقی

۱۔ ’’فإذا طلق زوجته طلقة بائنة واحدة أو اثنين جاز له العود إليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة وإنما بعقد جديد‘‘ (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۹/۲۹)، ’’وينكح مبانة بما دون الثلاث في العدة وبعدها ‘‘(بالإجماع)(الدر المختار علی الرد ۵/ ۴۰، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

دباؤ ڈال سکتی ہے، باقی ان باتوں سے پہلی مطلقہ بیوی سے جو نکاح کر لیا ہے اس میں خرابی نہ آئے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۲/۱۴۰۳ھ

منکوحۃ الغیر سے نکاح:

۱-گذارش ہے کہ سائل سن ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزی حکومت میں فوج میں تھا، نیازمند کی بیوی گھر پر موجود تھی جس سے ایک بچی تھی، نیازمند ۱۹۴۷ء کے دوران پاکستان چلا گیا، نیازمند کی نوکری کی پنشن جو تھی نیازمند نے اپنی بیوی کے نام کی تھی جو نیازمند کی بیوی کو ملتی رہی۔

۲-نیازمند نے پاکستان سے خط وکتابت بھی جاری رکھی، اس کے بعد نیازمند حج کے لئے مکہ مدینہ چلا گیا اور وہاں ایک سال رہا، اس کے بعد نیازمند سیدھا اپنے ملک یعنی اپنے گھر چلا آیا نیازمند عرصہ تیس سال کے بعد گھر آیا۔

۳-یہ کہ میرے پاکستان جانے کے ۲ سال کے بعد میری بیوی نے ایک اور شخص کے ساتھ عقد کر لیا، جس کا نام چودھری خان ہے جو کہ حلقہ پلیا نگر کا رہنے والا ہے، چودھری خان کے عقد سے میری بیوی کے چھ بچے بچیاں ہوئی ہیں، جنکی شادی ہوچکی ہے۔

۴-مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ۹۰ سال تک بیوی خاوند کا انتظار کر کے دوسری شادی کر سکتی ہے لیکن عرصہ تیس ۳۰ سال میں میری بیوی نے دوسرا خاوند اختیار کیا ہے جبکہ نیازمند گم بھی نہیں تھا، بلکہ ایک دوسرے کے خطوط بھی جاری رہے یعنی خطوط میرے بھائی کی طرف سے مجھے آتے جاتے رہے اب جناب حضرات سے گذارش ہے کہ شرع محمدی کے مطابق کیا میری بیوی کو دوسرا خاوند کرنے کا حق تھا یا کہ نہیں؟ اگر جناب کے مسئلہ میں حق بنتا ہو تو نیازمند کو خلع مل سکتا ہے یا نہیں؟ مطابق مسائل نیازمند کو فتوی بھیج کر بتائیں کہ وہ میری بیوی منتج ہے یا نہیں؟ کیونکہ نیازمند کی زندگی میں اس نے دوسرے آدمی سے عقد کیا جائز ہے یا نا جائز؟

حاجی دل مند چودھری (سکنہ بڈیاں ڈاکخانہ ریکساں ضلع راجوری)

الجواب باللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب آپ کے بھائی کی آپ سے خط وکتابت تھی اور پھر عورت نے آپ کے پاکستان جانے کے بعد دوسرے شخص سے عقد کیا اور آپ کے بھائی نے نہ خود اعتراض کیا اور نہ آپ کو مطلع کیا قرینہ ہے کہ طلاق ہوچکی تھی۔غرض یہ

تحریرمدعی کومشکوک اورکمزوربناتی ہےاورایسی صورت میں بالخصوص اتنی مدت کے بعدجبکہ دوسرےشوہر سے چھ بچے بچیاں ہو کر بالغ ہوگئے اورشادی شدہ بھی ہوگئے اورکنبہ وخاندان میں بھی کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا یہ بھی قرینہ ہے کہ نکاح فسخ ہوچکا تھا وعورت مطلقہ ہوچکی تھی، اوربعد طلاق عدت گذارکردوسرےشخص سے عقدکیاہےاوراس کےخلاف ہونے کی صورت میں سارے کنبہ وخاندان والےبھی متہم ہوں گے۔

ایسی صورت میں اب اتنے زمانے کے بعد اس دوسرےشخص سےنکاح کرلینےکوغلط وباطل قرارنہیں دیاجاسکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور

الجواب صحیح کفیل احمدنائب مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی محمدظفیر الدین مفتاحی

دوسرے کی بیوی سےنکاح:

بلاطلاق حاصل کیے ہوئے سائرہ عورت کےساتھ زیدکانکاح ہواہے بعدنکاح (بیت اللہ) اول شوہر نے طلاق دیا طلاق دینے کے قبل کانکاح صحیح ہوایا کہ نکاح لوٹایاجاوے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینے کے قبل کانکاح صحیح نہیں ہواہے طلاق کےبعدنکاح لوٹایاجاوےنکاح لوٹاناواجب ہے جب تک پھر سے نیانکاح دونوں میں نہ ہوئے دونوں بالکل الگ الگ رہیں تعلقات زن وشوئی ہرگز نہ رکھیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور۹/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمدجمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجہ غائب کی عورت کانکاح دوسری جگہ کب صحیح ہوگا؟

زینب کاشوہر اسلم برضاوخوشی اپنےگھر سے ۱۹۶۲ء کی بارہ مئی میں ملازمت پرراوڑکیلا کے اطراف میں چلاگیا ۲۶

۱- "ولایجوز لرجل أن یتزوج زوجة غیرہ وکذا المعتدة" (الہندیہ ۱/ ۲۸۰)۔

ستمبر ۶۲ء تک مراسلہ کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد سے اب تک کوئی خبر نہیں ملی ہے خبر گیری کے لئے کوئی آدمی تو نہیں گیا لیکن خط وکتابت وغیرہ کے ذریعہ پتہ لگایا جارہا تھا کہ ۶۴ء کے مارچ میں وہاں فرقہ وارانہ فساد ہوگیا اس کے بعد ہفتہ تک اخباروں میں شائع بھی کرایا گیا، لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی ہے ۶۵ء کے ماہ فروری میں اسلم کی تلاش میں خود اس کی والدہ اور ماموں راورکیلا گئے اور اس کے گردونواح کے علاوہ دیگر مقامات بھی گئے مگر کوئی سراغ نہیں ملا وہ واپس آکر انہوں نے یہ بیان دیا کہ دریافت کرنے پر اکثر لوگوں نے اس کے ہلاک ہوجانے کا خیال ظاہر کیا ہے، اس لئے ہم کو اسلم کے شہید ہونے کا یقین ہوگیا ہے، چنانچہ اس کی والدہ نے اکثر قرآن خوانی کے رسومات انجام دیئے جس میں رشتہ دار بستی کے لوگ اس کے سسرال والے شریک ہوئے اور اسلم کی بیوی زینب کو یہ کہدیا گیا ہے کہ لڑکا شہید ہوگیا ہے تم اپنا دوسرا انتظام کرسکتی ہو نوجوان زینب شوہر کے نان نفقہ سے محروم اپنے میکہ میں بیوہ ماں کیساتھ نہایت مصیبت کی زندگی گذار رہی تھی تا چار رشتہ داروں قرب وجوار اور بستی والوں کے مشورہ سے چار مہینے دس روز موت کی عدت پوری کرکے ۶۵ء کے ماہ نومبر میں دوسرے سے عقد کرلیا ہے، صورت مذکورہ میں زینب کا دوسرے سے عقد کرلینا جائز اور درست ہے یا کہ نہیں جہاں حاکم شرعی یا قاضی موجود نہیں ہے وہاں کیا طریقہ اختیار کیا جاوے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب شوہر (اسلم) کی والدہ اور ماموں نے خود بھی تلاش کرلیا اور واپس آکر یہ بیان کیا کہ اسلم کے شہید ہوجانے کا ہم کو یقین ہوگیا ہے اور زینب کے اعزہ وقربا اور پاس پڑوس والوں کو بھی اسلم کے شہید ہوجانے کا یقین ہوگیا تو زینب کا یہ عقد کرلینا درست وجائز ہوگیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بالغہ کا اپنی مرضی سے کئے ہوئے نکاح نیز طلاق نامہ پر جبراً نشان انگوٹھا لینے کا حکم:

لڑکی اور لڑکا دونوں جوان ہیں، لڑکی لڑکے سے ملکر کہیں چلی جاوے اور پھر اس سے نکاح کرے تو کیا نکاح ہوگیا کچھ دن بعد اس لڑکے کے والدین لڑکی کو اپنے گھر لے آئیں اور پنچایت کرکے اس لڑکی کے شوہر سے زبردستی طلاق کے خواہاں ہیں اور لڑکی کی بھی یہی مرضی ہے کہ مجھے طلاق ملجائے اور لڑکا طلاق دیتا نہیں، زبردستی لڑکے سے نشان انگشت فارغ

خطی پر پنچایت والے لگوائیں تو کیا یہ نکاح ٹوٹ گیا اور طلاق ہوئی یا کہ نہیں، بینوا توجروا

الجواب وبالله التوفيق:

اگر دونوں ہم کفو ہیں اور مہر مثل پر شرعی گواہوں کے سامنے نکاح ہوا ہے تو یہ نکاح صحیح ہوگا ایسی صورت میں بلا وجہ شرعی زبردستی طلاق لینا یا لڑکی کا طلاق چاہنا دونوں بہت برا ہے، اور زبردستی محض نشان انگوٹھا فارغ خطی پر لگوا لینے سے نکاح نہ ٹوٹے گا اور نہ طلاق ہی واقع ہوگی جب تک لڑکا زبان سے بھی طلاق نہ دیدے، ''**وفي البحر أن المراد الإكراه على التلفظ بالطلاق فلو أكره على أن يكتب طلاق امرأته فكتب لا تطلق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا**''(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ نائب مفتی دار العلوم دیوبند

۱- رد المحتار کتاب الطلاق ۴/ ۴۴۰۔

باب المحرمات

بیوی کے کم عقل ہونے کی وجہ سے سالی سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

زید کی بیوی بہت کم عقل ہے، عقل سے کوئی کام یا کوئی بات بھی کرنا دشوار ہے اور اس کے تین چھوٹے بچے ہیں، زید کی بڑی سالی کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں سسرال میں کوئی نہیں ہے، سالی کے بچوں کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ایسی صورت میں سالی بہنوئی سے نکاح کرنے کی آرزومند ہے، کیا زید اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بیوی کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بہن سے کسی طرح آپ کا نکاح نہیں ہوسکتا ہے، کلام اللہ شریف میں اسکی صریح ممانعت وارد ہے، "**و أن تجمعوا بین الاختین إلا ما قد سلف**" (۱)، سالی سے نکاح کرنے کی خواہش میں بیوی کو طلاق دیدینا یہ بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ قوی خطرہ ہے کہ عندالشرع باعث غضب وہلاکت نہ ہوجاوے، صبر کیجئے جیسے نباہا آئندہ بھی نباہ دیجئے، اس میں آپ کے درجات بلند ہوں گے اور اللہ خوش ہوگا، سالی کا نکاح کسی دوسرے سے کرادیجئے کہ اس کی زندگی باعصمت وعزت گذرے اور اپنی موجودہ بیوی جب بے عقل وکم سمجھ ہے اور آپ اس کو طلاق دیدیں تو دوسرا اس سے نکاح بھی نہ کرے گا دربدر ٹھوکریں کھائے گی اور اس کا دل دکھے گا اور آپ پر اس کی آہ پڑے گی جو بہت ڈرنے کی بات ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سورۂ نساء: ۲۳۔

بیوی اوراس کی ماں کو رکھنا:

زید نے اپنی بیوی کو رکھتے ہوئے بیوی کی ماں کو بھی رکھ لیا ہے اور دونوں کو حمل بھی رہ گیا ہے، آیا بیوی کا نکاح باقی رہایا کہ نہیں، اور اگر باقی نہیں تو پھر کس طرح سے اس سے نکاح کیا جاوے اور کچھ برادری اس کے ساتھ کھاپی رہی ہے اور کچھ برادری اس سے جدا ہے، تو اس کے ساتھ کھانا کیسا ہے اور جو برادری اس کے ساتھ ہے اس کے لئے مسئلہ کیا کہتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید کی بی بی ہمیشہ کے لئے زید پر حرام ہوگئی زید پر واجب ہیکہ وہ اپنی بیوی کو فوراً طلاق دیکر اپنے نکاح سے الگ کردے اور ہرگز اس کے قریب بھی نہ جائے، اب ان دونوں میں نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے جس طرح زید کی ساس زید پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے اسی طرح اس کی بیوی بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی (۱)، جب تک زید اپنی بیوی سے متارکت نہ کرے اور طلاق نہ دے برادری کو چاہئے کہ اس کے ساتھ متارکت کرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: جب تک زید اپنی بیوی اور ساس کو علیحدہ نہ کرے برادری اس سے ترک تعاون کرے جو اس کے ساتھ تعاون کرے گا گنہگار ہوگا، قال اللہ تعالیٰ: **"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"**(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

بیوی کو طلاق دینے یا اس کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی بہن سے نکاح:

ایک مرد نے اپنی عورت کو طلاق دیدی یا اس مرد کی عورت کا انتقال ہوگیا تو اب ہر دو صورت میں یہ مرد اپنی سالی سے نکاح کرسکتا ہے یا کہ نہیں اگر کرسکتا ہے تو کب کرسکتا ہے اور اس مرد کو ایام عدت کے پوری ہونے کا انتظار کرنا پڑیگا یا زوجہ کے مرتے ہی اس کی دوسری بہن سے شادی کرلے۔

۱- ''وحرم ایضا بالصهریة اصل مزنیة'' (الدرمع الرد ۱۰۷/۳)۔

۲- سورۂ مائدہ:۲۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بیوی کوطلاق دیا پھر تو بیوی کی عدت گذرنے کے بعد بیوی کی بہن سے نکاح جائز ہوگا، اس کی عدت کے اندر اسکی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے، ہاں اگر بیوی مرگئی ہےتوعدت گذارنی کوئی شئی نہیں ہے، مرد پرعدت نہیں ہوتی جب چاہے اس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہےکمافی الشامی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

دوسرے کی مطلقہ سے بغیر عدت گذارے نکاح:

ہمارا ایک عزیز ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن لڑکی شادی شدہ تھی اب اس کی طلاق ہوگئی ہے، لڑکی بے سہارہ ہے اسکا نہ کہیں رہنے کا اور نہ کہیں پیٹ پالنے کا ٹھکانہ ہے، نہ تو اس کے والدین ہیں اور نہ گھر ہے، لڑکے کے گھر والے کہہ رہے ہیں کہ جب تک تین مہینہ ۱۳ دن گذر نہ جائیں گے ہم اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے اور رشتہ دار بھی کہہ رہے ہیں کہ جب تک نکاح نہیں ہوجائے گا تب تک ہم بھی اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے آخر اس کا کوئی فتوی ہے کہ بغیر عدت پورا کئے ہوئے نکاح ہوجائے، اس بے سہارے لڑکی کا گھر بس جائے نہیں تو یہ لڑکی بے موت مرجائے گی شرعی حکم کا فتوی لکھ کر روانہ کردیجئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس لڑکی کو جب سے طلاق ہوئی ہے اس وقت سے جب تین حیض آجائیں اسکا دوسرا نکاح کیا جاسکتا ہے جائز ہے، خواہ یہ تین حیض تین مہینے پر آجائیں یا کم میں، جس عورت کو حیض (ماہواری) آتی ہے اسکی عدت تین مہینے نہیں ہے بلکہ محض تین حیض ہے (۲)، لہٰذا اگر اس لڑکی کو طلاق کے بعد سے تین حیض آچکے ہیں تو فوراً اب اپنے عزیز سے اس کا نکاح کردیجئے ورنہ

۱- دیکھئے ردالمحتار ۵/۱۷۸۔

۲- ’’وإذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا أو رجعيا أو ثلاثا أو وقعت الفرقة بغير طلاق وهي حرة ممن تحيض فعدتها ثلاثة أقراء‘‘ (الہدایہ ۱/۵۲۶)۔

جب تک تین حیض نہ آجائیں کسی محفوظ جگہ جہاں اس کی عزت وآبرو محفوظ رہے رکھیں، خواہ اپنے گھر میں خواہ کسی معتبر آدمی کے گھر میں یہ سب جائز ہے، بلکہ ایسی لاوارث لڑکی کی عزت وآبرو بچانے کی نیت سے ایسا کرنا ثواب کا باعث ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کا تین ماہ کے بعد نکاح کردینا:

زید کے انتقال کے تین ماہ بعد زید کی بیوی ہندہ کے ولی نے عدم علم کی بناء پر ایام عدت طلاق پر قیاس کرتے ہوئے نکاح تین ماہ کے بعد بکر سے کردیا ہے، یہ نکاح باعتبار شریعت کے کیا ہوا اگر نکاح فاسد ہوا تو کس طرح ہوا اور یہ بتائیں کہ اگر ہندہ کو پھر دوبارہ بکر کے نکاح میں دیا جائے تو اسکی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

وفات کی عدت چار ماہ دس دن ہے(۱) اور عدت کے اندر نکاح کرنا درست نہیں جو نکاح عدت کے اندر ہوتا ہے وہ فاسد ہوتا ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد ہوا (۲)، لہٰذا دونوں فوراً علیحدہ علیحدہ ہوجاویں اور اگر آپس میں تعلق زن وشوئی رکھنا چاہتے ہیں تو چار ماہ دس دن گزارنے کے بعد پھر سے نکاح پڑھالیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۱/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

سوتیلی خالہ سے نکاح:

اپنی سوتیلی خالہ سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

۱- ”والعدۃ للموت باربعۃ اشھر بالاھلۃ لو فی الغرۃ وعشرۃ من الایام“ (الدر مع الرد ۵/ ۱۸۸)۔

۲- ”لایجوز للرجل ان یتزوج زوجۃ غیرہ ولا المعتدۃ سواء کانت العدۃ من طلاق او وفاۃ“ (الہندیہ ۱/ ۲۲۸)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنی سوتیلی خالہ سے مثل سگی خالہ (حقیقی خالہ) کے نکاح جائز نہیں قطعی حرام (۱) ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

شوہر کو مردہ بتلا کر نکاح کر لینا:

۱- خدیجہ بی نامی ایک عورت نے جو منکوحہ تھی قاضی صاحب کے پاس یہ ظاہر کر کے کہ میرا شوہر فوت ہو گیا، عبدالرحمن نامی ایک شخص سے جو ملازم سرکار تھا عقد کر لیا، حالانکہ اس کا شوہر عبدالمجیب زندہ تھا وہ پاکستان چلا گیا تھا لیکن عبدالرحمن کو اسکا علم نہ تھا۔

۲- عبدالرحمن شوہر ثانی بعد عقد تین سال تک زندہ رہا اس کے بعد فوت ہو گیا ہے۔

۳- اس کا شوہر اول عبدالمجیب بعد وفات شوہر ثانی عبدالرحمن ناظر آیا اور اس نے اس نکاح ثانی پر اپنے احباب اور رشتہ داروں سے شکایت کی، مگر اس کے متعلق کوئی کاروائی سرکاری نہیں کی، عبدالرحمن شوہر ثانی کی وفات پر چونکہ عبدالرحمن ملازم سرکار تھا منجانب اس کی زوجہ اولی سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں نابالغ تھیں خدیجہ بی نے اس وظیفہ اور انعام کے روپیہ سے عبدالرحمن کی اولاد کو کچھ نہیں دیا ہے، اس لئے انہوں نے اس کے مقابلہ میں ایک نالش عدالت دیوانی میں کر دی کہ وہ عبدالرحمن کی زوجہ شرعی نہیں ہے ناجائز ہے، اس لئے وظیفہ وانعام کی مستحق نہیں ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ عبدالمجیب شوہر اول جو بعد وفات شوہر ثانی آیا تھا، اس نے کوئی اعتراض اس نکاح پر نہیں کیا ہے، تو کیا ایسا نکاح جائز متصور ہوگا یا نہیں؟ ورنہ عبدالرحمن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس نکاح پر اعتراض کریں اور اس کو ناجائز قرار دلائیں جس سے خدیجہ کو نقصان پہنچتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال خدیجہ بی کا شوہر اول زندہ تھا، عام اس سے کہیں چلا گیا تھا یا مفقود الخبر تھا اور خدیجہ بی نے تفریق

۱- ”حرمت علیکم امہاتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم الخ“ (سورۂ نساء ۲۳)، ”للنص الصریح ودخل فیہ الاخوات المتفرقات وبناتھن..... والعمات والخالات المتفرقات“ (البحر الرائق ۳/ ۹۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

شرعی حاصل کئے بغیر دھوکہ دیکر اپنے شوہر کو فوت شدہ بتلا کر عبدالرحمٰن سے اپنا عقد کر لیا تھا مگر چونکہ عبدالرحمٰن کو شوہر اول (عبدالمجیب) کی زندگی کا علم نہیں تھا بلکہ اس نے اس کو فوت شدہ سمجھ کر اور نکاح جائز سمجھ کر عقد کیا تھا، اس لئے اس کی یہ وطی بالشبہ ہوئی اور یہ نکاح حقیقت واقعہ پر نظر کر کے فاسد ہوا اور ایسی صورت میں عبدالرحمٰن کے نطفہ سے جو اولادیں خدیجہ بی کے ہوں گی وہ ثابت النسب ہوں گی، "وتجب العدة بعد الوطء..... ويثبت النسب" (۱)، اور مستحق وراثت ہوں گی اور خدیجہ بی کا چونکہ نکاح فاسد ہے وراثت نہیں ملے گی، البتہ مہر مسمیٰ اگر مہر مثل کے برابر یا کم ہے تو ملے گا اور مہر مسمیٰ مہر مثل سے زیادہ ہے تو محض مہر مثل ملے گا اور شوہر اول کا بعد انتقال عبدالرحمٰن ناظر یکا اپنے احباب واعزہ سے شکایت کرنا اثر انداز نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں خدیجہ بی کے بطن سے اگر کچھ اولادیں عبدالرحمٰن کی ہوئی ہوں گی تو وہ بھی زوجہ اولی کی اولادوں کی طرح جو عبدالرحمٰن سے ہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سکوحصہ ملے گا، تنہا عبدالرحمٰن سے نہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سکوحصہ ملے گا تنہا عبدالرحمٰن کی زوجہ اولی کی اولاد کو نہیں البتہ رقم پنشن یا انعام جو خدیجہ بی زوجہ عبدالرحمٰن کو حکومت نے دیا ہے وہ تنہا خدیجہ بی کا ہے بقیہ اس کے سوا جو متروکہ عبدالرحمٰن کا ہوگا اس میں تمام ورثہ کو حسب تخریج شرعی ملے گا۔ تمام ورثہ کی تفصیل لکھ کر سب کے حصے معلوم کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مفقود الخبر کی بیوی سے نکاح:

مریم کا شوہر اب سے ۱۸؍سال قبل ٹریوننگ کے زمانہ میں ہندوستان سے پاکستان جانے کے ارادہ سے مکان سے گیا، اس کے بعد سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ راستہ میں ہی مر گیا یا پاکستان چلا گیا وہ تنہا تھا کوئی اسکے ساتھ نہیں تھا، اس وقت سے اب تک مریم کو پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، اس کی ماں نے کلکٹر کی اجازت لیکر دوسرا نکاح کر دیا اتفاق سے اس کے بچے ہوئے اور دوسرا شوہر بھی مر گیا ہے، آج تک پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، مریم نے دوسرا شوہر مرنے کے بعد اور اس کی عدت گذارنے کے بعد خالد سے نکاح کر لیا، اب یہ تیسرا نکاح مریم کا صحیح ہے یا کہ نہیں، خالد کے لئے مریم حلال ہے یا کہ نہیں؟

۱- الدر المختار ۳؍ ۲۷۷۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مریم کا یہ نکاح خالد کے ساتھ صحیح نہیں ہے، اگر خالد سے صحیح نکاح کرنا چاہتی ہے تو جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت کے سامنے اپنے سارے واقعات کو بیان کر کے اصل شوہر کے نکاح کو فسخ کرنے کی درخواست کرے اور وہ جماعت مسلمین قاعدہ شرع کے مطابق واقعات کی تحقیق بین شہادت اور ثبوت کے ذریعہ اس نکاح کو فسخ کر کے مریم کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدے تو مریم فسخ نکاح کے وقت سے عدت تین حیض گذار کر اپنا نکاح خالد سے پھر سے پڑھوائے اور جب تک جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق شرعی حاصل ہو کر دوسرا نکاح خالد سے نہ ہو جاوے، خالد سے بالکل علیحدہ رہے ہرگز اس کے قریب نہ جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

سالی سے نکاح:

اسحق نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو ۸ سال پہلے طلاق دی تھی جسکا اسحق کو خود اقرار ہے، لیکن بیوی کو بلا نکاح ثانی اپنے پاس رکھے رہا ہے اس درمیان میں بچے بھی ہوئے اور میں نے اس اسحق کی بیوی کی لڑکی نجمہ سے اب سے ایک سال پہلے شادی کر لی تھی اور ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی اس سال چار یا پانچ ماہ ہوئے اس شخص نے پھر کئی طلاقیں دیدی ہے۔ ۳۔۴ دن کے درمیان میں نے اسحق کی بیوی کی لڑکی نجمہ کو تین طلاق دیدی ہے۔

اب دریافت کرنا یہ ہے کہ اسحق کی بیوی سے جو میری ساس تھی اور میں نے نجمہ کو طلاق دیدی ہے ابھی نہ تو نجمہ کی طلاق مغلظہ کی عدت گذری ہے اور نہ تو اس اسحق کی بیوی کی دوبارہ طلاق کی عدت گذری ہے نکاح کر سکتا ہوں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں نجمہ کا نکاح صحیح اور منعقد ہوا تھا اور مجرد نکاح صحیح منعقد ہونے سے ہی نجمہ کی ماں نجمہ کے شوہر پر ہمیشہ کیلئے حرام ہوگئی تھی جیسا کہ درمختار علی ہامش الشامی ج ۲ ص ۲۷۸ کی عبارت: "وحرم بالمصاهرة بنت زوجته الموطوئة وأم زوجته وجداتها مطلقا بمجرد العقد الصحيح وإن لم توطاء الزوجة الخ" سے معلوم ہوتا

ہے کہ نجمہ کے شوہر کا نکاح نجمہ کی ماں سے کسی طرح اور کسی حال میں جائز نہیں ہو سکتا ہے، خواہ نجمہ کی رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، خواہ نجمہ یا نجمہ کی ماں عدت میں ہو یا عدت سے باہر، ہر حال میں نا جائز اور حرام ہے، نجمہ کی ماں نجمہ کے شوہر پر بمنزلہ اپنی ماں کے حرام ہو چکی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

عدت میں کسی کا بھی نکاح صحیح نہیں۔

الجواب صحیح احقر محمود غفی عنہ نائب مفتی دار العلوم دیوبند ۱۰/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

باب حرمۃ المصاہرۃ

حرمت مصاہرت کی ایک صورت:

زید نے اپنی ساس، یعنی بیوی کی ماں کی شرمگاہ پر انگلی لگائی جس سے اس کا مقصد اس سے زنا کرنا یا کوئی اور کچھ نہیں تھا اور نہ اور کوئی بات تھی، زید بچپن سے ہی گندے خیالات کا تھا اور گندے خیالات کی بناء پر اس نے یہ کیا، ہوا یہ کہ ایک رات زید اور اس کی بیوی اور زید کی ساس ایک ہی کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں، ساس اور بیوی دونوں سو رہی تھیں، زید نے جان بوجھ کر کہ یہ میری ساس ہے اس کی شرمگاہ پر انگلی لگائی، تو اب شریعت کے قانون کے مطابق اس کو کیا کرنا چاہئے جس سے اس کی تلافی ہوجائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال واضح نہیں ہے، آیا شرمگاہ پر اتنا موٹا کپڑا تھا کہ انگلی رکھنے سے ایک کے جسم کی حرارت دوسرے کے جسم تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو اپنی بیوی کے حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا، بلکہ دونوں بدستور زن وشوہر باقی ہیں، اور اگر باریک کپڑا جس سے ایک کی حرارت جسم دوسرے تک پہنچتی ہے یا ننگے جسم پر ایسا کیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ ساس کا شوہر اگر زندہ ہے اور اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے کہ واقعی میرے داماد نے ایسا کیا ہے (۱)، جب تو اس شخص کی بیوی کے حرام ہونے کا حکم ہوجائے گا، (۲)، اس لئے کہ ننگی شرمگاہ پر یا باریک کپڑے پر انگلی لگانا عموماً شہوت سے ہی ہوتا ہے۔

۱- "في المس والنظر إلى الفرج لا يفتى بالحرمة إلا إذا تبين أنه فعل بشهوة، لأن الأصل في التقبيل الشهوة بخلاف المس والنظر كذا في المحيط هذا إذا كان المس على غير الفرج وأما إذا كان على الفرج فلا يصدق" (الفتاوی الہندیہ ۱/۲۷۶)۔

۲- "رجل قبل امرأة أبيه بشهوة أو قبل الأب امرأة ابنه بشهوة وهي مكرهة وأنكر الزوج أن يكون بشهوة فالقول قول الزوج وإن صدقه الزوج وقعت الفرقة" (الفتاوی الہندیہ ۱/۲۷۶)۔

اسی طرح ساس کے شوہر کے تصدیق کرنے سے جس طرح ساس اپنے شوہر پر حرام ہوجائے گی، اسی طرح اگر داماد بھی اس کا اقرار کرے کہ ایسی حرکت ہوگئی ہے تو ساس کی بیٹی اس پہ حرام ہوجائیگی، یعنی اگر داماد کو اقرار ہو کہ اس نے ایسا کیا ہے تو داماد پر اس کی بیوی بھی حرام ہوجائے گی، اور اگر ساس کا شوہر مر چکا ہے اور ساس کو اس قبیح فعل کی تصدیق ہے، پھر بھی جب تک داماد اس قبیح فعل کا اقرار نہ کرے گا، اس کی بیوی کے اس پر حرام ہونے کا حکم نہ کریں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۱/۵/۲۶ھ

شہوت کے ساتھ دو چار سال کی بچی کو چھونے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی:

شہوت کی حالت میں اگر بیٹی یا ساس پر بھول کر بھی ہاتھ پڑ جائے تو بیوی نکاح سے باہر یعنی طلاق پڑ جائے گی، لہذا گذارش یہ ہے کہ بعض لوگوں کو خواہش نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر بیوی کو سوتے ہوئے جگانا پڑتا ہے اور بیوی کے پاس چھوٹی بچی دودھ پینے والی یا دو چار سال کی سوئی ہوئی ہوتی ہے تو بچی کے اوپر ہاتھ پڑنے سے تو نکاح نہیں ٹوٹتا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں نکاح نہیں ٹوٹتا ہے، مسئلہ آپکو ادھورا معلوم ہوا ہے پورا مسئلہ یہ ہے کہ بھول سے اور بلا شہوت کے ہاتھ لگانے سے نکاح نہیں ٹوٹتا ہے اور یہ کہ جس بیٹی یا ساس کو ہاتھ لگایا ہو تو پہلے تو بلا کسی حائل کے بدن پر لگایا ہو یا اگر بدن پر کپڑا ہو تو اتنا موٹا یا ایسا نہ ہو کہ اپنے ہاتھ کی گرمی اس کے بدن تک نہ پہونچ سکے دوسرے یہ کہ جس کو ہاتھ لگائے وہ مشتہاۃ یعنی کم از کم ۹ برس کی ہو، تیسرے یہ کہ اس پر ہاتھ لگانے سے شہوت ہو اور پھر ہاتھ لگانے میں ازدیاد شہوت بھی ہو جب جا کر حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے ورنہ نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵/۷/۲۸ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ''وأصل ممسوسة بشهوة بحائل لايمنع الحرارة...... هذا اذا كانت حية مشتهاة'' (الدرمع الرد ۳/۱۱۰)۔

بہو کا خسر پر زنا کی تہمت لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

ایک ۵۰ سال والے بوڑھے موذن کو اس کے بیٹے کی بہو زنا کی تہمت لگا رہی ہے کہ میرے خسر نے زبردستی زنا کیا مجھ سے اور بڈھا اس بات کو نہیں مانتا ہے اور گواہ کوئی نہیں ہے، بلا گواہ بہو کا قول معتبر اور صحیح ماننا جائز ہے کہ بہو کا قول معتبر مانکر اسکو اذان دینے سے روکا جائے گا، نیز یہ بھی بتلایا جائے کہ جب وہ عورت اس فعل کا اقرار کرتی ہے تو کیا وہ اب اپنے شوہر کے پاس رہ سکتی ہے یا اس پر حرام ہوگئی ہے، عندالشرع کیا فتوی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب بوڑھا آدمی زنا کا اقرار نہیں کرتا ہے اور کوئی گواہ موجود نہیں ہے تو محض اس عورت کے کہنے سے اذان دینے سے نہ روکا جائے گا، اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ وہ عورت اپنے اس اقرار سے شوہر پر حرام ہوئی یا نہیں؟ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر کو عورت کے اس کہنے کا یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے تو وہ عورت اس پر حرام ہوگئی فوراً اس سے الگ ہو جاوے اور اس کو طلاق دیدے۔

اور اگر عوت کے کہنے کا یقین نہیں ہے، اس کو سچا نہیں سمجھتا ہے تو عورت حرام نہیں ہوئی ہے، "**رجل تزوج امرأة على أنها عذراء فلما آرادوقاعها وجدها قدافتضت فقال لها: من افتضك فقالت أبوك، إن صدقها الزوج بانت منه ولامهرلها وإن كذبها فهي امرأته**"(۱)، اورنہ اس کے لئے کوئی اور حکم ہے البتہ عورت اپنے اس کہنے سے فاسقہ ہوگئی اسکو توبہ کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود غنی عنہ

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۷۶۔

مزنیہ کی لڑکی سے نکاح:

ایک آدمی نے ایک عورت سے زنا کیا جس سے لڑکی بھی ہوئی پھر وہی زانی اس عورت کی بڑی لڑکی سے جو اس عورت کے شوہر سے ہوئی تھی شادی کرنا چاہتا ہے کیا یہ درست ہے؟

شیخ محی الدین (میٹریل ڈیپارٹمنٹ شیڈکم۔ سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

وفي رد المحتار: يحرم كل من الزاني والمزنية على أصل الآخر وفرعه لورضاعا، قال في البحر: وبحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفروعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها (اى المزنية) وفروعها (أي المزنية) على الزاني نسبا ورضاعا كما في وطء الحلال، (۱)، وفي الهداية: ومن زنى بامرأة حرمت عليه أمها وبنتها" (۲) وتحته في فتح القدير: " روى في حرمته أحاديث كثيرة منها، قال رجل: يا رسول الله إني زنيت بامرأة في الجاهلية أفأ نكح ابنتها؟ قال: لا أرى ذالک" (۳)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اپنی مزنیہ کی بڑی لڑکی سے نکاح نہیں کرسکتا، یہ نکاح بھی حرام وناجائز ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۲/ ۹۹ ۱۳ھ

۱- شامی ۳/ ۳۱-۳۲ کتاب النکاح فصل فی المحرمات، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔

۲- ہدایہ ۲/ ۱۵، کتاب النکاح، فصل فی بیان المحرمات، (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)۔

۳- فتح القدیر ۳/ ۲۱۲ فصل فی بیان المحرمات، دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

باب الرضاعۃ

رضاعی بہن سے نکاح کرنے کے متعلق حکم شرعی:

زید نے ایک عورت سے شادی کی جس پر تین معتبر عورتوں نے اس کے دودھ بہن ہونے کی شہادت دی، لیکن زید نے اپنی غرض کے ماتحت ان کی تصدیق نہ کر کے شادی کر لی، حالانکہ شاہدین میں ایک اپنی ماں، دوسری رضاعی ماں، تیسری ایک اور معتبر عورت ہے، مگر کسی عالم سے فتویٰ منگوا کر شادی کر لی، لیکن خدا کی مرضی اس عورت کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ عورت چونکہ مالدار ہے، اس غرض سے سب سے ٹکراؤ رہتا ہے، لیکن ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں کہ یہ زید کی دودھ بہن ہے، ایسی حالت میں اس شادی کو توڑنا واجب ہے یا نہیں؟

عبداللطیف چودھری نیل باڑی

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا جواب گذر چکا ہے، صرف واقعہ میں اتنا فرق ہے کہ وہاں شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی، بلکہ کرنا چاہتا تھا اور یہاں خودرائی کر کے کر لی ہے، لہٰذا اس کے حکم میں سابق حکم کے ساتھ اتنا اضافہ ہے کہ جب رضاعت کی شہرت ہے تو طلاق دے کر علیحدگی اختیار کر لینا ہی بہتر ہے، بلکہ ایک درجہ میں واجب ہے اور احتیاط تنزہ کا حکم ہے۔ ''فتاویٰ خانیہ'' میں بھی اسی طرح کا جزئیہ منقول ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

ثبوت رضاعت کے لئے تنہا عورتوں کی شہادت:

ہمارے پڑوس میں دو بہنوں کی شادی کئی سال قبل ایک گاؤں میں انجام پائی، بڑی بہن کے بیٹے ہوئے اور لڑکیاں بھی، جبکہ چھوٹی بہن کی لڑکیاں ہی ہوئیں، دونوں بہنیں اقرار کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہم عمر بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلا چکی ہیں اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم خاندان کے کسی مرد کے ذہن میں یہ بات نہیں ہے، آیا وہ رضاعی بہن بھائی ہیں یا نہیں ہیں؟ چھوٹی بہن جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس کی بڑی بہن کے بیٹے کے ساتھ عمل میں آئے لیکن دونوں بہن اس حقیقت کا بار بار اعتراف کرتی رہی ہیں کہ وہ دونوں بچوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلا چکی ہیں، چنانچہ خاندان کے بزرگوں نے متوفیہ کی چاہت کے پیش نظر مفتیان دین سے رجوع کیا اور اس سلسلہ میں ایک بات پیش آئی کہ رضاعت ثابت ہے، اس لئے رشتہ نہیں ہوسکتا جبکہ ایک اور مفتی کا دعوی ہے کہ جب تک کوئی مرد رضاعت کے بارے میں شہادت نہ دے رضاعت قرار نہیں پاسکتی اور یوں رشتہ ازدواج ہوسکتا ہے، آپ سے استدعا ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطا فرمائیں۔

پروفیسر عبدالغنی (ساکن بٹینگو، شولا پورہ بارہمولہ کشمیر)

الجواب وبالله التوفيق:

ثبوت رضاعت کے لئے دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کی شہادت ہے، صرف تنہا عورتوں کی شہادت معتبر نہیں، لیکن صورت مذکورہ میں چونکہ نکاح سے پہلے نکاح کے جواز وعدم جواز میں شک واقع ہوگیا ہے، اس لئے جانب حرمت کو ترجیح ہوگی، ان کا باہم نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔

"أفاد أنه لا يثبت بخبر الواحد إمرأة كان أو رجلا قبل العقد أو بعده وبه صرح في الكافي والنهاية تبعا لما في رضاع الخانيه :لو شهدت به إمرأة قبل النكاح فهو في سعة من تكذيبها لكن في محرمات الخانيه: إن كان قبله والمخبر عدل ثقة لا يجوز النكاح وإن بعده وهما كبيران فالأحوط التنزه وبه جزم البزازى معللاً بان الشك في الأول وقع في الجواز وفي الثاني البطلان والدفع أسهل من الرفع" (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- شامی جلد ۴/ ۵۶۸، مکتبہ عثمانیہ، باب الرضاع۔

عورت کی شہادت پر حرمت رضاعت کا شرعی حکم:

محمد سراج الحق چودھری نے ایک ایسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا جس پر تین معتبر عورتوں نے شہادت دی کہ سراج الحق نے اس عورت کی ماں کا دودھ پیا ہے، شاہد میں ایک سراج الحق کی ماں ہے جس کو تمام ہمسایہ والوں نے معتبر وثقہ ہونے کی شہادت دی، لیکن سراج الحق اس بارے میں اپنی ماں کی تصدیق نہیں کرتا، بلکہ فاسقہ بھی کہتا ہے۔ دوسری عورت، عورتِ مذکورہ کی ماں، یعنی دودھ ماں وہ بھی معتبر اور ثقہ ہے، سوم ہمسایہ کی ایک عورت حاجی، بہر حال تینوں معتبر لوگ جانتے ہیں خصوصا ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں، ایسی حالت میں سراج الحق کو اس عورت سے جو اپنی دودھ بہن ہے (شاہدات کی شہادت کی وجہ سے) اس سے شادی کرنا جائز ہے یا نا جائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مانا کہ حرمت رضاعت ثابت ہونے کے لئے دومرد یا ایک مرد اور دوعورتوں کی شہادت کی ضرورت ہے، محض عورتوں کی شہادت سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لیکن حرمت ثابت نہ ہونے پر نکاح کرلینا واجب بھی تو نہ ہوگا، بہت سے بہت مباح وجائز ہو سکے گا، اور حقیقی ماں کی اطاعت مباح امور میں واجب ہوتی ہے، اسی طرح رضاعی ماں احترام وعظمت اور اس کی اطاعت بھی امور مباح میں ضروری ہوتی ہے، پس جب یہ دونوں کہتی ہیں کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں، نیز اس کی شہرت بھی ہوچکی ہے، تو ہرگز اس کو دونوں حقیقی ماں ورضاعی ماں کی مخالفت جائز نہ ہوگی اور نکاح کی اجازت نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں ماں کو فاسق کہنا سخت گناہ ہے، اگر بغیر وجہ شرعی کہا ہے تو خود فاسق شمار ہوگا، کیونکہ حکم قرآنی: **"ولا تقل لهما اف"** (۱) کے خلاف ہے اور حدیث میں عقبہ بن حارث کا واقعہ بالکل اسی قسم کا منقول ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو اس نکاح سے منع فرمادیا۔ پھر انہوں نے دوسری عورت سے نکاح کیا (۲)، اس لئے سراج الحق صاحب کو ہرگز ایسی عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۷/۹۱ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید

۱- سورۂ اسراء آیۃ ۲۳۔
۲- مشکوٰۃ شریف، ص ۲۷۴۔

بیوی کا دودھ پینا:

ایک شخص نے اپنی بیوی کا دودھ پی لیا ہے؟ کیا اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی؟ دوبارہ نکاح پڑھانا پڑے گا۔

شفیع احمد الاعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

بیوی کا دودھ پی لینے سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ نکاح بحالہ باقی رہتا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بالغ ہوجانے کے بعد کسی عورت کا بھی دودھ بولا اضطراری ضرورتوں (علاج وغیرہ کے) کے پینا حرام ہے درست نہیں ہے اور یہی حکم اپنی بیوی کے دودھ کا بھی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیوی کا پستان منہ میں لے لیا اور دودھ نکل آیا تو اس کو نہ پئے اور نہ نگلے بلکہ کلی کردے اور تھوک دے۔ اس کے علاوہ جو مسئلہ یہ مشہور ہوگیا کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے غلط ہے اور مسئلہ یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر فرط محبت یا جوش شہوت وغیرہ میں بیوی کا پستان منہ میں لے تو یا تو دودھ نکلنے کی جگہ بچا کر منہ میں لے یا پھر اگر دودھ منہ میں آجائے تو فوراً تھوک دے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے:

حمیدہ اپنے بچہ کو اپنا دودھ پلا رہی تھی قریب ہی اس کا شوہر کھانا کھا رہا تھا، کسی طرح بچے کے منہ سے دودھ کے قطرے کھانے میں گر گئے، جسے زید اور حمیدہ دونوں نے دیکھا، دیکھنے کے باوجود زید نے دیدہ ودانستہ اس کھانے کو کھالیا ہے، اب عمداً ایسی حرکت کرنے پر اس کی منکوحہ اس کے عقد میں باقی رہے گی یا کہ نہیں یا حرام قرار پائے گی؟

۱- ''مص رجل ثدی امرأته لم تحرم'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۴/۴۲۱)، ''لأنه جزء آدمی والانتفاع به بغیر ضرورة حرام علی الصحیح'' (ایضاً ۴/۳۹۷) ''وعلی هذا لا یجوز الانتفاع به للتداوی'' (البحرالرائق ۳/۳۸۹)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کی منکوحہ ہرگز اس پر حرام نہ ہوگی بلاشبہ حلال رہے گی (۱)، البتہ جس جگہ قطرے گرے تھے وہ حصہ اس کو علیحدہ کردینا چاہئے تھا اور اس کو کھانا اس کو جائز نہیں تھا،''**ولم يبح الارضاع بعد مدته لأنه جزء آدمي والانتفاع به لغير ضرورة حرام على الصحيح**'' (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دودھ دوا میں ملا کر پلانے سے رضاعت کا حکم:

ایک لڑکی مسماۃ زینب اپنی بچپن کی حالت میں ایک بار بہت سخت بیمار ہوئی، اسی حالت میں زید کی والدہ کا دودھ صرف ایک قطرہ دوا میں ملا کر زینب کو پلایا گیا تھا بغیر دواء کے اس صورت میں رضاعت ثابت ہوجاتی ہے یا کہ نہیں اور اس لڑکی یعنی زینب سے زید کی شادی ہوسکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

زید کی والدہ کا دودھ اگر ڈھائی سال کی مدت کے اندر ہی پلایا گیا ہے اور حلق کے اندر اتر بھی گیا تو رضاعت ثابت ہوگئی اور نکاح بھی حرام ہوگیا ہے، یہ جب کہ خالص دودھ پلایا گیا ہو اور اگر دودھ دواء میں ملا کر پلایا گیا ہے تو دودھ کے غالب ہونے کی صورت میں حرمت نکاح اور رضاعت ثابت ہیں اور دواء غالب ہونے کی صورت میں نہ حرمت ثابت ہوئی اور نہ رضاعت،''**ومخلوط بماء و دواء (الى قوله) اذا غلب لبن المرأة**'' (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ ۱۶/۷/۱۳۸۵ھ

۱- ''واذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق بالرضاع تحريم'' (الہندیہ ۱/۳۴۳)۔

۲- الدرالمختار ۴/۳۹۷۔

۳- درمختار۔

رضاعت سے متعلق:

مسمّٰی رسول ڈار کی پہلی عورت فوت ہوچکی ہے، اس کے بطن سے دولڑکیاں جانہ بی بی وخدیجہ بی بی موجود تھیں پھر رسول ڈار مذکور نے دوسری شادی مسماۃ خورشی کے ساتھ کی ہے خورشی مذکور کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں شوہر مذکور سے موجود ہیں، لیکن خورشی مذکورہ اپنی دونوں سوتیلی لڑکیوں کے لڑکوں یعنی جانہ بی کے لڑکے رشید کو خدیجہ کے لڑکے نذیر کو دودھ پلائی ہے، لہذا خورشی مذکورہ رشید ونذیر مذکورین کی ایک طرف سوتیلی نانی بھی ہے دوسری طرف دودھ پلانے والی ماں بھی ہے اوران دونوں یعنی رشید کی بھی بہن ہے، اورنذیر کی بھی بہن ہے دریافت یہ ہے کہ رشید کو نذیر کی بہن کے ساتھ اورنذیر کو رشید کی بہن کے ساتھ عقد نکاح کریں شرعا جائز ہے یا نہیں؟

نذیر احمد متصل زیارت، حضرت شاہ ہمدان، مقام ترالی ضلع پلہ والہ، کشمیر

الجواب وباللہ التوفیق:

ا-خورشی کے بطن سے اوررسول ڈار کے نطفہ سے جولڑکا ہے وہ مصرہ اورجمیلہ کے نسب کے اعتبار سے سوتیلا ماموں ہے اوراس کا نکاح مصرہ اورجمیلہ سے حرام ہے اوررشید اورنذیر رضاعت کے اعتبار سے سوتیلے ماموں ہیں (سوالنامہ میں مصرہ اورجمیلہ کے متعلق صراحت نہیں ہے کہ وہ کس کی لڑکیاں ہیں) اورنسب کے اعتبار سے جورشتہ حرمت کا ہوتا ہے وہ رشتہ رضاعت کے اعتبار سے بھی حرمت کا ہوتا ہے، ''**یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب**''(۱)۔

پس مصرہ کا نکاح نذیر سے اورجمیلہ کا نکاح رشید سے قطعا حرام ہوگا اگر چہ ایک رشتہ سے دونوں خالہ زاد بھائی بہن ہونے کی وجہ سے نکاح جائز معلوم ہوتا ہے مگر یہ رشتہ اب مفید حلت نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۶/۱۴۰۰ھ

۱- صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث نمبر (۱۴۴۵) میں ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: "فإنه یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب" نیز یہ حدیث "ما یحرم من الولادۃ" اور "ما یحرم من الرحم" کے الفاظ میں بھی منقول ہے
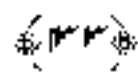
باب الاولیاء والاکفاء

والد کے ماموں کے لئے نابالغہ کا نکاح کرنا:

تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں اس کے والد کے ماموں نے والد کے سامنے ہی اپنے اختیار سے زید کیساتھ نکاح کرادیا۔

والد نے اپنے ماموں صاحب کے خوف کی وجہ سے انکار نہیں کیا ہے لیکن اجازت بھی نہیں ہے اور نہ مبارکبادی دی اور اسی وقت گھر پہنچے تو بندہ کی والدہ نے یہ کہا کہ تم نے ایسا کیوں کردیا ہے اس پر بندہ کے والد نے یہ جواب دیا کہ نکاح کردینے کی میری بالکل مرضی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے اجازت دی ہے اس پر بندہ کے والد کو غصہ آیا ہے مگر ماموں کے خوف کی وجہ سے پہلے رہنے دیا اور تقریباً بندہ کی چار سال عمر تک حیات رہ کر وفات پاگئے اور اب بندہ بالغ ہے اور بالکل اس نکاح سے متفق نہیں ہے اسی طرح موجودہ ولی برادر کلاں اور والدہ کی بھی مرضی نہیں ہے، لہذا گذارش ہے کہ شریعت کے مطابق جو حکم ہو تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال بوقت نکاح باپ ولی تھا اور اس نے اجازت نہیں دی پھر اس کے بعد اسکا لڑکا یعنی بندہ کا بھائی ولی ہوا اس نے بھی ابھی تک اجازت نہیں دی ہے اور نہ لڑکی ہی نے بالغ ہو کر نافذ کیا تو اس صورت مسئولہ میں بندہ کا بھائی جو ولی ہے اور خود لڑکی بھی اس نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

۱- ”وإن كان المزوج غيرهما اى غير الاب والجد ..لايصح النكاح من غير كفوء او بغبن فاحش ... دون كان من كفوء وبمهر المثل صح ولكن لهما اى الصغير والصغيرة خيار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ إذالعلم بالنكاح بعده“(الدرمع الرد ۴/ ۱۷۵، مکتبہ زکریا)۔

والد نے نابالغہ کا نکاح کر دیا تو بعد بلوغ اس کو خیار بلوغ نہیں ملے گا:

گذارش ہے کہ کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کے والدین نے کر دیا ہو اور اس لڑکی کو یہ نہ معلوم ہو کہ میرا نکاح ہو گیا ہے اب وہ لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہو اور اپنے شوہر کے یہاں جانا پسند نہیں کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں خود اپنی مرضی سے نکاح کرتی ہوں اور شوہر اس کا اختیار نہیں دیتا ہے اور نہ طلاق دیتا تو اس کا پہلا نکاح ٹوٹ گیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

والدین کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ نہیں حاصل ہوتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں لڑکی کو اپنے اسی شوہر کے پاس جانا چاہئے، لڑکی کا جانے سے انکار کرنا یا جانے کو ناپسند کرنا صحیح نہیں ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

والد کے لئے نابالغہ لڑکی کا جبراً نکاح کرنا:

ایک لڑکی جو کہ ابھی نابالغ تھی اس کے باپ نے اس کا رشتہ ایک جگہ کر دیا، جب لڑکی بالغ ہوئی تو اس نے رشتہ کرنے سے انکار کر دیا، باپ کے سامنے وہ بول نہ سکی، اس نے قریب کے ہر ایک مرد وزن کے سامنے انکار کیا، والد نے مطابق اپنے وعدہ کے شادی کرنی چاہی، اس وقت اس لڑکی کے سب قرابت والے بھی اس شادی میں آنے سے انکار کر گئے حتی کہ اس کے بھائی، بہن اور سب رشتہ دار اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے اور بوقت نکاح وہاں موجود نہ رہے تب منکوحہ لڑکی نے کہا کہ اچھا آپ اپنی بات پوری کر لو، میں بھی اپنی بات پوری کروں گی جس سے اجازت نہ دینا مقصد تھا بوقت نکاح کپڑے زیور بالکل نہیں لئے، نکاح ہوئے سات سال ہو گئے ہیں، لڑکی آج تک اپنے والد کے گھر پر ہے اور اس نے آج تک کوئی حق زوجیت ادا نہیں کیا ہے اور نہ خاوند کے ساتھ اور پاس رہی ہے، خانہ داماد سے شرط لی گئی تھی کہ اگر وہ کوئی برا کام کرے، چوری کرے، زنا کرے تو اس پر لڑکی کو طلاق واقع ہو جائے گی، اس کے بعد اس خاوند سے کئی غلطیاں بار بار سرزد ہوئیں ہیں، اس سے یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے نہ بھاگے گا، لیکن وہ بار بار بھاگا ہے، اب وہ لڑکا پاکستان چلا گیا ہے، بلا مشورہ کے دریافت ہے کہ نکاح میں کوئی خلل واقع ہوا ہے یا کہ نہیں؟

۱- ''للولی النکاح الصغیر والصغیرۃ ... ولزم النکاح ... إن کان الولی أبا أو جدا ... لم یعرف منهما سوء الاختیار مجانة وفسقا وان عرف لایصح'' (الدر مع الرد ۴/ ۱۷۲)۔

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں بوقت نکاح لڑکی جب بالغ تھی اور باپ نے لڑکی کی بلا رضامندی کے زبردستی نکاح کیا ہے تو یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوا، اگر لڑکی نے ایک دفعہ بھی اپنے شوہر کو اپنے اوپر قابو دے دیا ہو یا ایک دفعہ بھی شوہر سے ہم صحبت یا خلوت صحیحہ ہو چکی ہو تو رضامندی ثابت ہوگئی اور اس کا نکاح لازم ہوگیا ہے (۱)۔

اور نکاح ہوئے سات (۷) سال ہو چکے ہیں اور شوہر خانہ داماد ہے، اس لئے اغلب یہ ہے کہ ایک آدھ دفعہ تو ضرور ان باتوں میں سے کسی بات کا موقع آگیا ہوگا۔ دیکھو خدا سے معاملہ ہے اور حلال وحرام کا معاملہ ہے دنیا سازی سے ہرگز اس قسم کے معاملات میں کام نہ لینا چاہئے۔

بہر حال اگر ایک دفعہ بھی عورت نے رضا دیدی ہو یا اپنے اوپر شوہر کو قابو دیدیا ہو تو نکاح لازم ہوگیا اور اب اس شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کوئی بات واقع ہوگئی ہو تو عورت پر پہلی خلاف ورزی میں طلاق واقع ہوگئی ورنہ شوہر سے طلاق ہی لینا پڑے گا، شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کیا واقع ہوا یہ دیکھ لیا جائے اور حکم لگایا جائے۔

ہاں اگر واقعی ایک دفعہ بھی لڑکی نے اپنی رضا نہیں دی اور نہ ایک دفعہ بھی تنہائی ویکجائی شوہر سے اس نے (۷) سات برس کی مدت میں کی ہے تو لڑکی کو اب بھی اختیار باقی ہے کہ اپنے اس نکاح کو کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس اور قوم کے ذمہ دار کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں اس نکاح کو رد کرتی ہوں اور توڑتی ہوں اور وہ لوگ تینوں آدمی (جو بمنزلہ جماعت مسلمین کے ہیں) واقعات کی تحقیق شریعت کے مطابق کر کے عورت کے اس رد کو تسلیم کرلیں اور فسخ نکاح کا فیصلہ دیدیں جب بھی یہ نکاح رد اور فسخ ہوجائے گا، عورت کو دوسرا نکاح کرنے کا حق شرعا حاصل ہوجائے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۹/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عنہ، محمد جمیل الرحمان

نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد کی اجازت کے بغیر کرنا:

ایک لڑکی صغیر السن کی شادی عرصہ ۱۰ دس سال ہوئے ہوئی تھی، نابالغ لڑکی کا والد شادی کا پیغام بھیجنے کے وقت بھی

۱- ”قال الزوج للبكر البالغة بلغك النكاح فسكت وقالت رددت النكاح ولا بينة لهما على ذلك ولم يكن دخل بها في الاصح فالقول قولها (الدر المختار) وقال الشامي: واحترز به عما اذا دخل بها طوعا حيث لاتصدق في دعوى الرد في الاصح“ (ردالمحتار ۴/ ۱۶۷ مکتبہ زکریا)۔

ناراض تھا،لڑکی کے والد کا حقیقی چچالاولد ہے، اس کی ملکیت زمین وغیرہ کے دباؤ سے لڑکی کا والد اپنے حقیقی چچا سے دبا رہا، لیکن طبیعت اس نکاح کے خلاف رہی، نکاح ہونے کے وقت بھی لڑکی کا والد نکاح میں شریک نہیں ہوا اپنے گھر میں بھی نہیں رہا، اسوقت لڑکی بالغ ہوچکی ہے، معزز حضرات کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود بھی لڑکی کا والد آج بھی ناراض ہے، لڑکی بھیجنے پر کسی حالت میں آمادہ نہیں، کچھ معزز حضرات حافظ ظہور احمد و ابو انوار احمد و حافظ اقبال احمد نے لڑکی کو تنہائی میں الگ بلاکر سمجھایا اور کافی دباؤ دیا کہ جہاں پر تیرا نکاح تیرے دادا نے کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے تم وہیں چلی جاؤ،لڑکی نے سمجھانے کے باوجود بھی جانے سے صاف انکار کردیا، ان حضرات کے سامنے کہا کہ میں وہاں کسی بھی حالت نہیں جاؤں گی ایسی حالت میں کیا یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

مسلم الدین (۷ افریقی منزل دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفيق:

اس نابالغہ کا نکاح اس نابالغہ کے والد کی اجازت پر موقوف تھا، پس اس کے والد نے علم نکاح ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کردیا تو یہ نکاح اس رد کرنے کے وقت ختم ہوگیا (۱)، اب لڑکی کو وہاں بھیجنا بھی جائز نہیں اب وہیں اس نکاح کی بنیاد پر بھیجنا حرام کاری کرانے کے مترادف ہوگا، ہاں اگر لڑکی وہاں جانے کو تیار ہوجائے تو پھر سے چند گواہوں کے سامنے نکاح پڑھا کر بھیجا جائے ویسے ہرگز نہ بھیجا جائے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "في شرح التنوير: فلو زوج الأبعد حال قيام الأقرب توقف على إجازته وفي الشامي تحت (قوله توقف على إجازته) فلايكون سكوته اجازةً لنكاح الأ بعد وإن كان حاضراً في مجلس العقد مالم يرض صريحا أو دلالة تأمل" (ردالمحتار ۱۹۹/۴، کتاب النکاح باب الولی)۔

۲- "نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي عند ابي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى في ظاهر الرواية كذا في التبيين" (ہندیہ ۲۸۷/۱، کتاب النکاح، الباب الرابع فی الاولیاء، مکتبہ دارالکتاب)۔

عدم کفو کی بنیاد پر فسخ نکاح

حمید اور رضیہ میں بے حد محبت ہے رضیہ نے اپنے باپ کو اطلاع کئے بغیر حمید سے نکاح کی تیاری کی، دن اور وقت مقرر کیا، دو گواہ بنائے دونوں بالغ تھے ان کے سامنے ایجاب وقبول ہوا، نکاح نامہ مرتب ہوا فریقین اور گواہ نے دستخط کئے، عرصہ تک بغیر اعلان نکاح کئے زن وشوئی کی طرح زندگی گذاری ہے، جب رضیہ کے باپ زید کو علم ہوا تو اول تو نکاح تسلیم نہیں کیا اور کہتا ہے کہ اگر نکاح واقع ہوگیا ہے تو لڑکے کے ہم کفو نہ ہونے کی وجہ سے مجھے فسخ کرانے کا حق ہے حمید دیندار اور ایم اے تک تعلیم یافتہ ہے، اور رضیہ کا باپ دیندار اور سید خاندان سے ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

کفوء کی تعریف:

کفوء کی کیا تعریف ہے؟

عربی النسل وغیر عربی النسل میں کفوء کا مسئلہ:

☆ کیا ہندوستان میں عربی النسل وغیر عربی النسل کفوء اور غیر کفوء کا مسئلہ معتبر ہے یا کہ نہیں؟

☆ کیا رضیہ اور حمید ہم کفوء ہیں؟

☆ کیا یہ نکاح واقع ہوگیا ہے یا کہ نہیں واقع ہوا ہے؟

☆ کیا زن وشوئی کے تعلقات قائم ہوجانے کے بعد اور ہم کفوء نہ ہونے کی بناء پر زید کو اپنی لڑکی کا نکاح فسخ کرانے کا حق ہے؟

☆ اس دور میں جب عہدہ قضاء کا وجود نہیں ہے فسخ کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

☆ (درمختار علی الشامی) باب الکفائۃ میں ہے: **(الکفائة) من کفاه إذا ساواه والمراد هنا مساواة مخصوصة أو کون المرأة أدنی** اور اس کی تشریح (شامی ۲/۳۴۸) میں ہے:

شعر: ان الکفائة فی النکاح تکون فی ست لها بیت بلیغ قد ضبط

نسب واسلام کذالک حرفة حرية وديانة ومال فقط۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کفائۃ نسب، اسلام، پیشہ، حریت، دیانت اور مال میں یعنی ان باتوں میں مخصوص قسم کی مساوات کا نام ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

☆ عربی النسل قومیں خواہ ہندوستان میں ہوں یا غیر ہندوستان میں ان میں باعتبار نسل کے کفائت معتبر ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: "تعتبر (الکفائة) نسباً فقریش أکفاء والعرب أکفاء" (۱)۔

☆ حمید کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کہ وہ کس خاندان ونسب اور کس پیشہ کا ہے اس کا جواب بغیر اسکے نہیں ہوسکتا ہے جو ۳ کا ہے۔

☆ اس کا بھی وہی جواب ہے۔

☆ **"وله اذا کان عصبة الا عتراض فی غیر الکفوء فیفسخه القاضی (۲)زاد لفظ یسکت للاشارة الی ان سکوته قبل الولادة لایکون رضا (الی قوله) ویفهم منه انه لولم یسکت بل خاصم حین علم فکذالک بالاولی"**

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے کے بعد بھی تم کفوء نہ ہونے کی بناء پر فسخ نکاح کا حق باقی رہتا ہے، لیکن فتوی اس پر ہے کہ بالغہ عورت جو اپنا نکاح بلا اذن ولی غیر کفوء میں کرے اس کا نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: **"ویفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازه أصلاً وهو المختار للفتوی (۳) وفی الشامی تحته وقال شمس الائمة وهذا اقرب الی الاحتیاط کذا فی تصحیح العلامة قاسم"**۔

۶۔ مسلمان حکام جو منجانب حکومت وقت اس قسم کے معاملات فیصل کرنے کے مجاز ہوں اور قاعدہ شرعیہ فقہیہ کے مطابق سماعت وتحقیق واقعہ دار ومدار مقدمہ سب مرتب کر کے فیصلہ دیں تو معتبر ہوگا۔ یا پھر جماعت مسلمین جو کہ کم سے کم تین دیندار با وقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت جو قائم مقام قاضی شرعی کے ہوسکے بقاعدہ شرعیہ فقہیہ سماعت وتحقیق واقعہ دار ومدار مقدمہ وغیرہ مرتب کر کے فیصلہ دے، یہ ایسی جگہوں کا طریق کار ہے جہاں عہدہ قضاء شرعی کا وجود نہ ہو (**الحیلة الناجزه للحلیلة العاجزة**) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید

۱- تنویر علی هامش الشامی ج ۲ ص ۳۴۷ باب الکفاءۃ۔

۲- درمختار علی ہامش الشامی ج ۲ ص ۳۴۷ وفی الشامی ۳۴۸/۲ تحت قولہ مالم یسکت حتی تلد۔

۳- درمختار علی الشامی ۴۰۹/۲۔

لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کرلیا تو کیا حکم ہے؟

شرائط کفو	حمید	رضیہ بالغہ
نسب	غوری	سیدہ
اسلام	قدیم الاسلام	قدیم الاسلام
حریت	آزاد	آزادی
دیانت	پرہیزگار	پرہیزگار
پیشہ	معلمی	کلرکی
دینداری	زیادہ	کم
علم دین	علم دین سے واقف زیادہ	بہت کم واقف

ا۔کیا حمید اور رضیہ ہم کفو ہیں؟

بالغہ رضیہ کو حمید کے حسب نسب کے بارے میں علم ہونے کے باوجود رضیہ نے بلا رضامندی ولی حمید سے عقد کرلیا اور زن وشوئی کی زندگی بسر کی۔

(الف) کیا یہ نکاح واقع ہوگیا یا کہ نہیں؟

(ب) اگر نکاح نہیں ہوا ہے تو کیا زن وشوئی کے تعلقات حرام کاری کے مترادف ہوئے؟

۲۔امام محمدؒ نے اپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ (الف) ایسی حالت میں بالغہ عورت کا نکاح جائز ہے گو ولی کی اجازت اور رضامندی نہ ہو، ملاحظہ ہو حاشیہ علم الفقہ ص ۷۲ مصنفہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوئیؒ باب النکاح۔

(الف) غیر عربی النسل عربی النسل کا کفو نہیں ہوسکتا ہے، اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ اگر غیر عربی النسل علم دین کا عالم ہو تو وہ عربی النسل بلکہ خاص قریشی عورت کا جو علم سے بے بہرہ ہو کفو ہو جائے گا (منقول از علم الفقہ جلد ششم ص ۲۷)۔

(ب) دار الافتاء فرنگی محلی کا فتوی ہے کہ نکاح واقع ہوگیا۔

(ج) دار الافتاء دار العلوم) دیوبند کی کیا رائے ہے۔

(۳) کیا آپ اپنے فتوی کے جواز میں ہیں، یعنی غیر کفو میں بلا رضامندی والدین نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا ہے؟

(الف) کسی آیت قرآن مجید یا حدیث شریف کا حوالہ دیں گے۔

(ب) بالفرض امام حسن ابن زیاد اور امام محمدؒ میں اختلاف ہے اور بالفرض حسن بن زیاد کا قول مرجوح ہے تو کس بناء پر؟

(ج) براہ کرم کسی ایسے اسلام کے مسلک کی رہنمائی کردیجئے جو حنفی مسلک کے مقابلے میں زیادہ وسیع النظر ہو۔

۴۔ حمید کہتا ہے کہ حنفی فقہ میں ماوراء النہر کے ذریعہ ہم تک پہونچنے میں کافی حد تک تحریف ہوگئی ہے ورنہ اسلام میں بہت وسعت ہے، بالفرض اسلام کی نام نہاد مساوات اتنی تنگ ہے تو نعوذ باللہ، میں پھر ایسی مسلک سے وابستہ ہوجاؤنگا، اس سبب سے میں نے تشفی بخش جواب کے لئے درخواست کی ہے، کیونکہ ارتداد کا بھی اندیشہ ہے، اسوقت تک حمید بہت دیندار ہے اور دیندار خاندان سے تعلق ہے۔

سائل شوکت علی

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جدول کے اندر حمید کو پرہیز گار، زیادہ دیندار علم دین سے زیادہ واقف دکھلایا گیا ہے اور پھر آخیر حصہ سوال میں اسکے عقیدے اور ایمان کا جو حال لکھا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ ایک عورت کی محبت وعشق میں اس کے مرتد تک ہوجانے کا اندیشہ ہے، نیز مسلک حنفی کو محرف اور غیر صحیح سمجھتا ہے جس کے حق ہونے پر اجماع امت ہے، نیز اس موجودہ اسلام کو ترک کر کے ایسے اسلام کی جانب رہنمائی کا خواہاں ہے جو مسلک حنفی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہو، یہ سب چیزیں اس کی انتہائی بدعقیدگی، ضعف ایمانی بلکہ زندیقیت کی جانب مشعر ہیں، پھر اس کو دیندار و پرہیز گار کس طرح کہا جارہا ہے؟ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ کمال ایمان کی دلیل یہ ہے کہ انسان دنیا کے آگ میں جل جانا اختیار کرے مگر آخرت کی آگ میں جانا گوارہ نہ کرے چہ جائے کہ محض حظ نفس کی خاطر قبول ارتداد پر تیار ہوجاوے اور قبول ارتداد کے بعد دخول نار جہنم میں کوئی شبہ نہیں العیاذ باللہ) اگر جدول کا مفہوم صحیح ہے تو اس متضاد تحریر کا کیا منشا ہے اور اس سے کیا مفہوم ہوتا ہے؟ ذرا غور سے سوچئے کیا جس طرح فقہ حنفی کو ماوراء النہر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچنے ہی کی وجہ سے محرف وغیر صحیح سمجھتا ہے، اسی طرح کیا وہ احادیث کو بھی محرف نا قابل قبول نہیں سمجھ سکتا؟ جبکہ اکثر ذخیرہ حدیث بھی ماوراء النہر کے ہی ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے اور جب اس کا یہی اصول ہے تو وہ کلام الٰہی کو بھی محرف وغیر معتبر (نعوذ باللہ) کہہ سکتا ہے، اس تحریر سے چند اور دعوی بھی ظاہر ہو۔تے ہیں مثلاً

یہ کہ وہ صرف قرآن کریم وحدیث ہی میں دلیل شرعی کو محصور سمجھتا ہے، اجماع وقیاس کا منکر ہے، پھر اپنے کو مجتہد بھی سمجھتا ہے جیسا کہ سوال ۳۔ کے الف وباء سے ظاہر ہوتا ہے، خود غور کیجئے ایسا آدمی دیندار ہوگا یا بددین ونفس پرست ومشغوف بحب النساء، برادرم نادان کی دوستی بسا اوقات بجائے نفع دینے کے مضر بھی ہوجاتی ہے، اگر کچھ لکھنا ہی تھا تو صرف اتنا لکھتے کہ دارالعلوم کے فتوی کے خلاف فرنگی محل لکھنوی کا یہ فتوی ہے اوران کے یہ دلائل ہیں، اب ہم کیا کریں؟ بہر حال آپ نے فرنگی محل لکھنو کے دلائل تو لکھے نہیں یہ تو وہ حضرات جانیں البتہ علم الفقہ سے جو استدلالات آپ نے لکھے ہیں وہ آپکے لئے مفید مطلب نہیں، علم الفقہ باب النکاح ص۲۶ سے جس عبارت کا حوالہ آپ دے رہے ہیں وہ بہت مبہم اورنا کافی بلکہ نا تمام ہے۔

امام محمد سے جو قول بھی منقول ہے اسکا پورا مفہوم یہ ہے کہ نکاح بغیر الکفوء ولی کی اجازت ورضامندی کے بغیر منعقد تو ہوتا ہے مگر موقوف رہتا ہے نافذ نہیں ہوتا ہے، ولی نافذ کرے گا تو نافذ ہوگا اور اگر فسخ کردے تو فسخ ہوجائے گا اور جب ولی فسخ کردے گا تو قاضی کے نافذ کرنے سے بھی نافذ نہ ہوگا، حتی کہ بعد اجازت دوبارہ پھر سے تجدید نکاح نہ کرلیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس دوران میں جو اولاد یں پیدا ہوں گی وہ اس شخص کی جائز وارث نہ ہوں گی ''کما صرح به في المبسوط (ج ۵ ص ۱۳) ومحمد يقول: لما توقف العقد على إجازة الولي لتمام الاحتياط فكما ينعقد بإجازته لينفسخ بفسخه و بعد ما يفسخ ليس للقاضي ان يجيزه ولكن يستقبل العقد إذا تحقق العزل (ثم بعد اسطر) وعلى قول محمد لا يتوارثان، لأن أصل العقد كان موقوفاً وفي العقد الموقوف لا يجري التوارث الخ''

یہاں ولی کو اعتراض ہے اوراسپر یہ سب طومار ہے، لہذا ایسا نکاح نافذ نہ ہوگا اورایسی صورت میں تعلق زن وشوئی غلط اورحرام ہوگا، علم الفقہ کی عبارت میں یہ سب تفصیلات نہیں، لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہے، یہی حال علم الفقہ ص ۲۷ کی عبارت کا بھی ہے جس کو شامی کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس عبارت میں شامی کے استثناء پر قیاس کیا گیا ہے اوروہ قیاس مع الفارق ہوگیا ہے جس سے استدلال صحیح نہیں الخ علامہ شامی ہر عالم کو مستثنی نہیں فرمارہے ہیں بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ اورحسن بصری رحمہا اللہ جیسے معظم ومسلم مقتدا عالم دین کو مستثنی فرمارہے ہیں: ''قال العلامة ابن عابدين الشامي: " وكيف يصح لأحد أن يقول: إن مثل أبي حنيفة والحسن البصري و غيرهما ممن ليس بعربي انه لا يكون كفؤ البنت قرشي جاهل أو لبنت عربي بوال على عقبيه الخ''(۱)۔

۱- شامی ج۲ ص ۴۲۳ باب الکفائۃ۔

اور یہ کلیہ مسلم ہے کہ مثال ممثل لہ کی وضاحت وتبیین کے لئے ہوتی ہے، اس مثال سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کی مراد ہر عالم نہیں ہے بلکہ وہ عالم دین مراد ہے جو ایسا برگزیدہ محترم اور مسلم مقتداء ہو کہ قریش وسادات کو بھی اس کے عقد میں لڑکی دینے سے عار نہ ہو، چہ جائیکہ ایسا عالم جس کا حال وہ ہے جو سوال میں مذکور ہے، نیز اس کے ولی کو ایسی عار لاحق ہو جس پر یہ شدید نزاع واقع ہو، غرض ان جزئیات سے آنجناب کی متصد براری دشوار ہے، پہلے استفتاء میں حمید کے نسب کے بارے میں سکوت تھا، اس لئے اس کے جواب میں کچھ نہ لکھا گیا تھا کہ یہ نکاح ہوا یا نہیں، اب لکھا جاتا ہے کہ اگر حمید ورضیہ دونوں زن وشوئی رکھنا چاہتے ہیں تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ رضیہ کے ولی اقرب کو راضی کر کے اس کی اجازت اور رضامندی سے پھر سے جدید نکاح کر دیا جائے اور جب تک نکاح جدید بعد اجازت ورضاء ولی اقرب نہ ہو جائے قطعاً دونوں الگ الگ رہیں، ہرگز یکجا نہ ہوں ورنہ جتنی اولادیں اس درمیان میں ہوں گی وہ سب غیر ثابت النسب ہوں گی اور دونوں ہمیشہ حرام کاری کے جرم میں وگناہ کے مرتکب رہیں گے اور اس کے وبال دنیوی اور اخروی میں مبتلا ہوں گے، یہ حکم شرعی تو خود ان دونوں زن وشوہر کے ہیں، رضیہ کے ولی کو جب شریعت مطہرہ نے حق اعتراض وحق فسخ دیدیا ہے اور وہ اسے ہی استعمال کر رہا ہے تو اس کو تو کوئی حکم دوسرا نہیں دیا جا سکتا ہے، البتہ مشورہ بھی خواہانہ دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کے تعلق سے جو رسوائی وبے عزتی ہوئی تھی ہو چکی کسی قیمت وشکل سے واپس نہیں آسکتی ہے، بلکہ اس رشتہ کو منقطع کرنے اور مخالفت کرنے میں لڑکی کے اور آوارہ اور خراب ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے اور ایسی صورت میں سارے خاندان کی بھی آئندہ رسوائی در رسوائی محتمل ہے اور بخلاف اس کے اس رشتہ کو قائم کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ دونوں ہی سدھر جائیں گے اور اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اخروی زندگی بنانے کی فکر میں لگ جائیں جس سے یہ عار اور رسوائی بالکل ختم ہو جائے، یا کم از کم ہلکی وبے اثر سی ہو جائے اور اولادیں بھی صحیح النسب ہوں، انکی حفاظت پر بھی نظر شفقت ایک درجہ میں ضروری ہے۔

پس ایسی صورت میں ولی رضیہ کو بھی خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ اس کیلئے بہتر صورت یہ ہے کہ اس رشتہ کو اپنی اجازت ورضامندی سے نکاح جدید کے ذریعہ قائم کرا دے اور پھر خوش اخلاقی وحسن برتاؤ سے خود بھی اور کسی اللہ والے مصلح عالم دین کی مدد سے دونوں میں جذبہ دینداری وصحیح تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے اور معاملہ اللہ کے حوالہ او سپرد کر دے۔

(نوٹ) اتنی تحریر سے جواب مسئلہ تو منقح ہو گیا ہے باقی جو مطالبات ہیں انکا مستفتی کو حق نہیں ہے تسکیناً للخاطر اور تبرعاً اتنا عرض ہے کہ کم از کم مبسوط للسرخسی، وفتح القدیر باب الاولیاء والاکفاء کا مطالعہ دیانت سے سمجھ کر کر لیں تو آیات واحادیث ووجہ استدلال وترجیح سب کا علم ہو جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی کسی کو اطمینان اور تشفی نہ ہو اور خروج عن الاعتدال

یا طغیان عن الشرع کرے تو خودغور کر کے دیکھ لے کہ نقصان کسکا ہے خود اس کا ہے خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق وہی ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفوء میں نکاح کرنا:

لڑکی اپنی اور اپنی ماں کی مرضی سے ولی کے ہوتے ہوئے غیر برادری میں نکاح کرلے تو کیا ایسا نکاح ہوگا یا نہیں، اور اگر لڑکی بالغ ہے اور نکاح ہوجائے تو ولی کو قاضی کے نکاح توڑ دینے کا حق ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر ولی کی اجازت کے اگر بالغہ لڑکی غیر کفو میں اپنا نکاح کرلے گی تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

"ویفتی فی غیر الکفو بعدم جوازہ اصلا وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان" (۱)۔

بالغہ لڑکی پر ولی کی ولایت مستحبہ ہے جبری نہیں ہے اس لئے وہ اپنے نفس کی مختار ہے جہاں چاہے نکاح کرے لیکن اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ایسے شخص سے نکاح کرے جس سے لڑکی کے خاندان والوں کی بے عزتی اور تحقیر ہوتی ہو اسی کو غیر کفو کہا جاتا ہے، اگر ایسے شخص سے بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کرے گی تو ولی کو اس کے فسخ کرانے کا اختیار رہتا ہے کہ حاکم وقت مسلم سے فسخ کرالے۔

نکاح پڑھانے والا قاضی فسخ نہیں کرسکتا ہے، متاخرین فقہاء کرام کا فتویٰ اس زمانہ فساد میں یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح کرنے سے نکاح ہوتا ہی نہیں جو جواب میں مذکور ہے کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور قطعاً جائز نہ ہوگا۔ مگر ہندوستان میں مغل اور پٹھان آپس میں کفو سمجھے جاتے ہیں، بہت سے مقام میں دونوں میں رشتہ داریاں ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اگر لڑکی کے خاندان کی اس نکاح سے بے عزتی ہے تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند محمود غفی عنہ

۱- (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۳۰۵) عبدالرحمٰن غفرلہ مدرسہ امینیہ دہلی الجواب صحیح الجواب صحیح ۵/۱ رجب ۵۸ھ۔

راجپوت، شیخ صدیقی کا کفو نہیں:

ہم حنفی ہیں، واقعہ اس طرح ہے کہ میری ایک عزیزہ نے جو کہ بالغ ہے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر خاموشی سے اپنا نکاح کرلیا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اصل نکاح کی اطلاع ملنے پر لڑکی کے والدین چونکہ اس رشتہ کو پسند نہیں کرتے تھے، لڑکی کو بہت زور دیکر طلاق کے لئے تیار کرلیا، لڑکے کے ماں باپ نے بھی اس نکاح کو پسند نہیں کیا ہے، انکے مجبور کرنے کے بعد طلاق دلوائی، اس واقعہ کا اثر لڑکے اور لڑکی پر بہت ہوا، لڑکی کی صحت روز بروز بگڑنے لگی اس واقعہ کو قریب چار سال ہوگئے ہیں اس دوران میں ہر طرح کا علاج کیا مگر لڑکی کی صحت بدستور رہی اور اب گمان غالب ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو وہ سال ڈیڑھ سال میں اپنی زندگی کے اختتام کو پہنچے گی۔

دوسری جگہ رشتہ کی کوئی امید نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا کامیاب رہنا محال نظر آتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ لڑکا راجپوت مگر حنفی عقیدہ کا ہے اور لڑکی شیخ صدیقی ہے، کفو کے بارے میں تحریر فرماویں، اب اس حالت میں معلوم کرنا ہے کہ لڑکی کا نکاح اس لڑکے سے پھر کیا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

راجپوت شیخ صدیقی النسل کا کفو نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں لڑکی کا اپنے والدین کے خلاف مرضی نکاح منعقد و صحیح بھی نہیں تھا، اس لئے طلاق بھی واقع نہیں ہوئی تھی (۱) لیکن جب لڑکی اور لڑکے میں اس درجہ کی محبت ہوچکی تھی تو لڑکی کے والد کے لئے مناسب تھا کہ راضی ہوکر پھر سے نکاح پڑھوا دیتا، بہر حال اب بھی جب صحت اور محبت کا یہ حال ہے تو طرفین کے والدین کے لئے مناسب ہے کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ دونوں کا آپس میں نکاح پڑھوا کر تعلق زن وشوئی قائم کرادیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”وتعتبر الكفاءة للزوم النكاح (الدر المختار) وقال الشامي للزوم النكاح اى على ظاهر الرواية ولصحته على رواية الحسن المختار للفتوى ردالمحتار ۴/۲۰۹، مکتبہ زکریا)۔

باب المہر والجہاز

ادائیگی مہر میں کس وقت کے سکہ کا اعتبار ہوگا؟

دار القضاء امارت شرعیہ مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ کی عدالت میں ایک ساٹھ سالہ بیوہ خاتون نے اپنے زرمہر کی وصولی کا مقدمہ دائر کیا ہے جو زوج کے مال متروکہ سے ادا ہوگا، مقدمہ کی نوعیت اور فقہاء کی تصریحات کی وجہ سے کچھ شبہات ہیں جن کا تعلق قصور فہم سے زیادہ ہے، امید ہے کہ مسئلہ مذکورۃ الذیل کے چند پہلوؤں پر مدلل جواب سے نوازا جائے گا۔

دعوی اس خاتون کا یہ ہے کہ میرا نکاح پچاس سال پہلے ہوا، مہر پانچ سو روپیہ مقرر ہوئے، شوہر کے انتقال کے بعد اب مجھکو ترکہ میں سے میرا مہر دین اس طرح ملنا چاہئے کہ پچاس سال پہلے چاندی کے سکے رائج تھے، لہذا اب مجھے اس وقت کے پانچ سو روپئے کے سکے کی قیمت موجودہ زمانہ کے سکے کے حساب سے دس ہزار ملنا چاہئے۔ عدالت اسلامیہ مجھے اس وقت دس ہزار روپئے دلوائے۔

اب قابل تحقیق امر یہ ہے کہ مہر کی رقم میں عقد نکاح کے وقت کا مروجہ سکہ پانچ سو روپئے (جس کی قیمت دس ہزار روپئے ہے) ادا کرنا ہوگا یا جس وقت مہر ادا کیا جا رہا ہے اس وقت کا رائج سکہ پانچ سو روپئے ادا کرنا ہوگا۔

یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ بوقت نکاح عموماً دو طرح کی تعبیر ہوتی ہے:

الف- تمہارا نکاح پانچ سو روپئے سکۂ رائج الوقت کے عوض کر دیا۔

ب- کبھی بغیر قید سکۂ رائج الوقت کہا جاتا ہے کہ پانچ سو روپئے پر تمہارا نکاح کر دیا، کیا ہر دو تعبیر کا حکم ایک ہی ہوگا؟ جبکہ مہر عموماً اس دیار میں عرفاً موجل نہیں ہوتا ہے۔

ج- اگر کسی نے ساٹھ سال قبل کسی سے قرض سو روپئے لئے اور اب اس کی ادائیگی کرنا چاہتا ہے تو وہ موجودہ سکہ میں سو روپئے ادا کر دینے سے بری الذمہ ہو جائے گا یا ساٹھ سال پہلے کے رائج اور دئیے ہوئے سکہ کی قیمت موجودہ سکہ کی شرح میں ادا کرنا ہوگا، بر تقدیر ثانی کیا موجب ربوا ہوگا یا نہیں، کیا مسئلہ مہر کو قرض پر قیاس کر کے علما متحد مانا جائے گا علامہ

شامی نے مطلب مہم فی احکام النقود اذا کسدت او انقطعت او غلت اور رخصت میں جو تفصیلات ذکر کی ہیں کہ باب قرض و بیع میں یوم القرض اور یوم البیع کی قیمت واجب نہ ہوگی اور یہی مفتی بہ ہے، اس تفصیل پر اگر یوم القرض کے سکہ اور مالیت کا اعتبار ہوتو پھر کیا یہ مفضی الی الربا ءاور سبب انفتاح ابواب ربا کا باعث ہوگا یا نہیں، بہر حال اب مہر کی ادائیگی کس شرح سے شرعا واجب ہوگی براہ کرم اس کی وضاحت شرعی بنیادوں پر فرمائی جائے۔

محمد قاسم مظفر پوری (خادم التدریس والقضاء الشرعی، مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ بہار)

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی تنقیح تو اس مقدمہ میں یہ ہوگی کہ شوہر کے انتقال کو کتنا زمانہ گزرا، اگر ابھی حال میں انتقال ہوا ہے جب تو دعوی قابل سماعت ہونے میں شبہ نہیں، یا انتقال شوہر کو زمانہ دراز گذرا ہے لیکن مدعا علیہم کو مہر کا باقی رہنا تسلیم ہے یا زوجہ نے مہر کا مطالبہ کیا تھا اور ابھی تک کامیاب نہ ہوسکی، اس لئے کہ یہ دعوی جب ہی دعوی قابل سماعت ہوگا اور اگر انتقال زوج کے بعد زوج کی کوئی جائیداد فروخت ہوئی مگر زوجہ نے مہر کا مطالبہ نہیں کیا تو استصحاب حال کی بنیاد پر اور السکوت فی معرض البیان بیان کے اصول پر نیز علامہ شامی کی اس تصریح کی بناء پر کہ **اذا ترک الدعوی ثلثة وثلاثین سنة لا تسمع**(۱) دعوی قابل سماعت ہی نہ ہوگا، غرض جب دعوی قابل سماعت ہوجائے تو پھر یہ تنقیح ہوگی کہ انعقاد عقد میں مہر صرف پانچ سو روپیہ مقرر ہوا یا پانچ سو روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا، اگر سکہ رائج الوقت کی قید کے ساتھ مقرر ہوا تو عرف میں رائج الوقت بوقت ادا مراد ہوتا ہے پس اس صورت میں اس وقت کا پانچ سو روپیہ واجب الاداء ہوگا۔

اور اگر سکہ رائج الوقت کی قید نہیں تھی تو اس صورت میں وقت عقد کا پانچ سو روپیہ ادا ہوگا اور اس صورت میں یہ تنقیح ضروری ہوگی کہ پچاس سال پہلے (بوقت عقد) جو روپیہ تھا وہ غالب الغش تھا یا مغلوب الغش تھا اگر اس وقت سکہ غالب الغش تھا تو قیمت واجب الاداء ہوگی اور امام محمد کے نزدیک رفقا بالناس یوم الکساد کی قیمت واجب الاداء ہوگی اور امام یوسفؒ کے نزدیک یوم العقد کی قیمت واجب الاداء ہوگی، اور فتوی بعض فقہاء کے نزدیک امام محمد کے قول پر ہے اور بعض فقہاء کے

۱- ''إذا ترک الدعوی ثلاثاً وثلاثین سنة ولم یکن مانع من الدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواہ، لأن ترک الدعوی مع التمکن یدل علی عدم الحق ظاهراً، وفی جامع الفتوی عن فتاوی العتابی: قال المتأخرون من أهل الفتوی: لا تسمع الدعوی بعد ست وثلاثین سنة إلا أن یکون المدعی غائباً أو صبیاً أو مجنوناً ولیس لهما ولی أو المدعی علیه أمیراً جائراً اهـ'' (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۱۷)۔

نزدیک فتوی امام ابو یوسف کے قول پر ہے، لہذا گنجائش دونوں پرعمل کی نکل آتی ہے، سہولت جس شق کو لینے میں ہو عمل کرسکتے ہیں اور اگر اس وقت سکہ مغلوب الغش تھا تو روپیہ چونکہ چاندی کے سکہ کا نام ہے اس لئے اس وقت سکہ میں جتنی مقدار چاندی کی تحقق ہو اس مقدار سے کچھ زائد چاندی شبہ ربوا سے بچنے کی غرض سے واجب الادا ہوگی، ہاں اگر عورت چاہے تو اتنی چاندی کی اس وقت کی قیمت یا کوئی جائداد یا عروض بھی لے سکتی ہے اور اگر اس وقت کے سکہ میں چاندی کی مقدار متعین کی تحقیق نہ ہو سکے تو اس مقدار کا تخمینہ لگا کر جنس بدل سونے کے جنس سے ادائیگی واجب ہوگی، ہاں اگر عورت آج کے سکہ سے اس کی قیمت لینے پر یا کوئی جائداد یا عروض لینے پر راضی ہو تو یہ بھی لے سکتی ہے، احقر کے نزدیک حکم مسئلہ یہی نکلتا ہے اور ماخذ کے لئے شامی ۴۴۳-۴۴۵ اور شامی ج ۴، ص ۲۵، ۲۴ کا دیکھنا بھی کافی ہوگا (۱)، اور اگر مزید تحقیق مطلوب ہے تو فتاوی خیریہ کا اور تنقیح فتاوی حامدیہ کا مطالعہ بھی کرلیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مہر کی ادائیگی میں کس سکہ کا اعتبار ہوگا؟

۱- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر مثلاً پانچ سو روپے مقرر کئے جائیں تو بوقت ادائیگی کتنے روپئے ادا کرنے پڑیں گے؟

۲- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر اشرفی مقرر کی جائے تو روپئے کی شکل میں اشرفی کی کس وقت کی قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ نکاح کے وقت کی یا ادائیگی کے وقت کی؟

۳- اشرفی کیا چیز ہے اور اس کا وزن کیا ہے۔ اسی طرح دینار اور درہم کیا چیز ہے اور ان کا وزن کیا ہے؟

محمد علی (امام جامع مسجد ولاگر ہر، ضلع بیگوسرائے بہار)

الجواب وباللہ التوفیق:

مرکزی دارالافتاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ خانقاہ رحمانی مونگیر سے نمبر ۱ کا جواب دیا گیا کہ بوقت نکاح پانچ سو

۱- سماع دعوی کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۱۵-۱۱۷) اور غالب الغش یا مغلوب الغش روپیوں کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۵۵، ۵۶) پر تفصیل موجود ہے

روپے کا جتنا سونا ملتا تھا۔ اب ادائیگی کے وقت اتنے سونا کے بدلے جتنے روپئے ملتے ہوں وہ روپئے ادا کرنے پڑیں گے چاہے وہ پانچ سو سے کم ہوں یا زیادہ اس جواب کا ماخذ امام ابو یوسف کا قول ہے جو مفتی بہ ہے عبارت درج ذیل ہیں:

"وقال الثانی ثانیا علیه قیمتها من الدراهم یوم البیع والقبض وعلیه الفتوی" (۱) "ای یوم البیع فی البیع ویوم القبض ومثله فی النهر فهذا ترجیح لخلاف ما مشی علیه الشارح ورجحه المصنف ایضا کماقدمناه فی فصل القرض وعلیه فلا فرق بین الکساد والغلاء فی لزوم القیمة" (۴/۳۳۵)۔

سوال نمبر ۲: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی کی قیمت وہ ادا کرنی پڑے گی جو ادائیگی کے وقت ہے نہ کہ وہ قیمت جو بوقت نکاح تھی جیسا کہ شامی ۴/۳۳:

"اعلم ان الذی فهم من کلامهم ان الخلاف المذکور انما هو فی الفلوس والدراهم الغالبة الغش ویدل علیه انه فی بعض العبارة اقتصر علی ذکر الفلوس وفی بعضها ذکر العدالی معها وهی کما فی البحر عن البنایه بفتح العین المهملة والدال وکسر اللام دراهم فیها غش وفی بعضها تقیید الدراهم بغالبة الغش وکذا تعلیلهم قول الإمام ببطلان البیع بان الثمنیة بطلت بالکساد لان الدراهم التی غلب غشها انما جعلت ثمنا بالاصطلاح فإذا ترک الناس المعاملة بها بطل الاصطلاح فلم تبق ثمنا فبقی البیع بلا ثمن فبطل ولم ار من صرح بحکم الدراهم الخالصة او المغلوبة الغش سوی ما افاده الشارح هنا وینبغی انه لاخلاف فی انه لایبطل البیع بکسادها ویجب علی المشتری مثلها فی الکسا دوالانقطا ع والرخص والغلاء اما عدم بطلان البیع فلا نها ثمن خلقة فترک المعاملة بها لا یبطل ثمنیتها فلا یتاتی تعلیل البطلان المذکور وهو بقاء البیع بلا ثمن واما وجوب مثلها وهو ما وقع علیه العقد کمائة ذهب مشخص او مائة ریال فرنجی فلبقاء ثمنیتها أیضا وعدم بطلان تقومها" (۲)۔

سوال نمبر ۳: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی سونا کی ہوتی ہے جس کا وزن دس ماشہ ہوتا ہے جیسا کہ لغات کشوری میں ہے اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے اور درہم چاندی کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے تین ماشے ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ فتاویٰ دارالعلوم جدید مرتبہ مفتی ظفیر الدین میں ہے۔

محمد علی (امام جامع مسجد ولا گرہر، ضلع بیگوسرائے بہار)

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/۵۵۔

۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/۵۶، ۵۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

سوال نمبر ۲و۳ کے جواب سے احقر کو اتفاق ہے۔

البتہ سوال نمبر ا کے جواب سے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ سوال میں صراحت ہے کہ نکاح کے وقت پانچ سو روپئے دین مہر مقرر ہوئے پانچ سو اشرفی مقرر نہیں ہوئی ہے اور روپیہ چاندی کے سکہ کا نام ہے پس اس کو سونے میں منتقل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سیدھا سادہ حکم یہ ہے کہ وہ پانچ سو روپیہ کیا تھا نوٹ تھا یا سکہ۔

اگر نوٹ تھا تو اس نوٹ کی اس وقت جتنی چاندی ملتی تھی وہی چاندی مہر شمار ہوگی اور وہی چاندی یا اس کی جو قیمت اس وقت کے نوٹ سے ہوتی ہو اتنے نوٹ دلائے جائیں اور اگر وہ پانچ سو روپیہ نوٹ نہیں تھا بلکہ سکہ تھا تو سکہ دو حال سے خالی نہیں غالب الغش تھا تو اس وقت اس غالب الغش کی جتنی چاندی ملتی تھی اتنی چاندی مہر ہوگی اب اتنی چاندی آج کل کے جتنے روپئے میں ملے اتنے روپئے آج کل کے نوٹ سے دیئے جائیں

اور اگر وہ پانچ سو روپیہ مغلوب الغش سکہ تھا تو چونکہ روپیہ ہر زمانہ میں ایک تولہ کے برابر شمار ہوا ہے اس لئے اس پانچ سو روپیہ کے پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوں گے اور وہ مہر پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوگی اور پانچ سو تولہ چاندی آج کل جتنے نوٹوں سے ملے اتنے نوٹ دینے ہوں گے اور دلیل میں حضرت امام ابو یوسف کا ہی قول اختیار کریں گے کیونکہ وہی مفتی بہ ہو چکا ہے اور اشبہ بالفقہ ہے(۱)۔

باقی علماء کرام کی بحثیں بھی احقر کی سمجھ میں نہیں آئیں اسلئے ان سے بھی اتفاق نہیں ہے۔

هذا ما ظهر لي فان كان صوابا فمن عند الله وان كان خطأ فمن نفسي ومن الشيطان فنعوذ بالله من شرور انفسنا ومن خدع الشيطان، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۱۴۰۱ھ

مہر میں اشرفی طے کرنا:

زید نے ۱۹۵۳ء میں ہندہ سے شادی کی اور مبلغ دس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت و گیارہ اشرفیاں مہر مقرر کیا، جبکہ اس سے برسوں قبل اشرفی کا رواج بند ہوگیا تھا۔ اب ۱۹۸۲ میں ہندہ مہر کی طلبگار ہے اور زید بھی اس دین کو ادا کرنا چاہتا ہے،

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/۵۵، ۵۶۔

اشرفی کا وجود اس وقت بھی ہندوستان میں نا پید ہے، یعنی ملک میں اس کا رواج اس وقت بھی نہیں ہے تو زید اس مہر کو کس طرح ادا کرے گا۔ بعض لوگ ایک اشرفی کو ایک تولہ سونے کے برابر قرار دے کر ایک تولہ سونا کی قیمت دو ہزار روپیہ قرار دے کر گیارہ اشرفیوں کو بائیس ہزار کی مالیت کے برابر کا مطالبہ کرتے ہیں از روئے شرع زید پر کتنی رقم واجب الادا ہوگی؟

محمد فروز عالم

الجواب وباللہ التوفیق:

بہار کے علاقہ میں عموماً شیر شاہ سوری کی اشرفیاں رائج تھیں اور وہ صرف اٹھنی کے برابر ہوتی تھیں پس اس کے مطابق صرف ۵ ۲؍۱ (ساڑھے پانچ) تولہ سونے کی موجودہ قیمت دینی ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زوجین کے درمیان مہر میں اختلاف ہو تو مہر کتنا واجب ہوگا؟ نیز مہر شرعی کی تحقیق:

میری لڑکی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہے اور مہر شرع محمدی بوقت نکاح طے ہوا تھا، لڑکی نے اپنے مہر وصول کرنے کیلئے عدالت میں چارہ جوئی کی ہے، آپ یہ بتائیں کہ مہر شرع محمدی کی کتنی تعداد ہے، لڑکی اپنا مہر ایک ہزار روپیہ طلب کر رہی ہے، کیونکہ بوقت نکاح اتنے ہی متعین ہوئے تھے اور اس کا خاوند ۴؍۲۷ ادا کرنا چاہتا ہے اس کا شرعی حکم اس معاملہ میں مطلع فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب بوقت نکاح مہر ایک ہزار روپیہ طے ہو گئے تھے، جیسا کہ عورت کا دعوی ہے تو اب مہر شرع محمدی کتنے بھی ہوں جتنے مہر بوقت نکاح طے ہوئے تھے اتنی دینا واجب ہوگا، اگر خاوند اس سے انکار کرتا ہے تو لڑکی پر بینہ و ثبوت پیش کرنا واجب ہوگا، اگر بینہ اور ثبوت پیش کردے تو فیصلہ اس کے مطابق ہوگا، اور اگر عاجز رہے تو خاوند سے حلف لیں گے جو حقدار کہے گا فیصلہ اس پر ہوگا۔ باقی مہر شرع محمدی کی محض تحقیق تو ہر جگہ کے عرف کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور مہر فاطمی کو بھی کہتے ہیں، اگر مہر فاطمی مراد ہے تو مہر فاطمی تقریباً ۱۳۲ تولہ بھر خالص چاندی کے برابر ہوتی ہے چاندی کا جو نرخ

جس زمانہ میں ہوگا اس وقت اس کے اعتبار سے قیمت لگا کر مقدار معلوم کرلیں گے، مثلاً آجکل چاندی اگر تین روپیہ بھر ہوتو ۱۳۲ تولہ چاندی کا دام تقریباً ۳۹۶ روپیہ ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنا ئب مفتی دارالعلوم دیوبند

جنابت کا غسل نہ کرنے سے کیا عورت مرد پر حرام ہوجاتی ہے اور اس کا مہر مرد پر واجب ہوتا ہے؟

ایک آدمی کی شادی کسی غیر عورت سے ہوتی ہے، دونوں میاں بیوی ہمبستر بھی ہوئے ہیں اور صحبت بھی کرتے ہیں، لیکن عورت کبھی غسل نہیں کرتی ہے، اس کو کہا بھی جاتا ہے کہ غسل کیا کرو، لیکن کبھی غسل نہیں کرتی، تو کیا ایسی عورت ایک مسلمان مرد پر حلال ہے؟ اگر اس کا خاوند اس وجہ سے اس کو طلاق دیدے تو کیا اس پر مہر واجب ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر واجب ہے تو کیوں؟ جبکہ عورت اسلامی اصولوں پر نہ چلے۔

الجواب وباللہ التوفیق

اگر کوئی عورت مباشرت اور مجامعت کے بعد غسل نہیں کرتی تو اپنے شوہر پر حرام نہیں ہوجاتی ہے، البتہ ایسی عادت ڈالنا سخت گناہ ہے اور کبھی غسل نہیں کرتی تو نماز وغیرہ کیسے پڑھتی ہوگی، ایسی عورت کو طلاق دینا شوہر پر واجب نہیں ہے، **"لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرۃ"**(۱)۔

جہاں تک ہوسکے سمجھا بجھا کر ڈانٹ پھٹکار کر اس کی اصلاح کرے ثواب ملے گا، اگر سمجھانے سے نہ مانے تو اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اگر پھر بھی نہ درست ہو تو ہلکی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو **"واللتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن"** (۲)۔

اگر پھر بھی نہ مانے تو ہمیشہ یہی خیر خواہی سے سمجھاتے رہیں اور اس سے خوش نہ ہو، لیکن حقوق زوجیت نان نفقہ ادا کرتے رہیں تو خود گنہگار نہ ہوں گے بعبر پورا واجب ہوگا مہر تو استمتاع بالبضعہ کا عوض ہے اور اس کو یہ حاصل کر چکا ہے اور یہ

۱- الدرالمختار فصل فی المحرمات ۴/ ۱۴۴۔

۲- سورۂ نساء ۳۴۔

سب خرابیاں معاشرہ اور رہائش کی ہیں، اور اس کا تعلق مہر سے نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود غنی عنہ

ناشزہ عورت اوراس کے مہر وغیرہ کا حکم:

ایک عورت اپنے شوہر کی نافرمان ہوئی اور بغیر اذن زوج خود بھاگ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے، زوج کے خلوت صحیحہ سے انکار کرتی ہے، شوہر کے گھر کو آباد کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتی ہے، اگر ایسی عورت کو شوہر طلاق دینا چاہے تو شوہر پر نان ونفقہ اور مہر دینا لازم ہوگا یا کہ نہیں، کیا ناشزہ کی تعریف میں اسکو شمار قرار دیا جائے گا اور عورت نافرمان کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

زوج اپنی مدخولہ بیوی کو جب بھی خود طلاق دیگا تو نان ونفقہ عدت کا اور مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورت خود طلاق طلب کرے اور اپنا نان ونفقہ اور مہر معاف کردے یا اس کے بدلہ میں طلاق طلب کرے تو معاف ہوگا یہ حکم غیر ناشزہ کا ہے اور عورت کا بغیر اذن شوہر کے خود سے بھاگ کر چلا جانا اس کا یہ نشوز ہے اور جب تک واپس نہ آجائے، اس وقت تک کے نان نفقہ کی وہ مستحق نہیں رہتی ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور اسی نشوز کیوجہ سے اور اسی حالت میں شوہر نے طلاق دیدی ہے تو عورت نفقہ کی مستحق نہ ہوگی(۱)، لیکن اگر ایک بار بھی دونوں میں خلوت صحیحہ ہوچکی ہے تو عدت تین حیض اور پورا مہر واجب ہوگا اور اگر ایک بار بھی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو عدت طلاق واجب نہ ہوگی، ''**رجل تزوج امرأۃ نکاحا جائزا فطلقها بعد الدخول وبعد الخلوۃ الصحیحۃ کان علیها العدۃ** ''(۲)، مگر مہر نصف واجب ہوگا، ''**وإن طلقتموهن من قبل أن تمسوهن وقد فرضتم لهن فریضۃ فنصف مافرضتم**'' (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''فان نشزت فلا نفقۃ لها حتی تعود الی منزله'' (الہندیہ ۱/ ۵۴۵)۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۵۲۶۔　　۳- سورۂ بقرہ ۲۳۷۔

وسعت سے زائد مہر مقرر کرنا:

اگر کوئی معمولی آدمی خاندانی رواج کے مطابق یا برائے نام شادی کے موقع پر لاکھوں روپیہ مہر باندھے اور اس کو دینے کی طاقت نہ ہوتو یہ جائز ہے یا کہ حرام ہے؟ کسی مستند فقہ کا حوالہ دیجئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

نکاح تو منعقد ہوجائے گا، لیکن اتنے زیادہ مہر باندھنا جس کی ادئیگی طاقت میں نہ ہو، بہت برا ہے۔

هكذا في عامة كتب المعتبرة۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جواب صحیح ہے۔

جس شخص کے دل میں یہ ہو کہ مہر ادا نہیں کرے گا، حدیث شریف میں اس کو زانی فرمایا ہے، یعنی قیامت میں اس کا حشر ایسا ہوگا جیسا زانی کا(۱)۔　　　　احقر محمود عفی عنہ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کے مہر کا حکم:

☆ بیوہ کا دین مہر موجل مرحوم نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا تھا اور نہ زوجہ نے کبھی معاف کیا ہے، ایسی صورت میں کیا دین مہر کی رقم ترکہ سے منہا کی جاسکتی ہے؟

۵،۶- مرحوم عبدالعلیم کے مرنے کے وقت اگر مرحوم کے باپ وماں زندہ نہیں تھے تو مرحوم عبدالعلیم کا کل ترکہ، خواہ بصورت مکان ہو یا بصورت سامان یا زیورات ونقد ہو یا بینک وغیرہ کسی جگہ جمع شدہ ہو، ان سب کے مجموعہ میں سے پہلے بیوہ کا مہر جو باقی ہے وہ ادا کیا جائے، اسی طرح اگر اور کوئی قرض باقی ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اس کے بعد باقی ترکہ صرف ایک تہائی کے اندر مرحوم کی وصیت صحیحہ نافذ کی جائے، پھر اس کے بعد جو کچھ ترکہ بچے اس کو چالیس سہام پر تقسیم کردیں۔ چالیس سہام میں پانچ سہام بیوہ کا حق ہوگا۔ اور چودہ سہام فرزند کا حق ہوگا۔ اور سات سات سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، جو

۱- کنزالعمال معجم الطبرانی ص ۵۲۱۔

لڑکی کسی غیر ملک کی شہری ہوگئی ہے محض اس سے اس کا حق وراثت سوخت نہ ہوگا، بلکہ اس کا حصہ محفوظ رکھ کر اس کو مطلع کیا جائے، اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے، یا اس سے بیع وشراء وغیرہ کا کوئی شرعی معاملہ بذریعہ مراسلت وغیرہ کرلیا جائے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر مرحوم کے انتقال کے وقت ماں یا باپ کوئی زندہ تھے تو ان کو واضح کر کے پھر تخریج شرعی معلوم کی جائے۔

نوٹ: یاد رہے کہ فنڈ میں جو رقم حکومت اپنی طرف سے ملاتی ہے وہ صورت مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ نہیں ہے، بلکہ وہ رقم تنہا بیوہ کا حق ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ کے جواب میں درج ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۳/۹۶ ۱۳ھ

مہر سے متعلق مختلف قسم کے سوالات:

ہم ایک بڑی تعداد میں انگلینڈ میں مقیم ہیں اور ہماری جماعت کا نام ''ثمرت پار چورا خلیفہ سنت والجماعت (یوکے)'' ہے، اس جماعت کی ماتحتی میں ہم خوشی غمی وغیرہ کے طور طریق شریعت کے موافق انجام دیتے ہیں، ہمیں یہاں انگلینڈ کی اقتصادی حالت کے پیش نظر مہر کے سلسلہ میں چند مسائل درکار ہیں۔ یہاں کا معاشرتی انتظام مختصر طور پر یہ ہے:

لوگوں کی اقتصادی حالت بہت اونچی ہے۔ متوسط شخص کی ایک ہفتہ کی آمدنی اندازاً چالیس سے پچاس پونڈ ہے، دولہا جس وقت مجلس نکاح میں آتا ہے تو کم از کم ایک سو پونڈ کا لباس زیب تن کیے ہوتا ہے، نیز نکاح پڑھانے والے اور مسجد ومدرسہ کو بطور ہدیہ اندازاً ۲۰ پونڈ دیئے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرا خرچہ الگ ہوتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) جس عورت سے نکاح ہوتا ہے، اس کا مہر فقط ۷ ۱۲ ۲ ۱/۲ روپیہ ہوتا ہے، پونڈ کے حساب سے مقرر نہیں کی جاتی، اب بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مہر کی یہ موجودہ رقم حالت کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) مہر فاطمی کتنی ہے اور کیا ہے؟ ۷ ۱۲ ۲ ۱/۲ روپیہ یہ مہر فاطمی شمار ہوتی ہے یا نہیں؟

(۳) شریعت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مقدار کیا ہے؟

(۴) شریعت کی نظر میں کتنا مقرر شدہ مہر عمدہ مہر ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات حدیث کی روشنی میں اور کتابوں کے حوالہ کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آج سے تقریباً ۵۰-۶۰ سال قبل ۱۲۷½ تولہ خالص چاندی کے برابر شمار ہوتا تھا۔ اب تو ایسا نہیں ہے اب تو پیسے کاغذ کے ہونے لگے ہیں اور ۱۲۷½ روپیہ صرف ۸-۹ تولہ خالص چاندی کے برابر بھی بمشکل ہوں گے اور مہر فاطمی کے برابر تو کسی بھی طرح نہیں ہوسکتے، مہر فاطمی کی مقدار بعض محققین کے نزدیک ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ چاندی کے برابر ہے، اتنی چاندی ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں میں ملیگی اتنے روپیہ مہر فاطمی میں دینے ہوں گے اور بعض محققین کے نزدیک مہر فاطمی کی مقدار تقریباً ۱۳۲ تولہ چاندی کے برابر ہے۔ اتنی چاندی (۱۳۲ تولہ) جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں سے ملے گی اتنے روپے مہر فاطمی میں دینے ہوں گے۔ یہی دوسرا قول (تقریباً ۱۳۲ تولہ چاندی) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند صاحب فتاوٰی دارالعلوم دیوبند کا ہے اور یہی ہمارے نزدیک ماخوذ بہ ہے۔

وہاں کے جو معاشرہ وتمدن کا حال سوال میں درج ہے اور جو حقیقت مذکور ہے اس کے اعتبار سے واقعی یہ مقدار (۱۲۷½ روپیہ ان کاغذی روپیوں سے) بہت کم ہے، اس لئے کہ مہر کی اقل مقدار اگرچہ صرف دس درہم ہے جو تقریباً تین یا ساڑھے تین تولہ چاندی کے وزن کے برابر ہوتا ہے، لیکن مہر کی مقدار کیا ہے؟ اس کے بارے میں اپنے اکابر علماء کی دو رائے ہیں:

۱———اول تو یہ ہے کہ شوہر کی حیثیت کے اعتبار سے اتنی مقدار ہو کہ اس کا ادا کرنا تو شوہر کے استطاعت میں ہو مگر ادا کرنے میں شوہر کچھ دشواری اور بار محسوس کرے۔ یہ رائے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور اشبہ بالفقہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اور ایسر للعمل ہے———اور جماعتی طور پر یکساں عمل کے لئے یہی مقدار زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ خواہ ایک سو چالیس تولہ چاندی رکھ لی جائے چاہے ۱۳۲ تولہ چاندی دونوں کی گنجائش ہے۔

۲———اس نمبر کا جواب ۱ کے جواب میں آچکا بلکہ ۳ و ۴ کے جوابات بھی ۱ کے ہی جواب میں آچکے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۹۶ ۱۳ھ

۱- جہیز کا شرعی حکم:

زید کہتا ہے کہ جہیز لینا و دینا درست نہیں اور دلیل یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت علی کو جہیز اس لئے دیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضور ﷺ نے ان کی پرورش کی تھی تو اپنا سمجھ کر جہیز دیا تھا تو کیا یہ قول صحیح ہے۔ اور جو آج کل لین دین ہوتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

۲- شریعت یا جہالت میں بیان کردہ احادیث سے استدلال:

مولانا پالن حقانی کی کتاب ''شریعت یا جہالت'' کا کیا درجہ ہے اور اس کے اندر جو احادیث ہیں ان سے کسی مسئلہ پر استدلال کرنا بغیر دوسری کتب کی مدد کے درست ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

۳- لڑکی والوں سے شادی کے لئے کچھ لینا جائز نہیں:

مولانا مشتاق صاحب جامع مسجد بھنڈاریڈی گریڈیہہ کے امام ہیں اور گزشتہ چند سالوں سے امامت کرتے آرہے ہیں، امام صاحب کے بھتیجہ محمد ریاض الدین ولد مراد علی کی شادی مورخہ ۱۱رمئی ۱۹۹۰ء بروز جمعہ ہوئی، لڑکی والے سے آٹھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لیے، ۲۸راپریل ۱۹۹۰ء بروز سنیچر لڑکی والے لڑکے یعنی ریاض الدین کے یہاں پہنچے اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں پانچ ہزار روپے دیے، اس میں مولانا مشتاق موجود تھے۔ پھر مولانا مشتاق کے سالے محمد طیب ولد شیخ پوات علی کی شادی ۱۷رمئی ۱۹۹۰ء بروز جمعرات ہوئی تو لڑکی والے سے چھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لئے لڑکے والے نے جمعرات کو شادی کے موقع پر کھانے کی دعوت دی اس دعوت میں مولانا مشتاق شریک ہوئے اور کھانا بھی کھایا، اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ تلک لینا کیسا ہے؟ اور مشتاق کو امام رکھنا کیسا ہے؟ اور مولانا مشتاق کو امام رکھنا درست ہے یا نہیں اور ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

لڑکی والوں سے شادی کے لئے یا شادی کے موقع پر لڑکے والوں کا لینا تلک کہلاتا ہے اور یہ عمل ورواج کافروں غیر مسلموں کا ہے اور شریعت کی نگاہ میں ناجائز اور گناہ ہے قرآن پاک میں اس کی ممانعت موجود ہے: قال اللہ تعالیٰ: ''یا أیها الذین آمنوا لاتکونوا کالذین کفروا''(۱)، اور اس طرح لینا نکاح کی شرط کے درجہ کی چیز ہوکر حرام ورشوت کے

۱- سورۂ آل عمران: ۱۵۶۔

درجہ کی چیز ہو جاتی ہے جس کا واپس کر دینا لڑکے پر اور لڑکے کے والوں پر ضروری ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی والے لڑکے سے یا لڑکے والوں سے نکاح سے قبل نکاح کی شرط کے طور پر کچھ لیں تو شرعا یہ چیز ممنوع اور رشوت کے درجہ میں ہو کر واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ کما صرح بہ فی الشامی (۲/۳۶۵ نعمانی)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱۱/۱۴۱۰ھ

سامان جہیز کے ضیاع کے بعد مطالبہ:

ہندہ جو کہ بکر کے نکاح میں تھی، ہندہ ایک شخص کے ساتھ شوہر کے یہاں سے فرار ہو گئی، کچھ دنوں کے بعد وہ لڑکی پکڑی گئی، لڑکی جو ساز و سامان ساتھ لے گئی تھی، اس میں سے اکثر ان دونوں نے بیچ کھایا، لڑکی کے باپ کا بیان ہے کہ لڑکی کے پاس بہتر ۷۲ تولہ چاندی تھی، پنچایت میں معاملہ رکھا گیا، پنچایت والوں نے اتنی چاندی اس لڑکے کے باپ سے دلوادی اور سامان مذکور کو برادری کے ایک معزز آدمی کے پاس امانت رکھ دیا گیا، اس واقعہ کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اب اس لڑکی کے باپ نے اس کی شادی دوسری جگہ کر دی اب اس سامان کے تین دعویدار ہیں۔

۱- لڑکی کا باپ، ۲- اس لڑکی کا اصل شوہر، ۳- وہ شخص جس کے ساتھ یہ بھاگی تھی، دعویٰ تو سب کرتے ہیں مگر اس آٹھ سال کے عرصہ میں کوئی ایک بھی ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سامان کسی کو دیا جائے یا نہیں؟ اور دیا جائے تو کس کو اور اگر کوئی بھی ان تینوں میں سے اس کا مستحق نہیں ہے، تو کیا اس چیز کو فروخت کر کے کسی مسجد وغیرہ میں لگایا جا سکتا ہے؟

مولانا قمر صاحب دیوبندی

الجواب وباللہ التوفیق:

بہتر ۷۲ تولہ چاندی اگر لڑکی کو اس کے باپ نے دیا تھا تو وہ چاندی اور سامان جہیز خود لڑکی کی ملک شرعا ہو گیا، اب اس کے ضیاع کے بعد مطالبہ کا حق کسی کو نہیں رہا(۱)۔ اور اگر یہ چیزیں جہیز میں دی ہوئی نہیں تھیں تو باپ مدعی ہوا اور البینۃ علی المدعی (۲) کے ضابطہ شرعی کے مطابق بینہ و ثبوت پیش کرنے کے بعد اثبات دعویٰ اور واپسی کا حق دار لڑکی کا باپ ہوتا، پس

۱- "جهز ابنته بجهاز وسلمها ذلك ليس له الإسترداد منها" (الدر المختار) علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: "هذا إذا كان العرف مستمرا أن الأب يدفع مثله جهازا لا عارية" (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۳۰۶)۔

۲- دیکھئے شرح المجلہ ۱/۵۱ مادہ ۷۶، "وعن الأشعث بن قيس قال: كان بيني وبين رجل من اليهود أرض فجحدني فقدمته

جب ثبوت شرعی اور بینہ باپ پیش نہ کرسکا تو اب اس کے واپسی کے مطالبہ کا حق باپ کو بھی نہیں رہا اور لڑکی کے اصلی شوہر کو بھی اس کے مطالبہ کا حق نہیں رہا، البتہ جس سے وہ چیزیں وصول کی گئیں ہیں، اس کو واپس کردینا ضروری ہے، اس کے علاوہ پنچایت کا خود کہیں خرچ کردینا جائز نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ

إلى النبي ﷺ، فقال لي رسول الله ﷺ: هل لك بينة قلت: لا، قال لليهودي: إحلف، قلت: إذاً يحلف فيه، فيذهب بمالي، فأنزل الله سبحانه: إن الذين يشترون بعهد الله وأيمانهم ثمناً قليلاً" الخ (سنن ابن ماجہ ۲/ ۷۷۸ کتاب الاحکام باب البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ حدیث ۲۳۲۲)۔

۱- "والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم" (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۳۰۱)۔

باب المعاشرہ بالمعروف

پاکی وناپاکی کا خیال نہ رکھنے والی بیوی کے ساتھ برتاؤ:

ایک لڑکی سے میری شادی ہوئی تھی اسے بچہ بھی ہے، جب اس سے شادی ہوئی میں راضی نہیں تھا، یہ لڑکی رہن سہن میں پاکی ناپاکی کا کوئی خیال نہیں کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ خوبصورت ہے، لیکن میری اپنی نظر میں خوبصورتی دکھائی نہیں دیتی، جب نگاہ اٹھاتا ہوں دیکھ کر ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے، اس کو چھوڑ کر دوسری شادی کروں تو کیسے، مہر ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے، دوسری عورت پہلی ہوتے ہوئے کوئی دینے کو تیار نہیں ہے، بہر حال کوئی ایسی صورت بتلائیے کہ اس انسان نما حیوان سے چھٹکارا ہوجائے، میرے کہنے میں بھی نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ کا حل یہ ہے کہ آپ صبر کریں اور اس کے حقوق ادا کرتے رہیں، اس سے آپ کے درجات بلند اور آخرت درست ہوگی، اور اس عورت کو نرمی سے سمجھاتے رہیں، انشاءاللہ ایک دن حسب منشاء بھی ہوجائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- تنفر دور کرنے کے لئے مشکوۃ شریف ۲۸۰، درج ذیل حدیث کو بھی سامنے رکھیں: "قال رسول اللہ ﷺ لا یفرق المومن مومنہ ان کرہ منہا خلقا رضی منہا آخر" (رواہ مسلم)۔

نافرمان بیوی کی اصلاح کا طریقہ:

زید کی بیوی نہایت بدمزاج اور زبان دراز ہے، زیادہ تر کام زید کی مرضی کے خلاف کرنے والی ہے، وہ شریعت نبوی کی مکمل طریقہ سے پابند نہیں ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر اس کو غسل کرنے کی پاکی کی غرض سے ضرورت ہے اور اس کو معمولی زکام بھی ہے تو وہ کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتی ہے اور نمازیں ترک کرتی رہتی ہے، جن کی قضا بھی بعد کو نہیں پڑھتی ہے، ناخنوں پر سرخی لگانا بھی نہیں چھوڑتی، جبکہ اس کو یہ بتلا دیا ہے کہ ایسا کرنے سے وضو مکمل نہیں ہوتا ہے اور جب وضو نہیں ہوتا تو نماز بھی نہیں ہوتی ہے، وہ تعلیم یافتہ بھی ہے، زید چاہتا ہے کہ وہ خوشگوار اور شرعی زندگی مع اپنے گھر کے ماحول کے گذارے، وہ خود سنیما نہیں دیکھتا ہے، لیکن بیوی زید کی عدم موجودگی میں بلا شوہر کی اجازت اور اس کے علم میں لائے ہوئے سینما دیکھنے گئی، زید اس کو بار ہا سمجھایا، مارا، غصہ ہوئے، غرضیکہ اس کو سمجھانے اور انسانیت اور شرافت سے زندگی گذارنے کی نصیحت میں زید نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اب زید کو اپنی بیوی کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب آپ اس ماحول میں ہر طرح نصیحت کر کے تھک چکے ہیں، تو اب آپ دونوں میاں بیوی اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسے دوسرے دینداری کے ماحول میں قیام پذیر ہو جائیں جہاں عام طور سے عورتوں میں بھی دینداری ہو اور پردہ پوشی کا پورا پورا لحاظ ہو، اور وہاں بیوی کے سابق حالات کے دوست واحباب و تعلق والے نہ ہوں یا نہ ملیں تو امید ہے کہ حالات استوار و درست ہو جائیں گے، یا پھر آپ صبر کے ساتھ نصیحت و کوشش کرتے رہیں بڑے ثواب کے مستحق ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

كتاب الطلاق
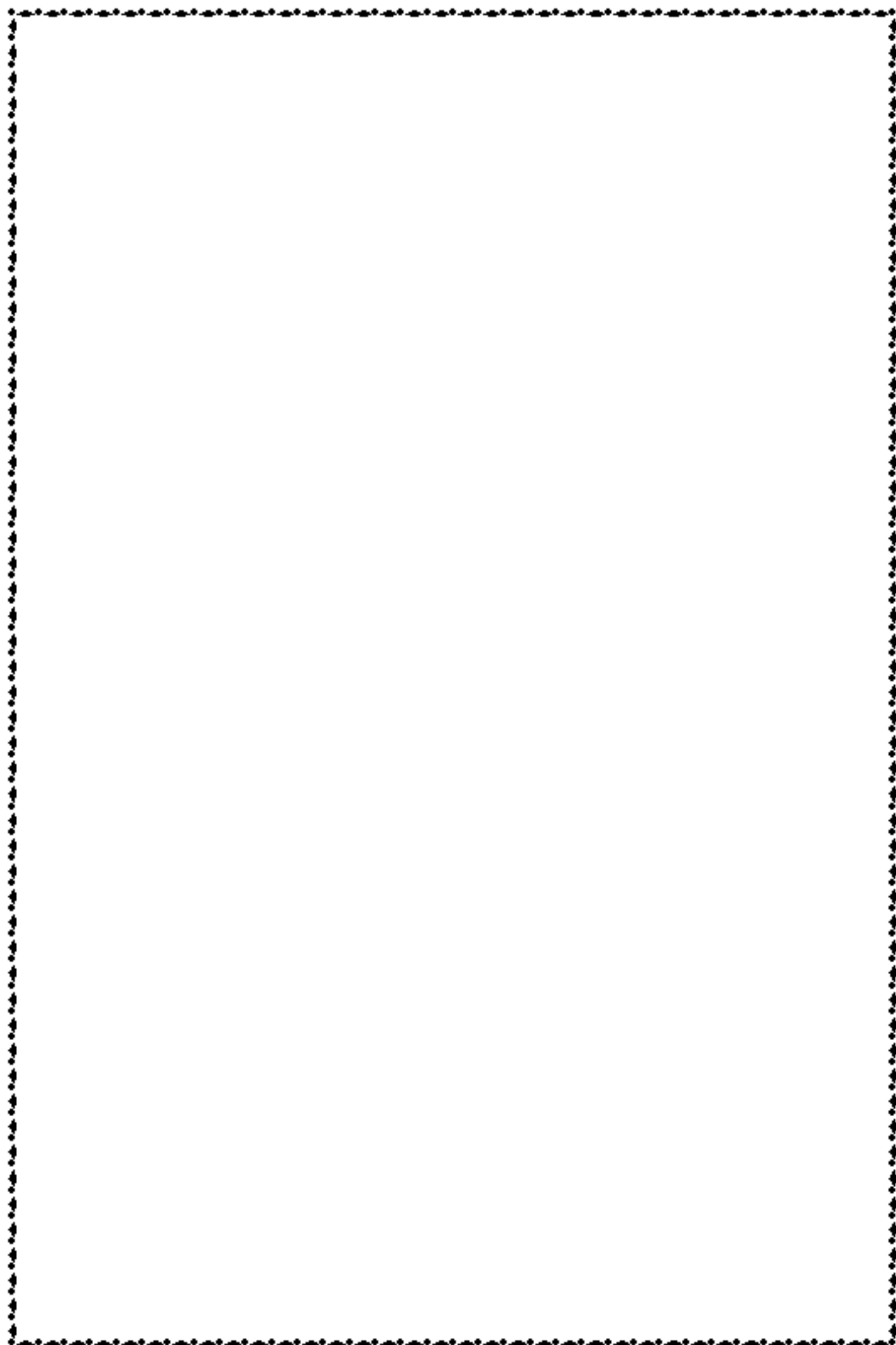
کتاب الطلاق

طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں:

الف کی بیگم بذات خود اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے؟ اور دونوں کا نکاح خارج مانا جائے گا؟ اگر ایسا کرنے سے الف کی بیگم آزاد نہیں ہوسکتی تو کونسا ایسا عمل ہے جس سے وہ آزاد ہوگی، اگر الف کی بیگم اپنے شوہر سے آزاد ہوتی ہے تو بچے کس کے رہیں گے۔ جب کہ بچوں کی عمریں بالترتیب ۹/سال ۷/سال ۴/سال ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینے کا حق اللہ نے، اللہ کے رسول نے وشریعت نے صرف مرد کو دیا ہے، اگر عورت طلاق دیدے تو وہ طلاق واقع ہی نہ ہوگی (۱)، بلکہ اگر شوہر حقوق زوجیت ادا کرتا رہے اور پھر عورت طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ملائکہ کی سب کی لعنت پڑتی ہے اور عورت سخت گنہگار ہوتی ہے اور اگر شوہر سے طلاق کے بغیر کسی سے نکاح کرے تو ہمیشہ زنا کاری کے گناہ اور وبال میں مبتلا رہے گی۔

اور اگر شوہر سے طلاق حاصل ہوجائے تو اس کے نطفہ سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں، وہ سب اسی طلاق دینے والے شوہر کے شمار ہوں گے اور جب یہ مطلقہ کسی دوسرے سے شادی کرے گی تو وہ شوہر ان بچوں کو اس مطلقہ سے الگ کردینے کا شرعاً حقدار ہوجائے گا۔

لہذا اس قسم کا خیال بھی ترک کردینا اس عورت پر لازم ہے، ورنہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کے اندر بھی سخت

۱- "عن ابن عباس قال: أتى النبي ﷺ رجل فقال: يارسول الله! سيدي زوجني أمته وهو يريد أن يفرق بيني وبينها قال فصعد رسول الله ﷺ المنبر فقال: ياأيها الناس: ما بال أحدكم يزوج عبده أمته ثم يريد أن يفرق بينهما إنما الطلاق لمن أخذ بالساق" (ابن ماجہ باب طلاق العبد/ ۱۵۲)۔

وبال میں مبتلا ہوجانے کا شدید خطرہ ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محض دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی:

زید کی شادی کو ۲۷ دن ہوئے، زید کو اپنی بیوی سے محبت ہے، مگر ملازمت کے سلسلہ میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسرے صوبہ میں جارہا ہے، دوران سفر بیوی کی جدائی سے بہت مغموم تھا، اچانک ذہن میں برے برے خیالات اور وسوسے آنے لگے، اسی جنونی کیفیت میں زید نے سوچا کہ میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، فوراً ہی پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا، اس صورت میں جب کہ زبان سے کچھ نہیں کہا کیا طلاق ہوجائے گی، اور اگر خدانخواستہ طلاق ہوجائے تو رجوع کی کیا صورت ہوگی؟

سید خلیل احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینا زبان کا فعل ہے، زبان سے دینے سے واقع ہوتی ہے اور محض دل میں دینے سے اور سوچنے سے کوئی طلاق نہیں پڑتی (۱)، پس جب آپ نے زبان سے کچھ نہیں کہا ہے تو اس سوچنے سے اور وسوسہ آنے سے کوئی طلاق نہیں پڑی بالکل مطمئن رہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱۲/۱۴۱۱ھ

بیوی کے سامنے طلاق لکھ کر دینے سے طلاق نہیں پڑتی:

اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے زبان سے طلاق دیئے بغیر محض طلاق لکھ کر بیوی کو دیدے تو کوئی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

۱- "إن الله تجاوز عن امتي ما وسوست به صدورها مالم تعمل بها أو تكلم بها رواه الشيخان" (مشکوۃ المصابیح/ ۱۸)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس (اشکال) کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے ان باتوں کا ذکر کردینا ضروری ہے، وقوع طلاق کی حقیقت شرعیہ تلفظ الطلاق بلفظ الایقاع ہے(۱) یعنی ایقاعی لفظ کے ساتھ طلاق کا تلفظ کیا جائے اور تلفظ زبان کا فعل ہے۔

جس طرح تکبیر تحریمہ میں تکبیر کہنا زبان کا فعل ہے (۲) اور تسمیہ عندالذبح میں تسمیہ کرنا زبان کا فعل ہے۔

اگر کوئی شخص تحریمہ کی تکبیر زبان سے ادا نہ کرے، صرف دل ہی دل میں تکبیر کہکر یا بغیر زبان سے کہے ہوئے کاغذ پر محض لکھ کر تحریمہ باندھ لے تو انعقاد صلوۃ متحقق نہ ہوگا اور نماز نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر کوئی ذبح کے وقت زبان سے تسمیہ نہ پڑھے، بلکہ صرف دل ہی دل میں کہہ کر یا صرف کاغذ پر لکھ کر ذبح کردے تو ذبیحہ حلال وجائز نہ ہوگا۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ طلاق میں بھی ہے، اگر کوئی شخص محض دل ہی دل میں طلاق کہہ لے، یا بغیر زبان سے ایقاع طلاق کا لفظ بولے ہوئے اور بغیر کسی مجبوری کے محض کاغذ پر لکھ ڈالے تو اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ "الدین یسر" (۳) کے قاعدہ سے شریعت مطہرہ نے ضرورت کے موقع میں بقدر ضرورت کتابت کو بھی قائم مقام تلفظ قرار دے دیا ہے۔

مثلاً ایک شادی شدہ شخص اخرس گونگا ہے، اشارہ سے بھی اظہار طلاق پر قادر نہیں اور طلاق دینے کی اسکو ضرورت ہے، یا مثلاً معتقل اللسان ہے اور یہ اعتقال دائمی ہوگیا ہے اور زبان سے تلفظ طلاق پر قادر نہیں ہے اور ضرورت طلاق دینے کی ہے یا مثلاً ایک شخص جو دور ہے یا سامنے نہیں ہے اور وہ طلاق کی اطلاع عورت کو دینا چاہتا ہے، اس کی اس کو ضرورت ہے تو ان سب صورتوں میں کتابت طلاق بمنزلہ تلفظ طلاق کے قرار پاجاتی ہے اور اسی کو فقہاء نے بایں عبارت نقل فرمایا ہے:

۱- البحر الرائق مطبوعہ مکتبہ زکریا ۳/ ۴۱۰ میں طلاق کی تعریف میں مذکور ہے: "رفع قيد النكاح حالاً أو مآلاً بلفظ مخصوص"، اور شامی ۴/ ۴۵۷ میں ہے: "لأن ركن الطلاق اللفظ أو ما يقوم مقامه"، نیز درمختار مع شرحہ ردالمحتار للشامی (۲/ ۲۵۲-۲۵۳) میں مذکور ہے: "(و) أدنى (المخافتة اسماع نفسه) ومن يقربه.......... (ويجري ذلك) المذكور (في كل ما يتعلق بنطق كتسمية على ذبيحة ووجوب سجدة تلاوة وعتاق وطلاق واستثناء"، علامہ شامیؒ نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے: "قال في النهر: أقول: ينبغي أن يكون الحكم كذلك في كل ما يتوقف تمامه على القبول ولو غير مبادلة كالنكاح" (۲/ ۲۵۴)۔

۲- تحریمہ کی شروط میں سے نطق کے تحت مذکور ہے: "فمن همس بها أو اجراها على قلبه لا تجزيه" (ردالمحتار ۲/ ۱۳۱)۔

۳- عن أبي هريرةؓ عن النبي ﷺ قال: "إن الدين يسر، ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا، وأبشروا استعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱/ ۹۳ کتاب الایمان باب الدین یسر حدیث: ۳۹)۔

"**ان الكتابه اقيمت مقام العبارة عند الحاجة**"(۱) اور یہ علت مطردہ ہے ہر جگہ جاری ونافذ ہوگی اور اسی بناء پر چونکہ اقامۃ کتابت مقام العبارۃ محض بوجہ ضرورت اور بقدر ضرورت پر دائر ہے، اس لئے مکرہ کی طلاق بالکتابۃ واقع نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہاں کتابت کی حاجت نہیں بغیر کتابت کے بھی زبان سے طلاق دلوائی جاسکتی ہے اور بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے موجود ہوتے ہوئے زبان سے کوئی طلاق دینے کے بجائے محض لکھ کر دیدے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ بجائے لکھنے کے زبان سے طلاق دے سکتا تھا، اگر اس وقت زبان سے کہنے سے کوئی شخص کسی مانع کی وجہ سے زبان سے ادا نہ کرسکتا ہوتو بعد میں یا اسی وقت وہاں سے ہٹ کر بذریعہ کتابت طلاق نامہ بھیج سکتا تھا مگر جب اس نے ایسا نہیں کیا تو یہ حاضرانہ کتابت لغو وبیکار غیر مفید ہے، اسی کو علامہ ابن عابدین نے (شامی ج ۵ ص ۴۷۰) میں بایں الفاظ ادا کیا ہے:

"**وظاهره أن المعنون من الحاضر الناطق غير معتبر**"(۲)۔

علاوہ ازیں فقہاء نے جہاں جہاں بھی طلاق بالکتابۃ کو مفید سمجھا ہے وہاں وہاں جومثالیں لائے ہیں ان سب میں کہیں کہیں ارسل وغیرہ ایسے الفاظ لائے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طلاق بالکتابۃ غائبانہ ہوئی ہے، سامنے اور روبرو کی نہیں ہے اور مثال چونکہ ممثل لہ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے بطریق دلالۃ النص یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غائبانہ کتابت طلاق مفید ہوتی ہے، پھر چونکہ تصانیف کا مفہوم مخالف حجۃ ہوتا ہے، اس لئے بطریق اشارۃ نص یہ حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ بالمشافہ کی کتابت بغیر کسی شدید ضرورت کے معتبر نہ ہوگی جیسا کہ شامی (ج ۵ ص ۴۷۰) کی عبارت سے اوپر واضح ہوچکا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۱۳۸۰ھ

طلاق دے دوں کہنے سے طلاق نہیں پڑتی:

صورت مسئلہ یہ ہے کہ مسمی محمد ناصر علی ابن اللہ رکھا کا عقد نکاح مسماۃ پروین بنت شبیر احمد سے ہوا میری بیوی پروین میرے مکان پر تھی کہ میں اس کو اپنی خالہ کے یہاں شرکت شادی میں لیجانا چاہتا تھا، کیونکہ میری خالہ کے دھمیر اضلع سہارنپور تحصیل رڑکی نے اس کے لانے کا اصرار فرمایا تھا مجھے گھر کے کچھ افراد منع کرنے لگے، میرے تقاضے میں شدت ہوگئی،

۱- البحر الرائق ۲۲۹/۳۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۲۶۱/۱۰۔

گھر والوں نے مزید رکاوٹ پیدا کرنی چاہی، تو میں نے از روئے حق زوجیت بغرض سرپرستی اپنا حق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ طلاق دے دوں یعنی کیا آپ لوگ میری مفارقت پسند کرتے ہو تو میں ایسا کردوں محلہ کی کچھ موافق مخالف عورتیں بھی موجود تھیں جنہوں نے میرے اس لفظ کو دوسرے حضرات سے طلاق دیدینا ثابت کیا اور میرے اور میری زوجہ کے سرپرستوں (والد وغیرہ) کو باور کرانا چاہا کہ اس نے تو تمہاری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، میرے خسر صاحب ابھی آئے تھے انھوں نے یقین سے کہدیا کہ تم نے تو میری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، پھر اب میں کیسے بھیج دوں تو حضرت مفتی صاحب جناب سے استدعا ہے کہ بصورت مذکورہ بالا کیا میرے اس بیان سے طلاق واقع ہوگئی ہے؟

محمد ناصر علی بن اللہ رکھا چرتھاول، مظفرنگر

الجواب وبالله التوفيق:

اگر ناصر علی نے واقعی صرف یہی جملہ (کہ طلاق دیدوں) کہا ہے تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔ یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں ہیں بلکہ محض استفہام یا تہدید کے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۲/۱۴۰۲ھ

ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں احمد آباد اسلامک ریسرچ سینٹر کی جانب سے منعقد سیمنار کے فیصلہ پر محاکمہ:

احمد آباد ۴ نومبر ۱۹۷۳ھ یہاں اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ۴/۵/۶ نومبر ۷۳ء کو تین طلاقوں پر ایک کل ہند سیمنار ہوا جس کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے کی جس میں حسب ذیل نکات پر اتفاق رائے کیا:

(۱)　ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاقِ مغلظہ ہونے کا مسئلہ اجماعی وقطعی نہیں ہے، اس میں سلف ہی کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

(۲)　فقہی جزئیات وتفصیلات سے قطع نظر مندرجہ ذیل دو صورتوں کے بارے میں مجلس مذاکرہ کی رائے یہ ہے:

۱- ''أما تفسيره شرعا فهو رفع قيد النكاح حالا أو مآلا بلفظ مخصوص'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۳۴۸) اور استفہام وتہدید اور وعدہ ووعید پر مشتمل تعبیرات سے رفع قید نکاح کا تحقق نہیں ہوتا، قوله طلقي نفسك فقالت أنا طالق أو أنا أطلق نفسي لم يقع لأنه وعده (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۵۵۸)۔

الف: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، میں نے طلاق کا لفظ تاکید کے لئے دہرایا تھا تو اس کی اس بات کو باور کیا جائے گا، اور یہ طلاق طلاقِ مغلظہ شمار نہ ہوگی۔

ب: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے: تجھے تین طلاق مگر وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی، میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین طلاق کا لفظ کہے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لئے میں نے تین طلاق کے لفظ استعمال کئے تھے۔ اس کی بات باور کی جائے گی اور یہ طلاق طلاقِ مغلظہ بائنہ شمار نہ ہوگی۔

(۳) اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو طلاق کا صحیح طریقہ بتایا جائے، ان کو یہ واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کا طریقہ بدعت، معصیت اور عورت کے حق میں ظلم وزیادتی ہے، طلاق کے اس غلط طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور طلاق دینا ضروری ہے، تو بس ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

امابعد ۴/۵/۶/ نومبر ۱۹۷۳ء کے اسلامک ریسرچ سینٹر احمد آباد کے زیر اہتمام تین طلاقوں کے بارے میں کل ہند سیمنار کے نام سے جو سیمنار ہوا ہے، اس کا فیصلہ قومی آواز لکھنو میں شائع ہوا ہے، اس کا تراشہ سامنے ہے اس پر کچھ عرض کرنا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ سیمناروں کی حیثیت عموماً محض ایک علمی مذاکرہ وتبادلہ خیالات کی ہوتی ہے، اس کو شرعی حکم یا فتویٰ قرار دینا صحیح نہیں، اگر کوئی شخص اس کو شرعی حکم قرار دے تو یہ اس کی غلطی اور فریب خوردگی ہوگی، پھر اس سیمنار کو کل ہند سیمنار کہنا بھی تسلیم نہیں، کل ہند سیمنار اس وقت کہا جا سکتا تھا جب پورے ہندوستان کے تمام مکاتب فکر اور ہر طبقہ خیال کے معتمد علماء کرام کا کم از کم معتد بہ طبقہ اس میں شریک ہوتا اور ہر ایک کے مقالے وبیانات پر مکمل بحث وتمحیص کے بعد کوئی متفقہ رائے سے فیصلہ کیا جاتا، یہاں ایسا نہیں ہوا، لہٰذا اس کو کل ہند سیمنار کہنا کیونکر درست ہوگا؟ بلکہ محض ایک حاضر جماعت یا ٹولی کا سیمنار ہوا جو قطعاً کسی دوسرے طبقہ خیال کے فرد پر حجت نہیں بن سکتا اور بالکل لایعباء بہ کے درجہ کی چیز ہے، اس لئے اس پر کچھ کہنا یا اس کی تردید کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ آج کل بے راہ روی کا دور دورہ ہے، مبادا کوئی شخص اس کو شرعی حکم یا شرعی فتویٰ قرار نہ دے دے، اس لیے اس کی حقیقت واضح کردینے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر ذیل

کی چند سطور عرض ہیں۔ مقالے سامنے موجود نہیں کہ ان پر کچھ تفصیلی گفتگو کی جا سکے، اس لئے صرف تراشہ اخبار میں جو چار نکات پر اتفاق ظاہر کیا گیا محض اسی پر عرض کیا جاتا ہے۔

چوتھا نکتہ: جس کو نمبر ۴ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے صحیح ہے اور تسلیم ہے کہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان کو طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ بدعت ومعصیت وعند اللہ انتہائی مبغوض ومذموم ہے اور عورت کے حق میں اور خود اپنے حق میں ظلم وزیادتی ہے، طلاق کے اس طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور اگر طلاق دینا ضروری ہو تو صرف ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے اور وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے نتائج وعواقب پر نظر رکھ کر اور غور وفکر کرنے کے بعد طلاق کا اقدام کرنا چاہئے اور وہ بھی اس وقت جب عورت حیض سے پاک ہو کر غسل وغیرہ کر چکی ہو اور اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو، جیسا کہ فقہاء نے بیان فرمایا ہے اور اس مسئلہ کی تشہیر وترویج اور تعلیم کے لئے جتنی بھی سعی کی جائے محمود وپسندیدہ خدمت ہوگی۔

دوسرا نکتہ: (۱) و (۲) کے ضمن میں الف کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے الخ، وہ صحیح اور قابل اعتماد نہیں ہے، اس لئے کہ بیوی سے اس طرح براہ راست کہنا اس بات پر قرینہ ہے کہ شوہر نے بیوی کے سامنے اس کو مخاطب کر کے (طلاق، طلاق، طلاق) کہا ہے، لہذا جب بیوی نے خود سن لیا ہو تو لفظ تجھے کہا ہو، یا نہ کہا ہو نسبت بیوی کی طرف مراد ہوگی اور بیوی کے لئے جائز نہیں رہے گا کہ کسی طرح بھی شوہر کو اپنے اوپر قابو پا لینے دے، اگر شوہر بحلف بھی بیان کرے کہ میری نیت محض تاکید کی تھی اور صرف ایک طلاق دینے کی تھی یا دومرتبہ کا لفظ بھی تاکید کے طور پر کہا تھا، شوہر کے اس حلفی بیان کی بھی تصدیق شریعت نہ کرے گی، تصدیق کرنا اس کے لئے جائز نہ رہے گا، اس لئے کہ عورت اس معاملہ میں مثل قاضی کے ہے۔

اسی طرح اگر یہ معاملہ قاضی (یا قائم مقام قاضی جیسے جماعت مسلمین وشرعی کمیٹی) کے سامنے پہنچ جائے گا تو وہ بھی بحلف بیان کرنے کی تصدیق نہ کرے گا، بلکہ تین طلاق کا ہی حکم ہوگا۔ ہاں اگر عورت کو شوہر کے جملہ کے کہنے کا علم نہ ہوا اور معاملہ قاضی یا قائم مقام قاضی تک نہ پہنچے، مثلاً شوہر نے غائبانہ کہا ہو کہ اس کو طلاق، طلاق، طلاق پھر بحلف کہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، دومرتبہ طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہہ دیا تھا تو اس صورت میں فیما بینہ، وبین اللہ تصدیق کرلی جائے گی اور اس کی رجعت صحیح قرار دی جائیگی، اسی طرح اگر شوہر کے سوا کسی کو بھی شوہر کے اس جملہ کے کہنے کی خبر نہ ہو، مثلاً بالکل تنہائی میں عورت سے بھی غائبانہ کہہ دیا ہو اور واقعی شوہر نے تاکید کی نیت سے اور تاکید کے لئے ہی

دہرا یا ہے تو معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان رہے گا۔ اور اس کا رجعت کرلینا صحیح رہے گا، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

الف: "لو کرر لفظ الطلاق وقع الکل وإن نویٰ التاکید دین" (۱)۔

ب: "قوله إن نویٰ التاکید الخ أی وقع الکل فی القضاء" (۲)۔

ج: تنقیح فتاویٰ حامدیہ، ص ۳۷ میں اسی قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "لا یصدق فی ذالک قضاءً، لأنه مأمور باتباع الظاهر، والله یعلم بسرائره، ولا یصدق أنه قصد التاکید إلا بیمینه، لأن کل موضع یکون القول منه قوله: إنما یصدق مع الیمین (ثم الیٰ قوله) أن المرأة کا لقاضی فلا تحل لها أن تمکنه إذا سمعت منه ذالک وعلمت؛ لأنها لاتعلم إلا الظاهر" (۳)، لہٰذا شوہر کا یہ جملہ اگر عورت نے خود سن لیا ہے یا معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے تو خاوند کا یہ دعویٰ کہ اس جملہ سے میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دو مرتبہ محض تاکید کے طور پر دہرا یا ہے، قابل اعتبار اور مفید مطلب نہ ہوگا اور محض اس دعویٰ سے فقط ایک طلاق کا حکم نہ ہوگا اور عورت کے واسطے شوہر کو اپنے اوپر قابو دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ اس سے خلاصی کی ہر مناسب تدبیر اختیار کرنا لازم ہوگا۔ جیسا کہ شامی، (ص ۵۹۴ ج ۲) میں اس کی تصریح موجود ہے، البتہ اگر عورت شوہر کو اپنے سے روک کر یا بھاگ کر یا فدیہ دیکر وغیرہ کسی طرح بھی خلاصی حاصل نہ کر سکے تو معاملہ قاضی تک پہنچائے، اب اگر قاضی کے سامنے بھی شوہر تین مرتبہ لفظ طلاق کہنے سے بحلف انکار کرے اور عورت کے پاس خلاف کا بینہ نہ ہو اور قاضی عورت کے خلاف فیصلہ کردے تو اب گناہ عورت پر نہ رہے گا، بلکہ صرف مرد پر رہے گا۔

وفی البحر از بزازیہ لا وز جندی: "إنها ترفع الأمر للقاضی فإن حلف ولا بینة لها، فالإثم علیه أی إذا لم تقدر علی الفداء أو الهرب ولا علیٰ منعه عنها" (۴)۔

ہاں اگر شوہر نے محض ایک طلاق کی نیت کرنے پر اور دوبار محض تاکید کے لئے بولنے پر یہ جملہ بولنے سے قبل ہی ثقہ گواہ بنالیا تھا اور ان کی گواہی سے عدالت میں ثابت کردیا کہ واقعی محض ایک طلاق کی نیت سے یہ جملہ کہا ہے اور محض تاکیداً

۱- شامی ۳/۲۹۳ کتاب الطلاق، باب طلاق غیر المدخول بہا۔

۲- حوالہ سابق۔

۳- تنقیح الفتاوی حامدیہ ۳۷۔

۴- شامی، شامی کتاب الطلاق باب مطلب الصریح ۳/۲۵۱۔

دیہر یا ہے تو اس صورت میں شوہر بھی گنہگار نہ ہوگا، اور محض ایک طلاق رجعی کا حکم ہوگا جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

"ویقع بها أی بهذه الألفاظ وما بمعناها من الصریح (إلی قوله) بلافرق بین جاهل وعالم، وإن قال تعمدته تخویفا لم یصدق قضاء، إلا إذا أشهد علیه قبله" (۱)۔ **وهکذا فی البحر وغیره۔**

اور ابن دقیق العید نے "احکام الاحکام" (ص ۱۲۷ ج ۲) میں اسی عذر جہل پر بہت مدلل ومفصل کلام کیا ہے ——— جس کا حاصل یہ ہے کہ منصوصات ومامورات میں جہالت کا عذر معتبر نہیں ہے اور تین طلاق کے بعد حرمت منصوص ہے اور بغرض نکاح جدید **"حتی تنکح زوجا غیره"** (۲) حکم بھی منصوص ہے پھر اس کا جہل کس طرح معتبر ہوگا۔

تیسرا نکتہ: جو ۲ کے ضمن (ب) کے تحت بیان کیا گیا ہے قطعا غلط اور نا قابل تسلیم ہے، اس لئے کہ شوہر نے اپنی بیوی سے یہ جملہ (تجھے تین طلاق) کہا تو اب اگر شوہر بحلف بھی بیان دے کہ اس جملہ سے میری نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی، بلکہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین کا لفظ استعمال کیے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو شوہر کا یہ بیان کسی صورت میں معتبر نہ ہوگا، بلکہ تین طلاق ہی کا حکم ہوگا اور حرمت مغلظہ ہوگی اور شوہر کے قول کی تصدیق کر کے محض ایک طلاق شمار نہ ہوگی۔

کما فی الرد: **"والطلاق یقع بعدد قرن به أی متی قرن الطلاق بالعدد کان الواقع بالعدد بدلیل ما أجمعوا علیه من أنه لو قال لغیر المدخول بها أنت طالق ثلاثا طلّقت ثلاثا...... وقوله عند ذکر العدد الخ أی عند التصریح بالعدد فلا یکفی قصده"** (۳) اور لاعلمی کے عذر کا اعتبار نہ ہوگا، ابھی اوپر نکتہ ۲ ضمن الف کے تحت کی اخیر عبارت: **"بلا فرق بین عالم و جاهل"** سے اور بھی واضح ہوتا ہے، اسی طرح عقل کے بھی مطابق ہے، اس طرح کہ نقل وعقل وشرع سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ جس زبان کا جو لفظ ہوتا ہے اس زبان میں اس لفظ کے لئے جو معنی موضوع ہوتے ہیں وہی معنی مراد ہوتے ہیں۔

اس معنی کے خلاف معنی کا مراد لینا غلط کہا جاتا ہے، اور معتبر نہیں ہوتا ہے جیسے آم (ایک خاص پھل کا نام ہے جس معنی کے لئے وضع ہوا ہے وہی معنی اس سے مراد لئے جائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص لفظ آم بول کر املی یا انار وغیرہ (دوسری نوع کا پھل) مراد لے تو ہرگز اعتبار نہ کیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میری مراد اس لفظ آم، سے آم نہیں تھی، بلکہ املی تھی تسلیم نہیں کیا

۱- شامی ۳/ ۲۴۸-۲۴۹ باب الصریح۔

۲- سورۂ بقرہ ۲۳۰۔

۳- ردالمحتار ۳/ ۵۱۳-۵۱۴۔

جائے گا تغلیط وتکذیب کی جائے گی ۔بالخصوص جب کہ آم بول کر املی وغیرہ مراد لینے میں اس کا کوئی نفع بھی متصور ہو)۔

مثلاً یہی تین کا لفظ ہے، اس لفظ کے معنی ہر ہندوستانی کے ذہن وعلم میں متعین ہیں کہ دو اور چار کے درمیان کا عدد مراد ہے، جو دو سے زائد اور چار سے کم ہوتا ہے اور یہی معنی اس لفظ (تین) کا حقیقی معنی اور معنی موضوع لہ ہے جس میں نیت بلانیت ہر حال میں یہی عدد دو در ہے مراد ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ میں اس کے معنی نہیں جانتا تھا یا اس کا موقع استعمال نہیں جانتا تھا، یا میری مراد تو صرف دو تھی تکذیب کی جائے گی، قسم بھی اس پر کھائے گا تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بالخصوص ایسے موقع پر جب کہ اس مراد لینے میں اس کا ذاتی نفع ہو اور جھوٹ بولنے کا احتمال بھی ہو رہا ہو، بالکل یہی حال یہاں بھی ہے کہ ہرگز اس کے قول کا جو طلاق کے ساتھ تین کا لفظ بولنے کے باوجود کہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تین طلاق کہنے سے تین طلاق واقع ہو جائیں گی، یا یہ کہے کہ مراد تین سے تین نہیں تھی، بلکہ صرف ایک تھی، یا یہ کہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ بغیر تین کے لفظ بولے ہوئے طلاق ہی واقع نہیں ہوتی تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بلکہ تغلیط وتکذیب کی جائے گی، بلکہ اگر قسم کھا کر بھی یہ توجیہات وتاویلات کرے گا تو بھی تسلیم نہ کیا جائے گا اور بہت سے بہت یہ کہا جائے گا کہ تین طلاق تو واقع ہو گئیں، اب آئندہ سے احتیاط کرو، قوم کی زبان اور اس کی لغت ومحاورہ کو سیکھو اور معلوم کرو، اگرچہ ہمارا استدلال محض ان روایات اور ان پر قیاسات پر نہیں ہے، بلکہ نص قرآنی: **"فان طلقها فلا الخ"** (۱) جو تیسری طلاق کے بارے میں عام اور مطلق ہو کر وارد ہوئی ہے، اسی سے ہے جیسا کہ ہم عنقریب واضح طور سے بیان کریں گے، مگر یہ روایت مذکورہ بھی محض عقلی تک بندی تک نہیں ہے، بلکہ ماخوذ من الکتاب والسنۃ ہے جب منطوق قرآنی: **"وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا"** (۲) اور حسب ارشاد نبوی: **"انما بعثت إلی الأسود والأحمر"** الحدیث حضرت سرکار دو عالم نبی آخر الزماں تمام عالم کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں، تمام عالم کو خواہ وہ کوئی زبان ولغت رکھتا ہو سب کے لئے احکام خداوندی پہونچانے سے خواہ بلاواسطہ اور براہ راست زبان مشکوۃ سے اور یہ احکام پہنچانا خواہ بلاواسطہ اور براہ راست زبان مشکوۃ نہ ہونے میں ہو یا بواسطہ ہو اور منطوق قرآنی: **"وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ"** (۳) کے اشارۃ النص نے بتایا کہ ہر قوم میں احکام خداوندی کی تعلیم اس قوم کی زبان ولغت میں ہوگی، چنانچہ قوم عرب میں سرکار دو عالم ﷺ نے براہ راست خود لغت عرب میں تعلیم احکام فرمائی اور اقوام عجم میں آپ کے صحابہ وتابعین

۱- سورۂ بقرہ: ۲۳۰۔

۲- سورۂ سبا: ۲۸۔

۳- سورۂ ابراہیم: ۴۔

نے اور علماء ومشائخ نے ان عجمیوں کی زبان میں، ابلاغ احکام فرمایا، پس جس طریقہ سے لغت عرب میں لفظ ثلاثہ کے معنی و مصداق میں گفتگو ہوگی، ان نصوص کے تابع ہونے کی وجہ سے محض عقلی قیاسات یا تکبندی نہیں کہلائے گی، بلکہ درایت شرعی وقیاس شرعی ہی کے دائرہ کی چیز ہوگی، اور مستنبط من القرآن والحدیث ہوگی، لیکن یہاں پر چند مغالطات پیش کئے جاتے ہیں، ان کا دفع کرنا بھی ضروری ہے، کہا جاتا ہے کہ تم اپنی عقل وقیاس کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہو اور احادیث میں صراحتہ تمہارے قیاس کے خلاف مذکور ہے کہ جب خیر القرون میں کوئی تین طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی تو ہم تمہارے قیاس کو اختیار کریں یا حدیث کو، اس سلسلہ میں پہلی چیز دھوم دھام سے پیش کی جاتی ہے وہ حضرت ابو الصہبا کی روایت ہے کہ جب کوئی شخص طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہا عورت کا ہے، جب کوئی شخص اپنی غیر مدخول بہا کو تین مرتبہ طلاق دیتا تھا تو بے شک اس کو ایک طلاق بائن سے مطلقہ شمار کرتے تھے اور یہ صحیح ہے کہ یہ روایت مبہم اور مجمل ہے اور ابو داؤد شریف میں تصریح ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہا عورت کے لئے ہے۔

"**أما علمت أن الرجل كان إذا طلق امرأته ثلاثا قبل أن يدخل بها جعلوها واحدة**"(۱) اور امام ابو داؤد بڑے درجہ کے محدث اور معتمد ثقہ ہیں، وہ اس حدیث پر کوئی جرح نہیں فرماتے ہیں، اس لئے یہ زیادتی ثقہ کی ہوگی، اور معتبر ومقبول اور صحیح ہوگی، نیز مدخول بہا عورت کے لئے چونکہ نص قرآنی: "**إذا نكحتم المؤمنات ثم طلقتموهن من قبل أن تمسوهن فمالكم عليهن من عدة تعتدونها**" (۲) اس پر عدت نہیں ہوتی، وہ طلاق دے گا تو پہلے ہی طلاق پڑنے پر وہ نکاح وعدت سب سے خارج ہو کر شوہر سے بالکل غیر متعلق وآزاد، بلکہ شوہر کے لئے بالکل اجنبی وحرام ہو جائیگی اور دوسری وتیسری بار کی طلاق لغو وبے کار ہو جائے گی اور یہ بالکل ایسا ہے، جیسے کوئی اپنی مدخول بہا عورت کو طلاق رجعی دے تو عدت کے اندر اندر رجعت کر سکتا ہے اور مزید طلاق دینا چاہے تو مزید طلاق بھی دے کر اس کو بائنہ یا مغلظہ جو چاہے کر سکتا ہے، لیکن جب عدت ختم ہو جائے تو پھر کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر دے تو لغو وبیکار ہو جائے گی یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ عدت باقی نہ رہنے کی وجہ سے کسی قسم کا تعلق ولگاؤ باقی نہ رہا، وہ ہر طرح آزاد واجنبی ہوگئی جس طرح کسی اجنبی عورت کو طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح اس کو طلاق دینے سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، بالکل اسی طرح غیر مدخول بہا کا بھی حکم ہے، لہٰذا اس حدیث سے تین طلاق کے ایک طلاق ہونے پر استدلال کرنا درست نہ ہوگا۔

۱- ابوداؤد ۲/۲۶۱، حدیث: ۲۱۹۹، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- سورۂ احزاب: ۴۹۔

دوسری چیز ابن عمرؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے حالتِ حیض میں تین طلاق دی تھیں، ان کو سرکارِ دوجہاں ﷺ نے ایک طلاق قرار دیا تھا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر نے صرف ایک طلاق بحالت حیض دی تھی، اور حضور ﷺ نے ان کو رجوع کر لینے کا حکم دیا تھا تین طلاق دینے کی روایت کی تغلیط خود راوی نے بھی کی ہے۔

تیسری چیز محمود ابن لبید کی روایت پیش کی جاتی ہے جس کی تخریج نسائی نے کی ہے کہ ایک شخص کے بارے میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو یکدم تین طلاق دی ہیں، تو حضور ﷺ غضبناک ہوگئے کہ کیا کتاب اللہ سے کھیل کیا جائے گا درانحالیکہ میں تمہارے اندر موجود ہوں؟ اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے حضور ﷺ نے یکدم تین طلاق دینے پر ڈانٹا ہے، اس لئے تین طلاق بیک دم واقع نہ ہونی چاہئیں، یہ استدلال یوں غلط ہے کہ روایت میں کہیں مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے اس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دید یا تھا، بلکہ چونکہ تین طلاق بیک دم دینا عند اللہ بیحد مبغوض ہے، اس لئے آپ نے نکیر فرمائی اور جو تین طلاق اس نے بیکدم دیدی تھیں آپ کا اس کو رد نہ فرمانا اس کے نفاذ پر تقریر ہوگئی کہ باوجود مبغوض ہونے کے کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے گا تو وہ واقع اور نافذ ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں اس روایت کے بارے میں امام نسائی خود تصریح کرتے ہیں کہ یہ روایت مخرمہ ابن بکیر عن ابیہ کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کی ہے اور مخرمہ ابن بکیر کا اپنے والد بکیر سے سماع متکلم فیہ ہے، لہذا یہ روایت غریب اور متکلم فیہ ہو کر اس قابل نہ رہی کہ اس کو دوسری صحیح حدیث اور مستند روایات کے مقابلہ میں ترجیح ہو سکے۔

چوتھی چیز حضرت ابو رکانہ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں اور حضور ﷺ نے اس تین طلاق کو ایک قرار دیا تھا، لہذا ایک دم تین طلاق ایک طلاق ہونا چاہئے۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ مسلم شریف میں تصریح ہے کہ ابو رکانہ نے طلاق البتہ (جس کو طلاق بتی بھی کہتے ہیں) دیا تھا، لفظ البتہ کے معنیٰ قطع کامل اور کلی انقطاع کے آتے ہیں اور قطع کامل اور انقطاع کلی جس طرح تین طلاق میں ہوتا ہے، اسی طرح ایک طلاق بائن میں بھی ہوتا ہے، لہذا اسی لفظ "البتہ" سے دونوں مراد لے سکتے ہیں اور ایک طلاق بائن باعتبار تین طلاق کے کم مبغوض ہوتا ہے اور صحابہ کے شایان شان یہی ہے کہ مبغضیت کی طرف میلان نہ ہو، اور ایک ہی طلاق بائن مراد لیا ہو، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ نے ان سے پوچھا ہے اور انہوں نے حلف بیان فرمایا کہ محض ایک طلاق مراد لی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے محض ایک طلاق بائن کا حکم دیا نہ یہ کہ تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا یہ کس قدر مغالطہ ہے، مسند احمد ابن حنبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق دے دی تھیں اور حضور ﷺ نے اس کو ایک طلاق قرار دے دیا، دھوکہ نہ کھانا چاہئے، اس

لئے کہ یہ واقعہ ابو رکانہ کا نہیں ہے، جیسا کہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے (کمافی البذل)۔

بلکہ رکانہ کا ہے اور حضور ﷺ نے رکانہ کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار نہیں دیا ہے، راوی کو وہم اور خلط ہوگیا ہے اور اس خلط کو اس طرح نقل کردیا، جیسا کہ متقدمین محدثین نے اس کی تصریح کی ہے اور توضیح کی ہے (کمافی البذل)، اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی اس لئے کہ مسند احمد کی اس سند سے مسلم کی یہ سند زیادہ قوی ہے، اور مضبوط ہے اس کے مقابلہ میں، لہذا اس سند اور اس سند کی روایت کو ترجیح نہ ہوگی اور مسلم کی روایت میں امام نووی کا فیصلہ ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق صریح نہیں دی تھیں، بلکہ طلاق البتہ دی تھیں اور اس پر ساری گفتگو پہلے گزر چکی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت رکانہ کا بھی ہے کہ انہوں نے بھی تین طلاق دی تھیں اور حضور ﷺ نے اس کو ایک قرار دیا تھا تو یہ بھی قابل تسلیم اور صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اولاً تو یہ روایت مجاہیل کی ہے جو ہرگز صحاح کے مقابلہ میں قابل استناد نہیں ہے، ثانیاً اگر تعدد کی بنیاد پر تسلیم بھی کرلیا جائے تو کسی راوی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا ہو، اس لئے یہ بات کہ تین طلاق ان روایات سے ایک شمار ہوں کسی طرح صحیح نہیں۔

پانچویں چیز یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن پاک کے "**الطلاق مرتان فامساک بمعروف أوتسریح باحسان**" (۱) کے سیاق وسباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تین طلاقیں تین وقت میں اور تین مجلس میں دے تو تین طلاق کا حکم ہوگا اور حرمت مغلظہ ہوگی، ورنہ نہیں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ "**الطلاق مرتان**" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو طلاق دو مرتبہ دو وقت میں دے، پھر جب اس کے بعد فان طلقہا وارد ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تیسری طلاق تیسرے وقت اور تیسری مجلس میں ہونا چاہئے، یعنی آگے پیچھے ہونا چاہئے بیک وقت بیک مجلس و بیک زبان نہ ہونا چاہئے، پس اگر کوئی شخص ایک ہی وقت میں، ایک مجلس میں یا ایک ہی مرتبہ میں تینوں طلاق دیدے تو تین طلاق واقع نہ ہوں گی، بلکہ اس کا حکم اس آیت میں داخل ہی نہ ہوگا۔

یہ دلیل محض بے بنیاد اور انوکھی ہے، اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ دو طلاق رجعی بھی اس وقت واقع ہونا چاہئے، جب کہ وہ دو وقت اور دو مجلس میں دے اور اگر ایک ہی مرتبہ میں دو طلاق دے دے تو رجعی نہ ہونا چاہئے، بلکہ محض ایک ہی طلاق رجعی ہونی چاہئے، یا بالکل نہ ہونی چاہئے، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، پھر اس کے علاوہ یہ جدید ترجمانی جمہور صحابہ وتابعین جمہور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے ذہن میں نہیں آئی جو زمانہ خیر القرون میں ہونے کے ساتھ جس طرح کتاب وسنت

۱- سورۂ بقرہ ۲۲۹۔

کے معاملہ میں محقق و امام تھے، اسی طرح لغت عرب ومحاورات عرب کے جاننے میں بھی امام مسلم تھے اور آج تو اس زمانہ میں جس کو شر القرون بھی کہنا بے محل نہ ہوگا اور کہنے والا ان حضرات مذکور میں کسی درجہ کا محقق یا امام تو ہرگز نہیں ہے۔

چھٹی چیز: جو بڑے زور وشور سے بیان کی جاتی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کا اثر ہے جس میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اور حضرت صدیق کے زمانہ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ میں تین طلاق ایک طلاق شمار ہوتی تھی، مگر لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، اس لئے ضرورت ہے ہم لوگ (مجتہدین صحابہؓ) تین طلاق کو تین ہی مانیں اور تین ہی نافذ کریں (یہ مشورہ فرمایا اور مشورہ کے بعد) تین نافذ کردیا۔

اس اثر سے استنباط کرتے ہیں کہ تین طلاق دینے میں ایک طلاق ماننا اصلی مشکوٰۃ نبوت سے متفق علیہ طریقہ پر برابر چلا آرہا تھا، اور ایک طلاق کے وقوع کا حکم برابر دیا جاتا تھا مگر حضرت عمرؓ نے کسی عارض کی وجہ سے تین طلاق مان لیا اور تین نافذ کردیا۔

یہ استدلال صحیح نہیں اس میں پوری بات مذکور نہیں، اس لئے کہ اس اثر میں خود اشارہ موجود ہے کہ لوگ کچھ جلدی کرنے لگے اور بے احتیاطی کرنے لگے، لہٰذا جب تک وہ جلدی اور بے احتیاطی واضح نہ ہوجاوے کہ کیا تھی اور پوری بات سامنے نہ آئے، محض اس اثر سے جس میں محض جزوی بات مذکور ہو استنباط یقیناً نامکمل وادھورا رہے گا۔

پوری بات یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں جب کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا تو رجعت کرنے میں دوسروں کے اعتبار سے زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا، اگرچہ تین سے زیادہ طلاق بھی کیوں نہ دیا ہو، بلکہ بہت سے لوگ عورتوں کو پریشان کرنے اور انہیں معلق رکھنے کے لئے مسلسل طلاقیں دیتے اور رجوع کرلیتے تھے، اور اس کے حقوق ادا نہ کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''الطلاق مرتان'' کی آیت کریمہ **"فلاتحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره"** (۱) تک نازل فرما کر تین طلاقیں دینے کے بعد رجعت کردینے سے قطعاً روک دیا، بلکہ یہ حکم دیدیا کہ اس معاملہ میں عورت کی مرضی کو بھی دخل رہے گا اور وہ بھی اس قید کے ساتھ کہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اس سے مباشرت اور وطی کے بعد تفریق یا طلاق ہوچکی ہو اور پھر عورت قاعدہ شرعی کے مطابق اس کی زوجہ بنے، جیسا کہ حضرت عکرمہ خود حضرت ابن عباس سے نقل فرماتے ہیں:

۱- سورۂ بقرہ ۲۲۹-۲۳۰۔

”عن عکرمة عن ابن عباس قال: والمطلقات یتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء، ولا یحل لهن أن یکتمن ماخلق الله في أرحامهن–الایة، وذالک أی نزول هذه الایة أن الرجل کان في الجاهلية وبدء الإسلام إذا طلق امرأته فهو أحق برجعها وإن طلقها ثلاثا ذالک فقال: ”الطلاق مرتان“ (الاية)“(۱)۔

اس آیت کریمہ: ”فلا تحل له من بعد الخ“ میں ایک سرزنش کا پہلو بھی معلوم ہوتا ہے اور صحابہ کرام کل کے کل عدول تھے ان کی شان میں ”أصحابي کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهتدیتم“ وارد ہے، ان کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بغیر کسی شرعی وجہ یا داعیہ کے اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد تین طلاق کے قریب بھی جاتے رہے ہوں، تین طلاق کے بعد پھر رجعت کر لینا اور پریشان کرنا یا معلق چھوڑے رکھنا تو بڑی بات ہے، بالخصوص جب کہ لفظ طلاق ہی کو ”ابغض المباحات“ فرمایا گیا اور اگر کبھی احیانا کسی صاحب سے تین طلاق صادر ہوگئی تھیں تو دربار نبوت سے سخت قسم کی سرزنش اور سخت غضب ناکی کا اظہار بھی فرمایا گیا ہے، جیسا کہ محمود ابن لبید کی روایت وارد ہے:

”قال أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبان، ثم قال: أیلعب بکتاب الله وأنا بین أظهرکم“ (۲)،حتی قام رجل وقال: یا رسول الله! ألا أقتله (بذل المجہود)——

ان تو بیخوں اور تہدیدوں کے سننے کے بعد صحابہؓ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عام طور سے تین طلاقوں کے دینے میں عجلت یا بے احتیاطی کرتے ہوں گے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کی مراد و نیت محض ایک طلاق دینے کی رہی ہو، مگر کسی مصلحت کے پیش نظر بہ نیت تاکید تین بار لفظ طلاق بولدیں اور کہیں کہ میری نیت محض ایک طلاق کی تھی اور تین بار لفظ طلاق کو محض تاکید کی نیت کے لیے کہہ دیا ہے، تو ان کی عدالت و دیانت و تقویٰ و امانت کے پیش نظر تصدیق کر لی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث رکانہ میں جنہوں نے طلاق البتہ دے دی تھی جس سے تین طلاق اور ایک طلاق دونوں کا احتمال تھا یا دونوں مراد لیا جا تا تھا تو سرکار دو جہاں نے ان سے حلف لے کر کہ تمہاری مراد کیا تھی ایک کی تھی یا تین کی۔ حضرت رکانہ نے جواب میں مختلف بیان فرمایا کہ میری مراد صرف ایک طلاق کی تھی تو حضور ﷺ نے ایک ہی طلاق قرار دی اور یہی طلاق رکانہ قرظی نے دی اور ایک طلاق کی نیت نہیں کی تو اس کو ایک طلاق نہیں قرار دیا گیا، بلکہ تین طلاق اور حرمت مغلظہ اور موجب حلالہ قرار دیا گیا، اسی طرح عویمر عجلانی نے لعان والے واقعہ میں سرکار دو جہاں کے سامنے تین طلاق دیدیں اور حضور ﷺ نے اس کو نافذ فرما دیا۔

۱- ابوداؤد ۲/۲۵۹، حدیث: ۲۱۹۵، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- الدر المنثور ۱/۵۰۴، دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

اورحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کوتین طلاق کوایک طلاق ماننے والے بڑے زوردارطریقے سے پیش فرماتے ہیں ہرگز اس مقصد کے لئے پیش کرناصحیح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ "الطلاق مرتان" کی آیت کریمہ کےشان نزول کوبتلاتے ہوئے اس بات کوفرماچکے ہیں کہ تین طلاق دینے کے باوجودجوحق رجعت طلاق دینے والااپنے لئے سمجھتاتھا وہ اس آیت کریمہ:"الطلاق مرتان" کےنزول سےمنسوخ کردیاگیااورتین طلاق کوایک ثابت کرنیوالوں کامقصداورمدعا یہی ہے کہ تین طلاق دینے والوں کوبھی حق رجعت ملناچاہئے،کس قدرمتضادبات ہے، ایسی متضادبات وہ لوگ ہرگزنہیں فرماسکتے، بلکہ ان کامقصدیہ ہے کہ "الطلاق مرتان" کےنزول کےبعدلوگ محض ایک طلاق کی نیت سےطلاق دیتےتھے اورمحض تاکید کے لئے لفظ طلاق تین باربول دیتےتھے اورچونکہ اس وقت دیانت کاغلبہ تھا، بہت کم ارتکاب بھی کرتےتھے، اس لئے لفظ طلاق تین باربولنے کے باوجودان کے بیان کی تصدیق کرکے دیانۃً ایک طلاق کاحکم دےدیاجاتاتھا، لیکن جب تغیراحوال رونماہونے لگااورلوگ اس میں کثرت سےمبتلاہونے لگےتوحضرت عمرفاروقؓ کویہ اندیشہ ہونے لگاکہ مبادا کوئی شخص محض ایک طلاق کی نیت کئے بغیر یا تین ہی طلاق کی نیت سےتین بارطلاق دےکرمحض ایک طلاق کی نیت کا اظہار کردے اورہم ایک طلاق تسلیم کرلیں، توکتنے بڑے حرام کام میں مبتلاہوجائے گا اوراس اندیشہ کوصحابہ کرامؓ سےظاہرفرماکر مشورہ لیااورفرمایاکہ مناسب معلوم ہوتاہے کہ دریافت کامعاملہ توالگ ہے، صاحب معاملہ خوداس کاذمہ دارہوگا، لیکن جب یہ معاملہ ہمارےپاس (یعنی عندالقضاء) آجائے توہم تین طلاق کوایک طلاق تسلیم نہ کریں، بلکہ تین ہی کاحکم دیں اورجب یہ حکم سب پرظاہرہوجائے گاتولوگ پھرطلاق دینے کاارتکاب بھی کم کریں گے، اوراحتیاط بھی کریں گے، اس مشورہ کے بعدجب لوگوں نے موافقت ظاہرکردی توحضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ نے تین بارلفظ طلاق بولنے پرقضاءً تین ہی طلاق کاحکم دینا شروع فرمادیااوردیگرصحابہ نے بھی اس فیصلہ کومان لیا۔

خودحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے بعدتین بارلفظ طلاق بولنے کے بعدبھی تین طلاق کے واقع ہونے کاحکم دیناشروع فرمادیا،جیساکہ ابوداؤدشریف میں صحیح سند کےساتھ حضرت مجاہد کےطریق سےمروی ہے کہ حضرت مجاہد نےفرمایا،میں حضرت ابن عباس کےپاس موجودتھا:

"(مجاهد) قال: كنت عند ابن عباسؓ فجاء رجل فقال: إنه طلق امرأته ثلاثا فسكت حتى ظننت أنه سيردها إليه فقال: ينطلق أحدهم فيركب الحموقة ثم يقول: ياابن عباس: يا ابن عباس: إن الله قال: الطلاق مرتان إلى قوله فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره. الاية. عصيت ربك بانت

منک امر أتک" (۱)۔

(ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہیں، یہ سن کر ابن عباسؓ کچھ دیر خاموش رہے، یہاں تک کہ مجھکو خدشہ ہوا کہ وہ اس کی بیوی کو ایک طلاق قرار دے کر اس کے پاس ہی لوٹا دیں گے، لیکن کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، خود حماقت پر سوار ہوتا ہے، پھر یا ابن عباس یا ابن عباس کرنے لگتا ہے (سن لو) اللہ کا ارشاد ناطق ہے "**الطلاق مرتان..... فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره**" پڑھ کر فرمایا کہ اب تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، تیرے نکاح سے نکل گئی) ظاہر ہے کہ یہ حکم صرف ایک طلاق کے وقوع میں نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ تین طلاق ہی نافذ فرمائیں، چنانچہ حضرت ابن عباس کے تقریبا تمام ارشد تلامذہ ان کا یہی فتویٰ نقل فرماتے ہیں کہ وہ تین طلاق کو تین ہی قرار دیتے تھے، اور تین ہی طلاق واقع ہونے کا حکم فرماتے تھے، بلکہ صاحب "استذکار" نے تو بہت صاف لفظوں میں اس کی تصریح کردی ہے کہ تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کی روایت جیسا کہ ابن عباس کی طرف منسوب ہے وہ بالکل غلط اور وہم ہے، کسی عالم محقق نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے (۲)۔

اسی طرح امام مالک نے بھی مؤطا میں فرمایا ہے: "**بلغه (أي مالک) أن رجلا قال لعبدالله ابن عباس إني طلقت امرأتي مأة تطليقة فماذا تریٰ! فقال ابن عباس: طلقت منک ثلاثا وسبع وتسعون اتخذت بها آیات الله هزوا**" (۳)۔

(ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو مرتبہ طلاق دیدی ہیں آپ میرے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ تیری بیوی تین طلاق سے مطلقہ ہوگئی اور ۹۷ بار مزید لفظ طلاق بول کر تو نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا، اور اس کا کھیل بنایا) یہ سب کو معلوم ہے کہ امام مالک کے بلاغات بھی، خواہ ان کی وہ سند ذکر نہ فرماویں، مگر وہ متصل السند اور صحیح ہوتے ہیں، اس لئے اب ان تصریحات کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس اجماع کے منعقد ہوجانے کے بعد بھی حضرت ابن عباس بیک مجلس تین طلاق کو ایک ہی طلاق فرماتے تھے، یہ بات متضاد و متعارض ہوجائے گی، بلکہ اگر اس پر ضد کی جائے تو حضرت ابن عباس پر صریح اتہام کے مرادف بھی ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر زمانۂ مشکوٰۃ نبوت سے لے کر ابتدائے زمانۂ عمرؓ تک کتاب وسنت کا عام حکم یہی مان لیا جائے کہ

۱- ابوداؤد ۲/ ۲۶۰-۲۶۱، حدیث: ۲۱۹۷، مکتبۃ عصریہ بیروت۔

۲- الجوہر النقی ۲/ ۱۱۳۔

۳- أوجز علی الموطأ ۱۰/ ۵۔

تین طلاق بیک مجلس ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی، لیکن حضرت عمر نے اسی ایک طلاق کو تین قرار دیدیا تو غور کیجئے کہ کس قدر خطرناک بات ہوگی؟ حضرت عمر کے دبدبہ ورعب کے باوجود ایک معمولی درجہ کے صحابی بھی اگر کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات دیکھتے تھے برملا لومۃ لائم کے خوف کے بغیر حضرت عمرؓ کے منہ پر ظاہر فرمادیتے تھے، اس کی بہت سی مثالیں کتابوں میں مذکور ہیں، پھر یہ کیسے عقل باور کرسکتی ہے کہ اتنا بڑا اور حرمت وحلت کا حامل مسئلہ کتاب وسنت کے خلاف اس طرح برملا تمام اجل صحابہ کے سامنے طے ہوجائے اور کوئی خلاف نہ کرے، بلکہ ائمہ اربعہ کا مسلک وہی ہوجائے جس پر حضرت عمر نے اجماع منعقد کیا، بلکہ جمہور صحابہ اور جمہور تابعین وجمہور ائمہ کا یہی مذہب ہوجائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق بھی تین ہی شمار ہوں گی، ایک طلاق شمار نہ ہوگی، جیسا کہ امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل فرمایا ہے:

"ذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين إلى أنه يقع ثلاثا" (۱)۔

اسی طرح طبقۂ صحابہ کے بعد طبقۂ تابعین میں حضرت طاؤسؒ کا نام لیا جاتا ہے کہ وہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیتے تھے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ علی ابن مدینی کے ارشد تلمیذ حسین ابن علی کرابیسی کی جانب سے اس کی تردید نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"روى حسين ابن على ابن الكرابيسي في كتاب أدب القضاء قال: اخبرنا على ابن عبد الله وهو ابن المديني عن عبد الرزاق عن معمر عن طاؤس أنه قال: من حدثك عن طاؤس أنه كان يرى طلاق الثلاث واحدة كذبه"۔

(ہم کو ابن مدینی نے خبر دی اور ان کو عبدالرزاق نے خبر دی اور ان کو معمر نے اور ان کو ابن طاؤس نے اور ان کو خود طاؤس نے خبر دی اور متنبہ کیا کہ جو تم سے میرے بارے میں یہ کہے کہ وہ تین طلاق ایک طلاق سمجھتے تھے اس کی تکذیب کرنا تسلیم مت کرنا، جھٹلا دینا)۔

ابھی ہم جوہرنقی سے صاف مستند کارکا فیصلہ نقل کرچکے ہیں کہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق ماننے کی روایت کسی محقق کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے، بالکل اسی طرح دارقطنی کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی عورت کو تین طلاق مبہم طور پر (خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعددہ) دے گا یا تین طلاق کا اقرار، خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعددہ کرے گا اس کی عورت اس کے لئے حلال نہ رہے گی، یہاں تک کہ وہ حسب قاعدہ شرعیہ کسی دوسرے شخص سے حلالہ نہ کرا چکی ہو۔

۱- فتح القدیر ۳/۳۲۵، لا أجد هذه العبارة رغم ألبي تفصحت تفصحا كثيرا۔

"أيما رجل طلق امرأته ثلا ثا مبهمة أو ثلا ثا عند الإقرار فلاتحل له حتى تنكح زوجا غيره" (۱)۔

ان ہی باتوں سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ طبقۂ تابعین کے بعد بھی بعض علماء کی طرف بیک مجلس تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کا جوانتساب ہے وہ واقعیت یا حقانیت یا صداقت سے بہت دور ہے، ممکن ہے کہ یہی سب وجوہ واسباب ہوں کہ جب علامہ ابن قیم نے اپنے استاد ابن تیمیہ کی اتباع میں تین طلاق کو ایک قرار دے کر اس پر دلائل فراہم کئے تو ان کے تلامذہ میں سے ارشد تلامذہ ابن رجب نے اپنے استاذ کے اس دعوے کی نہایت شدومد کے ساتھ اور بہت زوردار طریقہ پر تردید کی اور ایک مجلس کی تین طلاق کو تین قرار دیا، اس لئے کہنا پڑے گا کہ یا تو کتاب وسنت کا یہ مسئلہ ہی نہیں کہ بیک مجلس تین طلاق ایک طلاق ہو یا اگر تھا تو اس کے نسخ کی کوئی قوی دلیل ان سب کے پاس خود موجود تھی چنانچہ حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت بھی اس پر کھلی دلیل ہے کہ سرکار دوجہاں نے خود ایک مجلس کی تین طلاق اور تین طلاق سے زائد طلاق کو تین ہی طلاق قرار دیا ہے، حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت کو حضرت امام ابن ہمام فتح القدیر میں اس طرح فرماتے ہیں:

"وأسند عبد الرزاق عن عبادة ابن صامت أن أباه طلق امرأته ألف تطليقة فانطلق عبادة إلى رسول الله فقال رسول الله ﷺ: بانت بثلث في معصية الله تعالىٰ، وبقيت تسعمائة وسبع وتسعون عدوانا وظلما إن شاء عذبه و إن شاء غفر له (۲)۔

(عبدالرزاق نے اپنی باقاعدہ سند کے ساتھ عبادہ ابن صامت سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبادہ کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دیں تو حضرت عبادہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعہ نقل کر کے حکم معلوم فرمایا، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کی بیوی ان کے نکاح سے تین طلاق کے ساتھ خارج ہوگئی اور وہ معصیت خداوندی میں مبتلا ہو گئے اور نوسوستانوے طلاقیں ظلم اور زیادتی ہوکر صادر ہوئیں، اب اللہ کی مرضی ہے کہ چاہے تو وہ ان کو عذاب دے، چاہے معاف کردے)۔

صاحب بحر نے بھی اس روایت کی توثیق کی اور قابل استناد قرار دیکر ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق شمار کرنے کے موقع میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں: "روى عبد الرزاق عن عبادة ابن صامت مرفوعا انه عليه السلام قال: بانت بثلاث في معصية الله" (۳)۔

۱- دار قطنی۔
۲- فتح القدیر، کتاب الطلاق ۳/۵۲۳۔
۳- البحر الرائق ۳/۲۳۳۔

(عبدالرزاق نے حضرت عبادہ ابن صامت سے مرفوعاً نقل فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں تین طلاق سے جدا ہوگئی)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کے شیوع کا عموم نہ ہوا ہو۔ عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہوا ہو اور یہ بھی وجہ اشتباہ بنا ہو اور انہی وجوہ سے حضرت عمرؓ کو مذکورہ بالا اندیشے پیدا ہوئے ہوں اور انہوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا تذکرہ فرمایا ہو اور سب نے ان کی رائے سے اتفاق کرلیا ہو اور پھر اس حکم کی اشاعت ہوگئی ہو۔

اس تقریر کے مطابق نہ نسخ ماننے کی حاجت ہوتی ہے اور نہ اجماع پر مدار ہوتا ہے، بلکہ محض حکم نبوی ﷺ کے اشاعت کا اہتمام نمایاں ہوتا ہے، ساتھ ہی محض ایک مجلس کی تین ہی طلاق نہیں، بلکہ فم واحد تین طلاق یا تین طلاق سے زائد طلاق کا بھی تین طلاق ہونا واضح ہوگیا اور عبادہ ابن صامت کا لفظ: "ان اباہ طلق امرأته الف تطليقات" صریح دال ہوگیا کہ فم واحد بھی متعدد طلاقیں متعدد ہوں گی، نہ کہ محض ایک۔

غرض اگر ان باتوں کو تسلیم نہ کیا جائے تو چھوٹے بڑے تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیت و دیانت مجروح ہوتی ہے جس سے ان تمام سے یکسر اعتماد غائب ہوجائے گا۔ اور پھر اس کا اثر کتاب وسنت یا پورے دین پر جہاں تک غلط طریقہ سے پہونچے ظاہر ہے۔ اس لئے دفع تضاد کی وہی صورت متعین ہوتی ہے جو احقر نے اوپر تفصیل سے لکھی ہے اور اسی وجہ سے محققین علماء ومشائخ نے لکھا ہے کہ اجماع صحابہ خود حجت قطعیہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے متعدد ہوجانے اور ثابت ہو جانے کے بعد ایک مجلس کی تین طلاق کے منکر پر رد کرنے میں مشغول ہونے کی حاجت نہیں ہے، اس لئے یہ قول اجماع اور حجیہ شرعی کے مخالف ہے، اور اسی وجہ سے اگر کوئی حاکم (یا قاضی یا مفتی) فم واحد کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے تو اس کا حکم نافذ ہی نہ ہوگا، اس لئے کہ حجت شرعی (اجماع) کی مخالفت ہے، محض اختلاف نہیں ہے، اس کو اختلاف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اس میں اجتہاد کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

"ولا حاجة أى الاشتغال بالأدلة على رد قول من أنكر وقوع الثلاث جملة، لأنه مخالف للإجماع كما حكاه في المعراج ولذا قالوا: لوحكم حاكم بأن الثلث بفم واحد واحدة لم ينفذ حكمه، لأنه لا يسوغ فيه الاجتهاد، لأنه خلاف لا اختلاف"(۱)۔

یہاں یہ بات بھی واضح کردینی ضروری ہے کہ فقہی جزئیات اور تفصیلات کو اور ائمہ اربعہ کے اصول استنباط کو جو مجمع علیہ ہیں، پس پشت ڈالنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کوتاہیوں میں ابتلاء ہوگیا، اگر فقہاء کی تفصیلات وبیان کردہ جزئیات اور

۱- البحر الرائق ۳/ ۲۴۰۔

اصول استنباط کی اتباع سے قطع نظر کرلیا جائے تو ہم میں سے کوئی اس درجہ پر نہیں ہے کہ کتاب وسنت کو بغیر واسطۂ ائمہ کے کما حقہ سمجھ کر اس سے صحیح استنباط کرے، اگر ہم نے ان کے جزئیات کے اصول وضوابط اور تفصیلات سے قطع نظر کرکے سوچنا اور سمجھنا شروع کردیا تو بدراہی کے شکار ہوجائیں گے اور دین کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دیں گے، جس طرح امم سابقہ اور دیگر مذاہب سماوی کے ماننے والے اور مدعیان مبتلا ہوگئے اور یہی وہ مرض مہلک ہے جس کی طرف بہت سی صحیح احادیث اور مسلم ارشاداتِ نبوی میں ارشارے ہی نہیں، بلکہ مستقل اور زبردست وعیدیں اور نکیریں مذکور ہیں۔

پہلا نکتہ: جوایک ا کے تحت درج ہے:

ایک مجلس کی تین طلاق کے مغلظہ ہونے کا مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت بھی ان سابق بیانات سے خود بخود واضح ہوگئی کہ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ ہونے میں سلف ہی کے زمانہ سے اختلاف موجود ہے، یا یہ مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں بالکل نا قابل تسلیم وغیر صحیح ہے اور زائد تفصیل آگے آتی ہے کہ اس اختلاف کا نام اختلاف نہیں ہے، بلکہ خلاف اجماع اور خلاف حجت شرعیہ اور خلاف حق ہے اور خلاف حق کا جو درجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اسی اجماع کے منکر کے بارے میں علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری، ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ نقل فرماتے ہیں: ”**وقال من خالف فيه فهو شاذ مخالف لأهل السنة وإنما تعلق به أهل البدع ومن لايلتفت إليه لشذوذه من الجماعة التي يجوز عليهم التواطوء على تحريف الكتاب والسنة**“ (۱) اور پھر اسی جلد اور صفحہ میں اس طرح رقم طراز ہیں:

”**وذهب جماهير العلماء من التابعين ومن بعدهم منهم: الأوزاعي، والنخعي، والثوري، وابوحنيفة، واصحابه، والشافعي، وأصحابه، وأحمد، وأصحابه، واسحاق، وأبوثور، وأبو عبيدة وآخرون كثيرون على أن من طلق امرأته ثلاثا وقعن ولكنه يا ثم**“ (۲) اور اسی مسئلہ کو علامہ ابن عابدین نے اپنے ان الفاظ میں نقل کیا ہے اور بعض حنابلہ کی اس توجیہ وقول کو جس کو انہوں نے اس اجماع کے خلاف میں نقل کیا ہے باطل وغلط قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ”**وأما إمضاء عمر الثلاث عليهم مع عدم مخالفة الصحابة وله وعلمه بأنها كانت واحدة فلا يمكن إلا وقد اطلعوا في الزمان المتأخر على وجود ناسخ أو لعلمهم بانتهاء الحكم**

۱- عینی شرح بخاری ۹/ ۵۴۷۔

۲- عینی شرح بخاری ۹/ ۵۳۷۔

لذالک لعلمهم بالناطته بمعان علموا انتفاء ها في الزمن المتأخر وقول بعض الحنابلة: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مأة الف عين رآته فهل صح لكم عنهم أو عن عشر عشر عشر عشرهم القول بوقوع الثلث باطل، أما أولا فإجماعهم ظاهر، لأنه لم ينقل عن أحد منهم أنه خالف عمر حين أمضى الثلاث ولا يلزم في نقل الحكم الإجماعي عن مأة الف تسمية كل في مجلد كبير لحكم واحد على أنه إجماع سكوتي، وأما ثانيا فالعبرة في نقل الإجماع نقل ما عن المجتهدين و المائة ـالف لايبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم أكثر من عشرين كالخلفاء والعبادلة وزيد ابن ثابت و معاذ ابن جبل وأنس وأبي هريرة والباقون يرجعون اليهم ويستفتون منهم وقد ثبت النقل عن أكثرهم صريحا بإيقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف، فما ذا بعد الحق إلا الضلال، وعن هذا قلنا: لوحكم حاكم بأنها واحدة لم ينفذ حكمه؛ لأنه لايسوغ الاجتهاد فيه فهو خلاف لا اختلاف، وغاية الأمر فيه أن يصير كبيع أمهات الأولاد أجمع على نفيه، وكن في الزمن الاول يعن(۱)۔

انہی وجوہ کی بناء پر احقر نے شروع میں کہا تھا کہ اس سمینار کوکل ہند سمینار کہنا غلط ہے اور نا قابل تسلیم ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس سے ہرگز دھوکہ میں نہ آنا چاہیے، ہاں صحیح مسائل کی ترویج اور تین طلاق دینے کی مبغوضیت اور بوقت ضرورت طلاق کے مسنون اور بہتر طریقہ کی تشہیر اور ترویج و تعلیم جس قدر زیادہ اور موثر انداز میں ہو پوری قوت سے کرنی ضروری ہے، بلکہ وقت ایسا ہے کہ یہی نہیں اور دیگر عقائد اور اعمال ومعاملات کی شرعی تعلیم وترویج وترغیب میں بھی انتھک سعی وکوشش کرنی اور انتظام بنانا اور چلانا ضروری ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۱۱/ ۹۳ ۱۳ھ

ایک مجلس کی تین طلاق:

ایک شخص نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدی، آیا طلاق حکم اللہ اور حکم رسول سے ہوگئی یا کہ نہیں؟

۱- شامی ۳/ ۲۳۳، کتاب الطلاق۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مدخول بہا کو جب شوہر نے تین طلاقیں دیدیں تو تینوں واقع ہوکر طلاق مغلظہ ہوگئی، خواہ ایک ہی مجلس میں دی ہوں، اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

کما فی العالمگیریۃ ۲/۳۷۰ **"وإذا قال لامرأته أنت طالق وطالق وطالق ولم يعلقه بالشرط إن كانت مدخولة طلقت ثلاثا وإن كانت غير مدخولة طلقت واحدة"**(۱)۔

ہاں اگر عورت غیر مدخول بہا ہے یعنی ان میاں بیوی میں یکجائی نہیں ہوئی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر بایں الفاظ طلاق دیا ہے (میں نے تجھ کو تینوں طلاقیں دیں) جب تو تین واقع ہوں گی، ورنہ محض ایک طلاق بائن واقع ہوگی کما هو ظاہر (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید محمود عفی عنہ

گواہوں کے سامنے تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟

مسمی کریم اللہ نے اپنی منکوحہ کو اپنی حقیقی بھاوج اور امیر خان کے سامنے تین طلاق دیا جسکی وجہ دو مقامی خانگی جھگڑا بی بی اور مرد کا ہے اسکی شہرت منکوحہ نے اپنی زبان سے چند آدمیوں سے اپنے موضع میں کیا اس واقعہ کے بعد منکوحہ مرد کے گھر میں ایک ماہ تک ٹھہری رہی مگر مرد یعنی کریم اللہ بی بی سے قطعی طور پر قطع تعلق کر کے الگ رہتا تھا، ایک ماہ بعد کریم اللہ کی بی بی اپنے بچوں کو لے کر اپنے میکہ حبیب پور چلی گئی اور چھ ماہ سے اوپر ہورہا ہے کہ میکہ میں قیام پذیر ہے، لڑکی یعنی کریم اللہ کی بی بی کے وارثان کی جانب سے پیشتر مہر مانگا گیا اور کہا گیا کہ اپنے بچے کو لیجاؤ، اس کو طے کرنے جب کریم اللہ جاتا ہے تو اب یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق نہیں ہوا ہے، بی بی کو مع بچوں کے لیجاؤ، اس لئے عرض ہے کہ بروئے شرع محمدی جو مسئلہ صادق آتا ہو تحریر فرماویں کہ کیا وہ طلاق جائز کہ ناجائز ہے بینوا توجروا۔

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/۳۵۵، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- ''اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن عليها فإن فرق الطلاق بانت بالأولى ولم تقع الثانية والثالثة'' (الفتاوی الہندیہ ۱/۳۷۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کریم اللہ نے جب تین طلاقیں دیدیں اور اسکے گواہ بھی موجود ہیں اور خود عورت کو بھی اقرار ہے تو اب بعد میں انکار کسی طرح جائز نہیں، اب تین طلاقیں واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کریم اللہ کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی اور نہ کریم اللہ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، حلالہ یہ ہے کہ کریم اللہ کے طلاق کے بعد عدت (تین حیض) گذرنے پر عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو اور وہ اس سے ہم صحبت ہونے کے بعد فوت کرجائے یا کسی وجہ سے طلاق دیدے اور وہ عورت اپنی یہ عدت بھی گذارے تو اب کریم اللہ سے جدید نکاح کرنے کے بعد حلال ہوسکتی ہے بغیر اس کے نہیں ہوسکتی(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

تین طلاق دینے والے پر مالی جرمانہ اور اس کی تعزیر کا حکم:

موجودہ کورٹ نے مسلم پرسنل لا کے خلاف جو قانون بنایا ہے کہ مطلقہ پوری زندگی یا دوسرے نکاح تک نفقہ کی حقدار ہے، اس قانون سے بہت سی مسلمان خواتین بھی غلط فائدہ اٹھارہی ہیں چنانچہ ہماری طرف سورت اور احمد آباد کی کورٹ میں اس قسم کے سیکڑوں مقدمے (کیس) داخل کئے گئے ہیں اور کتنی عورتوں کے لئے فیصلہ بھی کردیا گیا ہے، جب عوام کو مقدمہ اور مسلم وکلاء کو تعاون سے روکا جاتا ہے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان مظلومات کے نفقہ کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو بھکارن بنا دی جائے گی؟ جبکہ بعض عورتیں بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرے نکاح کے قابل بھی نہیں ہے، اور ان کے اقرباء اس حالت میں نہیں ہوتے کہ ان کا نفقہ برداشت کرسکیں اب ایسی تنگ دستی میں وہ مطلقہ کورٹ سے اپنی داد نہ حاصل کرے گی تو کیا کرے گی اگر عدت سے زائد نفقہ حاصل نہیں ہوسکتا تو ایسی مطلقہ کا کیا حل ہے؟ اور نفقہ حاصل کرنے سے وہ مجرم شوہر جو ایک ساتھ بلاوجہ تین طلاق دیتا ہے ان کے لئے سزا بھی ہے اور دوسروں کے لئے عبرت ہے۔

چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کمزوری اور عورتوں کے لئے کوئی قابل اطمینان حل پیش نہ ہونے کی وجہ سے حکومت نے

۱- ”وان کان الطلاق ثلاثا فی الحرۃ او اثنین فی الأمۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ نکاحا صحیحا ویدخل بھا ثم یطلقھا أو یموت عنھا“ (قدوری مع اللباب کتاب الرجعۃ ۲/ ۱۸۳، مطبعہ دارالایمان سہارنپور)۔

اب تک اس قانون کو بدلا نہیں ہے اور بہت سے ناواقف یہ سمجھ کر کہ اب ہمارے لئے دین پر چلنا مشکل ہے اور ہمارے لئے سوائے مقدمہ کے کوئی حل نہیں ہے، اپنے ایمان کو خراب کر رہے ہیں اب ان حالات کے پیش نظر چند امور دریافت ہیں:

(۱) ایسی مطلقہ کے لئے جو بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی اور اقرباء کی مالی حالت بھی کمزور ہے، نفقہ اور دیگر دشواریوں کا حل شریعت کے مطابق کیا ہوگا۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک ساتھ تین طلاق دینے والوں کو سزا فرمائی ہے (طحاوی شریف جلد ۲) اور جواہر الفقہ (۲/ ۵۳۳) پر مذکور ہے کہ جو شخص ایک ساتھ تین طلاق دے گا اس پر عدالت کو حسب صواب دید تعزیری سزا جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔

تو کیا شرعی قاضی نہ ہونے کی صورت میں ان تعزیرات پر قیاس کرتے ہوئے ایسے مجرم سے بطور سزا و تنبیہ جماعت یا پنچایت قطع تعلق اور بائیکاٹ کر سکتی ہے۔

(۳) ظاہری روایت کے مطابق مالی جرمانہ جائز نہیں ہے۔

لیکن امام ابو یوسف کی ایک روایت کے مطابق جائز ہے، جیسا کہ شامی جلد ثالث باب التعزیر میں منقول ہے: "وعن أبي يوسفؒ يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال"۔

اب سوال یہ ہے کہ رسم المفتی میں قول مرجوح کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مواقع الضرورة مستثناة اور آگے قول مرجوح پر ضرورت کے وقت گنجائش کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں اور انگریز کے دور میں مظلومہ عورتوں کے چھٹکارے کا بظاہر کوئی حل نہیں تھا تو حضرت تھانویؒ نے مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے شرعی پنچایت کا حل نکالا تھا اور علماء نے اس کو قبول بھی کیا تھا تو آج بھی مطلقہ عورتوں کی مشکلات اور مجرم کو سزا اور بلا وجہ غلط طلاق کے رواج کا سدباب ان مصالح کے پیش نظر کیا قول مرجوح پر عمل کرتے ہوئے جماعت یا پنچایت بلا وجہ ایک ساتھ تین طلاق دینے والے سے مالی جرمانہ لے سکتی ہے؟ تاکہ اس سے مطلقہ کے نفقہ کا حل ہو سکے اور غلط طلاق کا رواج اور معاشرہ کے بگاڑ کے سدباب کا ذریعہ بھی ہو جائے۔

(۴) دوسری طرف وہ مظلوم مرد جو طلاق دینے پر مجبور ہے، اس قانون سے بچنے کے لئے مطلقہ کے ولی کو عورت کے نفقہ سے زائد روپیہ بطور صلح دے سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل گجرات میں بہت سے بے گناہ مردوں کو بھی مجبوراً طلاق دینے پر پانچ پانچ دس دس ہزار روپئے دینے پڑ رہے ہیں، امید ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر قابل اطمینان تفصیلی جواب

مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مونس ہدات، گجرات

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: اصل جواب معلوم کرنے سے پہلے چند باتوں کا معلوم کرلینا ضروری ہے:

(۱) یہ جتنی خرابیاں نظر آرہی ہیں سب معاشرے کے خرابی کیوجہ سے ہیں، اگر معاشرہ مسلمانوں کا شرعی اور صحیح ہوجائے تو ان خرابیوں میں سے ایک خرابی بھی پیدا نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کی دین ودنیا دونوں کی فلاح وکامیابی کے لئے معیار قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر (۱) (قرن نبوت، قرن صحابہ، قرن تابعین) ہیں ان کی مطابقت وموافقت ومتابعت فلاح وکامیابی کی ضامن ہیں اور اس کی متابعت وموافقت چھوڑنے میں ہی سب پریشانیاں ودشواریاں لاحق ہوتی ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

(۳) ان قرون ثلاثہ میں نکاح ثانی کوئی عیب نہیں قرار دیا گیا تھا بلکہ ازروئے احادیث وآثار فلاح وکامیابی کا ذریعہ تھا اور آج اس کے برعکس اعتقاد بن گیا ہے اور نکاح ثانی کو عیب و بےعزتی قرار دیا گیا ہے، چاہے دنیوی اعتبار سے بھی اس سے بڑے بڑے معائب کا اور خرابیوں کا ارتکاب ہو مگر پھر بھی وہ عیب شمار نہیں ہوتا شریعت مطہرہ کا منشاء تو یہ ہے کہ کوئی مرد بغیر جائز عورت کے ساتھ کے مجرد زندگی نہ گزارے، اسی طرح کوئی عورت بغیر جائز مرد کے مجرد زندگی نہ گزارے، دونوں کی عصمت وآبرو کی حفاظت اس نکاح میں مضمر ہو اور اسی کو آج عیب و بےعزتی قرار دیا گیا ہے، سب خرابیوں کی جڑ یہی ہے (۲)۔

خیال فرمائیے ازواج مطہرات میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کوئی کنواری نہیں تھیں، سب بیوہ یا شادی شدہ تھیں، اسی طرح صحابہ وصحابیات کا عام حال دیکھا جائے، اکثر کئی کئی شوہروں سے بیوہ یا جدا شدہ تھیں، اسی طرح

۱- عن عبداللہ قال: سئل رسول اللہ ﷺ: أی الناس خیر؟ قال: "قرنی، ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم ثم یجیئ قوم تبدر شہادۃ أحدہم یمینہ وتبدر یمینہ شہادتہ" (صحیح مسلم ۴/ ۱۹۶۳ کتاب فضائل الصحابۃ حدیث ۲۱۱/ ۲۵۳۳)۔

۲- عن سعد بن أبی وقاص ؓ قال: "رد رسول اللہ ﷺ علی عثمان بن مظعون التبتل ولو أذن لہ لاختصینا" (صحیح مسلم ۲/ ۱۰۲۰ کتاب النکاح حدیث ۶/ ۱۴۰۲)۔

تابعیات کا بھی حال ہے کہ قطعی نکاح ثانی یا نکاح ثالث وغیرہ کو معیوب نہیں جانتی تھیں۔

(۴) دور صحابہ سے آگے بڑھ کر بھی دیکھئے یہی معمول وعام رواج ملتا ہے، سیر و تاریخ میں جانا نہیں ہے، آپ حضرات خود دیکھ سکتے ہیں صرف دو ایک مثال نقل کر دیتا ہوں حضرت امام شافعی بالکل بچے تھے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کی والدہ محترمہ نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ سے عقد نکاح کر لیا (۱)، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی بچپن کی کل تعلیم وتربیت حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کے پاس ہوئی ممکن ہے اس بنا پر بھی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہو کہ **الناس عيال في الفقه لأبي حنيفة** اس وجہ سے ان کے علمی درجہ میں عیال کا ہونا تو ظاہر ہی ہے اسی طرح حضرت اسماعیل دہلوی شہید وحضرت مولانا قاسم رحمہما اللہ کو جب نکاح ثانی کی مردہ سنت کو زندہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے اپنی انتہائی بوڑھی بہن سے اس نکاح ثانی کی مردہ سنت کے احیاء وزندہ کرنے کی ابتدا فرمائی پھر بے شمار عورتوں کے نکاح ثانی ہوئے اور اس کا تقریباً رواج پڑ گیا تھا اور یہ مردہ سنت زندہ ہو گئی تھی یہ تو غیر مسلموں کا مذہبی طریقہ ورواج تھا کہ عورت بیوہ ہونے کے بعد ستی ہو جائے یا اسی شوہر کے نام پر بیٹھی رہے دوسری شادی کرنے کو مذہبی طور پر نہایت معیوب و بے عزتی قرار دیا جاتا اور سمجھا جاتا تھا اور یہی رواج بڑھ کر بیوہ ہونے کے علاوہ مطلقہ ہونے تک میں چل پڑا اور جب سے مسلمانوں میں اس رواج بد کا رواج ہوا مسلمانوں میں بھی یہی بات چل پڑی اس لئے یہ ساری خوفناک وافسوس ناک حالات اور صورتیں جو پیش آ رہی ہیں وہ سب صرف غیر مسلمانہ روش کے اختیار کرنے اور اپنانے سے آ رہی ہیں اور اب یہ ایک عام قومی مرض بن کر پورے معاشرہ کو خراب کر رہا ہے۔

(۵) ظاہر ہے کہ مرض کا ازالہ اسی وقت اچھی طرح ہوتا ہے جب سبب مرض کا ازالہ اچھی طرح ہو جائے، لہذا اس ضابطہ عقلیہ کی بنا پر تمام پریشانیوں کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کافرانہ رسم کا علاج کر لیا جائے اور ایسی کوشش کی جائے کہ تمام ماؤں وبہنوں کے دماغ سے کم از کم نکاح ثانی کی نفرت ختم ہو جائے اور نکاح ثانی کا رواج عام ہو جائے تو معاشرہ خود صحیح ہو کر شریعت مطہرہ کے عین مطابق ہو کر صلاح وفلاح دارین کا ذریعہ بن سکتا ہے، آج نکاح ثانی کی سنت مردہ ہو گئی ہے جو شخص اس مردہ سنت کو زندہ کرے گا یا اس کا بیڑہ اٹھائے گا وہ صحیح حدیث شریف "**من أحيا سنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد**" (۲) کے مطابق مجاہد عند اللہ شمار ہوگا اور شہیدوں کے برابر ثواب پائے گا، اسی طرح ایک اور صحیح حدیث شریف ہے:

۱- رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ مقدمہ / ۱۴۳، وتزوج بأم الشافعي وفوض إليه كتبه وماله...الخ۔

۲- عن أبي هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ: "من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد" (مشكاة المصابیح ۱/ ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الثانی)۔

"من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل أجر من عمل بها من الناس لا ينقص من أجور الناس شيئا" (۱)۔

تمام گفتگوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس پریشانی کا اصلی علاج شریعت کے قوانین میں ردوبدل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصلی علاج معاشرہ کا سدھارنا اور سیدھا کرلینا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہر سوال کا جواب نمبر وار دیا جاتا ہے۔

(۱) اس نمبر کا حکم یہی ہے کہ اس کو اپنا دوسرا نکاح کسی مناسب جگہ کرلینا چاہیے اور اگر بالفرض کسی شرعی معذوری یا کسی وجہ سے نکاح ثانی نہیں کرسکتی تو اس کا نفقہ مطلقہ کے عصبات کے ذمہ ہوگا، طلاق دینے والا شوہر بھی اگر از خود کچھ تبرع کر دے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن شوہر کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر شرعاً لازم کیا جا سکتا ہے (۲)۔

(۲) حضرت عمرؓ نے تین طلاق دینے والے کو سزا نہیں دی ہے بلکہ اس کے "**أبغض المباحات عند الله الطلاق**" (۳) کے ارتکاب پر تنبیہ فرمائی اس کا قرینہ خود اس کے تین طلاق کو ختم نہ کرنا بلکہ باقی رکھنا ہے، تنبیہ اور سزا میں بون بعید ہے، نیز سزائے جسمانی کا حکم بھی سزائے مالی سے مختلف ہے۔ **کما ورد في الحديث: "لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه"** او **کما قال** ﷺ (۴) اور جوہر الفقہ کا محمل صرف یہ ہے کہ شوہر نے ظلماً تین طلاقیں دی ہوں ورنہ اس کا بھی کوئی محل نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص واقعی محض ظلماً تین طلاق دیدے اور عورت کا کوئی قصور نہ ہو تو شرعی پنچایت اس کی اصلاح تک قطع تعلق کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

۱- "إن النبي ﷺ قال لبلال بن الحارث: اعلم، قال ما أعلم يا رسول الله، قال: اعلم يا بلال، قال: ما أعلم يا رسول الله؟ قال: أنه من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيئا، ومن ابتدع بدعة ضلالة لا ترضى الله ورسوله كان عليه مثل آثام من عمل بها، لا ينقص ذلک من أوزار الناس شيئاً" (سنن الترمذی ۵/ ۴۵، کتاب العلم، باب ماجاء فی الأخذ بالسنۃ واجتناب البدع حدیث: ۲۶۷۷)۔

۲- "فالإناث عليه (يعني على الأب) نفقتهن إلى أن يتزوجن إذا لم يكن لهن مال، وليس له أن يؤاجرهن في عمل ولا خدمة وإن كان لهن قدرة، وإذا طلقت وانقضت عدتها عادت نفقتها على الأب" (فتح القدیر ۴/ ۲۱۷، باب النفقۃ، نیز دیکھئے: رد المحتار ۵/ ۳۴۱)۔

۳- عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال: "أبغض الحلال إلى الله تعالى الطلاق" (سنن ابوداؤد ۲/ ۲۵۵، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق حدیث: ۲۱۷۸، نیز سنن ابن ماجہ ۱/ ۶۵۰، حدیث: ۲۰۱۸)۔

۴- عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله ﷺ قال: ...الحدیث (سنن الدار قطنی ۳/ ۲۶ حدیث ۹۱)۔

(۳) حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ جو بوقت ضرورت تعزیر مالی کی اجازت دیتے ہیں تو پھر بعد اصلاح اس کے واپس کر دینے کا حکم بھی دیتے ہیں اور یہ اباحت نفع بخش نہیں اور اگر تعزیر مالی ناگزیر ہو اور واپسی میں اصلاح بھی متوقع نہ ہو تو پھر اس کی اجازت ومرضی سے کسی کار خیر میں صرف کر دینے کی بھی گنجائش ہوگی ورنہ اباحت مطلقہ کا قول معتمد نہیں (۱)۔

(۴) **الضرورات تبیح المحظورات الخ مواقع الضرورۃ مستثناۃ** کا بھی یہ محل نہیں ہے، اس کا محل اس وقت ہو سکے گا جب بچاؤ وبدل کی کوئی صورت نہ ہو اور یہاں موجود ہے، اسی وجہ سے مسئلہ مفقود الخبر یا مسئلہ حیلہ ناجزہ پر بھی قیاس کرنا صحیح نہیں (۲)۔

(۵) مظلوم مرد کی بھی تکالیف کا لحاظ کرنا اور اس سے چھٹکارا لینے کی راہ کا ہموار کرنا مقصود شرعی ہے اور شریعت مطہرہ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا ہے، چنانچہ خلع میں مہر کی رقم سے زیادہ رقم کے وصول کرنے کی کراہیت جب مرد کے لئے ہے تو اس سے عورت کے لئے نفقہ عدت سے زیادہ کی رقم لینا مکروہ نکلے گا اور واجب العمل نہ ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۸/۱۴۰۲ھ

طلاق دینے پر مالی جرمانہ لینا:

ہماری قوم لوہار نے نکاح اور طلاق کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر سو روپیہ سے لیکر پانچ سو روپیہ تک جرمانہ کر دیئے ہیں اور جرمانہ پنچایت میں وصول کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیتے ہیں، کیا طلاق دینا پنچوں کے امکان میں ہے یا کہ شوہر کے امکان میں، ایک لڑکے نے اپنی بیوی کو ناراض ہو کر طلاق دیدی ہے تو اس کے شوہر سے طلاق دینے کے جرم میں جرمانہ لینا جائز ہے یا کہ نہیں اور حرام ہے یا کہ حلال ہے اور جو رقم جرمانہ کی لی ہے اس کو واپس دیجائے یا کسی کام میں لایا جائے؟

۱- ’’وأفاد في البزازية أن التعزير بأخذ المال على القول به إمساک شيئ من ماله عنه مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه... وفي المجتبى لم يذكر كيفية الأخذ وأرى أن يأخذها فيمسكها فإن أيس من توبته يصرفها إلى ما يرى‘‘ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۱۰۶)۔

۲- کیونکہ انتہاء عدت کے بعد اس کا نفقہ اس کے فقیر ہونے کی صورت میں اس کے باپ یا اولاد پر لوٹ آتا ہے اور اگر وہ خود مالدار ہے تو اس کا نفقہ خود اپنے اوپر واجب ہے ’’لو استغنت الأنثى بنحو خياطة وغزل يجب أن تكون نفقتها في كسبها كما هو ظاهر ولا نقول تجب على الأب مع ذلک إلا إذا كان لايكفيها فتجب على الأب كفايتها بدفع القدر المعجوز عنه‘‘ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۳۳۷)۔

۳- ’’وكره تحريماً أخذ شيئ أي قليلاً أو كثيراً، والحق أن الأخذ إذا كان النشوز منه حرام قطعاً لقوله تعالى: "فلا تأخذوا منه شيئاً" (النساء ۲۰)‘‘ إلا أنه إن أخذ ملكه بسبب خبيث‘‘ (رد المحتار علی الدر المختار ۵/۹۳)۔

الجواب وبالله التوفیق:

طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے، شوہر کے طلاق دینے سے پورے خاندان یا کسی اور پر جرمانہ عائد کرنا ظلم اور حرام ہے، اسکا لینا حلال نہیں ہے، جرمانہ مال کا صرف حکومت کو حق ہے اور کو نہیں جو رقم جرمانہ وصول ہوئی ہے اس کو واپس کر دیں(۱)، ہاں اگر مالک خود کہیں، یا کسی مصرف میں خرچ کرنے کی اجازت دیدیں تو خرچ کر سکتے ہیں بلا انکی مرضی کے نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق کے بعد دوسری شادی:

زید میں اور زید کی منکوحہ میں بزمان منکوحہ جسمانی نقصانات کی بنا پر اختلافات پیدا ہوئے اور جب زید کو اس کی منکوحہ نے باہمی نقصانات کی جانب زیادہ توجہ دلائی تو اس نے غصہ میں آکر منکوحہ کی والدہ اور اپنے بھائی اور والدہ کے روبرو طلاق دیدی ور اپنی والدہ سے کہا کہ آپ لیجائیے، اس وقت اس کو غصہ آرہا ہے میں اس کو سمجھا دوں گا اور گھر پر ذکر نہ کرنا، منکوحہ کی والدہ اسکو لیکر آگئی یہ واقعہ شادی کے اکیس دن بعد ہی پیش آگیا تھا اس کے بعد سے وہ دوبارہ نہیں گئی اور نہ ہی وہ لڑکا آیا، مگر زید کے دوسرے لواحقین کئی بار آئے مگر منکوحہ گئی نہیں، اس صورت میں قریب ڈھائی سال گذر گئے اور ڈھائی سال بعد زید منکوحہ کے ماموں زاد بھائی کو ملا تو انہوں نے زید سے کہا کہ اگر تم نے طلاق دیدی ہے تو تم دستخط کردو اس پر زید کافی برہم ہوا ہے اور کہا کہ میں دستخط نہیں کروں گا مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے، اب قریب ساڑھے تین سال بعد جبکہ کوئی خرچ وغیرہ نہیں بھیجا اور نہ ہی کوئی واسطے مطلب رکھا ہے تو منکوحہ کی والدہ اور اس کے لواحقین نے عدالت میں درخواست دیدی، اس پر عدالت نے منکوحہ کے بیان پر دوسری شادی کا حکم دے دیا ہے۔

اس بارے میں علماء کرام فرمائیں کہ آیا منکوحہ زید دوسرا نکاح کر سکتی ہے یا کہ نہیں اور اس کے لئے عدت کا کیا حکم ہے اور وہ کس وقت سے ضروری ہے، آیا پہلی طلاق سے یا عدالتی طلاق سے، کیونکہ منکوحہ نے وہاں سے آنے کے بعد باقاعدہ عدت بھی پوری نہیں کی ہے، ایک بات یہ ضروری تحریر کرنی ہے کہ بزمان منکوحہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے، آیا اس حالت میں

۱- ''لایاخذ مال فی المذھب، بحر وفیہ عن البزازیہ وقیل: یجوز، ومعناہ ان یمسکہ مدۃ لینزجر ثم یعیدہ لہ فان أیس من توبۃ صرفہ إلی مایری التعزیر فی المجتبی انہ کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ الدرالمختار مع الرد ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند، والحاصل ان المذہب عدم التعزیر باخذ المال، رد المحتار علی الدر ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

عدت ہوتی ہے یا کہ نہیں اور جن لوگوں کے سامنے طلاق دی ہے وہ موجود ہیں، ان میں تین مرد مسلم اور ایک ہندو ہے، ضرورت پڑنے پر وہ گواہی دے سکتے ہیں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(سوال میں چند امور قابل لحاظ ہیں):

۱۔زید سے نکاح کے بعد خلوۃ صحیحہ ضرور ہوئی ہے جیسا کہ سوال کی شروع عبارت سے ظاہر ہے اور خلوۃ صحیحہ کے بعد وقوع طلاق میں عدت واجب ہوتی ہے۔

۲۔زید نے غصہ میں آکر اپنی منکوحہ کی والدہ (الی قولہ) روبرو طلاق دیدی، اس عبارت سے اگر چہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کن لفظوں میں ایقاع طلاق کیا ہے لیکن اس سے متصل زید کا جملہ (اسکا سامان دیدو الخ) جو سابق ایقاع کی تفسیر اور ترجمان ہوسکتا ہے جس کا ظاہر ومتبادر طلاق مغلظ ہے مگر لفظ سامان دیدو دھمکی بھی ہوسکتی ہے، اس لئے داخل متیقن محض ایک طلاق رجعی ہوگا۔

۳۔ڈھائی سال کے بعد جب منکوحہ کا ماموں زاد بھائی زید سے ملا ہے تو زید دستخط (تحریر طلاق) کرنے پر تو برہم ہوا ہے مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے۔یہ قرینہ ہے کہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے۔

۴۔زید کے اس طلاق دینے پر تین مرد مسلم گواہ بھی ہیں جیسا کہ سوال کی آخیر میں عبارت سے ظاہر ہے۔

۵۔سوال کا یہ جملہ کہ وہاں سے آنے کے بعد منکوحہ نے باقاعدہ عدت پوری نہیں کی ہے اسکا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ کسی متعین مکان میں بیتوتت نہیں کی، اگر یہی مفہوم ہے تو اس کا کچھ اثر اتمام عدت پر نہ پڑے گا، کیونکہ عدت حائضہ محض حیض آجانے کا نام ہے اور متبادر ہے کہ بعد طلاق کے زمانہ طویل (تقریباً چار سال) گذر چکا ہے جس میں عموماً اور عادۃً تین حیض آچکے ہیں اور منکوحہ اس تین حیض آنے پر منکر نہیں ہے۔

۶۔عدالت کی تفریق شرعی تفریق نہیں ہے کہ کچھ اثر انداز ہوسکے بجز اسکے کہ قانون کی زد سے محفوظ رہے یا تفریق شرعی کی تحصیل آسان ہوجاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں احقر کے نزدیک فقہ حنفی کی رو سے اسی ایقاع طلاق کیوقت سے طلاق واقع ہوگئی نہ کہ عدالتی طلاق سے (۱) اور پھر اسکے بعد جب تین حیض گذر چکے ہیں تو اس وقت عدت بھی ختم ہوگئی پس

۱- "فالعدة من وقت الطلاق لا من وقت القضاء" (الدر مع الرد، ۵/ ۲۰۲)۔

جب سے عدت ختم ہوچکی ہے، اسی وقت سے وہ دوسرا نکاح کرنے کی مجاز ہے، لہذا اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو وہ دوسرا نکاح بعد ختم عدت کرسکتی ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/ ۷/ ۵۸ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

طلاق مکرہ کا حکم:

ریڈیو کویت نے بتلایا کہ اگر کسی شخص سے لڑکی والے یا دیگر اشخاص جان سے مارڈالنے کی دھمکی دے کر طلاق لیتے ہیں تو وہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حافظ مہدی حسن، پوسٹ بکس ۴۲۴۴/ ریاض، سعودی عرب

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ بات ادھوری ہے، پوری بات اس طرح ہے کہ اگر جبر واکراہ کر کے مثلاً جان سے مارڈالنے کا خوف دلا کر لفظ طلاق کی تحریر لے لی اور زبان سے طلاق نہ دلوائی تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔

اور اگر زبان سے طلاق دلوائی تو اگر جبر واکراہ دے کر زبان سے کہلوایا ہے، چاہے مارڈالنے کی دھمکی دے کر کہلوایا ہو بہر حال واقع ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

بیوی سے صرف ایک، دو، تین کہنا:

زید اور ہندہ میں جھگڑا ہوا، زید بحالت غصہ اپنے بستر پر جا کر سوگیا، کچھ رات گذرنے کے بعد ہندہ نے زید کو کسی

۱- ''فلو أکره علی أن یکتب طلاق إمرأته فکتب لاتطلق، لأن الکتابة أقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا، کذافی الخانیة'' (فتاویٰ شامی ۴۴۱/ ۲ کتاب الطلاق)۔

۲- ''ویقع طلاق کل زوج بالغ، عاقل ولو عبداً أو مکرها فإن طلاقه صحیح، أي طلاق المکره'' (الدر المختار علی هامش الشامی ۴۲۱، کتاب الطلاق) (مرتب)۔

ضرورت سے بیدار کیا ،زید نے غصہ میں اپنی بیوی سے کہا کہ ایک دوتین اور پھر سوگیا بندہ نے پھر جگایا کہ تم کل صبح دس آدمیوں کے روبرو مجھکو جواب دو، اس پر زید نے اپنی بیوی ہندہ سے کہا میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیدیا ہندہ نے اپنے پڑوس میں اس کا ذکر کیا کہ زید نے مجھے اس طرح کے الفاظ کہا ہے۔

صبح کو ایک شخص نے زید سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی سے کیا کہا، اس نے کہا کہ صرف ایک دوتین ،پھر محلہ کے اکابر نے جمع ہوکر زید سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بیوی کو کیا کہا، اس پر بھی زید نے کہا کہ صرف ایک دوتین کہا ہے، اب زید کا کہنا ہے کہ میں نے یہ لفظ بیوی کو صرف ڈرانے کے لئے کہا ہے،طلاق کی نیت سے نہیں کہا ہے، کیا صورت ھذا میں ہندہ کو طلاق واقع ہوگئی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال ہندہ کا اپنے شوہر کا یہ قول نقل کرنا کہ میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیا اول تو شوہر اسکا منکر ہے اور ہندہ کے پاس شاہد نہیں ،دوم یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں بلکہ کنایہ طلاق کے ہیں اور وہ بھی ایقاع کا نہیں بہت سے بہت یہ سب دھمکی یا وعدہ کے ہوسکتے ہیں جو مفید نہیں، اس لئے صورت مسئولہ میں ہندہ پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

میری طرف سے طلاق ہے اورتا زندگی حرام ہے، سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں بیوی کے درمیان ابتدائی ملاقات میں نا اتفاقی ہوگئی ہے،عورت نے شوہر سے کہا کہ تم پڑھنا چھوڑ واور جو میں کہوں وہ کام کرو،ورنہ میرا اورتمہارا کوئی تعلق نہیں ہے،شوہر نے کہا کہ میں پڑھنا کیوں چھوڑوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا اور کہا کہ تمہاری بات غلط ہے سمجھ سے کام لے،لیکن عورت اپنی ضد پر قائم رہی اور کئی مرتبہ یہی کہا کہ میرا اور تمہارا تا زندگی کوئی تعلق نہیں رہے گا،شوہر نے جواب میں کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی طلاق ہے اورتو میرے لئے تا زندگی حرام ہے، اس بات کو تقریباً تین سال کا عرصہ ہوگیا ہے،شوہر نے رجوع نہیں کیا اور نفاق بدستور ہے اور شوہر کی شرائط پر زوجہ رہنے کو تیار نہیں

ہے اورعورت شوہر کے مکان پر موجود ہے شرعی جواب سے مسرور فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال طلاق کے دو جملے ا۔میری طرف سے بھی طلاق ۲۔اورتو میرے لئے تازندگی حرام ہے مذکور ہیں پہلا جملہ طلاق صریح رجعی کا ہے اوردوسرا جملہ طلاق صریح بائن کا اوردوسرا جملہ اول جملہ کی تفسیر ہے، علیحدہ کوئی ایقاع جدید نہیں ہے، اس لئے مسئولہ میں صرف طلاق بائن واقع ہوئی اورتعلق زوجیت بالکلیہ منقطع ہوگیا ہے۔

اب دونوں میں تعلق زن وشوئی بغیر نکاح جدید کئے کسی طرح قائم نہیں ہوسکتا اورنہ بغیر نکاح جدید کے ایک دوسرے کے سامنے آسکتے ہیں۔

نیز سوال کا ابتدائی جملہ (ابتدائی ملاقات الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں یکجائی وتنہائی (خلوت صحیحہ ہوچکی ہے)، اس لئے بصورت مذکورہ زرمہر پورادیناواجب ہے۔ھذا ماعندی من الفقہ الحنفی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر طلاق کا منکر ہو اور گواہ طلاق کی گواہی دیں:

ایک کمیٹی چند آدمیوں پر مشتمل لوگوں کے مذہبی معاملات کے فیصلہ کے لئے بنائی گئی ہے، لیکن اس نے اس کے بجائے دین اسلام میں خلل اندازی شروع کردی ہے اورطریق کار یہ اختیار کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ مخالفت ہوجائے تو اس کو نقصان دینا اوراس کی عورت کو بہکا کر یہ دعوی کرادینا کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دیدی ہے، اورجولوگ اس شرارت میں ملوث ہوں انکو گواہ بناکر طلاق نامہ ثابت کرانا انکا کام ہے، اب انکے سکریٹری نے ایک عورت کو بہکا کر اورجھوٹے دو گواہ طلاقنامہ کے انکو گواہ مقرر کرکے اس عورت سے شادی کرلی ہے اورخاوند اس عورت کے طلاق دینے سے منکر ہے اورعورت سے جھوٹ کہلوا کر اوردوجھوٹے گواہ بناکر طلاقنامہ اس عورت کا ثابت کرتے ہیں کہ اس کے خاوند نے اس کوطلاق دیدی ہے، کیا ایسی کمیٹی کا فیصلہ قابل قبول ہے، جو یہ خلاف شرع فساد کرتے ہیں اس کا کیا جرم ہے، آیا یہ مذکورہ عورت اس شخص کے لئے نکاح میں رکھنا کیسا ہے جبکہ اس کی شرارت ظاہر ہے اورخاوند منکر طلاق ہے، کیا ایسے لوگ جو اس کمیٹی کے ہر مشورہ میں شریک

ہوتے ہیں اور کمیٹی کو کہتے ہیں کہ ہمیں بھی کوئی عورت اس طرح دیجانی چاہئے انکی گواہی معتبر ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب تک گواہ خود رجوع یا اپنے کذب کا اقرار نہ کریں یا دلیل شرعی سے انکا کذب اس معاملہ میں ثابت و متعین نہ ہوجاوے اس وقت تک عدم طلاق کا حکم قضاءً نہیں ہوسکتا ہے (۱)، البتہ وہ ایسا کرنے کی وجہ سے آخرت میں سخت مجرم اور معذب ہوں گے اور دنیا میں بھی بدترین وبال میں مبتلا ہوں گے، ایسے لوگوں کے دل میں خوف خدا ڈالنا سب سے بڑی تدبیر ہے اور کمیٹی کے لوگ اگر غیر متدین ہوں تو انکو کمیٹی سے نکال دینا چاہئے اور کمیٹی کا کوئی فیصلہ جو اصول وضوابط شرعیہ کے خلاف ہوگا وہ شرعاً ہرگز معتبر و نافذ نہ ہوگا، آبادی کے بڑے لوگوں اور ذمہ دار لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے جرائم وفسادات کے انسداد کی تدبیریں سوچیں اور حتی المقدور روکیں، ورنہ سب حسب قدرت عنداللہ ماخوذ اور مبتلا ءوبال دنیا وآخرت ہوں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود غفی عنہ

شادی نامنظور ہے، طلاق دے دیا کہنے سے طلاق:

زوج کے ایک خط کی نقل منسلک ہے جو اس نے اپنے والدین کو لکھا ہے، جسکو پانے کے بعد فوراً اس کے والدین نے اس کو ایک خط دریافت طلب لکھا ہے کہ فوراً جواب دے اور اسپر عمل درآمد کیا جاوے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی جس پر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور پشیمان ہوا چنانچہ وہ خط نہ تو لڑکے کے والدین کو دیا گیا ہے نہ لڑکی کو نہ زوج کے والدین نے کوئی خط لڑکی کے والدین کو لکھا، اس لئے کہ اس کے خیال سے ضرورت نہیں باقی تھی اس کے بعد زوج رخصت کے وقت مکان آیا تو لڑکی بھی رخصت ہوکر آئی، اس وقت اس کی گود میں ایک سال کا بچہ بھی ہے اتفاق سے وہ خط زوج کی والدہ کے پاس پڑا رہ گیا تھا، جس کو لڑکی نے ایک مدت کے بعد کہیں بکس میں پالیا اور میکے جانے کے بعد اپنے والدین کو

۱- "وما سوی ذالک من الحقوق یقبل فیھا شھادۃ رجلین او رجل و امرءتین سواء کان الحق مالا او غیر مال مثل النکاح، الطلاق، والوکالۃ، والوصیۃ ونحو ذالک" (ہدایہ ۳/۱۵۴-۱۵۵، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

دکھلایا، اب لڑکی والے کہتے ہیں کہ طلاق ہوگئی اور خط میں یہ لفظ لکھا ہے (مضمون خط) آپ صاف صاف لکھ دیں میں آپ لوگوں سے بہت شرمندہ ہوں اور میرے معظم والدجہاں آپ نے میرے بڑے بڑے قصور معاف فرمائے ہیں ایک یہ بھی معاف فرماویں اور صاف صاف میری طرف سے لکھدیں کہ انور نے شادی نامنظور کردی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اب مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطے نہیں ہیں، والدہ کی خدمت میں سلام عرض ہے جمشید کو دعاء، آیا اس تحریر خط سے طلاق پڑی یا کہ نہیں؟

(محمد انور)

الجواب وبالله التوفيق:

انور شوہر کی تحریر دیکھی گئی اس میں انور کے اپنے الفاظ بغرض صرف اتنے ہیں کہ شادی نامنظور کردی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اگلا جملہ (اب مجھ سے ان لوگوں کا واسطہ نہیں) اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد کو لکھنے کے لئے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ (اہل زوجہ) اسکے والد سے کچھ تعلق و واسطہ نہ رکھیں، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ تحریر واقعی انور ہی کی ہے تو حسب تحریر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، پس اگر وہ لڑکی جب رخصت ہوکر اپنے زوج کے وہاں آئی اور زوج سے ملاقات ہوئی ہے اسوقت تک اس کو تین حیض نہیں آچکے تھے بایں صورت حسب سابق انور کی زوجہ باقی ہے اور اگر تین حیض آچکے تھے اور عدت ختم ہوچکی تھی تو زوجہ انور کے نکاح سے نکل چکی تھی رخصتی صحیح نہیں ہوئی، لہٰذا ایسی صورت میں دونوں آپس میں فوراً جدید نکاح کرلیں، "وينكح مبانة بما دون الثلاث في العدة وبعدها بالإجماع"(۱)، اور تجدید نکاح سے قبل قبل ہر گز آپس میں تعلق زن وشوئی قائم نہ رکھیں، ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے اور ارتکاب زنا میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: محمود غنی عنہ

۱- الدر المختار ۵/۴۰۔

مطالبہ طلاق پر دیدی، دیدی، دیدی، کہنا:

دونوں میاں بیوی میں کسی وقت جھگڑا ہورہا تھا، بیوی نے کہا کہ مجھکو تو طلاق دیدے تو شوہر نے بحالت غصہ کہا کہ میں نے دیدی، دیدی تین بار کہہ دیا، لیکن زبان سے یہ الفاظ نہیں نکالا کہ طلاق دیدی عورت کے کہنے پر یوں ہی کہدیا کہ دیدی کیا تین بار اس کی طلاق پڑی یا کہ نہیں؟ عورت اور مرد دونوں جاہل ہیں عورت حاملہ بھی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عبارت سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں ہی بلا نیت طلاق یہ الفاظ کہے ہیں، ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ نیت کے بغیر کہنے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **"إمرأة قالت لزوجها طلاق مراده فقال الزوج داده گیر (الی قوله) ولو قال: داده است أو کرده است یقع نوی أو لم ینو ولا یصدق فی ترک النیة قضاء "** (۱)۔

لہذا صورت مسئولہ میں تین طلاقیں مغلظہ واقع ہوگئیں ھذا ما عندی جواب لکھنے کے بعد قاضیخان کا جزئیہ ملا جو اسپر مثل نص ہے **قال لأمرته: هشته هشته حرامي حرامي فقال ما اردت به الطلاق لایصدق قضاء (الی قوله) قالوا تطلق ثلاثا** (۲)، **وایضا فی مختصر الخزانة ولو قالت: مرا طلاق کن فقال الزوج: کردم کردم کردم، طلقت ثلاثاً** (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید

پنچایت کا فسخ نکاح معتبر ہے یا نہیں؟

زید اور ہندہ میاں بی بی ہیں اور ہندہ کے زید سے بچے بھی ہیں اور زید نہ ہندہ کو اپنے یہاں لیجاتا ہے اور نہ طلاق

۱- فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۸۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- "مثل المبوسی عمن قال لأمرته: هشته هشته حرامي حرامي قال: لایصدق فی انه لم یرد به الطلاق وطلقت ثلاثا کذا فی الحاوی" (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۸۶، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۳- فتاوی مجموع النوازل ونصف دم قلمی ورق ص ۷۰۳۔

عی دیتا ہے اور نہ نان ونفقہ کا کفیل ہوتا ہے اور نہ پنچائت کچھ فیصلہ کرتی ہے اور اگر کرتی ہے تو زید پنچائت کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا ہے، مثلاً پنچائت نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح فسخ کردیا جاتا ہے، تو کیا پنچایت کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوجائے گا یا کوئی اور صورت ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کو اولاً پنچایت کی جانب سے جس میں کم ازکم ایک عالم بھی ہو مجبور کیا جاوے کہ بندہ کا کفیل ہو، نان نفقہ وغیرہ دے، اگر نہیں دیتا ہے تو طلاق دینے کے لئے کہا جائے کہ زید پر واجب ہے، اگر دونوں میں سے کسی کو نہیں منظور کرتا ہے تو پنچایت جس میں عالم جید کو بھی شامل کیا جاوے تفریق کردے یہ فیصلہ صحیح ہوجائے گا، لیکن زید سے قبل تفریق بتلا دیا جائے کہ اگر دونوں مذکورہ باتوں میں سے کسی کو نہیں مانیں گے تو ہم تفریق کردیں گے جو شرعاً معتبر ہے (حیلہ ناجزہ)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۷/۱۹۸۵ء
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

عدالت کی تفریق کا حکم:

ایک لڑکی کی شادی نابالغیت میں لڑکی کے والدین نے ایک مرد جس کی عمر ۴۰ سال ہوچکی تھی کے ساتھ شادی کردی، لڑکی بالغ ہوکر اپنے شوہر کے پاس گئی جبکہ شوہر کی عمر ۴۵ سال ہوچکی تھی قریب ۵-۶ سال لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہی، اس درمیان میں روحانی جسمانی تکالیف ہوئی جس سے وہ تنگ آ گئی، چنانچہ اس نے اس معاملہ کو برادری میں پیش کیا مگر برادری نے کوئی پنچایت نہیں کی ہے اور نہ سماعت معاملہ کیا، لڑکی کے شوہر کو مکرر سہ کرر بذریعہ سمن طلب کیا مگر باوجود تعمیل سمن پر بھی حاضر عدالت نہیں ہوا ہے، چنانچہ پنچایت نے بھی تنگ آکر شوہر کے خلاف عدالت میں دعوی کردیا، عدالت نے لڑکی کے شوہر کو طلب کیا وہ حاضر عدالت نہیں ہوا عدالت نے تنگ آکر ایک طرفہ فیصلہ لڑکی کے موافق دیدیا ہے، لڑکی نے فیصلہ کے ۳ماہ ۱۳ دن بعد اپنا عقد ایک ہم عمر جوان کے ساتھ کرلیا ہے، کیا یہ فیصلہ عدالت جائز ہے یا کہ ناجائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ عدالت کی یہ تفریق اگر مسلمان حاکم نے تمام کاروائی مقدمہ حسب قانون شرعی

مرتب کر کے کیا ہے تو یہ فیصلہ شرعی ہوا اور یہ عقد جو ہم عمر جوان سے ہوا ہے اگر تین حیض (عدت) گذار کر ہوا ہے تو صحیح ہوا ورنہ نہیں، اس صورت میں کہ فیصلہ شرعی نہ ہوا ہو زوجین پر واجب ہے کہ فوراً دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور منجانب لڑکی جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار، معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر اس کے سامنے لڑکی اپنا واقعہ رکھ کر تفریق کی درخواست کرے اور وہ جماعت حسب قاعدہ شرعیہ بیان وشہادت وثبوت وغیرہ جملہ کاروائی مقدمہ مرتب کر کے اپنی صواب دید کے مطابق تفریق کر دے تو اب یہ تفریق شرعی ہو جائے گی اور پھر عدت تین حیض گذار کر لڑکی اس ہم عمر جوان سے دوبارہ اپنا نکاح پڑھا کر اس کے ساتھ رہے۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین میں ایک معتبر ومتدین عالم بھی شامل کرلیں جو مسائل فقہ سے واقف ہو تو اچھا ہے، ورنہ وہ جماعت ہر موڑ پر کسی معتبر واقف مسائل عالم سے پوچھ کر عمل کرے اور حیلہ ناجزہ مصنفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی مطالعہ میں رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۹۸۵ء
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

طلاق نامہ پر صرف دستخط کرنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

محترمی جناب مفتی صاحب مندرجہ ذیل ایک طلاق نامہ نقل پیش کیا جا رہا ہے عبد الحفیظ نے اپنی زبان سے طلاق نہیں دیا ہے لیکن انہوں نے اسی طلاق نامہ پر دستخط کیا ہے بتلایا جاوے کہ یہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں بینوا توجروا۔

نقل طلاقنامہ یکم نومبر ۶۵ میں بشرن بی بی مقام شولاتالاب تھانہ بردوان ضلع بردوان کی رہنے والی ہوں، آج میں اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہوں، پنچ کے سامنے آئندہ ہم سے اور ان سے کوئی واسطہ نہیں اور لڑکے سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے اگر لڑکا ہمارے پاس جائے تو اس کا باپ عبد الحفیظ لا سکتا ہے، اگر ہم روکیں تو کہیں قانونی کاروائی کر سکتا ہے اور ہم نے دین مہر معاف بھی کر دیا ہے، ساتھ گواہ کے اور خوشی سے طلاق لیا شوہر کا نام عبد الحفیظ ہے اور راستہ گھاٹ میں ملاقات ہونے پر گالی گلوج نہیں کر سکتا ہے ایک بچہ بھی اگر گواہ دے تو انجام برا ہوگا۔ دستخط گواہ۔ ۱ عبد الرحمن ۲۔ محمد ادریس ۳۔ محمد مقصود عالم ۴۔ شفیق احمد ۵۔ فضل کریم (عبد الحفیظ شوہر بشرن بی بی)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عبدالحفیظ نے اس طلاقنامہ کی عبارت سن کر زبانی قبول کرلیا ہے اور تصدیق کردی ہے جب بھی طلاق واقع ہوگئی اور دین مہر معاف ہوگیا ہے، خواہ لفظ طلاق زبان سے بولا ہو یا نہ بولا ہو(۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۱۹۸۵ء
الجواب صحیح: محمود غنی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

نان ونفقہ اور حق زوجیت ادا نہ کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ کرانا:

زید نے عرصہ بارہ سال سے اپنی بیوی ہندہ کی کوئی خبر نہیں لیا ہے، ہندہ اپنے میکے میں ہے اور ہندہ کے زید کے نطفے سے دولڑکیاں ہیں وہ بھی ہندہ کے ساتھ ہیں، ایک لڑکی کی عمر ۱۶ سال اور دوسری کی عمر ۱۳ سال ہے، آٹھ سال پہلے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ کلکتہ میں رہتا ہے اور شادی کرلیا ہے، دو بچے بھی ہیں لڑکی کی عمر ۲۰ سال ہے، لڑکی کا بھائی اسکولا نے کلکتہ گیا لیکن وہ نہیں ملا زید کے والدین اس کے بچپن ہی میں انتقال کرگئے یہاں پر ایک مسلمان کے یہاں پرورش پائی ہے انہی ہی شادی کردیا تھا جوان ہونے پر سسرال میں دولڑکیاں پیدا ہونے تک رہا اور اس کے بعد گیا تو آج تک خبر نہیں لیا ہے اور نہ کوئی پتہ دیا ہے کہ میں کہاں ہوں، ایک لڑکی کی شادی نانیہال میں والدہ نے کردیا ہے، دوسری کی شادی بھی طے پا چکی ہے، ابھی ہوئی نہیں ہے، ہندہ کے والدین بہت کمزور ہوچکے ہیں، اس لئے ہندہ چاہتی ہے کہ میں بھی کہیں دوسری شادی کرکے اپنا گذر اوقات کرے عندالشرع کیا حکم ہے فرمایا جاوے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ہندہ کو اپنی آئندہ زندگی بلا دوسری شادی کئے ہوئے باعصمت طور پر گذارنی دشوار اور متعذر معلوم ہوتی ہے تو اولاً پہلے شوہر کی تلاش کی جاوے اور اس سے کہا جائے کہ یا تو اس کو لیجائے یا طلاق دیدے، اگر شوہر نہ ملے یا طلاق نہ دے اور ہر طرح مجبوری ہوجائے تو جماعت مسلمین بناکر (یعنی شرعی پنچائت بناکر) جو کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت ہو عورت اس کے سامنے اپنا معاملہ اور مجبوری رکھ کر درخواست کرے کہ تفریق شرعی واقع کرکے مجھے دوسرا نکاح کرنیکی اجازت دیجائے اور وہ جماعت حیلہ ناجزہ مصنفہ حضرت تھانوی

۱- "کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لایقع الطلاق مالم یقر انہ کتابہ" (شامی ۵۸۹/۲، عثمانیہ)۔

سامنے رکھکر قواعد شرعیہ فقہیہ کے مطابق بیان وشہادت وثبوت جملہ کارروائی مرتب کرے اورتفریق واقع کردے تو عدت گذارکرعورت کواپنا دوسرا نکاح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

(تنبیہ) جماعت مسلمین میں ایک متدین عالم کو جومسائل متعلقہ سے واقفیت رکھتا ہوشریک کرلیں تو زیادہ اچھا ہے،واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

والد کے اصرار پر طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے طلاق کا حکم:

جوادحسن نامی ایک شخص ہے جس کی ہمشیرہ خلیق النساء سے میرا عقد ہوا تھا، اس کے بعد کچھ ایسی نا اتفاقی ہوئی جس کی بناء پرتحریری طلاقنامہ دوسرے شخص نے لکھا ہے اورمجھ پر میرے والد اورلوگوں کا زور پڑا اورمیرے والد نے کہا کہ اگر طلاقنامہ پر دستخط نہ کروگے تو میں تمہارا حق ختم کردوں گا، میں نے طلاقنامہ پڑھ کر دستخط کردیا، ایسی صورت میں طلاق واقع ہوئی یا کہ نہیں اورمیرا اول ارادہ طلاق کا قطعی نہ تھا،لڑکی نے قریب ایک سال تک نکاح نہیں کیا ہے، اس کے بعد ماہ شوال ۹۴ ھ کونکاح ہوگیا ہے، ایسی صورت میں شریعت کا کیاحکم ہے:

الجواب وبالله التوفيق:

سعید الدین نے جب طلاقنامہ پڑھا اور اس کا مفہوم بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی تصدیق سے طلاق واقع ہوجائے گی (جیسا کہ سیاق وسباق سوال سے معلوم ہوتا ہے) دستخط کردیا اورانکارنہیں کیا گواپنے والدمحترم کے دباؤ سے ہی ایسا کیا یہ اکراہ نہیں ہے،لہذا تصدیق طلاقنامہ ہوکر طلاق واقع ہوگئی، چاہے سعید الدین کا دلی ارادہ طلاق دینے کا رہا ہو یا نہ رہا ہو،"**المسكوت في معرض البيان بيان**"(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید،محمود غفی عنہ

۱- "ولو استكتب من آخر كتابا بطلاقها وقرأه على الزوج فاخذه الزوج وختمه وعنونه وبعث به إليها فاتاها وقع ان اقر الزوج انه كتابه" (ردالمحتار علی الدر ۵۶/۴ م،مکتبہ زکریا)۔

بیوی کا میکہ میں رہنا طلاق کی دلیل نہیں:

ایک مرد نے چار شادی کی پہلی بیوی اسکی زندگی میں مرگئی اور اس کے کوئی بچے نہیں ہیں اور دوسری بیوی بھی اسکی زندگی میں مرگئی اور ان کے دولڑکے اور تین لڑکیاں اور تیسری بیوی سے ایک لڑکا ہے اس کے بعد تیسری بیوی کی موجودگی میں چوتھی شادی کرلی تیسری چوتھی بیوی کے اختلاف کی وجہ سے تیسری بیوی اپنے والد کی موجودگی میں بغیر رضامندی اپنے میکہ چلی گئی اور تقریباً ۲۹ سال سے اب تک میکہ ہی میں رہ رہی ہے، مرد کا انتقال دسمبر ۶۵ء میں ہوگیا ان ایام میں مرد نے کوئی خرچ بیوی کو نہیں دیا اور نہ کبھی ملاقات ہوئی باوجودیکہ میکہ صرف قریب ۴ میل دوری پر ہے، پتہ چلا کہ مرد کو اس طرح میکہ جانے پر سخت خفگی ہوئی اور انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے ذریعہ ایک طلاق نامہ تیسری بیوی کے نام روانہ کیا جو گاؤں کے ایک معتبر دیندار آدمی کو دیا گیا جس کو انہوں نے ان تک پہنچا دیا وہ شخص موجود ہیں اور یادد ہانی کے مطابق اس عذر کا اعتراف کرتے ہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس خط کے اندر کیا لکھا تھا مجھے علم نہیں، مرد کے بڑے بھائی کی بیوی موجود ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اس کے برعکس تیسری بیوی یہ کہتی ہے کہ میرا طلاق نہیں ہوا اور موجودہ چوتھی بیوی بھی کہتی ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، مرد کی کچھ جائیداد کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے تیسری بیوی کے لڑکے نے دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کیا کہ ہاں طلاق تو ہو چکا ہے اس وجہ سے ماں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے لیکن اب طلاق سے انکار کرتا ہے، دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے بھی والد کی موجودگی میں طلاق کی بات ہوئی تھی کہ میری بیوی کو طلاق ہو چکا ہے اس کے بعد مرد نے تقریباً ۴ یا پانچ سال بعد جب تیسری بیوی کا بچہ کچھ بڑا ہوگیا جو اپنی ماں کے ساتھ میکہ میں رہ رہا تھا اس بات کی کوشش کی کہ وہ لڑکا بھی والد اور بڑے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ رہے، لیکن اس کی ماں نے بچہ کو اپنے گھر آنے سے روک دیا جس کی وجہ سے ابتک وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانی ہال میں ہی ہے، تیسری بیوی کبھی بھی کسی خوشی و رنج کے موقعہ پر شریک نہ رہی اور مرد کی آخری دو سال کی سخت علالت و انتقال میں بھی شریک نہ رہی اب آیا طلاق واقع ہوا یا نہیں؟

شمیم احمد ۱۹۰، اے پہاڑپور، اعظم گڑھ

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ نکاح ہونا یقینی اور منکوحہ ہونا بھی یقینی اور منکوحہ کا وارث شرعی از نص قرآنی یقینی،

اس لئے جب تک اسی درجہ میں طلاق دینا بھی یقینی نہ ہو شرعا وراثت منصوصہ سے محروم نہیں کی جاسکتی (۱)، اور صورت مسئولہ میں طلاق نامہ کا خط کون لے گیا یا کس طرح بھیجا گیا معلوم نہیں، گاؤں کے جس معتبر آدمی کو دینا بیان کیا ہے اس کو معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا تھا۔ بڑے بھائی کی بیوی کا یہ کہنا کہ شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اور یہ جملہ سوال کے سابق جملہ (کہ طلاق نامہ روانہ کیا تھا کے متخالف ہے، دوسرے بر سبیل تسلیم مفید شہادت نہیں بالخصوص جب تیسری بیوی اپنے طلاق سے منکر ہے، اسی طرح چوتھی موجودہ بیوی کا یہ کہنا ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح تیسری بیوی کے لڑکے کا دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کرنا کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے والد کی موجودگی میں طلاق کی جو بات ہوئی یہ سب ان میں سے کوئی بھی ایقاع طلاق کی شہادت نہیں ہے بلکہ محض خبر ہے نہ معلوم اس خبر کی بنیاد کیا ہے، اس لئے یہ جملے بھی مفید اثبات طلاق نہیں ہو سکتے ہیں، اسی طرح تیسری بیوی کا رنج وخوشی میں شریک نہ ہونا یا تیمارداری یا انتقال کے موقعہ پر شریک نہ ہونا یہ سب کوئی بھی ایقاع طلاق یا وقوع طلاق کا ثابت کرنے والا نہیں، نیز بغیر مرضی واجازت شوہر چلے جانے سے محض نفقہ ساقط ہوتا ہے حق وراثت یا مہر ساقط نہیں ہوتی، پس خلاصہ کلام یہ نکلا کہ شوہر کے انتقال کے پندرہ سال بعد یہ نزاع اٹھی اور اس میں ثبوت طلاق کے معتبر اور عینی دو شاہد پیش نہ ہو سکے جو مثبت طلاق ہوتے اور عورت خود طلاق سے منکر ہے پس اس صورت میں عورت کے حلف پر شرعا مدار ہوگا، اگر عورت قاضی کے سامنے بحلف کہہ دے کہ مجھے طلاق نہیں ہوئی تھی تو وہ وراثت شرعی اور حق شوہری کی مستحق ہوگی ورنہ مستحق نہ ہوگی، یہی حکم مہر کے بارے میں بھی ہوگا کہ اگر ثبوت شرعی سے ادائیگی یا معافی ثابت نہ ہو تو تقسیم ترکہ سے قبل مہر کی بھی مستحق ہوگی (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۲/۱۴۰۱ھ

بحالت حمل تین طلاق کا حکم:

شوہر نے بحالت بیماری جب کہ بیوی حمل سے تھی تین طلاق دیدیا ہے عرصہ آٹھ ماہ کا ہو گیا ہے، پھر اس بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہتا ہے۔ یہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱- "ما ثبت باليقين لا يرتفع إلا بيقين، والمراد به غالب الظن" (الاشباہ والنظائر طبع کراچی ص/ ۹۰)۔

۲- عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ قال في خطبته: "البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه" (سنن الترمذی کتاب الاحکام ۳/ ۶۱۷ حدیث ۱۳۴۱)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب تین طلاق دیدیا تو اب بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح حلال نہیں ہوسکتی۔ طلاق حمل میں بھی واقع ہوجاتی ہے، حلالہ یہ ہے کہ عورت اس طلاق کی عدت (وضع حمل) گزار کر دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ زن وہم بستر ہو اور پھر وہ شوہر ثانی مرجاوے یا طلاق دیدے تو اس کی عدت گزارنے پر شوہر اول کے لئے حلال ہوگی (۱)، بغیر اس کے نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق کے بعد عدت واجب ہے:

زید کے گھر میں ایک عورت عرصہ ڈیڑھ سال سے بلا طلاق آ گئی تھی کیوں کہ اس کا شوہر کسی وجہ سے اس کو نہیں رکھتا تھا اور نہ طلاق ہی دیتا تھا، اس لئے عورت کو والدین نے زید کے یہاں بلا طلاق بھیج دی تھی، زید سے اس عورت کی ایک لڑکی بھی پیدا ہوگئی ہے جو کہ انتقال کرگئی ہے، اب ۱۷ نومبر کو مذکورہ عورت کے شوہر نے کچھ روپیہ لے کر طلاق دیدی ہے عورت کو تین ماہ سے زید کا حمل بھی ہے جو زید ہی کے نطفہ سے ہے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ عورت مذکورہ کے لئے ابھی عدت بھی ضروری ہے یا کہ نہیں یا فوری اس حالت میں زید سے نکاح پڑھا دینا ضروری ہے یا کہ نہیں جبکہ نطفہ زید سے ہی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عورت مذکورہ کے لئے اب بھی عدت گذارنی ضروری ہے اور صورت مذکورہ کا حکم یہ ہے کہ وہ اور عورت دونوں فوراً الگ الگ ہوجاویں ہرگز ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور اگر آپس میں نکاح کرنا یا تعلق زن وشوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ عورت حاملہ ہے اس لئے اس کی عدت وضع حمل ہے (۲) اس لئے بچہ پیدا ہونے کے بعد دونوں آپس میں نکاح پڑھا کر تعلقات زن وشوئی قائم کریں، اس کے خلاف ہرگز نہ کریں ورنہ سخت عذاب اور گناہ میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره'' (سورۃ البقرہ ۲ رکوع ۱۳)، ''وأولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن'' (سورۃ الطلاق ۲۸/ ۴)۔

۲- ''واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن'' (سورۃ الطلاق آیت ۴/ ۲۸)۔

والدین کا طلاق دینے پر اصرار:

زید کے چھ بچے ہیں لڑکے اورلڑکیاں ان میں سے ایک لڑکے نے خلاف شرع ایک لڑکی سے تعلقات کرر کھے تھے جس وقت اس کے والدین کوعلم ہوالڑ کے کوسمجھایا اور روکا گیا، جب اس بات کالڑکی اور اس کی ماں کوعلم ہواتو زید کے لڑکے کوانہوں نے بہکاسکھاکر باپ کا روپیہ مال چوری کرا کر اس کوگھر سےفرار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ حرکت لڑکے سے کرا کرلڑکی ماں اور بھائی نےمل کرزید کےلڑکے سے نکاح کرادیا اور اس نکاح میں لڑکی کا باپ بھی ناراضگی کی وجہ سے شریک نہیں ہوا اور لڑکے کےوالدین بھی دونوں باتوں کی وجہ سے ناراض ہیں، ایک توباپ کامال چوری کر کے یہ کام کیا لڑکی کا والدکافی عرصہ سے بدنام ہے،خلاف شرع اورخلاف قانون باتوں کی وجہ سے،اس لئےلڑکے کےوالدین کا اصرار ہے کہ یہ رشتہ ختم کر کے اگرلڑکا معافی مانگ کرگھر آنا چاہےتو اس کواجازت ہے، ایسی حالت میں زیدکو سمجھایا گیا ہےکہ اب نکاح ہو چکا ہے کسی کے گھر کوتوڑنا اچھانہیں ہے اورخلاف شرع ہےلڑکے کاباپ ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے اگر لڑکے نے ایسا نہ کیاتو میں اس کوتمام قسم کی اپنی املاک سےمحروم کردوں، ایسی حالت میں شریعت کیا کہتی ہے۔بینوا وتوجروا

الجواب وبالله التوفيق:

جب دونوں میں نکاح اور مناسبت دونوں باتیں ہوچکیں اورلڑکی کا باپ بدنام بھی ہو چکا ہے جس کا اعتراف زیدکو بھی ہے اور اس پرترس بھی کھارہا ہے اور رشتہ منقطع کرانے میں نہ توچوری کا مال واپس آ سکتا ہے اور نہ لڑکی کے والدین کی بےآبروئی دورہوسکتی ہے، بلکہ رشتہ منقطع کرانے میں لڑکے کے اورخراب اورآوارہ ہونے کا بھی خطرہ قوی ہے جس کی حفاظت بھی باپ پر ہے اور برعکس اس کے رشتہ منقطع نہ کرنے میں بامیدخدا ظن غالب یہ ہے کہ انشاء اللہ لڑکے کی اصلاح ہوجائےگی اورراہ راست پرآجائےگا اوراپنے کیے پرنادم ہوکر بدرگاہ رب العزت توبہ واستغفار بھی کرےگا اور ایسی صورت میں زیدکا سیدنا ابراہیم علیہ السلام اورسیدنا اسماعیل علیہ السلام کی مثال پیش کرنا بےموقع ہے، اس لئے زید کے لئے بہتر یہ ہےکہ اب دونوں کا نکاح باقی رکھتے ہوئے لڑکے کوآنے کی اجازت دےدے اورکسی اللہ والے عالم دین سے تعلق اصلاح قائم کرادےکہ وہ اس کوعلم دین اوردینداری سکھاتا رہے اوراصلاح کرتا رہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور

الجواب صحیح سیداحمدعلی سعید،محمودغنی عنہ

بیوی کے لئے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا:

میری (محمد مسلم) شادی عرصہ پچاس سال ہوتا ہے ہوئی اور آج سے دو برس قبل تک میری ازدواجی زندگی نہایت ہی اطمینان بخش رہی، میں صاحب جائداد ہوں، اپنی بیوی (عشرت النساء) کے اصرار پر اور چند مصلحتوں کی بناء پر اپنی کل جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کردیا، چونکہ میں نوکری پیشہ تھا اور کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں تھی، اب جائداد حاصل کرنے کے بعد میری گرہستی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی ہے اور میرے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ کر اس گاؤں میں دوسری جگہ دوکان کر کے اپنی زندگی بسر کررہی ہے اور میں جسمانی طور سے مجبور ہونے کی وجہ سے ان دنوں دربدر کی ٹھوکر کھا رہا ہوں۔

میری بیوی کی طرف سے طلاق کی مانگ ہے، مگر میں اس وقت تک طلاق نہ دینے کے حق میں ہوں جب تک وہ میری جائداد میرے حوالہ نہ کردے اور وہ چونکہ جائداد کا بیعنامہ کرچکی ہے، اس لئے وہ مجھ کو واپس نہیں مل سکتی ہے عندالشرع میرے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو عشرت النساء سخت غلطی کررہی ہے، اپنے لئے غضب خداوندی کا سامان کررہی ہے، ایسی عورت جو اپنے شوہر کو بلا وجہ شرعی ناراض رکھے اس پر اللہ رب العزت کا غضب ہوتا ہے، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ملائکہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں، **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ: " إذا دعی الرجل امرأته إلی فراشه فأبت فبات غضبان لعنتها الملائکة حتی تصبح" متفق علیه**(۱)، اس عورت کی دنیا کیساتھ آخرت بھی خراب ہوجاتی ہے خسر الدنیا والاخرہ اللہ ہر مسلمان کو اس سے بچائے، عشرت النساء پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے اور اس کو راضی اور خوش رکھنے کی انتہائی سعی وکوشش کرے اور شیطانی نرغہ میں نہ پڑے، عورت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ حد شرع میں رہتے ہوئے اپنے شوہر کو خوش رکھے، شوہر کو خوش رکھنے سے جنت ملتی ہے اور محمد مسلم پر لازم ہے کہ اگر اس کی عورت اپنے افعال اور برتاؤ سے تائب ہوجائے اور اطاعت کرنے اور خوش رکھنے لگے تو اس کے قصور کو معاف کرے اور ادائیگی حقوق میں انتہائی سعی کرے اور اگر عشرت النساء اس کے باوجود سرکشی ونافرمانی سے باز نہ آئے تو مسلم کو جائز ہے کہ وہ

۱- مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق ر ۲۸۰۔

طلاق دیدے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید محمود غنی عنہ

زبردستی طلاق نامہ پر دستخط کرانے سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟

محمد شریف ولد محمد مصطفیٰ عرف مرتضی ساکن شیوپور بنارس اپنی بیوی سرمن بی بی ولد بنی ساکن رسید ین پور تھانہ جلال پور ضلع جونپور کو ویدائی کی غرض سے اپنے سسرال گیا اور اپنے سسر نبی مذکور سے اپنی بیوی سرمن مذکورہ کی ویدائی کو کہا تو نبی نے صاف انکار کر دیا اور گالیاں دیں اور لکھے ہوئے کاغذ پر دستخط کردو اور مار کر ہڈیاں توڑنے کی دھمکیاں دیں، پھر اس کاغذ پر محمد شریف سے زبردستی دستخط بھی کرالیا اس کاغذ کا مضمون یہ ہے کہ محمد شریف مقر لہ ہے اور سرمن بی بی مقرلہ باہمی تنازع و جھگڑے کی وجہ سے نکاح کو ختم کر کے ایک دوسرے کو طلاق دے دیا ہے اور اب کسی فریق کا کوئی مطالبہ کسی دوسرے کے ذمہ باقی نہیں رہا، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے دستخط کے ساتھ کاتب ہندو اور گواہوں کے دستخط ہیں، محمد شریف نے دستخط کے وقت بھی یہی کہا کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں، زبردستی دستخط کرا رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے بھی دستخط ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ محمد شریف سے زبردستی دستخط لیا گیا ہے، شرعاً سرمن بی بی پر طلاق پڑی یا نہیں اور اگر پڑی تو کس قسم کی رجعی یا بائن۔

(نوٹ) ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی ہے، ایک دوسرے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مکمل ایک طلاق رجعی ہوئی، ایک تیسرے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ طلاق بائن پڑ گئی مکمل۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور محمد شریف نے دستخط کرتے وقت بھی یہی کہا ہے کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں زبردستی دستخط کرا رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے تو چونکہ محمد شریف نے نہ زبان سے طلاق دی اور نہ طلاق نامہ ہی کی تصدیق کی بلکہ اس نے طلاق نامہ کی تردید کی اور بلا تصدیق ایک لکھے ہوئے کاغذ پر محض دستخط کرنا کوئی شئی نہیں ہے۔ کما ھو الظاہر علی من لہ ادنی فہم، اس لئے صورت مسئولہ میں زوجہ محمد شریف پہ کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے جن لوگوں نے وقوع

طلاق کا حکم دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا حالت حیض میں وطی کرنے سے عورت پر طلاق واقع ہوجاتی ہے؟

مسماۃ عائشہ خاتون بنت احمد حسن کا نکاح محمد عبدالقدوس سے تقریباً تین سال قبل ہوا ہے فی الحال وہ بیان کرتی ہے کہ میری شادی ہونے کے بعد ہی سے میرا شوہر مذکور حالت حیض میں بھی مجھ سے جماع کرتا رہا میں نے منع کیا اور کہا کہ عالم سے سنا ہے کہ حیض کی حالت میں وطی کرنا حرام ہے وہ نہیں مانتا ہے بلکہ غصہ ہوکر کہا کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ہے، ایسی باتیں مت بولو، آخر مجبور ہوکر اپنے سسر اور ساس سے بیان کیا، اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہونے کی غرض سے پڑوس کی عورتوں سے بھی بیان کیا، لیکن کسی طرح سے وہ رکتا نہیں ہے اور میرا شوہر نماز بھی نہیں پڑھتا ہے، ایسے شوہر کے یہاں میں نہیں رہوں گی خودکشی کرلوں گی وہ عورت میکہ چلی گئی ہے اور واضح ہوکہ علماء اور پبلک میں دوفریق ہوگئے ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ اس کا شوہر جبکہ قصداً حیض کی حالت میں باوجود بارہا منع کرنے کے بھی بے پردہ حرمت قطعیہ پر اصرار کرتا رہا تو گویا وہ حلال سمجھ کر ہی حالت حیض میں وطی کرتا رہا ہے بایں وجہ وہ شخص کافر ہوگیا ہے اور اس کی بیوی مذکورہ پر طلاق بائن واقع ہوچکی ہے، اب عورت کو اختیار ہے کہ دوسرے شخص سے نکاح کرسکتی چنانچہ شرح فقہ اکبر (ص۱۸۵) میں ہے: ''**الاستهانة بها كفر بان يعلها هينة سهلة و يرتكبها من غير مبالاة بها ويجريها مجرى المباحات فى ارتكابها**'' اور صاحب البحرالرائق نے الفاظ کفریہ میں تحقیر الذنب لفظ کو شامل کرکے آخیر میں ''**يكون كفرا**'' کہا ہے اور شرح عقائد نسفی میں ''**الاستهانه بها كفر**'' ہے، اور ''**مالا يلمنه**'' اور خلاصۃ الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ میں بھی اس کی تائید کی ہے اور چونکہ اس واقع میں عورت کا قول شرعاً مقبول ہے، اس وجہ سے کہ یہ جملہ ''**مالا يطلع عليه الرجال**'' کے ہے وغیرہ۔

اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اس کے شوہر کو صرف استغفار اور کچھ صدقہ لازم ہے اور کچھ نہیں ہے فقط اب علماء کرام سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکورۃ الصدر میں کس فرقہ کا قول شرعاً مقبول ہے اور کس کا نہیں ہے اور عورت کا قول شرعاً

۱- ''وفي البحر أن المراد الإكراه على التلفظ بالطلاق فلو أكره على أن يكتب طلاق امرء ته فكتب لا تطلق لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا كذا في الخانية'' (ردالمحتار على الدر ۴/۴۴۰، مکتبہ زکریا)۔

مقبول ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسلمان کو کافر قرار دینا امر عظیم ہے، کسی کے قول میں جب تک سو میں ایک احتمال بھی مؤمن رہنے کا ہوگا اس کو کافر کہنا جائز نہ ہوگا احتیاط کرنا واجب ہے، اگر کسی نے احتیاط نہ کی اور کافر کہنے میں عجلت کر دیا اور حقیقۃً وہ عنداللہ مؤمن تھا تو وہ کفر لوٹ کر اسی کافر کہنے والے پر آجاتا ہے (والعیاذ باللہ منہ) (۱) صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال عبدالقدوس جذبات کا شکار ہے اور اس کا یہ قول کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ایسی باتیں مت بولو، اول تو اس کی کہنے والی محض عورت ہے اور کوئی گواہ اس پر نہیں ہے، دوسرے اگر صحیح بھی تسلیم کر لیں تو یہ جملہ مستلزم کفر کو نہیں ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ''**وقیل لا یکفر فی المسئلتین وھو الصحیح خلاصۃ وعلیہ المعول لانہ حرام لغیرہ لما فی المرتدانہ لا یفتی بتکفیر مسلم کان فی کفرہ خلاف ولو روایۃ ضعیفۃ**'' (درمختار علی ہامش الشامی ج ۱/ ۲۲۷ وھکذا تحۃ فی الشامی فی باب الحیض) (۲)۔ ''**وفی الطحطاوی علی المراقی ۷۳ بعد بحث طویل: فعلی ھذا لایفتی بکفر مستحلہ (ای الوطی فی الحیض ناقل) لانہ حرام لغیرہ وھو الاذی**'' (۳)۔

لہذا صورت مسئولہ میں عبدالقدوس کو کافر نہ کہیں گے اور نہ اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی، البتہ اگر انکی بیوی کو تجربہ اور حالات سے ظن غالب ہے کہ وہ پھر اس حرام میں مبتلا کرے گا تو اس کے پاس نہ جائے تا آنکہ اس کو اپنی حفاظت کا اطمینان شوہر کے حالات سے نہ ہو جائے اور اس درمیان کے نان ونفقہ وجملہ حقوق واجبہ کی وہ مستحق رہے گی، ہاں اگر شوہر کے سدھار سے بالکل مایوس ہو جائے یا الگ اپنی زندگی باعصمت گذارنی دشوار دیکھتی ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے اور اختیار ہے کہ اس سے طلاق حاصل کر لے یا خلع کرا لے اگر شوہر اس پر بھی تیار نہ ہو تو جماعت مسلمین شرعی پنچایت کے یعنی کم از کم دیندار با وقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر جو شرعاً قاضی شرعی کے قائم مقام ہوتی ہے اور اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کا حق رکھتی ہے، معاملہ اس کے سامنے رکھدے تاکہ معاملہ اسکے سامنے طے ہو جائے اور درخواست تفریق کرے وہ

۱- قال رسول اللہ ﷺ: ''ایما امرئ قال لاخیہ کافر فقد باء بہا احدھما ان کان کما قالت والا رجعت علیہ'' (مسلم شریف ۱/ ۵۷، مطبع رحیمیہ دیوبند)۔

۲- ردالمحتار علی الدر ۱/ ۴۹۳، باب الحیض مکتبہ زکریا۔

۳- ''ویسئلونک عن المحیض قل ھو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض'' (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۲)۔

جماعت مسلمین حسب قواعد شرعیہ جملہ کاروائی بیان وثبوت وشہادت وغیرہ مرتب کر کے تفریق واقع کردے یہ تفریق بھی درست ہوگی اور اس کے بعد عورت تین حیض گذار کر اپنا دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔

(تنبیہ) عبدالقدوس پر اس فعل سے باز آجانا اور خدا کے دربار میں توبہ و استغفار کرنا اور آئندہ ایسا نہ کرنا بہر حال واجب ہے خواہ اس عورت سے پھر تعلق ہو یا نہ ہو۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین کو چاہئے کہ الحیلۃ الناجزۃ بھی سامنے رکھکر تمام کارروائیاں اور فیصلہ مرتب کرے اور اس میں کوئی متدین واقف بالمسائل عالم بھی شریک ہو۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ دارالعلوم دیوبند

نابالغ کی طلاق کا حکم:

میرے لڑکے کا نکاح ہوا تھا مگر لڑکا اور لڑکی دونوں نابالغ تھے، دونوں کے والدین میں نا اتفاقی پیدا ہوگئی اور تحریری طلاق آئی اور طلاق پر لڑکے کا انگوٹھا لگا ہے اور اس کے بعد جس لڑکی سے نکاح ہوا تھا اسکے والدین نے دوسری جگہ نکاح کردیا ہے مگر وہاں لڑکی جانا نہیں چاہتی ہے، اس وقت لڑکی بالغ ہے اور وہ لڑکی وہیں آگئی ہے جہاں سے طلاق آئی تھی جہاں لڑکی کا نکاح ہوا وہ قطعی رضامند نہیں ہے، اس لئے عریضہ ھذا آپکی خدمت میں تحریر ہے کہ دوبارہ نکاح کیا جاوے یا کہ نہیں چونکہ پہلی طلاق نابالغیت میں آئی تھی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نابالغ لڑکے کا نکاح پڑھانے کا حق تو والد کو ہے مگر اس کے طلاق دینے کا حق کسی کو نہیں ہے نہ والد کو نہ خود نابالغ لڑکے کو جب تک بالغ ہوکر لڑکا خود طلاق نہ دے، لہذا نابالغی میں جو تحریری طلاق نامہ نابالغ لڑکے کے انگوٹھے کا نشان لگا کر آیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس سے کوئی طلاق نہیں پڑی ہے (۱)، اور لڑکی کا نکاح جو اس کے باپ نے دوسری جگہ کیا ہے وہ بھی صحیح

۱- کما فی شرح التنویر: "واھلہ زوج عاقل بالغ مستیقظ وفی الشامیہ، وقولہ واھلہ زوج عاقل الخ) احترز بالزوج عن سید العبد ووالد الصغیر ...... وبالبالغ عن الصبی" (رد المحتار علی الدر ۴/ ۴۳۱، مکتبہ زکریا دیوبند) "یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغا عاقلا سواء کان حرا او عبدا طائعا أو مکرھا" (کذا فی الجوہرۃ النیرۃ، الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۵۳، مکتبہ دار الکتاب دیوبند) "ولا یقع طلاق

نہیں ہوا ہے بلکہ لڑکی علی حالہ اپنے شوہر کی بیوی باقی رہی اور ہے، لہذا لڑکی کا بالغ ہونے کے بعد اپنے پہلے شوہر ہی کے پاس آجانا صحیح ودرست رہا دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

تم کو طلاق دیئے چھوڑ دیئے، چھوڑ دیئے کہنے سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں اور بیوی آپس میں جھگڑا اور تکرار کرتے ہوئے میاں نے بیوی سے غصہ میں کہا تمکو طلاق دیدیئے ایک مرتبہ طلاق کا نام لیا ہے اور دومرتبہ کہا تمکو چھوڑ دیئے تمکو چھوڑ دیئے، بیوی حاملہ ہے اور اسی تاریخ سے بیوی میاں سے الگ رہتی ہے۔

لہذا دریافت طلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ سے کونسی طلاق واقع ہوئی ہے، اب شوہر کی خواہش ہے کہ بیوی عقد میں رہے لہذا اب عقد میں لانے کے لئے شوہر کو کیا کرنا پڑے گا، کیا بیوی سے عقد ثانی پڑھانا پڑے گا یا اور کوئی صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تم کو چھوڑ دیئے کا لفظ بھی طلاق صریح ہے، لہذا صورت مسئولہ میں تینوں طلاق پڑ کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کوئی صورت عقد میں لانے کی نہیں اور حلالہ یہ ہے کہ اس طلاق مغلظہ کی عدت (وضع حمل ہے) گذر کر یعنی جب عورت کے بچے پیدا ہو چکے اس کے بعد عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرکے اس سے ہم صحبت ہو اور پھر وہ فوت ہو جائے یا طلاق دیدے اور اس کے بعد اس کی عدت (تین حیض) اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ہو جائے جب اس شوہر اول کے عقد میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود غنی عنہ

الصبی وان کان یعقل" (ہندیہ ۱/ ۳۵۳، دارالکتاب دیوبند)۔

۱- "واولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن" (سورۃ الطلاق: ۴)، "فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره" (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰)۔

بذریعہ تحریر وقوع طلاق کے لئے کیا گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

طلاق نامہ کی تحریر سے طلاق کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس پر گواہ نہیں ہے، ایسی صورت میں جبکہ طلاق نامہ غیر ملک سے یہاں آیا ہو بغیر گواہ کے طلاق قطعی ہوگئی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس کو زوج نے خود لکھا ہے، یا اس کے حکم سے لکھا گیا ہے:
''إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق ''(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

بندہ محمد سکندر علی ۲۴ پرگنوی متعلم دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۵ھ

اگر نشان تحریر سے نیز گزشتہ حالات وواقعات سے یہ یقین ہوجائے کہ یہ خط اسی کا ہے یا اسی کے حکم سے لکھا گیا ہے جب تو یہ حکم مذکور ہوگا۔ اور قرائن سے شبہ ہوجائے کہ شاید خط جعلی ہو تو اس کے پاس پھر خط لکھ کر تحقیق کر کے حکم لگایا جائے جلدی نہ کی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۱۳۸۰ھ

ناجائز تعلق کے شبہ کی وجہ سے طلاق دینے اور بچہ کے نسب و پرورش سے متعلق:

زید کی بیوی جس کا فرضی نام مریم ہے، کچھ عرصہ قبل اپنے خاندان والوں سے مریم کا جھگڑا ہوا، مریم نے زید کی بیوی پر الزام لگایا کہ وہ کسی غیر مذہب کے آدمی سے ناجائز تعلق رکھتی ہے اور اس کا حمل بھی قرار پا گیا ہے زید کو اس کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بمبئی میں ملازم تھا چھ ماہ کے بعد زید بمبئی سے گھر واپس آیا، ماہ اپریل میں دو ہفتہ اپنی بیوی کے پاس رہا جب زید کو اپنے رشتہ داروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مریم جو زید کی بیوی ہے اس کو کسی غیر مذہب والے شخص سے ناجائز تعلق ہوگیا ہے اور حمل سے بھی ہے، زید نے اپنی بیوی سے اسی وقت علیحدگی اختیار کر لی، چنانچہ زید اپنی بیوی پر الزام لگاتا ہے اور زید اس کو قطعی طلاق دینا چاہتا ہے، لیکن پنچوں نے فیصلہ وضع حمل تک روک رکھا تھا ۱۷/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو بچہ پیدا ہوگیا ہے اور زید بمبئی

۱- فتاوی عالمگیری علی الخانیہ ۱/ ۳۷۸، مطبع رشیدیہ پاکستان۔

سے ۷/اپریل ۱۹۶۲ء اپنے مکان آیا ہے، اس لحاظ سے حمل اور پیدائش کے درمیان ۶ ماہ اور ۹ دن ہوتے ہیں عام طور پر بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے زید ان حالات کیوجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے۔

(۱) ان وجوہات وواقعات کی بناپر زید کا الزام زنا لگانا درست ہے یا کہ نہیں؟

(۲) اگر جرم عائد ہوجائے تو موجودہ زمانہ میں جب کہ ہمارے لئے شرعی عدالت میں کسی قسم کی سزا نہیں دی جاتی ہے۔ اب کیا سزا دی جائے۔

(۳) مریم کی موجود اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

(۴) اب مریم کو مہر مل سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) اگر اسی طرح کا جرم ثابت ہوجائے تو کیا شوہر کے ذمہ مہر واجب الاداء ہوسکتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) جب زید کے آنے کے بعد ۶ ماہ سے زائد پر بچہ پیدا ہوا تو زنا کی تہمت بلا دلیل شرعی لگانا جائز نہیں ہے، بچہ حلالی کہلائے گا اور زید ہی کی طرف منسوب ہوگا اور زید کے مال سے وراثت پائے گا (۱)، رہا طلاق تو مریم کے چال چلن کا اندازہ لگائے اگر وہ محتاط طریقہ سے رہتی ہے اور الزام بلا کسی حجت شرعی کے لگے ہیں تو الزام کی پرواہ نہ کرنا چاہئے اور طلاق نہ دینا چاہئے، کیونکہ طلاق بلا وجہ شرعی کے شریعت میں بڑی سخت چیز ہے خداوند قدوس کے غضب کا سبب ہے۔

(۲) سیاق وسباق سوال سے ظاہر تو یہی ہے کہ یہ الزام بلا حجت شرعی محض جھگڑے کی بناء پر ہے، لیکن اگر شرعاً ثابت بھی ہوجائے تو کسی جسمانی یا مالی سزا کا اختیار صرف حکومت کو ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مریم پر خود واجب ہے کہ وہ نہایت عاجزی اور ندامت کے ساتھ اللہ رب العزت کے دربار میں رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے، توبہ واستغفار کرے اور کہے کہ اے اللہ اب ایسا نہیں ہوگا معاف کردیجئے اور واقعی آئندہ نہ کرنے کا دل سے عہد بھی کرلے۔

(۳و۴و۵) اگر مریم کو طلاق نہ دیا جب تو حکم ظاہر ہی ہے کہ جیسے اور ماں باپ کا حکم ہے ویسے ہی اس کا بھی۔ اور اگر طلاق دیدے تو مدت حضانت کم وبیش ۷ برس تک یعنی جب تک بچہ خود تقاضائے حاجت اپنی طہارت ولباس پوشی نہ کرنے

۱- ”وأقلها ستة أشهر إجماعا (فيثبت نسب) ولد“ (الدر المختار علی الرد ۵/۲۳۰، مکتبہ زکریا، جامع صغیر ۶۰، مطبع یوسفی لکھنؤ، ہدایہ ۲/۴۰۸، کتاب الطلاق مطبع یوسفیہ لکھنؤ، بدائع الصنائع ۳/۳۸۰، مکتبہ زکریا، فتاوی خانیہ علی الہندیہ ۱/۵۵۸، فتاوی ہندیہ ۱/۵۳۶، دار الکتاب دیوبند)۔

لگے تربیت و پرورش کا حق ماں کو ہے (۱) ،اور اس کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے جب تک کہ ماں اپنی شادی بچے کے کسی غیر ذی رحم سے نہ کرے (۲)، اور مہر بھی زید کے ذمہ ہر حال میں واجب الاداء ہے جب تک مریم خود معاف نہ کردے (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بحالت غصہ طلاق چند بار کہنے کا حکم:

ایک شخص نے بحالت غصہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور دوسرے لواحقین اس بات کے گواہ بھی ہیں۔طلاق میں تکرار بھی ہوئی ہے یعنی تین مرتبہ اس شخص نے طلاق کے الفاظ دُھرائے ہیں مگر اب غصہ اترنے پر وہ نہایت شرمندہ اور پریشان ہے قریب کے مدرسہ جامعہ حسینیہ سے فتوی منگایا تو اس میں لکھا تھا کہ طلاق مغلظہ واقع ہوچکی ہے اب دوبارہ نکاح بغیر حلالہ کے جائز نہیں ہے۔دوسرے ایک مولوی جو اہل حدیث میں سے ہے ان کا فتوی یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، چاہے کوئی انسان سو مرتبہ یہ کہہ دے کہ طلاق دیدی۔اب حکم شرع کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال تین طلاق واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی ،اب دوبارہ نکاح بغیر حلالہ کئے ہوئے جائز نہیں ہے ،حلالہ یہ ہے کہ وہ عورت بالکل اجنبی ہوگئی اس شوہر سے امید ختم کردے اور اس طلاق کی عدت (اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ورنہ تین حیض) گزار کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کرلے اور اس کے ساتھ رہے اس سے ہم صحبت ہو پھر وہ دوسرا شخص اگر بمقاضہ الٰہی فوت ہوجاوے یا کبھی طلاق دیدے اور یہ عورت اس طلاق کی عدت بھی (حسب طریق

۱- ’’وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم أحق بالولد لما روى ان امرءة الخ‘‘(ہدایہ ۲/ ۴۱۳ کتاب الطلاق،مطبع یوسفیہ لکھنؤ)،’’والام والجدة احق بالغلام حتى ياكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده لان تمام الاستغناء بالقدرة على الاستنجاء‘‘ (ہدایہ ۲/ ۴۱۴،مطبع یوسفی لکھنؤ،وعلی ہامشہ ۴۱۴ اعتبار الغالب یعنی ان الصبی فی الغالب اذا بلغ سبع سنین یستغنی عن الحضانة...... عنایۃ)۔

۲- ’’والنفقة على الأب على ما الذكر، ولا تجبر الام عليه لانها عست تعجز عن الحضانة‘‘(ونفقۃ الاولاد الصغار علی الاب لایشارکہ فیہا احد، (ہدایہ ۲/ ۴۱۳، ۴۲۳)،’’وتجب النفقة بانواعها على الحر (لطفله) يعم الانثى والجمع‘‘(رد المحتار علی الدر ۵/ ۳۳۶، مکتبہ زکریا)۔

۳- ’’المهر يتأكد باحد معان ثلاثة: الدخول والخلوة الصحيحة وموت احد الزوجين‘‘(ہندیہ ۱/ ۳۰۳،دارالکتاب)۔

مذکورہ سابق) گزار لے اس کے بعد جا کر شوہر اول کے نکاح میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی، جس اہل حدیث مولوی نے فتوی دیا ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے غلط ہے، صحیح نہیں ہے طلاق تو عموماً غصہ ہی کی حالت میں انسان دیتا ہے اور رضاوخوشی میں تو بہت ہی کم اس کا صدور ہوتا ہے۔مدہوش کی طلاق البتہ واقع نہیں ہوتی ہے، اور صورت مسئولہ میں یہ شخص مدہوش نہیں ہے نیز بہت سے نصوص میں بحالت غصہ طلاق واقع ہونے کی تصریح ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

غصہ میں اگر کوئی طلاق دے تو بلاشبہ واقع ہوجاتی ہے علامہ شامی نے ابن قیم کے رسالہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ طلاق غضبان کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ غصہ ایسا ہو کہ عقل متغیر نہ ہوا پنے ارادے اور قول کا علم ہو ایسے غصہ میں اگر طلاق دیدے تو تفریق واقع ہوجائے گی اور عورت اس کے نکاح سے آزاد ہوجائے گی۔دوسرے یہ کہ غصہ کا اس قدر غلبہ ہو کہ عقل مغلوب ہوجائے اپنے اقوال وافعال کی خبر نہ ہو تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا ''تجھ کو طلاق دے دیا'' تین بار کہنا:

صابرہ کا نکاح توحید خان کے ساتھ عرصہ پانچ سال کا ہوتا ہے ہوا تھا، اس درمیان میں کئی بار لڑکی اپنی سسرال گئی، لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ بہت سخت برتا ؤ مارپیٹ کرتا ہے۔ایک بار یہ کہہ کر کہ جامیں نے تجھ کو طلاق دیدیا ہے یہ الفاظ اس نے تین بار کہے اور مار کر گھر سے نکال دیا ہے، اس وقت سے صابرہ ماں باپ کے یہاں ہے اور اس عرصہ میں اس کا شوہر نہ تو لینے آیا ہے اور نہ تو صابرہ کے پاس اس کے شوہر کا کوئی اثاثہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی بسر کرے، عورت جوان عمر ہے اندیشہ رسوائی کا ہے اگر چہ وہ طلاق بھی دے چکا ہے لیکن صابرہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، شوہر سے کہا جاتا ہے کہ تم طلاق دیدو چار آدمیوں کے سامنے تو وہ اس سے بھی انکار کرتا ہے لہذا ایسے شوہر سے نجات کی کیا شکل ہے؟

۱- ''قلت وللحافظ ابن القیم الحنبلي رسالة في طلاق الغضبان قال فيها: انه على ثلاثة اقسام: احدها ان يحصل له مبادي الغضب بحيث لايتغير عقله ويعلم مايقول ويقصده وهذا لا اشكال فيه، الثاني ان يبلغ النهاية فلا يعلم مايقول ولايريده فهذا الاريب انه لاينفذ شيء من اقواله الخ'' (ردالمحتار علی الدر ۴/ ۵۲۴،مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں اگر صابرہ نے خود اپنے کان سے تین بار شوہر کا یہ جملہ سنا ہے کہ (میں نے تجھ کو طلاق دیا) تو اب صابرہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ تو حید خان کو کسی طرح بھی اپنے اوپر قابو پانے دے، بلکہ صابرہ پر واجب ولازم ہے کہ وہ شوہر سے الگ ہی رہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس سے چھٹکارا کرائے اور عیاناً بھی طلاق حاصل کرے، اگر ایسے طلاق نہ دے تو اپنا مہر وغیرہ معاف کر کے خلع کرائے یا بالاکراہ طلاق حاصل کرے۔ اگر تو حید خان سے کسی طرح بھی طلاق حاصل نہ کر سکے تو بلا تعلق ازدواجی قائم کئے اسی طرح پڑی رہے اور صبر کرے لیکن اگر بلا تعلق ازدواجی قائم کئے باعصمت زندگی گزارنی دشوار ہو تو صابرہ کو اختیار ہے کہ اپنا دوسرا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر لے(۱)۔

”وکذلک إن سمعت أنه طلقها ثلاثا وجحد الزوج ذلک وحلف فردها علیه القاضی لم یسعها المقام معه“ (۲)۔

اور اگر تو حید خان کی جانب سے قانون حکومت کے گزند و پریشانی کا خطرہ ہو تو پہلے عدالت مجاز سے اپنا دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت حاصل کر لے پھر دوسرا نکاح کرے۔ اور ظاہر ہے کہ چار سال سے اپنے باپ کے پاس میکہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اتنی طویل مدت میں تین حیض آچکے ہوں گے، اس لئے اب مزید عدت گزارنے کی حاجت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۴۰۹ھ

دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد منہ بند کر دینے سے کتنی طلاق پڑی؟

حبیب نے اپنی عورت سے لڑائی کیا اور غصہ میں آ کر انہوں نے اپنی عورت کو دو بار طلاق دیدیا تیسری بار زبان سے کچھ نکلنے نہیں پایا تھا کہ ایک آدمی نے اس کا منہ بند کر دیا ہے، پھر اس کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلا کہ جاؤ میں تم کو بعد عدت

۱- کما فی العالمگیری ص ۳۱۳ ج ۵ کتاب الکراہیۃ۔

۲- ”إذا سمعت المرءۃ الطلاق ولم تسمع الاستفتاء لایسعها ان تمکنه من الوطی ...... والزوج یدعی الاستفتاء ...... وفی فوائد شمس الاسلام لایقبل قوله وفی الفصول وهو الصحیح“ (الی قوله) قال شمس الائمة السرخسی“: ما ذکر أنها إذا هربت لیس لها ان تعتد وتتزوج بزوج آخر جواب القضاء اما فیما بینه وبین اللہ تعالیٰ فلها ان تتزوج بزوج آخر بعد ما اعتدت کذا فی المحیط (شامی قدیم ۲/ ۷۰۳، مطبع عثمانیہ)۔

میں تینوں لڑکیوں کو دیدیا ہے، پھر تین آدمی اس وقت موجود تھے ایک مولوی عثمان نے بتلایا کہ جا کر اپنی عورت کو رجوع کرلو۔
تو آیا عندالشرع اس عورت پہ کیسی طلاق واقع ہوئی۔
اور یہاں کے مولوی یہ بھی کہتے کہ طلاق واقع ہوگئی ہے دریافت ہے کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال محض دو طلاق رجعی واقع ہوئی تھیں جس سے رجوع کرنے کا حق شوہر کو رہتا ہے (۱)، چنانچہ جناب مولانا عثمان صاحب نے فوراً رجعت کرادی صحیح کیا اس رجعت سے پھر نکاح قائم ہوگیا۔ حلالہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اب اگر آئندہ خدانخواستہ ایک بار بھی طلاق دے گا تو حرمت مغلظہ ہوجائے گی اور بغیر حلالہ کے میاں بیوی نہیں ہوسکیں گے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی نے طلاق نامہ نہیں لیا جب بھی طلاق پڑ گئی:

میاں بیوی کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا ہے وہ ناراض ہوکر اپنے میکہ چلی گئی، اس کے شوہر نے بذریعہ ڈاک طلاقنامہ کا کاغذ بھیج دیا ہے اور وہ کاغذ اس کی بیوی نے لیا نہیں ہے۔ اس صورت میں طلاق ہوگئی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں بیوی نے اگرچہ طلاق نامہ کا وہ کاغذ نہیں لیا ہے لیکن حسب تحریر طلاق نامہ طلاق واقع ہوگئی (۳)،

۱- ”فإذا طلق الزوج زوجته رجعيا حل له العود اليها في العدة بالرجعة دون عقد جديد فاذا مضت العدة عاد إليها بعقد جديد فقط“ (الموسوعۃ الکویتیۃ ۲۹/ ۲۹، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ)۔

۲- ”الطلاق مرتان فإمساك بمعروف أو تسريح بإحسان“ (سورۃ البقرۃ آیت: ۲۲۹)، ”فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره“ (سورۃ البقرۃ: ۲۳۰)۔

۳- ”ثم المرسومة لاتخلو أما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فانت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة“ (شامی ۴/ ۵۸۹، مطبع عثمانیہ)۔

پس طلاق نامہ دیکھنا چاہئے اس میں جیسی طلاق اور جتنی طلاق لکھی ہوں اتنی ہی اور ویسی ہی طلاق واقع ہوگئی ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق نامہ وصول نہ کرنے یا واپس آجانے کے باوجود طلاق پڑ جاتی ہے:

پندرہ سالہ شادی شدہ بالغ زید نے کچھ گھریلو جھگڑے کی بناء پر اپنی منکوحہ بیوی کو جس کے بطن سے چار اولادیں ہیں کسی کے دباؤ میں آکر بغیر کسی گواہ کے جو کہ دل سے نہیں چاہتا تھا بذریعہ رجسٹری طلاقنامہ روانہ کردیا ہے اور وہ طلاقنامہ دس پیسہ والے لفافہ پر تھا اب وہ گھر پر موجود نہیں ہے ۔اس پر ڈاکیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا واپس آگیا ہے لفافہ بعینہ ویسے ہی بند تھا جیسے کہ اس نے روانہ کیا تھا کہیں کھولنے کا شبہ بھی ظاہر نہیں ہوا ہے، زید نے اس کے پیشتر رخصتی کے لئے دو نوٹس بھی روانہ کئے تھے جو کہ وصول ہو گئے تھے زید کو طلاقنامہ روانہ کرنے کا بے حد افسوس ہے کیا یہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

عبارت طلاقنامہ یہ ہے:

بذریعہ نوٹس ہذا آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ ہم نوٹس دہندہ نے آپ کو طلاق دیدیا، طلاق دیدیا، طلاق دیدیا اور آپ کو اپنی زوجیت سے خارج کردیا ہے۔ان کے لئے عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاقنامہ کی عبارت دیکھی، اس عبارت کے مطابق تین طلاقیں واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، خواہ عورت کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، ڈاک وصول کی یا واپس کی، ان باتوں کا کوئی اثر اس طلاق پر نہیں پڑے گا (۱)۔

"ثم المرسومة لا تخلوا إما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة الخ" فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "وان كانت مرسومة يقع الطلاق نوى او لم ينو" (شامی ۲/۵۸۹، مطبوعہ عثمانیہ)۔

شوہر کا طلاق دے چکا ہوں لکھنا:

بندہ گڑھی پہنچنے میں عرصہ پندرہ روز سے اجازت شوہر کے دہلی سے آگئی ہے، اس کے بعد دہلی سے بذریعہ ڈاک ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں طلاق دے چکا ہوں۔ دونوں فریق سامنے ہونے پر کہتے ہیں کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے، اس کے بارے میں علماء دین شرع کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال اگر واقعی شوہر نے یہ خط لکھا ہے تو طلاق واقع ہوگئی (۱)، اگر تین طلاق اس میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ خط سے ظاہر ہے بلکہ محض یہ لکھا ہے کہ میں طلاق دے چکا ہوں تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی اور دونوں نے جب یکجائی کر لی تو رجعت بھی ہوگئی ہے اور حسب سابق دونوں میاں بیوی باقی رہ گئے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۸/۱۴۱۰ھ

دوسرے سے طلاق لکھوانے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے:

میرے داماد نے مجھے طلاقنامہ دیا ہے، میں ان کا خسر ہوں طلاقنامہ میں تحریر کیا ہے کہ میں اپنی رقیہ بی بی کو تین طلاق دیتا ہوں " فاروق علی علوی" دستخط انگریزی میں اس طلاقنامہ کے پیچھے مولوی حافظ ابراہیم سورت تحریر کیا ہے۔

جب طلاقنامہ میرے ہاتھ میں دیا تب میں نے چند سوالات کئے کہ معاملہ کیا ہے، بات کیا ہوئی، طلاق دینے کا سبب کیا ہے، خلاصہ پوچھا کہ طلاقنامہ جب ہوا تو کون کون شاہد تھے، انہوں نے زبانی جواب دیا کہ دو تین آدمی تھے، مگر طلاق نامہ پر کسی شاہد کا دستخط نہیں ہے، یہ طلاقنامہ مجھے دیا اس وقت اس کی عورت بھی حاضر تھی، اس کو بھی یہ کہا نہیں کہ میں تجھے تین طلاق دیتا ہوں۔ آیا اس مسئلہ میں واقعی یہ طلاقنامہ صحیح اور شرعاً ہے یا کہ نہیں۔

(نوٹ) طلاقنامہ اگلے دن دیا گیا اس کے دوسرے روز اس کی نانی لڑکی کو لینے آئی ہے تب ہم نے اوپر کا خلاصہ کیا

۱- "ثم المرسومة لا تخلوا اما ان ارسل الطلاق فان كتب اما بعد فانت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق" (ہندیہ ۱/۳۷۸، الفصل السادس فی الطلاق بالکتابۃ، مطلب رشیدیہ پاکستان)، "وهو كانت طالق ومطلقة وطلقتک تقع واحدة رجعية" (ہندیہ ۱/۳۵۴، رشیدیہ پاکستان)۔

تھا کہ طلاقنامہ تحریر کرتے وقت وہاں دوتین شاہد موجود تھے اور اس نے نائی کو کہا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہ تھا اور میں نے تین طلاق نہیں دی تھی ،لڑکے کی عادت ہے کہ وہ پہلے دستخط کرتا ہے، اسی طرح اس نے پہلے دستخط کئے اس کے بعد طلاقنامہ جناب مولوی صاحب نے تحریر کیا لڑکا قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے کسی قسم کا علم نہیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی جانتا نہیں، عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

تحریر سوال سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ لڑکا اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہے، اس لئے مولوی صاحب سے لکھوایا ہے۔

(۱) اور لڑکے نے خود تحریر اپنے خسر کو دیا یہ قرینہ ہے کہ اس لڑکے کو اس تحریر کے طلاقنامہ ہونے کا علم تھا۔

(۲) یہ بھی ظاہر اور متبادر ہے کہ لڑکے نے جو کہا ہے وہی مولوی صاحب موصوف نے لکھا ہے ورنہ لڑکا وہ تحریر لاکر اپنے خسر کو نہ دیتا، ہاں یہ محتمل ہے کہ لڑکے نے صرف طلاقنامہ لکھنے کے لئے کہا ہو اور مولوی صاحب موصوف نے تین طلاقیں لکھدی ہوں اور لڑکے کو اس تین طلاق کا علم نہ ہو۔

تحریر سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسر کو دیتے وقت بیوی اگرچہ موجود تھی مگر طلاقنامہ لکھتے لکھاتے وقت بیوی وہاں موجود نہ تھی ،یا تو دوسرے دو تین آدمی تھے یا کوئی دوسرا شخص سوائے مولوی صاحب (کاتب) کے موجود نہ تھا اور ایسی صورت میں لڑکے پر حلف دے کر پوچھا جائے کہ تین طلاق لکھے جانے کا علم لڑکے کو تھا یا نہیں، اگر نہیں تھا تو فقط ایک طلاق رجعی واقع ہوئی اور عورت سے عدت تین حیض کے اندر رجعت بھی کر سکتا ہے اور بعد عدت محض تجدید نکاح سے بلا حلالہ کے بھی تعلق زن وشوئی قائم کر سکتا ہے اور اگر تینوں طلاقوں کے علم نہ ہونے پر قسم نہ کھائے تو تینوں طلاقیں ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کوئی صورت دونوں میں زن وشوئی کے تعلقات کے جواز کی نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق نامہ پر جبراً انگوٹھا نشان لینے سے طلاق نہیں پڑی:

ایک شخص نے اپنی لڑکی کی شادی کر کے ایک دومرتبہ روانہ کر کے پھر اس نے روک لیا اور کہا کہ طلاق دیدے، لڑکے کے دل میں اس کا خیال نہیں تھا لیکن لڑکی کے والد نے گھر بند کر کے طلاقنامہ پر انگوٹھہ لگوالیا ہے اور اس کو یہ معلوم نہ تھا

کہ کس چیز پر انگوٹھا لگوا رہے ہیں، اس وقت اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، کیا عندالشرع طلاق واقع ہوگئی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر زبان سے الفاظ طلاق نہیں کہلوایا ہے، محض انگوٹھے کا نشان زبردستی لگوایا ہے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۸/۱۴۱۰ھ

ختم کیا چند بار کہنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

کسی منکوحہ کا شوہر جو عرصہ آٹھ سال سے اپنی بیوی بچی کے نان ونفقہ سے بے نیاز ہو، اور اسے اپنے یہاں آباد نہ کرتا ہو۔

اس کی بیوی بچی کے ساتھ اپنے والدین کے یہاں رہتی ہو۔ نانا، نانی اپنی لڑکی اور نواسی کے نان ونفقہ میں کفیل ہوں تو ایسے شوہر کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ نیز منکوحہ کے شوہر سے آٹھ سال کے نان ونفقہ کا تقاضا برابر جاری ہے، مگر شوہر کو مطلق احساس نہیں ہے۔ مزید برآں شوہر اپنی سسرال میں آکر اپنی منکوحہ بیوی سے بآواز بلند مخاطب ہوکر یوں کہے کہ میں نے ختم کیا، ختم کیا۔ تین بار مسلسل یہی الفاظ کہے، جبکہ شوہر کا نظریہ بھی یہ ہو کہ اب اس کو آباد نہ کرے گا۔

تو کیا شوہر کی زبان سے بیوی کے سنتے ہوئے الفاظ طلاق کے مترادف ہوگئے، شوہر سے پردہ لازم ہوگیا، اور یہ الفاظ سننے والوں میں سسرال میں سے گھر کا دوسرا آدمی بھی ہو، براہ کرم اس کے متعلق آپ فرمائیں کہ شرعی احکام کیا ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ ''میں نے ختم کیا، ختم کیا'' اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے قبل خواہ عورت سے یا سسرال والوں سے کوئی سلسلہ کلام ضرور تھا، لہذا جب تک وہ بھی سامنے نہ ہو، محض اس لفظ ''میں نے ختم کیا'' پر اور محض شوہر کے نظریہ کی بنیاد پر

۱- ''رجل أکرہ بالضرب علی أن یکتب طلاق امرأتہ فلانۃ بنت فلان بن فلان فکتب امرأتہ فلانۃ بنت فلان وفلان طالق لاتطلق امرأتہ کذا فی فتاوی قاضی خان'' (ہندیہ ۱/۳۷۹، رشیدیہ پاکستان)۔

کوئی حکم نہیں لکھا جا سکتا، البتہ آٹھ سال سے حقوق زوجیت ادا نہ کرنا، نان ونفقہ نہ دینا، لاپرواہی برتنا یا ایسی حالت میں عورت کا بغیر شوہر رہنا اور باعصمت رہنا، اس کے لئے زندگی گذارنا دشوار ہو، تو عورت کو اختیار ہے کہ اگر مسلمان حاکم موجود ہو تو اس کی عدالت میں درخواست دے کہ شوہر کی لاپرواہی اور حقوق زوجیت کی اور نان ونفقہ کی عدم ادائے گی یا اپنا بغیر شوہر باعصمت زندگی گذارنا دشوار ہونا بتلا کر فسخ نکاح کی درخواست کرے، پھر وہ حاکم شوہر کو مطلع کر کے اس کو طلب کرے اور دعوی عورت کا صحیح ثابت ہو جائے تو شرعی اصول وضوابط کے مطابق پوری تفتیش وتحقیق واقعہ کر کے فسخ نکاح کا فیصلہ دے دے۔ پھر عدت گذار کر دوسرا نکاح کر لینا عورت کو جائز رہے گا۔ اور اگر ایسا مسلمان حاکم موجود نہ ہو تو یہ کام شرعی کمیٹی (جماعت مسلمین جو شرعاً قاضی کے قائم مقام ہوتی ہے) اس سے رجوع کرے اور سارے حالات اس کے سامنے رکھے، شرعی کمیٹی شوہر کو طلب کر کے اس سے یہ کہے کہ یا تو تم قاعدہ سے اسے آباد کرو یا طلاق دے کر آزاد کرو۔ اگر تم نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں کی تو کمیٹی تمہاری طرف سے طلاق قرار دے گی، اور ان دونوں باتوں پر عمل کے لئے ایک مناسب مدت مذکور گزر جائے اور عورت اس مقررہ مدت کے گزر جانے کے بعد شرعی کمیٹی سے پھر تفریق واقع کرنے اور طلاق قرار دینے کی درخواست کرے اور شرعی کمیٹی تفریق واقع کردے اور طلاق قرار دیدے تو شرعاً طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور عدت گزار کر دوسرا نکاح کر لینا عورت کو جائز ہو جائیگا۔ مگر ایسی صورت میں وقتی قانون حکومت کی زد سے بچنے کے لئے عورت کو عدالت مجاز سے حق خودمختاری حاصل بھی کر لینا چاہئے۔ عدالت مجاز سے اور شرعی کمیٹی سے تفریق شرعی اور فسخ نکاح حاصل کرنے کے اصول وضوابط مفصل طور پر رسالہ ”حیلہ ناجزہ“ میں مذکور ہیں، اس کو سامنے رکھ کر عمل کیا جاوے، بوقت عمل دارالافتاء سے معلوم کیا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

تو آزاد ہے، آزاد ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق کہنے کا حکم:

ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھ کو ایک مکان الگ دیدیجئے۔ شوہر نے کہا کہ میرے پاس الگ مکان کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ابھی میں کما کر کھلا سکتا ہوں، اس پر عورت نے کہا کہ میں خود کما کر کھا لوں گی، پھر اس عورت نے یہ لفظ کہا کہ میں تمہاری جھوٹی کی پچی کر دوں گی (یعنی کہ تم اپنے لڑکے کی بیوی سے غلط کام کرتے ہو) پھر شوہر نے اس عورت کو ماں کی گالی دی، اس پر عورت نے بھی شوہر کو گالی دی، پھر شوہر نے اس کے حقے کی نے اس پر دے ماری، اس نے شوہر کو دھکا

دے دیا۔ پھر شوہر نے کہا کہ میرے سے تو آزاد ہے۔ آزاد ہے تین مرتبہ کہہ دیا، لیکن دل میں طلاق کا ارادہ بالکل نہیں تھا، پھر اس کے بعد دو مرتبہ کہا کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اور کہتے ہیں کہ مجھے دو ہی مرتبہ یاد ہے، واللہ اعلم

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینے کے موقع میں بیوی کو یہ جملہ (تو آزاد ہے) کہنا عرف عام میں طلاق صریح دینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور طلاق صریح بلا نیت سے بھی واقع ہوجاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی اور عورت نکاح سے بالکل نکل گئی۔ اور عورت کو حق ہوگیا کہ وہ عدت (تین ماہواری) گزار کر جس دوسرے مرد سے چاہے اپنا نکاح کرسکتی ہے۔ پھر یہ دوسرا مرد اس عورت سے ہمبستری کرلینے کے بعد طلاق دیدے یا مرجائے اور اس عورت کی عدت جو اس دوسرے مرد سے لازم ہوئی تھی ختم ہوجائے، اس کے بعد پھر یہ عورت اگر چاہے تو اس سابق مرد سے جس نے تین طلاق دیدی ہیں اپنا نکاح کرکے رہے، بغیر اس حالہ کے اور کوئی صورت ان دونوں میں ازدواجی زندگی کی گنجائش نہیں رہی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۲/۷ ۱۴۱۰ھ

شوہر کا کہنا فارغخطی لے جاؤ سے طلاق کا حکم:

میں اپنی لڑکی کو اس کی سسرال سے رضامندی کے ساتھ لے آیا، جس کو عرصہ ڈیڑھ سال ہوگیا ہے اور انہوں نے جہیز کے بارے میں مجبوری دکھلائی کہ جہیز یعنی زیور زمین کے اندر دفن کردیا ہے کہ ہم آٹھ روز میں وہیں جہیز پہنچادیں گے، میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں لڑکی کو میرے ساتھ رضامندی سے بھیج دیا، میں لے کر گھر کو چلا آیا ہوں، اس کے آٹھ روز بعد لڑکے نے اپنی والدہ سے یہ خبر بھیج دی کہ ہم لینے نہیں آئیں گے، ایک مہینے تک انتظار کیا اسکے بعد خبر دی کہ اپنی بیوی کو لے جائے تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ ہم دوسری شادی کریں گے اس کو نہیں لائیں گے، پھر ہم نے دوسرا آدمی بھیجا تو اس کو کہا کہ ہم سے فارغخطی لیجاؤ ہم نہیں لائیں گے اور دوسری شادی کریں گے جس کو عرصہ چھ مہینے کا ہوگیا ہے، دوسری شادی بھی کرلی۔

۱- "وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة......لم تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية" (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۴۷۳)۔

ہم نے اس سے کہا کہ تم لڑکی آزاد کردو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم تو آزاد کر چکے ہیں، لاؤ ہم اس کا کاغذ لکھدیں اور فارغخطی لے لو، ہم لے جانا نہیں چاہتے ہیں، ایسی حالت میں طلاق ہوئی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آپکی تحریر سے صاف طور سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ (ہم آزاد کر چکے ہیں الخ) کس نے کہا ہے، شوہر نے خود کہے ہیں، یا اس کے گھر والوں نے کہے ہیں، اگر یہ جملہ خود شوہر نے کہا ہے تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی اور لڑکی آزاد ہوگئی اور اگر یہ جملہ خود شوہر نے نہیں کہا ہے تو عورت پر کوئی طلاق نہیں پڑی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۷/۱۳۸۵ھ

میں تم کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا بیٹی کو رکھوں کہنے سے طلاق نہیں پڑی:

زید نے اپنی بیوی ہندہ کو اپنے گھر دو تین آدمیوں کے سامنے یہ کہا کہ اگر میں تمکو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں صرف دو مرتبہ یہ لفظ کہکر بیوی سے جدا ہوکر دوسری جگہ رہنے لگا ہے، لیکن ایک ہفتہ کے بعد جب ہندہ زید کو بلانے آئی تو پھر زید نے کہا کہ جا اگر تمکو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں اگر تمکو میں رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں، اس کا اقرار زید اور ہندہ دونوں کو ہے اس موقع پر کوئی گواہ نہیں تھا۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کا یہ جملہ (اگر تمکو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں) نیز یہ جملہ (اگر تمکو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں) یہ دونوں جملہ لغو اور بیہودہ کلام ہے، ایسا کہنا جائز نہیں باعث گناہ ہے، اس لفظ سے نہ تو ظہار ہوتا ہے، کیونکہ ظہار کے لئے تشبیہ شرط ہے(۱) کما صرح بہ فی رد المحتار ج ۲ باب الظہار، اور نہ یہ لفظ طلاق صریح یا کنایہ کے الفاظ میں سے شمار کیا ہے کما ھو ظاہر، اس لئے ان جملوں سے نہ طلاق واقع ہوئی اور نہ ظہار ہوا، عالمگیری میں ہے: "**لو قال ان وطئتک وطئت امی لا شئی علیہ**

۱- "وشرعا (تشبیہ المسلم) فلا ظهار للمعی عندنا (زوجته) ولو کتابیة أو صغیرة أو مجنونة (أو) تشبیه مایعبر به عنها من أعضائها، أو تشبیه (جزء شائع منها بمحرم علیه تابیدا)" (الدر المختار علی الرد المحتار ۲/ ۷۹۰)۔

کذا فی غایۃ السروجی" (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید

صحت حلالہ کے لئے شوہر ثانی کا وطی کرنا ضروری ہے؟

حامد علی نے اپنی بیوی حمیدہ کو ۳ طلاق دیا، عدت کے بعد اسی حمیدہ سے حامد علی کے چچیرے بھائی جابر علی نے بغرض حلالہ نکاح کیا، لیکن حمیدہ اور جابر علی کے مابین اس نکاح کے بعد کبھی خلوت نہیں ہوئی ہے، اس کے چندماہ بعد جابر علی نے پھر حمیدہ کو ۳ طلاق دیا ہے، عدت کے گذرنے کے بعد حمیدہ نے اپنے زوج اول حامد علی سے دوبارہ نکاح کرلیا، واضح رہے کہ یہ صورت حلالہ کی حامد علی کے ایماء پرتھی، طلاق دینے کے بعد ایک دوسرے سے پھر سے دل خوش کرلیا تھا اور پھر سے وابستگی چاہتے تھے، اس لئے یہ حیلہ بنایا تھا، اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ یہ صورت حلالہ کی صحیح ہوئی یا کہ نہیں ہوئی ہے جبکہ جابر علی نے حمیدہ سے وطی نہیں کیا ہے اور نہ ہی خلوت ہوئی ہے، اب اگر وہ حمیدہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو کیا اس کو بھی طلاق کی ضرورت اور احتیاج ہے، فی الحال حمیدہ کے لئے احکام شرع کیا ہیں اور اس کی اس اولاد کے لئے جو اس حلالہ کے بعد پیدا ہوئی ہے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حلالہ میں شوہر ثانی کا صحبت کرنا شرط ہے، لہٰذا یہ حلالہ جو جابر علی نے کیا ہے حسب تحریر سوال صحیح نہیں ہوا ہے، حمیدہ پر واجب ہے کہ وہ حامد علی سے فوراً علیحدہ ہوجاوے اور عدت طلاق گذار کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کر کے اس کے پاس رہے اور اس سے ہم صحبت ہو پھر اگر وہ دوسرا شخص فوت ہوجاتا ہے یا طلاق دیدے تو اب اس کے بعد عدت گذار کر حامد علی سے نکاح کرنا درست ہوگا۔

حامد علی سے اس دوران میں جو اولاد ہوئی ہے وہ ثابت النسب قرار پائے گی، اس لئے کہ ممکن ہے کہ حامد علی کو اس مسئلہ کا علم نہ ہو کہ حلالہ میں وطی شرط ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد اور وطی بالشبہ ہوئی ہے اور وطی بالشبہ میں نسب ثابت ہوتا

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/۷۵۰، مکتبہ رشیدیہ

ہے(۱)، نیز حامد علی پر واجب ہے کہ وہ فوراً حمیدہ سے متارکت کرکے الگ ہوجاوے اور زبان سے کہدے کہ میں نے تم سے متارکت کرلی یا کہدے کہ میں نے تمکو چھوڑ دیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید

شوہر کا جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو کہنا:

ایک لڑکی کی شادی ہوئی تھی یعنی انکی لڑکی ہمارے یہاں آئی اور ہماری لڑکی انکے یہاں گئی، غرض ایک لڑکی کے تبادلہ میں روپیہ بھی دیا، زیور اور کپڑا بھی دیا اور لڑکی دی بعد شادی کے وہ اپنی لڑکی کو لے گئے اور ہماری لڑکی بھیجنے کو انکار کردیا ہے، معلوم ہونے پر ہم وہاں گئے اور ان سے کہا تو یہ جواب دیا کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو نہ ہم لائیں گے اور نہ ہمکو لڑکی کی ضرورت ہے، جس کو عرصہ کافی ہوگیا ہے، اب ہماری لڑکی پر طلاق ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال میں تحریر کردہ جملہ کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو نہ ہم لائیں گے او نہ ہمکو تمہاری لڑکی کی ضرورت ہے اگر خود لڑکی کے شوہر نے کہے ہیں تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی (بشرطیکہ اس جملہ سے شوہر کی نیت طلاق کی ہو)"**ومایبغی الازواج تقع واحدۃ بائنۃ إن نواھا**"(۲)، عدت تین حیض گذار کر جہاں چاہے اپنا نکاح کرسکتی ہے اور اگر شوہر نے خود یہ جملہ نہیں کہیں ہیں محض اس کے گھر والوں نے کہا ہے تو لڑکی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۸۵ ۱۳ھ

۱- "بخلاف الفاسد فانه وطئ بشبهة فيثبت به النسب" (شامی ۲/ ۶۸۷، مکتبہ فیض القرآن)۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۷۵۔

حلالہ کا طریقہ:

زید اپنی بیوی کو طلاق (تین طلاق) دے دیتا ہے اور اسی عورت کو ایک سال کے بعد اپنے نکاح میں لاتا ہے وہ پھر طلاق دے دیتا ہے اور یہ فعل بار بار دھراتا رہتا ہے، ایسی حالت میں نکاح مع حلالہ کے جائز ہے یا نہیں؟ نکاح اور حلالہ کے بارے میں تفصیل سے تحریر فرمائیں، اور حلالہ رشتہ دار یا غیر رشتہ دار سے جائز ہے یا نہیں؟ اور حلالہ کیسا ہے؟

عبدالحق (مینٹرل ملک آدم بلڈنگ، پیلان بھوپال)

الجواب وباللہ التوفیق:

تین طلاق کے بعد اگر عورت عدت طلاق گذار کر دوسرے مرد سے نکاح ذہمبستری کرا کے پھر اس سے طلاق واقع ہونے کے بعد عدت طلاق گذار کر یا اس دوسرے شوہر سے بیوہ ہو کر عدت وفات گذار کر اس پہلے تین طلاق دینے والے شخص سے حسب قاعدہ وشرع گواہوں کے سامنے نکاح کرے تو اس کے لئے شرعاً حلال و جائز ہوگی، ورنہ اگر اس میں ذرا بھی فرق ہوا تو حلال نہ ہوگی حرام ہی رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دے دیا سے کون سی طلاق پڑی؟

زید کی بیوی ہندہ کسی رنجش کی وجہ سے زید کے گھر سے چلی گئی ہے، ہندہ کے ماموں کا گھر وہیں ہے جہاں زید کا گھر ہے۔ زید کو شک ہوا تو زید اپنی والدہ کو لے کر ہندہ کے ماموں کے گھر گیا، دریافت کرنے پر ہندہ کے ماموں نے لاعلمی ظاہر کیا، زید کو غصہ آیا زید نے بحالت غصہ اپنی والدہ سے کہا گھر چلو ہم ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دیدیا ہے، کون ہم سے دین مہر لیتا ہے یہ کہتا ہوا گھر آیا، پھر بھی زید ہندہ کی تلاش میں رہا تقریب چار ماہ بعد ہندہ اپنے ماموں کے یہاں آئی ہے، زید کو معلوم ہوا زید ہندہ کے ماموں کے یہاں گیا کہ ہندہ کو رخصت کردو، ہندہ کے ماموں نے کہا کہ تم نے طلاق دیدیا ہے، زید نے کہا کہ ہم نے لفظ طلاق استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ لفظ جواب کہا تھا ہندہ کے ماموں نے کہا ہاں لفظ جواب کہنے سے بھی طلاق ہو گیا، عندالشرع طلاق ہوئی یا کہ نہیں ہندہ کا ماموں کہتا ہے کہ طلاق ہو گئی ہم دوسری جگہ نکاح کر دیں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کی اس عبارت میں ہم ایک دو تین کہتے ہیں جواب دیدیا کون ہم سے دین مہر لیتا ہے۔لفظ جواب دیدیا طلاق کنائی کے الفاظ میں سے ہے۔بحالت غضب بلانیت کے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے (کمافی الدرالمختار ص ۸۷۷)(۱) اور یہاں تو قرائن موجود ہیں

لہذا صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ،جس کا حکم یہ ہے کہ عورت نکاح سے بالکل نکل گئی، اگر عورت پھر اپنی مرضی اور خوشی سے اسی شوہر کے ساتھ تعلق ازدواجی قائم کرنا چاہے تو صرف نکاح جدید کے ساتھ کرسکتی ہے۔اور اگر عورت اس شوہر کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو جب سے لفظ جواب دیدیا کہا ہے اس وقت سے عدت تین حیض اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل گزارنے کے بعد اپنا دوسری جگہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔سابق شوہر کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا کہنا ہے آزاد کردوں گا کہا، گواہان آزاد کردیا بیان کرتے ہیں تو کیا حکم ہے؟

زید اپنی سسرال میں گیا وہاں جا کر زید اور زید کے سالے میں کچھ گفتگو ہوئی جس کی وجہ سے زید کو کافی تکلیف پہنچی، زید نے وہاں سے آکر کسی اور آدمی کے سامنے کہہ دیا کہ اگر میرے سالے کی یہی حرکت رہی اور وہ میرے ساتھ اس طرح سے لڑتا رہا تو میں اس کی بہن کو آزاد کردوں گا وہاں پر دو آدمی تھے، زید حلفیہ بیان دے رہا ہے کہ میں نے فقط ایک دفعہ یہ جملہ کہا ہے کہ آزاد کردوں گا اور کچھ نہیں کہا ہے وہ دو آدمی جن کے سامنے یہ بات ہوئی وہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے یہ کہا ہے کہ میں نے اپنے سالے کی بہن کو آزاد کردیا۔آزاد کردیا (وہ شاہد یہ کہتے ہیں) اور زید اوپر والا جملہ کہہ رہا ہے تو اس صورت میں شاہدوں کے کہنے سے طلاق واقع ہوگئی یا کہ نہیں؟

۱- ''الکنایات لاتطلق بها قضاء (الابنية او دلالة الحال) وهي حالة مذاكرة الطلاق أو الغضب''(شامی ۲/۵۳۵،۱۳۶۰ء، ۳۷۶، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال جب دوشاہد یہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے آزاد کردیا کا جملہ دوبار کہا ہے تو اگرچہ زید اس کا انکار کرتا ہے مگر دوطلاق رجعی واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ زید عدت (تین حیض) کے اندر اندر رجعت کرے، یعنی اپنی طلاقیں واپس لے لے تو زید کی بیوی حسب سابق زید کی بیوی رہ جائے گی، البتہ آئندہ اب زید محض ایک ہی طلاق کا مالک رہ جائے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر خدانخواستہ پھر کبھی زید ایک دفعہ بھی طلاق دیدے گا تو تینوں طلاقیں پڑ کر حرمت مغلظہ ہوجائے گی، ابھی تک حرمت مغلظہ نہیں ہوئی ہے، رجعت سے بیوی رہ جائے گی(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا زن وشوئی کے تعلقات نہ رکھنا کہنا:

زید کے تعلقات اپنی بیوی سے ٹھیک نہیں رہتے تھے۔ جس کی بناء پر اس نے اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ وہ اب اپنے تعلقات اس عورت سے زن وشوئی نہیں رکھے گا۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنے احباب سے وقتاً فوقتاً کیا، ایسی نیت کئے اس کو آٹھ ماہ ہوگئے ہیں اور زید نے اپنی نیت کی پابندی بھی کی ہے اور بیوی سے نہیں ملا ہے اور بود وباش بھی علیحدہ اختیار کرلیا ہے، اب اس کے احباب اس کو مجبور کررہے ہیں کہ زید اپنی بیوی سے مل کرلے اور زن وشوہر کے تعلقات قائم کرے۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنی بیوی سے نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا پختہ ارادہ دل میں قائم کرلیا ہے، اس صورت میں شرعی کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

زید نے اگر اپنی زبان سے بھی قطعیت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ اپنی زوجہ کے پاس نہیں جائے گا یا اس مضمون پر قسم کھالیا ہے تو اگرچہ بیوی کو اس کا علم نہ ہوا ایلاء ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے چارماہ سے زائد گزرنے پر ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور تعلق زن قائم کرنے کے لئے بغیر حلالہ کے محض پھر سے نکاح پڑھا کر تعلق زن قائم کرنا جائز ہوگا۔

۱- ''الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح باحسان''(سورہ بقرہ/۲۲۹)،'' فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره''(سورہ بقرہ/۲۳۰)۔

اور اگر یہ جملہ کہ تعلق زن قائم نہیں کرے گا، اس پر قسم نہیں کھائی تھی اور یمین نہیں بنایا تھا بلکہ محض دل ہی دل میں تہیہ اور ارادہ کیا تھا تو ابھی اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، بلا کسی جدید نکاح کے بھی اس کو اپنے ساتھ لا سکتا ہے اور تعلق زن وشوئی بھی قائم کرسکتا ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجین میں نا اتفاقی کی وجہ سے طلاق نہیں پڑی:

زید کی بیوی زینب اپنے گھر میں تھی، زید پردیس سے آکر اپنی بیوی کو لانے گیا، اہلیہ نے آنے سے انکار کیا کہ میں تمہارے باپ کے گھر نہیں جاسکتی ہوں، مجھکو وہاں تکلیف ہوتی ہے، زید نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر رہی، زید خود اپنی اہلیہ کو پکڑ لایا چونکہ زید اور اس کی زوجہ کی والدہ کا گھر متصل ہے، زینب گھر بھاگ گئی اب وہاں رہتی ہے، زید کی والدہ اور زید کی بیوی میں اتفاق نہیں ہے۔ اب اس حالت میں زید کا نکاح زینب کے ساتھ رہا یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی زینب پر کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی، نکاح میں باقی ہے، البتہ چونکہ بھاگ کر بلا اجازت گئی ہے اس لئے نان نفقہ کی مستحق نہیں ہے(۲)، لیکن زید پر بھی واجب ہے کہ اپنی بیوی کو الگ کمرہ دے، چاہے بقیہ گھر مشترک رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۸/۱۴۱۰ھ

۱- ''قوله هو لغة اليمين، قوله: وشرعا الحلف ..... ولهذا قال في الفتح: وفي الشرع هو اليمين على ترك قربان الزوجة أربعة اشهر فصاعدا بالله تعالى" (شامی ۴۲۹/۲، مطبوعہ عثمانیہ)۔

۲- ''قال الشامي تحت قوله (وركنه لفظ مخصوص) هو ماجعل دلالة على معنى الطلاق من صريح أو كناية (لاخارجة من بيته بغير حق) وهي الناشزة حتى تعود" (شامی ۸۹۰/۲ مکتبہ عثمانیہ) ''النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت او كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها" (ہدایہ ۴۳۷/۲)۔

عدالت سے خود مختاری حاصل کرنا:

ایک عورت نے بہت ہی مجبوری اور تکلیف سے مجبور ہوکر اپنے شوہر سے جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی، وہ عورت کے قابل نہ تھا، علیحدہ ہوکر درخواست خود مختاری عدالت سے دے کر خود مختاری حاصل کر لی ہے کہ جس سے چاہے نکاح کرے۔

(۱) کیا اس عورت سے بغیر عدت نکاح درست ہے؟

(۲) اگر عدت ہے تو اخراجات کس کے ذمہ ہیں؟

(۳) طلاق اس کے شوہر نے ایک سال دو مہینے قبل دیدی تھی۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر حاکم عدالت غیر مسلم ہو یا مسلم ہی ہو لیکن شرعی قاعدہ کے مطابق فسخ نکاح نہ کرے تو یہ اجازت خود مختاری شرعی نہیں ہوگی اور نہ معتبر ہوگی، بلکہ ایسی صورت میں قاضی شرعی کے قائم مقام جماعت مسلمین سے بھی تفریق شرعی حاصل کرنی ضروری ہے البتہ سوال کا یہ جملہ (اپنے شوہر جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی) اگر شوہر نے تین بار طلاق دیدی تھی تو اس طلاق کی عدت (تین حیض) گزارنے پر جہاں چاہے دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اگر تین طلاق سے کم دی تھی تو سوال نمبر ۳ کے مطابق جب طلاق دینے کے بعد جس کو ایک سال دو ماہ ہوا اور بعد طلاق ۶ ماہ وہیں رہی، میاں بیوی کی طرح رہی تو رجعت بھی ہوگئی، اب آٹھ ماہ سے علیحدہ ہے مگر نکاح قائم ہے اور عدالت سے خود مختاری شرعی نہیں ہے بلکہ جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق کرالے اور پھر حکم تفریق کے بعد سے عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اس عدت کا خرچہ شوہر پر عائد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۸/۱۴۱۰ھ

میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہنے سے طلاق:

زید نومسلم ہے اور اس کی بیوی بھی نومسلمہ ہے، ۱۹۵۵ء میں شادی ماں باپ کے رسم ورواج سے بلا مہر کے ہوئی تھی، بالغ ہونے پر دونوں مشرف باسلام ہوئے، زید ایک لڑکی کے باپ ہونے کے بعد زید کی بیوی کی نافرمانیوں سے تنگ

آکر اورسخت پریشان کرنے پر چھوڑنے کی نیت سے یہ الفاظ کہا کہ میں تجھے رکھنانہیں چاہتاہوں، میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، پنچایت میں فیصلہ ہوا کہ دوسوروپیہ مہر دے کرعلیحدہ کردو، زید اس فیصلہ پر راضی ہوگیا ہے، لیکن زید کی بیوی علیحدہ ہونے سے ناراض ہے، وجہ گرز زید اور بیٹی سے جدا ہونانہیں چاہتی اور وہ علیحدہ ہوگی تو مرتد ہونے کا امکان اور علیحدہ ہونے پر بہت بڑا فتنہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، زید کی بیوی معافی چاہتی ہے کہ آئندہ نافرمانی نہیں کروں گی، زید پریشان ہے کہ اگر وہ مرتد ہو جائے تو زید بھی گنہگار ہوگا اگر رجوع نہ کرنا چاہے، اگر طلاق ہوئی تو کونسی طلاق ہوئی، آیا شرعی احکام سے جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی (۱)، اگر دونوں پھر زن وشوئی کے تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو دونوں میں پھر سے جدید نکاح پڑھا دیا جائے - ان دونوں کے درمیان نکاح پڑھانے کے لئے عدت گزارنی بھی شرط نہیں ہے جب چاہے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

بیوی کو میں نے تم کو چھوڑ دی تو میرے کام کی نہیں کہنا:

اگر زید نے اپنی عورت محبوبہ کوتنازع اور جھگڑا ہونے کے وقت مار پیٹ کر کے بولا ہوگا جاؤ تو مجھے بکار نہیں ہے یا کہ فارسی میں کہا ہے تو بکار من نیستی یا بکار نی تو نیستی یا میں نے تجھکو چھوڑ دی یا میں تجھکو چھوڑ بولتا ہوں اور کشمیری میں کہتے ہیں میینہ تر اوک ژء (لفظ غیر واضح تھا اس کی تعیین مفتی نذیر احمد کشمیری سے مراجعہ کے بعد کی گئی جس کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا: میں نے چھوڑ دیا تجھ کو) یعنی مرے گھر سے نکل جاؤ کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے، مولانا مرحوم مولوی عبدالکبیر صاحب دیوبندی نے اپنے ایک فتوی میں لکھا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے اوردو کتاب کا حوالہ لکھا عالمگیری اور بزازیہ، لیکن ایک مولوی صاحب

۱- ’’الكنايات لايقع بها الطلاق إلا بالنية أو بدلالة الحال، لأنها غير موضوعة للطلاق بل تحتمله وغيره فلا بد من التعيين‘‘(ہدایہ ۲/ ۳۵۳، مطبع یوسفی لکھنؤ)" لايقع الطلاق بشئ من الكنايات إلا بالنية‘‘ (قاضی خاں علی الہندیہ ۱/ ۴۶۷، دارالکتاب دیوبند)۔

۲- ’’إذا كان الطلاق بائنا دون الثالث فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضائها‘‘(عالمگیری مع خانیہ ۱/ ۴۷۲-۴۷۳، دارالکتاب دیوبند)۔

نے فرمایا ہے کہ عالمگیری میں یہ الفاظ بولنے سے طلاق نہیں ہوتی ہے (۱)، پھر رہا بزازیہ وہ کتاب میرے پاس نہیں لیکن عبدالکبیر صاحب نے کوئی مسئلہ نہیں لکھا ہے لیکن اپنے جواب میں دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

نذیر احمد (متصل زیارت حضرت شاہ ہمدان مقام ترالی ضلع پلوامہ، کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

ان الفاظ میں سے بعض لفظ جیسے میں نے تجھکو چھوڑ دی یا چھوڑ دیتا ہوں طلاق صریح کے حکم میں ہے اور انکو بغیر نیت طلاق کہنے سے بھی طلاق واقع ہوجائے گی، اور بعض الفاظ طلاق کنائی کے ہیں، جیسے تو میرے کام کی نہیں ہے، یا تو میرے گھر سے نکل جا، ان الفاظ سے بغیر نیت طلاق کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی یہ جزئیات عالمگیری (۲)، بزازیہ، خانیہ ہر کتاب میں مذکور ہیں، یہ طریقہ استفتاء کا نہیں ہے بلکہ جو لفظ جس موقع میں بولا ہو اس کو بعینہ مع موقع کلام کے لکھ کر استفتاء کرنا چاہئے، لہذا لفظ جس موقع میں بولا ہو حکم اس کے مطابق ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۰/۶/۲۶ھ

کیا جذام کی وجہ سے حق حضانت ساقط ہونا چاہئے؟

میری ایک لڑکی ہے جس کی ماں کو جذام ہوگیا ہے، میں نے اس کو طلاق بائن دیدیا ہے، پنچایت نے اس طلاق سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ مدت رضاعت تک بچی کو ماں کے پاس رہنا چاہیے اور بچی کی ماں مرض جذام میں مبتلا ہے، اس لئے حق حضانت ماں کے بعد نانی کو ہوتا ہے، اس لئے بچی نانی کے پاس رہے گی اور منیر الدین بچی کو بیس روپیہ ماہانہ ادا کریں، بچی اپنی ماں اور بھائیوں کے شریک ہے، مجھے شبہ ہے کہ اس ماں کا اثر بچی پہ ہوگا، اس لئے بچی کو میں اپنی پرورش میں رکھنا چاہتا ہوں کیا رہ سکتی ہے؟

۱- "رجل قال لامرأته: مرا بکار نیستی ونوی به الطلاق لایقع" (فتاوی عالمگیری ۱/ ۳۸۰)۔

۲- "والأصل الذی علیه الفتوی فی زماننا هذا فی الطلاق بالفارسیة إنه إذا کان فیها لفظ لا یستعمل إلا فی الطلاق فذلک اللفظ صریح یقع به الطلاق من غیر نیة إذا أضیف إلی المرأة، وما کان بالفارسیة من الألفاظ ما یستعمل فی الطلاق وفی غیره فهو من کنایات الفارسیة فیکون حکمه حکم کنایات العربیة فی جمیع الأحکام، کذا فی البدائع" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۳۷۹)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال محض آپ کے بیان کردہ شبہ کے بناء پر حق حضانت سوخت نہیں ہوگا (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم احق بالولد إلى قوله: فان لم تكن له ام فأم الأم اولىٰ من ام الاب وان بعدت" (ہدایہ ۲/۴۳۷)۔

باب تعلیق الطلاق

شوہر کا ایک نہیں تین طلاق، طلاق، طلاق لکھنا:

زید حنفی المذہب بالغ اور خواندہ ہے، لیکن مسائل دینی سے بہت کم واقف ہے، غلط فہمی سے اس کی اہلیہ جو حنفی المذہب خواندہ ہے، کسی رشتہ دار میکہ والوں کے پاس بلا اجازت ورضامندی مہمان گئی ہے، غصہ سے پدر ہندہ اور اس کے متعلقین کو ڈرانے کے لئے بنام خسر خط لکھا کہ آپ لوگوں کی مہربانی ہوتو آپ کی لڑکی کو طلاق دیدیا ہوں۔ ایک نہیں تین، طلاق، طلاق، طلاق تو اب غصہ کی حالت طلاق واقع ہوجاتی ہے یا کہ نہیں اگر زید رکھنا چاہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب زید نے اپنے خسر کو یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیئے کہ میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے رہا ہوں ایک نہیں تین، طلاق طلاق طلاق تو بلاشبہ زید کی بیوی پر حنفی مذہب کے مطابق تین طلاق پڑ کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کسی طرح وہ عورت زید کے لئے جائز وحلال نہیں ہوسکتی چاہے، کسی نیت اور دھمکی کی غرض سے لکھا ہو ہر حال میں یہی حکم ہے۔ اور حلالہ یہ ہے کہ اس طلاق کے بعد ہندہ کو تین حیض آکر اور اگر حاملہ ہوتو وضع حمل ہوکر عدت ختم ہولے اور اس کے بعد ہندہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرکے اس کے ساتھ ہم صحبت ہولے پھر وہ دوسرا شوہر مرجائے یا طلاق دیدے۔ اور پھر اس موت یا طلاق کی عدت گزرجائے۔ اب اس کے بعد ہندہ زید سے دوبارہ نکاح کرکے اس کے پاس آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں، ''وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة.....لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهندية'' (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۹/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۷۳۔

شوہر کا ایک دو تین طلاق ہو مجھ پر اگر بیوی میرے گھر آئے کہنا:

زید نے یہ الفاظ کہے: ایک، دو، تین طلاق ہو مجھ پر اپنی بیوی منکوحہ زینب سے، اگر وہ میرے گھر واپس آگئی، لیکن آدھ گھنٹے کے بعد زینب گھر آگئی آیا یہ طلاق مغلظہ ہوئی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں حرمتِ مغلظہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، **"لانہ عد الطلاق أولا وعد الطلاق لیس بطلاق فبقی لفظ الصریح وھو یوجب الرجعة"** **کما فی الشامی**، فقط واللہ اعلم بالصواب

مفتی محمد فرید عفی عنہ

اس جواب پر سوال:

۱۔ اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کیا برابر ہے؟ نیز یہ عبارت شامی صفحہ مذکورہ میں نہیں ہے، شرط مقدم اور مؤخر ہونے میں مسئلہ یہی ہے۔

الجواب:

جناب ایک دو تین نہ صریح ہے نہ کنایہ ہے، صرف عدد طلاق ہے۔ نیز اس میں حکم بھی نہیں ہے اور خبر یہ مجہولہ کی بناء پر ایسے عدد سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس میں عدد کا مجھ پر طلاق ہونے سے کوئی تعلق ظرفیت یا مصدریت کا نہیں ہے، پس صرف ایک طلاق مجھ پر طلاق ہونے کی بناء پر واقع ہوگا۔ اس میں مدخول بہا غیر مدخول بہا کا یکساں حکم ہے۔

الجواب:

یہ جملہ (ایک دو تین) مختلف محاوروں کے مطابق بولا جاتا ہے، لہٰذا اس خط میں اس خط کے محاورہ کے مطابق حکم ہوگا۔ بتقاضائے آیت کریمہ: **"وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ"** (۱)۔

پس جس خطہ و دیار میں عرف عام و مشہور ہو کہ مذکورہ جملہ محض اپنی مستعدی ظاہر کرنے کے لئے اور مخاطب کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے بولتے ہیں اور اس کا تعلق اس کے بعد کے لفظ سے نہیں ہوتا تو اس خطہ میں اس سوال میں اس

۱- سورۂ ابراہیم: ۴۔

ذکر کردہ جملہ سے فقط ایک طلاق واقع ہونے کا حکم ہوگا۔

اور جس خطہ ودیار میں یہ عرف عام ومشہور ہو کہ یہ مذکورہ جملہ معدود ہوگا، اور مفہوم یہ ہوگا (ایک طلاق دوطلاق تین طلاق) پس اس خطہ ودیار میں اس سول میں مذکورہ جملہ سے تین طلاق واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوجائے گی۔ اور جس خطہ ودیار میں ان دونوں عرف میں سے کوئی عرف نہ ہو وہاں شوہر کے قول کا اعتبار ہوگا۔ جس کو وہ حلف بیان کرے گا، لہذا یہ دونوں مذکورہ جواب ادھورے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۵/۹۹ ۱۳ھ

تعلیق طلاق سے رجوع صحیح نہیں ہے:

زید نے اپنی منکوحہ ہندہ کو دوطلاق دیدی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر بکر کے گھر گئی تو تیسری بھی، (۲) بکر خاص رشتہ دار ہے بعض مرتبہ جانا بھی ضروری ہوجاتا ہے، جواب طلب امر یہ ہے اس کے بعد دونوں میں مصالحت ہوگئی ہے اور پھر زید نے اپنی شرط بکر کے گھر جانے کی واپس لے لی ہے کہ اب میں بکر کے گھر جانے سے منع نہیں کروں گا تو ہندہ بکر کے گھر پر جاسکتی ہے یا نہیں اگر گئی تو کیا تیسری طلاق واقع ہوجائے گی؟

ایک صاحب نے یہ بتلایا ہے کہ زندگی بھر بکر کے گھر نہیں جاسکتی ہاں اگر وہ گھر بدلے تو پھر جاسکتی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

محمد صالح عبدالصمد ساماتی (بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ (اگر بکر کے گھر پر گئی تو تیسری بھی) مطلق ہے، شوہر نے اس تعلیق کو اپنی اجازت سے مقید نہیں کیا ہے، اس لئے اب اجازت دینے سے وہ شرط اور اس شرط کا حکم ختم نہ ہوگا بلکہ جب بھی بکر کے گھر جائے گی تو تیسری طلاق بھی واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوجائے گی اور پھر بغیر حلالہ کے کوئی شکل جائز ہونے کی باقی نہ رہے گی، اور چونکہ اس لفظ (بکر کے گھر) سے عرف میں دار بکر کا دار سکونت ہے یعنی جس گھر میں بکر سکونت پذیر ہو وہ مراد ہے خواہ وہ گھر آبائی ہو یا بکر کا خرید کردہ ہو یا کرایہ پر لیا ہوا ہو، پس گھر بدل کر دینے میں یہ تفصیل ہوگی کہ جس گھر کو بدل کر اس میں جائے گا، اگر وہ سکونت کے لئے اختیار کیا ہوگا، خواہ کرایہ پر لے کر ہو تو اس میں بھی جانے سے قسم ٹوٹے گی اور تیسری طلاق پڑجائے گی، ہاں اگر کہیں

مہمانی میں بکر گیا یا کوئی گھر محض چند دن قیام کے لئے لیا، خواہ عاریت پر یا کرایہ پر، مگر اس گھر میں سکونت کرنے کا ارادہ نہیں ہے بلکہ محض عارضی طور پر چند دن کے لئے چلا گیا ہے اور وہاں زید کی منکوحہ ہندہ چلی جائے تو کوئی طلاق نہ پڑے گی، اسی طرح اگر ہندہ کے جانے کے بجائے خود بکر ہندہ کے گھر ملاقات کے لئے آجایا کرے تو اس سے کوئی طلاق نہیں پڑے گی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۱/۱۴۰۱ھ

مارنے پر طلاق کو معلق کرنا:

زید اور عمر دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، کئی بار زید نے عمر کو مارا (بہت زیادہ پٹائی کی) ایک بار پٹائی میں زید نے جوش میں آکر پیٹنے کے بعد کہا کہ اگر میں آئندہ ماروں تو میری بیوی کو طلاق اور مارنے سے مطلب پٹائی کرنا تھا جیسا کہ پچھلے کئی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ زید نے غصہ میں آکر عمر کو چھوٹے چھوٹے واقعات پر خوب مارا، طلاق معلق کرنے کے بعد ایک دن عمر لیٹا ہوا تھا لحاف اوڑھ کر اور اس نے ریح خارج کردیا زید نے بلا کسی ارادہ اور غصہ کے مذاق میں پیر ماردیا اتنی زور سے کہ جیسے عام طور سے ہاتھ پیر ٹکرا جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اس وقت نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی مارنے کا ارادہ تھا، اس کے بعد زید کو شک ہوگیا کہ یہ مارنا اس مارنے کے اندر تو شامل نہیں ہے جس پر طلاق معلق ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

عبدالحمید (ساکن کٹہرہ، مظفر نگر)

۱- "رجل قال لامرأته: إن دخلت دار أخي فأنت طالق، فسكن أخو الحالف داراً أخرى،ودخلت المرأة الدار الحديثة،قال بعضهم: إن كانت يمينه بغيظ الحقد من تلك الدار الأولى لا يحنث في يمينه، وإن كانت يمينه لأجل الأخ حنث في يمينه وإن لم تكن له نية حنث في قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى، وإن دخلت المرأة الدار التي كانت لأخيه وقت اليمين، إن كانت الدار في ملك الأخ إلا أنه لا يسكن فيها حنث في يمينه، وإن خرجت تلك الدار عن ملك الأخ بعد اليمين ببيع أو هبة أو غير ذلك لا يحنث كذا في فتاوى قاضيخان" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۴۳۴، فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۴۸۳)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے اور اسی طرح ہے تو اس سے قسم نہیں ٹوٹی اور طلاق نہیں پڑی، باقی آئندہ احتیاط رکھنا چاہئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۳/۱۴۰۲ھ

اقرارنامہ کی خلاف ورزی سے کون سی طلاق پڑے گی؟

چاند بیگ نے اپنی زوجہ رابعہ کو کافی ناجائز تکلیف پہنچائی ہے گالی گلوج مار پیٹ ناک کاٹنے کے لئے چھورے نکال کر حملہ آور ہوا ہے، آخر حد تک نا اتفاقی دونوں میاں بیوی میں ہوگئی ہے، دارالافتاء میں اس پر فیصلہ ہوا کہ چاند بیگ نے اقرار نامہ تحریر کیا اور یہ لکھدیا کہ آئندہ کسی قسم کی تکلیف دوں یا رابعہ کے ماں باپ کے یہاں ان کے لئے آنے پر روکوں تو قاضی صاحب جو فیصلہ کریں گے منظور کروں گا اور رابعہ کو اختیار ہوگا کہ بذریعہ دارالقضاء تفریق کردیں اور اقرارنامہ کے خلاف کروں تو بھی طلاق سمجھی جائے۔ اپنے اقرار کرنے کے بعد دو آدمیوں کے سامنے جو قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں یہ الفاظ چاند بیگ نے کہے کہ رابعہ بی کو میکہ لے جاؤ میں اس کو نہیں رکھتا میں نے اس کو طلاق دیدی ہے تین بار اسی طرح کہا، رابعہ بی نے دارالافتاء میں فیصلہ چاہا تو چاند بیگ نے بذریعہ رجسٹری یہ تحریر کیا کہ میں (دارالافتاء) دارالقضاء میں کوئی جواب ہی نہیں کرنا چاہتا ہوں عدالتی کارروائی کرڈالو۔

اب رابعہ بی یہ چاہتی ہیں کہ از روئے شرع جواب تحریر کریں کہ آیا میرا مہر بذمہ شوہر واجب ہے یا کہ نہیں، اور تین بچے بھی اس کے ہوئے جن سے ایک لڑکی حیات ہے۔ رابعہ کے والد لینے آئے انہوں نے نہیں پہنچایا جو اقرارنامہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اب حکم شرع سے مطلع فرمایا جائے؟

۱- اس لئے کہ ضرب ان امور ثلاثہ میں سے نہیں ہے جن کا مبزل بھی جد شمار ہو، اور اس لئے کہ عرفا اس پر مارکا اطلاق نہیں ہوتا، ''والأصل أن الأيمان مبنية .... وعندنا على العرف''، اس کے تحت شامی میں ہے: ''لأن المتكلم إنما يتكلم بالكلام العرفي، أعني الألفاظ التي يراد بها معانيها التي وضعت لها في العرف'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۵/۵۲۷)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب قرارنامہ طلاق کے بعد کئی مرتبہ قرارنامہ کی خلاف ورزی کی ہے اگر تین بار طلاق دینے کے پہلے یہ خلاف ورزی کی ہے تو ایسی خلاف ورزی سے جو پہلی بار کی ہے رابعہ پر ایک طلاق بائن پڑگئی اور رابعہ بی چاند بیگ کے نکاح سے نکل گئی۔ اور بعد میں تین طلاق لغو اور بے اثر رہیں اور طلاق بائن کا یہ اثر ہے کہ رابعہ بی اگر اپنی مرضی وخوشی سے پھر چاند بیگ کی زوجیت میں جانا چاہے تو پھر سے جدید نکاح کرکے جاسکتی ہے، (۱)۔ چاند بیگ زبردستی یا رجعت نہیں کرسکتا ہے اور اگر قرارنامہ کی خلاف ورزی سے پہلے تین بار یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے اس کو (رابعہ کو) طلاق دی تو اب تین طلاقیں واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب رابعہ بی اس شوہر کے لئے بجز حلالہ کے کسی طرح حلال اور جائز نہیں ہوسکتی ہے اور حلالہ یہ ہے کہ اس مغلظہ طلاق کی عدت تین حیض گزرنے پر رابعہ دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ اس کے ساتھ رہے ہم بستر ہو پھر اگر وہ فوت ہوجائے یا طلاق دیدے اور رابعہ کی یہ عدت وفات اور طلاق بھی گزر جائے، اس کے بعد شوہر اول چاند بیگ کا دارالقضاء میں نہ جانا یا قانون جوئی کرنا سب غلط ہے، اب اس کو اگر یہ واقعات مذکورہ فی السوال صحیح ہیں ان باتوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ رابعہ بی چاند بیگ کی زوجیت سے بالکل نکل گئی اور رابعہ بی کا مہر بذمہ چاند بیگ واجب الاداء ہے، چاند بیگ کو چاہیے کہ رابعہ کا مہر دے کر خاموش ہوجاوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کو ماضی پر محمول کرنے کا حکم:

باب الطلاق میں زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی پر محمول کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔ مثلاً یوں کہے کہ اگر تو پانی پیتی ہے تو تجھکو طلاق اور عورت نے پانی پیا زمانہ ماضی میں یہ الفاظ کہنے سے ۱۰ پانچ منٹ پہلے پانی پیتی ہے، یہ جملہ حالیہ ہے اور اس نے پانی پیا زمانہ ماضی میں۔ تو جملہ حالیہ میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی میں اعتبار ہوگا یا کہ نہیں ہوگا؟

۲- شوہر کا ''اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق'' کہنا:

زید نماز پڑھ رہا ہے۔ درمیان نماز اس کو اپنی بیوی مریم کا خیال آیا ہے، زید نے اپنا خیال فوراً اللہ عز وجل کی طرف

۱- "فاذا طلق زوجة طلقه بائنة واحدة او اثنين جاز له العود إليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة وإنما بعقد جديد" (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۹/۲۹)، "وينكح مبانة بمادون الثلاث في العدة وبعدها (بالاجماع)" (الدرالمختار علی الرد ۵/۴۰، مکتبہ زکریا)۔

متوجہ کیا اور اپنے نفس کو اس پر ملامت کی اور نماز پوری کی، اس کے بعد زید نے یوں کہا کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب مخل ہے تو تجھکو طلاق ہے، اور مریم زید کے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے والدین کے یہاں زید سے چالیس میل کے فاصلہ دوری پر ہے اور ابھی مریم کی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہے، تو طلاق واقع ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- شرط لگانے سے پہلے خواہ ۱۰-۵ ہی منٹ پہلے پانی پیا ہو۔ اس بعد کی شرط سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔

۲- یہ خطاب تو دلی اور مجازی خطاب ہے جو عرفاً رائج ہے، اس لئے لغو نہ ہوگا، لیکن یہ جملہ (کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب مخل ہے تو تجھ کو طلاق) تعلیق کا ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اگر آئندہ مریم اپنے ظاہری عمل اور قول سے روکاوٹ ڈالے گی تو ایک طلاق پڑ جائے گی۔ ابھی کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی اور یہ حکم اس صورت کا ہے کہ یہ جملہ اپنی زبان سے زید نے کہا ہو۔ اور جیسا کہ سیاق وسباق سوال سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر زبان سے نہ کہا ہو بلکہ محض دل ہی دل میں سوچا ہو تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا نہ اب نہ آئندہ (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر عیدین میں مصافحہ و معانقہ بدعت ہو تو بیوی پر تین طلاق:

۱- زید قسم کھا کر کہتا ہے کہ عیدین میں مصافحہ اور معانقہ کرنا اگر بدعت ہو تو ہماری بیوی پر تین طلاق، لہذا دریافت ہے کہ زید کی قسم باقی ہے یا کہ نہیں ایسا ہی ان کی بیوی مطلقہ ہے یا کہ نہیں؟

۲- بعض لوگ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ فتاویٰ رشیدیہ کے اندر ص ۱۰۲ اور ص ۱۴۰ اور امداد الفتاویٰ کے جلد چہارم میں ص ۹۷ پر عیدین کا معانقہ اور مصافحہ بدعت فرمایا یہ بالکل غلط بلکہ بدعت حسنہ اور ثواب ہے اور بالکل جائز ہے حدیث شریف میں منع نہیں ہے، لہذا یہ بھی کہنا صحیح ہے اور قسم باقی ہے۔ بینوا توجروا۔

۱- ''التعلیق اصطلاحا (ربط حصول مضمون جملة بحصول مضمون جملة اخری) فهو خاص بالمعنوی والمراد بالجملة الاولیٰ فی کلامه جملة الجزاء وبالثانیة جملة الشرط وبالمضمون ما تضمنة الجملة من المعنی فهو فی مثل ان دخلت الدار فانت طالق ربط حصول طلاقها بحصول دخولها الدار'' (شامی ۲/ ۶۷۷، مطبع عثمانیہ)۔

۲- ''فی القهستانی من انه ازالة النکاح او نقصان حله بلفظ مخصوص'' (شامی ۲/ ۵۷۱، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض عیدین کے نماز کیوجہ سے عیدگاہ میں جو مصافحہ کا رواج لازمی ہوگیا ہے یہ قطعاً بدعت (۱) ہے، اور امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ کا فتوی بالکل صحیح ہے، لہٰذا اگر ایسے مصافحہ پر طلاق کی قسم کھائی ہے جو سوال میں درج ہے تو بلاشبہ اس کی بیوی پر طلاق پڑگئی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط انه تكره المصافحة بعد اداء الصلاة لكل حال لان الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد اداء الصلوٰة ولانها من سنن الروافض اه ثم نقل عن ابن حجر من الشافعية انها بدعة مكروهة لا اصل لها في الشرع وانه ينبه فاعلها اولا ويعزر ثانيا ثم قال وقال ابن الحجاج من المالكية في المدخل انها من البدع وموضع المصافحة في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاخيه لا في ادبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذالك ويزجر فاعله لما اتى به من خلاف السنة'' (شامی ۵/۳۳۶، مطبوعہ نعمانیہ)۔

۲- ''اذا اضافه الى شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامرء ته ان دخلت الدار فانت طالق'' (ہدایہ ۲/۳۸۵، باب الایمان فی الطلاق، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

باب الخلع

خلع میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے:

زید کی شادی ہندہ سے ۱۰ نومبر ۶۳ء کو ہوئی قریب چھ ماہ تعلقات تو کچھ بہتر تھے، مگر اس کے بعد زید کی طرف سے ہندہ کو برابر خورد و نوش، لباس و پوشاک تک کی تکلیف دینی شروع ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہندہ اپنے والد کے سمجھانے سے نباہتی رہی مگر زید کی یہ حرکت دائمی ہوگئی، اب ہندہ کے والدین نے اپنی لڑکی کا بوجھ اپنے سر دیکھ کر پنچائت بلایا ہے اور کل احوال سنایا ہے جس کا اثر یہ ہوا کہ زید نے ایک شرائط نامہ لکھ کر پنچائت کے روبرو یہ یقین دلایا کہ اب میں ہر طرح کی شکایت دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کروں گا، تمام معززین حضرات زید کی بات پر یقین کر کے ہندہ کو پھر زید کے ساتھ پنچائت کے روبرو روانہ کردیا ہے مگر ابھی چند گز وہ پنچایت نہیں گئے ہوں گے کہ ہندہ کے رونے کی آواز آئی تمام حضرات وہاں پہنچ کر ہندہ کو بیہوش دیکھا، اب جب ہوش میں آئی تو زید کے ساتھ زندگی گذارنے سے ناراض ہے اور کہا اگر ہمارے والد ہمکو وہاں روانہ کریں گے تو خودکشی کرلوں گی۔ اس پر پنچائت نے اس کے والد کے حوالے کردیا جس کو دو سال ہوگئے ہیں کہ زید نے پھر لیجانے کی کوشش کی نہ لیجانے آیا ہے نہ نان و نفقہ کا انتظام کیا ہے، اب ہندہ اپنے ظالم شوہر سے خلع چاہتی ہے اور دین مہر اور سامان جہیز اور زیور کو چھوڑنے پر تیار ہے، ہندہ کے باپ نے زید کی ۶ کٹھہ زمین خرید لیا ہے جو کہ ہندہ کے نام ہے چھوڑنا نہیں چاہتی، اب زید کہتا ہے کہ جو زمین تم نے نام سے رجسٹری کرائی ہے اس کو بھی واپس کردو تو طلاق دوں گا، اب شرعی جواب سے مطلع کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سوال میں مذکورہ واقعات صحیح ہیں تو ہندہ کو خلع کرانا درست ہے، مگر خلع شوہر کی رضامندی سے ہوتا ہے، زبردستی نہیں ہوتا ہے، لہذا جب شوہر بغیر اس آراضی کو حاصل کئے خلع پر تیار نہیں ہے اور ہندہ کو خلع کی ضرورت ہے تو جس طرح اور

سب چیزیں مہر وغیرہ چھوڑی ہیں اس آراضی کو بھی واپس کرادے، ہندہ کو اختیار ہے اور اپنی مصلحت دیکھ لے یہ حکم اس صورت کا ہے جب ہندہ خود خلع کرا لینا ہی چاہتی ہے ورنہ تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی شوہر کی جانب سے ہے اور وہ ظالم ہے، اسکو اس خلع میں کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے حرام ہے (۱)، اس کو چاہئے کہ کچھ نہ لے اور طلاق دیدے ورنہ عند اللہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی محمود عفی عنہ

بیوی کا خلع نامہ تحریر کرنا:

خلع نامہ اہلیہ تحریر کر کے روانہ کردے تو خلع ہوگیا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر زوج اس خلع کو منظور کرے گا تو درست ہوجائے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خون میں عارضہ کی وجہ سے خلع لینا:

زید کو فساد خون کے عارضہ کی شروعات دس ۱۰ سال قبل ہوئی، پانچ سال قبل شادی ہوئی، شادی کے وقت خون میں حدت کم تھی، شادی کے دو ۲ سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جو کہ اب تین سال کی ہے، زید کی بیوی بظاہر زید سے خوش ہے اور آپسی تعلقات اچھے ہیں خون کی حدت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، علاج وپرہیز میں زید لاپرواہی برتتا ہے، کیا ایسی حالت

۱- ''ان کان النشوز من قبل الزوج فلا یحل له اخذ شئ من العوض علی الخلع وهذا فی حکم الدیانة'' (الفتاوی الہندیہ ۱/۴۸۸، دارالکتاب دیوبند) ''فجملة الکلام فیه ان النشوز ...... فان کان من قبل الزوج فلا یحل له اخذ شئ من العوض علی الخلع لقوله تعالیٰ: وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئا'' (سورۃ النساء آیت ۲۰، بدائع الصنائع ۳/۵۲۳، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲- ''لحدیث ابن ماجه قوله :الطلاق لمن اخذ بالساق، کنایة عن ملک المتعة'' (شامی ۲/۵۸۵، مطبوعہ عثمانیہ)۔

میں زید کی بیوی زید سے خلع لینے کی حق دار ہے؟

جمیل احمد (ریٹائر پولس سی، آئی، ڈی، محلہ گوپلا غ لکھیم پور یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر فساد خون کی وجہ سے جسم کی شکل وصورت اس طرح نہیں بگڑ گئی ہے، جس سے وحشت ونفرت ہوتی ہو یا اس کو ازدواجی زندگی حاصل نہ ہوتی ہو تو عورت کو خلع لینے کا اختیار نہ ہوگا وہ اس کی حق دار نہ ہوگی، ہاں اگر جسم کی شکل وصورت اس طرح بگڑ گئی ہو کہ وحشت ونفرت ہوتی ہو یا وہ ازدواجی زندگی کے لائق نہ رہ گیا ہو تو اس وقت شرعی کمیٹی میں سب حال رکھے تب جا کر تفریق شرعی حاصل کرنے کی درخواست کرنے کا حق ہو جائے گا اور پھر شرعی کمیٹی اپنی تحقیق وتفتیش کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق جو حکم دے گی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- "فی الکنز: (ولم یخیر أحدهما بعیب) قال شارحه: أطلق العیب فشمل الجذام والبرص والجنون والرتق والقرن وخالف الشافعي ومالک وأحمدُ في هذه الخمسة، وخالف محمدٌ في الثلاثة الأول إذا کانت بالزوج فتخیر المرأة بخلاف ما إذا کانت بها فلا یخیر لقدرته علی دفع الضرر عن نفسه بالطلاق دونها، ......ولقد کتبنا في القواعد الفقهیة في مذهب الحنفیة أن القاضي لو قضی برد أحد الزوجین بعیب نفذ قضاءه" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق کتاب الطلاق باب العنین وغیرہ ۴/ ۱۳- ۲۱۴، مکتبہ زکریا، وقال فی منحۃ الخالق علی البحر الرائق "أي القاضي المجتهد أو المقلد لمن یقول بذلک کما لا یخفی" ۴/ ۲۱۳)۔

باب اللعان

لعان کے لئے دارالاسلام شرط ہے:

شمس الدین تحصیل راجوری نے اپنے ماموں کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور وہ بطور منتبنہ کے ماموں کے ساتھ رہنا شروع کیا، شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں دو تین سال کے بعد جب لڑکی بیگمات زوجہ کو مدت حمل ظاہر ہوئی تو اس کے خاوند نے شکایت کی کہ یہ حمل جو کہ مسماۃ کو ہے اس کے خاوند کا نہیں ہے، بلکہ اس کے راجوری گوجر کے ساتھ ناجائز تعلق ہے اور یہ حمل بھی اسی کا ہے جب لڑکی کو حمل وضع ہوا تو لڑکی پیدا ہوتی ہے جس کی عمر دو سال کی ہو چکی ہے، اب دوسرے شخص کے ساتھ تہمت لگاتا ہے اگر ثبوت کے لئے کہا گیا ہے تو ثبوت پیش نہیں کرتا ہے بلا ثبوت ہے۔ دریافت ہے کہ اس صورت سے دونوں میاں بیوی کے تعلقات میں کوئی خلل تو نہیں آیا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی صورت میں شوہر اپنی بیوی سے پیدا شدہ بچہ کا اپنی اولاد کہنے سے انکار کرے یا اپنی بیوی کو زنا کی تہمت لگائے اور شرعی گواہ زنا کا پیش نہ کر سکے تو شرعاً لعان واجب ہوتا ہے مگر بھارت میں شرعی حکومت نہیں ہے کہ لعان جاری کیا جا سکے۔ لعان جاری کرنے کا حق محض حکومت اسلامی کو ہوتا ہے اور کسی کو نہیں ہوتا ہے، **"و أهله من هو أهل للشهادة على المسلم فمن قذف بصريح الزنا في دار الإسلام"(۱)، "قوله في دار الإسلام أخرج دار الحرب لانقطاع الولاية"(۲)**۔

پس ایسی صورت میں اگر شوہر کے نزدیک زنا کا واقعہ صحیح ہے اور عورت اس کے قابو کی نہیں ہے تو شوہر اس کو طلاق دے کر آزاد کر سکتا ہے اور اگر واقعہ صحیح نہیں ہے تو عورت کی برائت کرے اور اس کا حق ادا کرے اور آئندہ ایسی کوئی بات نہ

۱- الدر المختار۔

۲- رد المحتار ۵/۱۵۱۔

کرے جس سے عورت کی آبرو پر دھبہ آئے۔ اور عورت پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق رہے، خالہ زاد، ماموں زاد بھائیوں سے اور ہر اجنبی مرد سے پردہ شرعاً واجب ہے یہ سب خرابی پردہ شرعی نہ کرنے کی وجہ سے ہے عزت بھی جارہی ہے آبرو بھی رخصت ہورہی ہے، خلاصہ یہ نکلا کہ شوہر یا تو تہمت بازی ختم کر کے انسانیت کے ساتھ بیوی کے ساتھ رہے یا طلاق دے کر علیحدگی اختیار کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

باب ثبوت النسب والنفقہ

زنا سے پیدا شدہ بچی کا نسب:

مسماۃ شہر بانو سے محمد سلیمان نے زنا کیا اور اس زنا سے شہر بانو کے حمل رہ گیا ہے، جب چند مہینے کے بعد یہ بات پنچایت کے لوگوں نے جمع ہو کر سلیمان اور شہر بانو کو بلا کر دریافت کیا تو دونوں نے زنا اور حمل کا اقرار کیا تب پنچایت نے سلیمان پر حد شرعی جاری کیا اور وضع حمل بعد شہر بانو پر بھی حد شرعی جاری کیا اور اس سلیمان کے ساتھ شہر بانو کا نکاح کرا دیا ہے، اب اس متولدہ بچی جو سلیمان کے زنا کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اس کو حرامی کہنا درست ہے یا کہ نہیں اور بچی کا نسب ٹھیک ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بچہ کا نسب تو ٹھیک نہیں ہے البتہ قصور زانی اور زانیہ کا ہے بچے کو کوئی ایسا لفظ نہیں کہنا چاہیے جس سے اس کو تکلیف یا اس کی توہین ہو اور اس کہنے سے اس کو تکلیف ہوگی نہیں کہنا چاہیے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۰/۸/۲۴ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

نفقہ مطلقہ کے بارے میں حکم شرعی:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ اجلاس منعقدہ ایسٹرن کورٹ نئی دہلی مؤرخہ ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء میں یہ طے

۱- ''عن المعرور قال لقيت اباذر بالربذة وعليه حلة وعلى غلامه حلة فسئلته عن ذالك فقال إني ساببت رجلا فعيرته بامه فقال لي النبي ﷺ يا أبا ذر أعيرته بامه انك امرؤ فيك جاهلية الخ'' (بخاری شریف ۹/۱)۔

کیا گیا ہے کہ سپریم کورٹ میں نفقہ مطلقہ (متعلق دفعہ ۱۲۵ سی، آر، پی، سی) کے متعلق جو اپیل زیر سماعت ہے، اس میں بورڈ بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرے اور اپنے وکلاء کے ذریعہ سپریم کورٹ کے سامنے معاملہ کی قانونی اور فقہی حیثیت کی وضاحت کرے۔

نفقہ مطلقہ کا پس منظر یہ ہے کہ چند سال قبل پارلیامنٹ میں ایک بل پیش ہوا تھا۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر کسی شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی تو بیوی کو اس وقت تک نفقہ دینا ہوگا جب تک کہ اس کا دوسرا نکاح نہ ہوجائے، یا پھر اس کا انتقال نہ ہوجائے، مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داران سے گفت وشنید کی اور قانون میں بڑی حد تک ترمیم کرائی گئی، اس ترمیم کے بعد قانون کا یہ مفاد رہا کہ اگر شوہر دین مہر، واجبات عدت ادا کرے تو پھر بیوی کو کچھ اور دینا نہیں ہوگا۔

لیکن مختلف کورٹس کے فیصلوں نے پارلیامنٹ کے طے کئے ہوئے قانونی منشاء کو متاثر کردیا اور خاص طور پر مسٹر جسٹس کرشنا ایر کے فیصلے نے قانون کی شکل ہی بدل دی، ان کے فیصلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر اگر طلاق دے دے تو بیوی کو تا حیات نفقہ دینا ہوگا۔ ہاں اگر بیوی دوسرا نکاح کرلے تو نکاح ثانی کے بعد طلاق دینے والے کو نفقہ نہیں دینا پڑے گا۔

یہ فیصلہ فقہ اسلامی کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگوں میں علماء کرام نے اسے واضح طور پر شریعت مطہرہ کے خلاف قرار دیا ہے، لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے پورے ملک کی فضا کو متاثر کردیا ہے اور زیریں عدالتیں سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی پابند ہوچکی ہیں، اب سپریم کورٹ کی فل بنچ کے سامنے ایک مقدمہ درپیش ہے جس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس اہم کام کی دو جہتیں ہیں: ایک قانونی چارہ جوئی، دوسرے فقہی مواد فراہم کرنا، دونوں کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیٹی بنائی گئی ہیں، فقہی مواد فراہم کرنے والی کمیٹی کا رکن بورڈ نے آپ کو بنایا ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اس کمیٹی کا رکن بننا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے اور اپنی منظوری سے مجھے مطلع فرمائیں گے۔

براہ کرم آپ پہلی فرصت میں مسئلہ کے پہلوؤں کا جائزہ لیں اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے ایسا مواد فراہم کریں جس سے یہ بات ثابت ہو کہ مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری طلاق دینے والے پر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی مدت کیا ہے اور اس مخصوص مدت کے خاتمہ کے بعد نفقہ کی ذمہ داری شوہر سے کیوں ختم کردی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ جلدی ایک مدلل تحریر مرتب کرکے آپ مذکورہ فقہی کمیٹی کے کنوینر، جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی، قاضی امارت شرعیہ پھلواری

شریف پٹنہ کے پتہ پر ارسال فرمائیں گے۔ والسلام

منت اللہ (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ۸/ دسمبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وبالله التوفيق:

پیش نظر مسئلہ کی وضاحت کے لئے پہلے چند باتوں کا ذہن نشیں کرلینا ضروری ہے: پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں کی عزت وآبرو اور نفس وعظمت کی حفاظت بے حد پسند ومطلوب ہے، اس بنا پر شرع وشارع علیہ السلام کا منشاء یہ ہے کہ کوئی عاقل بالغ مرد وعورت بغیر شرعی وجہ کے بغیر نکاح کے نہ رہے، یا اخراجات بہت بڑھ جانے کے خطرے کے سبب عموماً انسان غربت وتنگدستی کی وجہ سے نکاح سے گریز کرتا ہے، حالانکہ نکاح صحیح سے رزق بڑھتا ہے۔ رزق میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں نکاح کی ترغیب کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے: "اطلبوا الرزق من الباع" (۱) اور اسی غلط خیال کو رد کرنے کے لئے نکاح سے رزق میں تنگی ہوگی۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے: "**وانكحوا الايامى منكم والصالحين من عبادكم وامائكم إن يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله**" (۲) اور اسی سے بہت سے مسائل متفرع ہیں۔ مثلاً:

- اولاد (لڑکا ولڑکی) جب بالغ ہوجائیں تو جلد سے جلد کسی مناسب جگہ ان کا نکاح کردینا چاہئے، تاکہ بے نکاح کے نہ رہیں۔
- جب تفریق یا طلاق واقع ہوجائے یا عورت بیوہ ہوجائے تو بغیر وجہ شرعی کے دوسرے نکاح میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔
- جب بغیر نکاح مجرد زندگی گزارنے سے مرد کو زنا کا خطرہ ہو یا عورت کو اپنی عصمت دری کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں نکاح کرلینا شرعاً واجب ہوجاتا ہے۔
- نکاح کی وجہ سے چونکہ عورت اپنے نفس وعزت کو شوہر کے حوالہ کردیتی ہے، اس کے شوہر پر عورت کا نان ونفقہ وسکنیٰ سب حسب حیثیت واجب وضروری ہوجاتا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "**لينفق ذو سعة من سعته**" (۳) اور

۱- کنز العمال۔

۲- سورۂ نور: ۳۲۔

۳- سورۂ طلاق: ۷۔

ایک مقام پر ارشاد ہے: ''**وعلى الموسع قدره وعلى المقتر قدره** " (۱)، اسی طرح کی اور بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں صراحت ہے کہ نکاح کی وجہ سے عورت کا نفقہ مرد پر شرعاً واجب ہوجاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کے امر مقصود میں محبوس ہوجاتی ہے اور عقلی قاعدہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اپنے غیر کے حق مقصود میں محبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی شخص کے ذمہ ہوجاتا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے: ''**لأن النفقة جزاء الاحتباس، وكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه**" (۲)۔

لیکن بطریق امر تعبدی وعبادات کے کمانی الہدایہ فی باب النفقہ مطلقہ جب نابالغہ مشتہاۃ ہو، یا آئسہ ہو یا حاملہ ہو، یا غیر حاملہ ہو عدت گزارنا واجب ہوتا ہے: **لقوله تعالىٰ: "والمطلقات يتربصن بانفسهن ثلاثة قروء"** (۳) **ولقوله تعالىٰ: "واللائي يئسن من المحيض من نسائكم ان ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر واللائي لم يحضن، وأولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن"** (۴) **ولقوله تعالىٰ: "وان كن اولات حمل فانفقوا عليهن حتى يضعن حملهن"** (۵) اور چونکہ زمانہ عدت میں ممکن ہے کہ رحم مطلقہ شوہر کے حمل سے مشغول ہو اور اس صورت میں صیانۃ نسب اور اختلاط ماء سے حفاظت کی خاطر مطلقہ کا احتباس ملحق الزوج ہونا ظاہر ہے، اس لئے احتباس کی وجہ سے ان مطلقات کا نفقہ بھی زمانہ عدت کا شوہر پر واجب رہتا ہے۔ اور بعد ختم عدت یہ تعلق احتباس بھی بالکلیہ ختم ہوجاتا ہے، اس لئے وجوب نفقہ بھی بالکلیہ ختم ہوکر اصلی حکم کہ بس بالغ مرد یا عورت کو بغیر عذر شرعی کے بلا تعلق نکاح نہ رہنا چاہئے، نہ کہ نفقہ کا وجوب بذمہ شوہر تا نکاح ثانی مطلقہ یا تا حیات مطلقہ باقی رہے گا۔

یہ حکم سراسر منشاء شرع وشارع علیہ السلام کے خلاف اور متضاد ہوگا۔ جو شرعاً کسی طرح جائز ودرست نہ ہوگا۔ اور آیت کریمہ: ''**وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين**" (۶) سے مدعا مذکور کہ مطلقہ کو تا حیات یا تا نکاح ثانی نفقہ کا وجوب ہونا ثابت نہیں کرسکتے، اس لئے کہ "**متاع بالمعروف**" قرآن پاک میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے۔ ان سب

۱- سورۂ بقرۃ: ۲۳۶۔
۲- ہدایہ ۲/ ۴۷۵ کتاب الطلاق۔
۳- سورۂ بقرۃ: ۲۲۸۔
۴- سورۂ طلاق: ۴۔
۵- سورۂ طلاق: ۶۔
۶- سورۂ بقرۃ: ۲۴۱۔

پر اوران کے متعلق روایت مرویہ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ متاع بالمعروف سے مرادضابطہ شرعیہ کے مطابق ایک متعین ومعلوم المقدار مال کا دیدینا ہے۔

جو کبھی متعہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور کبھی مہر مسمّٰی سے اور کبھی نصف مہر مسمّٰی سے اور کبھی مہر مثل سے اور کبھی عدت کے اندر نفقہ متوسطہ سے مراد ہوتا ہے اور بس، ان مرادوں سے تجاوز کرنا یا ان کے علاوہ مراد لینا تفسیر بالرائے کے حکم میں ہوکر ممنوع وناجائز ہوگا، اس لئے کہ تفسیر بالرائے ناجائز ہے اور گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے اور اس پر مفسرین اور محققین سلف وخلف کا اجماع ہے۔

چنانچہ احکام القرآن للجصاص میں آیت کریمہ: "**والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا**" کے تحت مذکور ہے: "**ومما يدل على أن المتعة غير واجبة مع المهر اتفاق الجميع على أنه ليس لها المطالبة بها قبل الطلاق، فلو كانت المتعة تجب مع المهر بعد الطلاق لوجبت قبل الطلاق وفي ذالك دليل على امتناع وجوب المتعة والمهر (اى معا)**" (۱)۔

اور اس کی تائید فتح القدیر شرح ہدایہ کی اس عبارت: "**المتعة أربعة اقسام (الى قوله) ليست بواجب ولاسنة ولا مستحب وهي التي طلقها قبل الدخول بها وقد سمي لها مهرا، لأن نصف المهر ثابت لها فيقوم مقام المتعة**" (۲) سے بھی ہوتی ہے۔

غرض نفقہ مطلقہ کو تا حیات یا تا نکاح ثانی واجب قرار دے دینا قطعاً جائز نہ ہوگا بلکہ صریح مداخلت فی الدین ہوگی اور کھلا ہوا ظلم ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۳/۱۴۰۴ھ

مطلقہ کو نفقہ کب تک ملے گا:

سوال: **وهذا معلوم لكل واحد من أبناء الهند ان الحكومة الهندية قد جاءت بقرار يلزم فيه رجال المسلمين الذين طلقوا نساء هم على نفقتهن حتى تزوجهن رجال آخرون أوتو فهن الله تعالىٰ، فإن**

۱- احکام القرآن للجصاص ۱/۴۳۲۔
۲- فتح القدیر ۱/۳۴۸۔

من القضاة في أنحاء البلادقد حكموا على الرجال الذين طلقوهن على نفقتهن حتى تزوجهن الآخرون، وإن أصواتكم ايها الاستاذ الفاضل واستنكاراتكم قد سمعنا ها بآذاننا العارية، ولكن اذان الحكومة مازالت مما حتى هذه اللحظة الاخيرة، وبعض الرجال الذين حكم عليهم بنفقة المطلقات قد رفعواالاستيناف الى المحكمة العالية مدعين ان هذا الحكم مخالف لأحكام شريعة الاسلام وحتى لدستورالهند، وهم يجتهدون كل الاجتهاد على حصول من المحكمة العالية ضد هذهم القراء ويعتنون غاية الاعتناء بجمع الفتاوىٰ من مختلف أنحاء العالم الاسلام فنرجوا فضيلتكم ان ترسلون فتوىٰ على هذه الأقضية (في اللغة الانكليزية) نرفعها أمام محكمة العالية. ومن الأسف أن بعض محامين المسلمين بالهندى يدعون أن القرآن الكريم لايخالف هذا القرار مستدلين إلى الأية الواردة في سورة البقرة: "وعلى المطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين" وهذه فرصة ذهبية لرفع اصواتنا واستنكار اتنا ضد هذا القرار الضال، فإن الا نتخاب إلى مجالس النواب والبرلمان قد قرب، فإنا نرفع أصواتنا من كل أنحاء البلد في هذه الفرصة، فتفوضوء بلا إقرار. والسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس فن سے اور جس فن کی اصطلاحات سے جس شخص کو پوری واقفیت نہ ہو اور اس نے اس فن کو اور اس کی اصطلاحات کو اس فن کے جاننے والوں سے اور اساتذہ سے باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، اس کو اس فن میں بحث کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ اگر بحث کرے گا تو فقط یہی نہیں کہ وہ بحث غیر مفید وغیر معتبر ہوگی، بلکہ بسا اوقات اس فن پر افترا اور اس کی تخریب میں سعی کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد کا سبب بن جائے گا۔

مثلاً لاء (قانون) اور اس کی اصطلاحات کو جس شخص نے قانون (لاء) کے ماہرین اساتذہ سے باقاعدہ سمجھ کر پوری مناسبت واستعداد حاصل نہ کی ہو اس کو قانون کی کسی دفعہ پر نقد وتبصرہ کرنے کا اور قانونی بحث کرنے کا حق واختیار نہ ہوگا، ورنہ مقصد قانون ہی فوت ہو جائے گا، بلکہ بسا اوقات نہایت خراب اور مہلک نتائج نکل آئیں گے۔ بالکل اسی طرح شریعت ایک مکمل قانون ہے اور اس کی بہت سی اصطلاحات ہیں اور اس کے خاص اصطلاحی معنی ومفہوم ہیں جس شخص نے ان قوانین و اصطلاحات اور اصطلاحی معانی ومفاہیم کو ان قوانین کے اور اصطلاحات کے جاننے والے اساتذہ وماہرین وعالمین سے

با قاعدہ حاصل نہ کیا ہو، ان سے پوری مناسبت واستعداد نہ پیدا کرلی ہو، اس کو قوانین شریعت اور اس کی اصطلاحات میں بحث کرنے کا حق نہ ہوگا، اگر کرے گا تو وہ بسا اوقات شریعت مقدسہ پر افترا کرنے کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد رونما کرنے کا سبب بن کر پوری امت کی ہلاکت وتباہی کا بھی سبب ہو سکے گا، مسئلہ زیر بحث بھی اسی نوع کا ہے، آیت کریمہ "**وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين**" (۱) کا تعلق اس حکم سے بالکل نہیں ہے کہ مطلقہ کو اس کی تا حیات یا تا نکاح ثانی منجانب طلاق دہندہ نفقہ دیا جائے، اگر ایسا کیا گیا تو دین الٰہی پر افترا ہوگا اور نہایت مہذب طریقہ سے اور نہایت ہوشیاری سے دین حنیف میں اور دین الٰہی میں تخریب کاری کی سعی کے مترادف ہوگا۔

اس لئے کہ نصوص کی روشنی میں اور نصوص کی مدد سے "**المطلقات**" میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کے مہر مقرر نہ ہوئے ہوں اور ان کے شوہروں نے تعلق زن وشوئی سے قبل ہی طلاق دیدی ہو، نہ کہ ساری مطلقہ عورتیں مراد ہوں۔ اور "متاع" سے ایسی ہی عورتوں کے مہر مثل سے نصف کے اندر کی مقدار مراد ہے۔ یہ عورت کے حسب حال بشکل نقد یا بشکل سامان ہو، نہ کہ ان کی تا حیات یا تا نکاح ثانی کا پورا خرچ مراد ہو اور اگر "**المطلقات**" میں "الف لام" عام رکھا جائے، عہد کا نہ لیا جائے تو "متاع" سے مراد محض عدت مقررہ متعینہ کا نفقہ ہے، نہ کہ ان کی تا حیات یا تا نکاح ثانی کا نفقہ۔ **هكذا يؤخذ من الروح** (۴۴/۲) اور قرآن پاک میں ہے: "**أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن، وإن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن**" (۲) حاملہ عورت کی عدت، خواہ وہ مطلقہ کیوں نہ ہو وضع حمل منصوص ہے۔ اور جنین کا جزو شوہر ہونا ظاہر ہے اور اسی وجہ سے پیدا ہونے کے بعد اس کا نفقہ حضانت بھی بذمہ مولود لہٗ ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود آیت نے اس مطلقہ کو محض زمانہ مدتِ حمل تک کا ہی نفقہ دیا ہے، یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جب حاملہ کو بھی زمانہ عدت ہی تک کے نفقہ کا استحقاق ہے تو غیر حاملہ کو بدرجہ اولیٰ زمانہ عدت کے بعد کے نفقہ کا استحقاق نہ ہوگا۔ پھر ان تمام تصریحات وتعینات شرعیہ کے خلاف متاع مطلقہ کے دوسرے معنی ومصداق کو ظاہر کر کے محض اس کو حکم شرعی قرار دینا ظاہر ہے کہ ناجائز رہے گا۔ اور دیدہ ودانستہ ایسا کرنا یا تو تخریب فی الدین کی سعی کے مترادف ہوگا یا افترا علی الشرع ہوگا۔

اس لئے صورت مسئولہ کے مطابق فیصلہ کر کے عورت کے نکاح ثانی یا تا حیات نفقہ کے لازم کرنے کا قانون بنانا

۱- سورۂ بقرہ: ۲۴۱۔

۲- سورۂ طلاق: ۶۔

بلا شبہ نا جائز اور مداخلت فی الدین ہوگا، اور کسی طرح جائز نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۳/۹۵ ۱۳ھ

منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہوگا:

کوثر کو جب کہ بانو بہت چھوٹی تھی طلاق ہوگئی تھی اور بتایا تو یہ جاتا ہے کہ کوثر کے خاوند کے کسی طوائف سے نکاح کر لینے کے باعث کوثر کی پھوپی فاطمہ نے کوثر کو طلاق دلوا کر اپنے پاس رکھ کر پالا اور سہارا دیا ہے، مگر زید کو شک ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں، بلکہ دوسرا ہے وہ یہ کہ زید کے ماموں راشد نے اپنے کسی ہندو دوست کے لڑکے موہن کی بچپن سے پرورش کی ہے اور موہن وکوثر ہم عمر ہونے کے ناطے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور موہن نے ۳۸ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود نہ تو ابھی تک شادی کی ہے، نہ وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن سے ملنے جاتا ہے اور اپنی تمام کمائی کوثر اور اس کی لڑکی بانو اور راشد کے اوپر خرچ کرتا ہے۔ آج اس دور میں بنا کسی لالچ یہ سب کرنا ناممکن ہے۔ لہذا زید کو شک ہے کہ موہن کے کوثر سے ناجائز تعلقات ہیں اور بانو ان کی ناجائز اولاد ہے، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زید نے موہن اور کوثر کی باہمی گفتگو کے دوران ایک دوسرے کو بہن یا بھائی کے القاب سے مخاطب ہوتے سنا ہے۔

اگر زید کا شک واقعی درست ہے اور بانو حقیقت میں کوثر اور موہن کی ناجائز اولاد ہے تو ایسی صورت میں زید کا بانو سے نکاح درست ہے کہ نہیں؟ کوثر ایک مسلمان کے موہن ایک ہندو سے ناجائز تعلقات کی بناء پر حرام اولاد سے نکاح کرنے کی صورت میں اس بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد پر شریعت کا کیا حکم ہوتا ہے؟ کیا آگے چل کر بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد بھی ناجائز ہوگی، مفصل حوالہ کے ساتھ جواب عنایت ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ان مذکورہ باتوں اور الزامات کو تسلیم بھی کر لیا جائے، بلکہ اگر واقعی ایسا ہو بھی گیا ہو تو جب بھی یہ نکاح ناجائز یا مکروہ نہ کہا جائے گا اور جب کوثر کو طلاق ہونے سے قبل ہی بانو پیدا ہو چکی تھی تو بانو کو کسی حال میں حرامی وغیرہ کہنا یا سمجھنا بھی ناجائز اور حرام اور سخت گناہ ہوگا۔ البتہ کوثر کا موہن کے سامنے بے پردہ ہونا اور اسی طرح بے تکلف رہنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، کوثر کی ماں اور کنبہ وخاندان کے سارے ہی افراد حسب استطاعت اس عمل سے نہ روکنے پر عند اللہ ماخوذ ہوں گے، اور

ان سب پر شرعاً حسب استطاعت لازم ہے کہ پردہ کرائیں یا پھر شرعی جواز کی صورت سوچیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۹۸ ۱۳ھ

جنات کا سلسلہ نسب:

انسانوں کا سلسلہ آدمؑ وحواؑ سے شروع ہوا، جنات کا شجرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ جنات کس قسم کے گناہ کرتے ہیں؟ ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ جنوں کے اور کتنے رسول ہوئے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جنات کا شجرہ ابوالجن سے شروع ہے، اس میں اگر چہ اختلاف ہے کہ وہ ابوالجن کون ہے؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابلیس ہی ہے اور مسئلہ چونکہ موقوف علیہ نجات نہیں ہے اور نہ عقیدہ ضروریہ سے متعلق ہے، اس لئے یہ اختلاف مضر نہیں۔ گناہ نام ہے حکم خداوندی کی نافرمانی کا، اور یہ مفہوم حکم کے خلاف کرنے سے آجائے گا، لہٰذا یہ سوال بے محل ہے، ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ کتنے رسول ان میں اور ہوئے اس کی تحدید منقول ومصرح نہیں۔ اور موقوف علیہ نجات نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بتلانا اور جاننا بھی ضروری نہیں، بلکہ اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول ان کی ہدایت کے لئے مناسب قرار دیئے بھیجے، ان میں ہمارے رسول ﷺ ضرور شامل ہیں اور سب سے افضل ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

كتاب الوقف
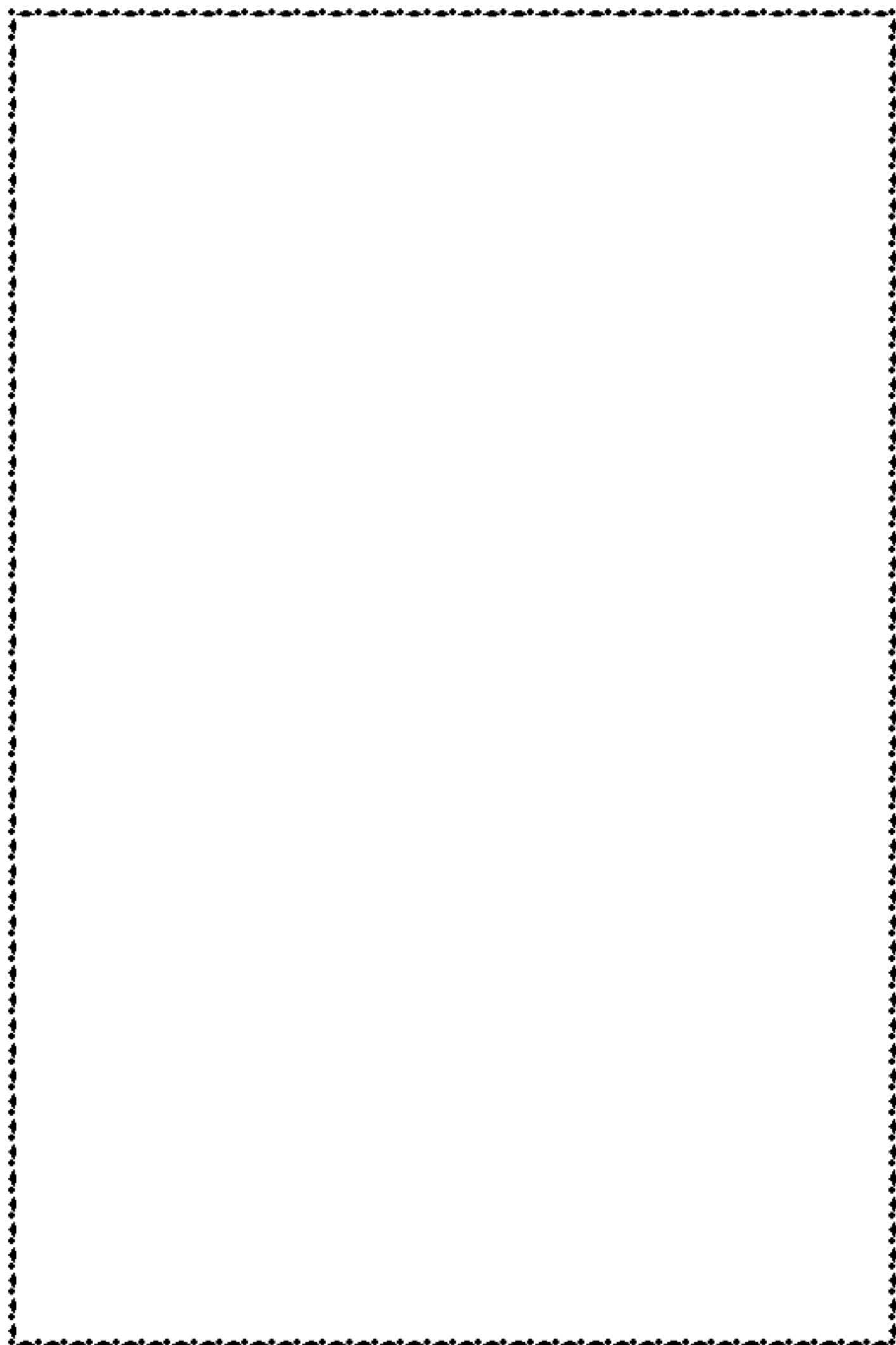
کتاب الوقف

موقوفہ جائداد علی الاولاد کے وقف کو ختم کر کے تقسیم کرنا درست نہیں ہے:

ہندہ مرحومہ نے ایک جائداد وقف علی الاولاد مندرجہ ذیل شجرہ اولاد پر وقف کی، اس کی تقسیم از روئے شرع کس طرح ہونی چاہئے؟ وقف کردہ جائداد کا وقف ختم کر کے تقسیم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر تقسیم ہو سکتی ہے تو مندرجہ ذیل شجرہ پر تقسیم سے از روئے شرع مطلع فرمائیں!

ہندہ خاتون

میت

ابن	ابن	بنت	بنت
محمد جان	محمد ادریس	محمد نساء	رحمت بی

۱- محمد نساء کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ لاولد انتقال کر گئی۔

۲- محمد ادریس کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور وہ بھی لاولد انتقال کر گئے، ان دونوں بھائی بہن کا حصہ بروئے شرع کس کو پہنچتا ہے؟

۳- رحمت بی کو وقف کردہ جائداد سے بروئے شرع کس قدر حصہ پہنچتا ہے؟

مجیب الرحمٰن منصور پوری (فراشخانہ دہلی)

الجواب وبالله التوفيق:

جائداد وقف کرنے کے بعد اس کو تقسیم کرنا درست نہیں (۱)، البتہ وقف کردہ جائداد کی آمدنی موقوف علیہم پر واقف

۱- ’’وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالىٰ، وصرف منفعتها على من أحب ولو غنيا فيلزم، فلا يجوز له

کے ترکے کے مطابق تقسیم ہوگی۔

مذکورہ موقوفہ جائداد کی آمدنی کی تقسیم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر واقفہ نے اولاد پر بغیر ان کے نام ذکر کیے ہوئے وقف کی ہو تو اس کی پوری آمدنی واقفہ کی شرط کے مطابق محمد جان اور رحمت بی کے درمیان تقسیم ہوگی۔

یعنی اگر برابر برابر پانے کی شرط ہو تو برابر برابر حصہ ملے گا اور اگر حصوں میں تفاوت رکھا تھا تو اس کے اعتبار سے ان دونوں میں سے ہر ایک کو حصہ ملے گا (۱)۔

اور اگر چاروں میں سے ہر ایک کا نام لے کر وقف کیا ہو تو انتقال کر جانے والے موقوف علیہم کا حصہ فقراء کو ملے گا اور باقی آمدنی واقفہ کی شرط کے مطابق محمد جان اور مسماۃ رحمت بی کے درمیان تقسیم ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

۱-واقف کے شرط کی رعایت ضروری ہے:

اگر واقف نے یہ متعین کردیا ہو کہ میرے روپے سے فلاں آدمی اس مدرسہ کو چلائے گا، اب اگر کسی دوسرے آدمی نے اس کو چلایا واقف کے روپے سے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲-وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے:

وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس میں سے لڑکے اور لڑکی کو یکساں حصہ ملے گا یا کچھ فرق ہے؟

محمد ابراہیم بن محمد صالح افریقی

إبطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوى. قال الشامي تحت قوله على حكم ملك الله: لعبر لفظ حكم ليفيد أن المراد أنه لم يبق على ملك الواقف ولا انتقل إلى ملك غيره، بل صار على حكم ملك الله تعالى الذي لا ملك فيه لأحد سواه، وإلا فالكل ملك الله تعالى" (ردالمحتار ۵۸/ ۳/ ۳ کتاب الوقف) (مرتب)۔

۱- "وتقسم بينهم بالسوية إن لم يرتب البطون وإن قال للذكر كالأنثيين فكما قال" (الدرالمختار علی حاشیہ ۴۳۸/ ۳ کتاب الوقف)۔

۲- "ولو قال: على أولادي ولكن سماهم فمات أحدهم صرف نصيبه للفقراء" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۶/ ۱۹۸، بیروت)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر واقف نے معین کردیا ہو کہ میرے روپے سے فلاں ہی شخص اس مدرسہ کو چلائے گا تو جب تک وہ فلاں شخص زندہ رہے گا اور اس سے مالی خیانت نہ ہوگی، اس وقت تک وہی شخص اس روپے سے مدرسہ چلانے کا حقدار رہے گا۔

البتہ جب وہ شخص انتقال کر جائے گا یا اس سے مالی خیانت ثابت ہوگی تو واقف کی اجازت سے دوسرے شخص کو مدرسہ چلانے کا حق ہوجائے گا۔ اور اگر واقف مر چکا ہو تو وقف کی حفاظت اور اس کو باقی رکھنے کی غرض سے شرائط کے مطابق دوسرے دین دار اور مناسب شخص کو یہ حق ہوجائے گا (۱)۔

اس سوال کا کہ وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس میں سے لڑکا اور لڑکی کو یکساں حصہ ملے گا یا کچھ فرق ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء میں اختلاف ہے، بعض فقہاء مثل ہبہ کے مساوات کے قائل ہیں اور بعض فقہاء بخلاف ہبہ کے وقف میں للذکر مثل حظ الانثیین کے قائل ہیں۔

علامہ شامیؒ نے "**مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، والعرف يصلح مخصصاً**" کے تحت ایک طویل ونفیس بحث کی ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر واقف خود زندہ ہو تو اسی سے دریافت کرلیا جائے اور جیسا وہ کہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے (۲)۔

اور اگر اس کا کوئی معمول بھی متعین اور واضح نہ ملے تو للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدے کے مطابق ہر لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر دیا جائے گا اور اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: "**فإذا أطلقها الواقف انصرفت إليها، إلى قوله، وفي جامع الفصولين: مطلق الكلام فيما بين الناس ينصرف إلى المتعارف**" (۳)۔

۱- "لأن شرط الواقف كنص الشارع" (الدرالمختار علی الشامی، ص ۴۱۶ کتاب الوقف)، "ولأن شرط الواقف معتبرة إذ الم يخالف الشرع" (الدرالمختار علی الشامی، ص ۴۱۶ ج ۴ کتاب الوقف)، "ولأن مراعاة غرض الواقفين واجبة والعرف يصلح مخصصاً" (علی حاشیہ الشامی، ص ۴۴۳ ج ۴ کتاب الوقف)۔

۲- وتقسم بينهم بالسوية إن لم يرتب البطون وإن قال: للذكر مثل حظ الأنثيين فكما قال (الدرالمختار مع الشامی ۴۳۸/۳ کتاب الوقف)۔

۳- فتاوی شامی ۴۴۳/۳ کتاب الوقف۔

اس بحث کو شامی میں اور تنقیح فتاوی حامدیہ میں اور فتاوی خیریہ میں، ص ۱۵۰ جلد اول پر بہت تفصیل سے نقل کیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۶/۱۴۰۱ھ

بھوپال کے بعض اوقاف کا شرعی حکم:

سابقہ ریاست بھوپال میں جو بیگمات کے زیر حکومت تھی فرماں روائے وقت سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ایک پروانہ بتاریخ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ جاری فرمایا، جس کی رو سے کچھ باغات ریاست کو وقف فرمائے تھے، پروانہ کی نقل شامل ہذا ہے، اس وقت ریاست کی جو رپورٹ سالانہ شائع ہوتی تھی اس کی دفعہ ۳۵ میں بھی اس کارروائی کی تصدیق کی گئی تھی، رپورٹ مذکور کا اقتباس متعلقہ بھی شامل ہے، اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس وقت کے نظام حکومت کے اعتبار سے۔

۱۔فرماں روائے وقت مختار کل اور ریاست کی جملہ املاک کا مالک کامل ہوتا ہے!

۲۔ریاست کے اندر جو اوقاف واقع تھے، ان کے متعلق قوانین واحکام وقف میں مرقوم تھا کہ تمام اوقاف شاہی (افراد خاندان شاہی کے قائم کردہ اوقاف) کی اور اوقاف عامہ دیگر اشخاص کے قائم کردہ اوقاف میں سے ان اوقاف کی جن کا کوئی متولی نہ ہو ریاست متولی ہوگی۔

۳۔سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ان کی جانشیں سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہوئیں اور انہوں نے ان میں سے ایک باغ موسومہ عیش باغ کو اپنے صاحب زادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو معافی دے دیا، اور ان کے بعد دوسرے صاحب زادے نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا، نواب صاحب موصوف نے جو بعد میں خود فرماں روا ہوگئے تھے اپنے حکم سے اپنے نام کرالیا، چنانچہ بعد میں کاغذات وہی میں یہ باغ نواب حمید اللہ خاں صاحب کے نام درج ہوا اور ابھی ان کی صاحب زادی کے نام درج ہے۔

ازراہ کرام مندرجہ ذیل امور کے متعلق روشنی ڈالی جائے کہ:

۱۔کیا ان دستاویزات کی رو سے جن کی نقول شامل ہذا ہیں، باغات مذکورہ بشمول عیش باغ دواماً وقف ہوگئے تھے؟

۲۔اس پروانہ (مورخہ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ) میں جس کی نقل شامل ہے نیابۃً وقف کیا جانا مذکور ہے کیا اس

عبارت سے دائمی وقف میں کوئی نقص واقع ہوگیا ہے؟

۳-کیافرماں روایانِ مابعد کے عمل سے جس کی تفصیل پیراگراف ۳ء مندرجہ بالا میں دی گئی ہے، وقف متاثر اور زائل ہوگیا ہے۔

الجوب وبالله التوفيق:

جب فرماں روایانِ حکومت بھوپال جملہ املاک ریاست کے مالک تھے، تو ان کے کسی وقف نامہ میں محض لفظِ نیابۃً واقع ہوجانے سے کسی وقف میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، بلکہ نیابتاً لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے ۱۲۸۰ھ کو فرحت باغ کو وقف کیا ہے، اسی طرح ان ہی کے نقشِ قدم نیابۃً میں سرکار شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے بھی ۱۳۰۲ھ میں نور باغ کو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے وقف کیا، اور عیش باغ کو نواب قدسیہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے وقف کیا۔

صرف فرق اتنا ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے بذریعہ وصیت ۱۲۸۰ھ میں اس وقف کا اظہار کیا ہے اور سرکار شاہجہاں مرحومہ نے بذریعہ پروانہ سرکاری حکم نامہ بابت ۱۳۰۲ھ میں وقف کیا ہے۔

لہٰذا سب صحیح و نافذ ہیں اور اس لفظ نیابۃً سے کوئی وقف زائل نہ ہوگا اور پھر سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے جو عیش باغ کو اپنے صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو یا ان کے بھائی نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا یا جناب نواب حمید اللہ خان صاحب نے اپنے دورِ فرماں روائی میں اپنی صاحبزادی کو دے دیا اگر چہ بنام معافی دیا ہے، مگر چونکہ حسبِ تصریح پروانہ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ بشمولہ مثل ۵ا مدِ مال دفتر ۔ باقاعدہ وقف مکمل و نافذ ہو چکا ہے، اس لیے اس لفظ معافی سے مراد تملیک یا ہبہ نہ ہوگا، بلکہ حسبِ ضابطۂ شرعیہ کلیہ کسی عاقل بالغ کا قول مہما امکن محل احسن پر محمول کرنا ضروری ہوتا ہے، شرح سیر کبیر للسرخسی۔

لہٰذا اس کی یہ توجیہ ہوگی کہ ان فرماں روایانِ وقف جناب سرکار سلطانِ جہاں بیگم و جناب نواب حمید اللہ خاں صاحب نے محض اپنا حق تولیت ان کے سپرد کیا ہے اور اپنا حق تولیت ان کے حق میں معاف کیا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے پہلے یہ حق جناب نصر اللہ خاں صاحب کو دیا، پھر ان سے لے کر یا ان کے بعد اسی حق

کو جناب حمید اللہ خاں صاحب کو دیا ہے، پس اگر اسی طرح دینے کو تملیک سمجھا یا اپنے کو عیش باغ کا مالک سمجھا یا اپنی صاحبزادی کو بطور تملیک وہبہ دیا تو یہ ان کی سمجھ کی غلطی تھی، مگر اس غلطی سے عیش باغ کا وقف ختم نہ ہوگا اور نہ اس میں فتور واقع ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ان کی غلطی بھی نہیں ہے۔

بہر حال اس صورت میں یہ وقف عیش باغ کا وقف قائم وصحیح رہے گا، صاحبزادی صاحبہ بھی متولیہ ہی شمار ہوں گی اور حقوق وفرائض تولیت ان پر بھی حسب شرائط وقف متوجہ ہوں گی اور بس!

اور ان فرمارویانِ وقف کا یہ دینا قریب ایسا ہی ہوا کہ جیسا باغ فدک جو پہلے سے وقف تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کو حضرت علیؓ کو دیا اور پھر حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو دیا اور یہ دینا تملیک وہبہ شمار نہ ہوا بلکہ بطریق تفویض وتولیت تھا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۵/۹۳ ۱۳ھ

ٹونک کے ایک وقف کا شرعی حکم:

ایک مسلمان نے اپنی غیر منقولہ جائداد وقف کر کے واضح طور پر اپنی نیت ظاہر کردی اور بتلا دیا کہ اس موقوفہ جائداد کی آمدنی سے میری تعمیر کردہ مساجد کے مصارف چلائے جائیں، کچھ حصہ دینی تعلیم پر صرف کیا جائے وغیرہ وغیرہ اور شروع سے اب تک اسی طرح صرف بھی ہورہے ہیں!

۱- تو کیا کبھی اس جائداد کی آمدنی کو کسی اور کام پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے، جو واقف کی نیت کے خلاف ہو؟

۲- جائداد موقوفہ جس کا حوالہ سوال ۱ میں دیا گیا ہے، وقف ہونے کے بعد اعلیٰ چیز میں تبدیل کردی گئی ہے، یا اس وقف کی پس انداز رقم سے نئی جائداد خرید لی گئی ہے، تو اس زائد آمدنی سے کوئی ایسا صرفہ کیا جاسکتا ہے جس کا وقف معلق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳- ایک غیر منقولہ جائداد وقف ہے، لیکن وقف نامہ نہیں ہے اور شروع سے اس جائداد کی آمدنی سے اس مسجد کے مصارف پورے کیے جارہے ہیں جو واقف جائیداد کے نام سے مشہور ہے۔

لیکن کیا ایسی جائداد کی آمدنی اس کام پر صرف ہوسکتی ہے جس پر اب تک کبھی کوئی صرفہ نہ کیا گیا ہو؟

۴- شہر ٹونک کی آبادی سے ملحقہ کھیت اور گورستان ہے، کسی گورستان کے قریب زرعی آراضی ہے، تو مالکِ کھیت

کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دھیرے دھیرے کورستان کا تھوڑا تھوڑا حصہ اپنے کھیت میں شامل کرلے، اور اگر کورستان کے قریب مکانات تعمیر ہوگئے ہیں تو مالکان مکانات کورستان کو اپنے استعمال میں لارہے ہیں اور ایک شرپسند طبقہ ایسا ہی ہے جو کورستان کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا اور مٹانے کی فکر میں ہے۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ کورستان کی حفاظت کس طرح ہو، قوم کی اس طرف توجہ نہیں ہے اور مقدمہ بازی کرنے کے لیے روپے نہیں ہیں، اگر کسی مسلمان وکیل کے پاس جائیں تو وہ پوری اجرت لیتا ہے اور اگر کسی امور کو ٹائپ کرائیں بھی تو پوری فیس دینی پڑتی ہے۔

غرضیکہ بغیر معاوضہ کوئی مسلمان کوئی کام نہیں کرتا تو شرعاً کورستان کی حفاظت کی ذمہ داری کس کی ہوسکتی ہے؟

مرزا مصطفیٰ بیگ (ریٹائرناظم مال ٹونک اسٹیٹ محلہ قافلہ راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-واقف نے جن جن مصارف کے لیے وقف کیا ہے جب تک ان مصارف کے لیے ضرورت باقی ہے یا آئندہ ضرورت متوقع ہے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا درست نہیں۔

ہاں جو آمدنی اس سے بھی زائد ہو اور رکھی رہنے میں ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہونے لگے تو مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے دوسرے اہم کار خیر میں صرف کر سکتے ہیں۔

۲-اگر وہ اعلیٰ چیز واعلیٰ مصرف واقف کے منشاء کے خلاف نہیں ہے تو یہ تبدیلی درست ہے ورنہ درست نہیں، اس وقف کی پس انداز رقم اگر ایسی زاید رقم ہے کہ جس کی ضرورت نہ تو اس وقت وقفِ مذکور میں ہے اور نہ آئندہ اس کی ضرورت متوقع ہے، تو اس زائد رقم سے کوئی جائداد خرید کر کسی دوسرے کار خیر میں وقف کی جاسکتی ہے، یا جواب ۱ کے مانند صرف کیا جا سکتا ہے جو عمل بھی مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے ہو۔

۳-وقف کے تحقق کے لیے وقف نامہ بھی تحریر کرنا ضروری نہیں ہے، وقف زبانی بھی متحقق وصحیح ہوجاتا ہے، پس واقف نے مسجد کے لیے وقف کردیا اور اس موقوفہ پر خرچ بھی کرنے لگا تو وقف متحقق ہوگیا اور اب اس کے خلاف دوسری جگہ پر خرچ کرنا درست نہیں ہوسکتا، منشاء واقف کی رعایت واجب ہوتی ہے۔

۴-جواب ۱ و ۲ میں ذکر کردہ ضابطہ کے مطابق اوقاف کی فاضل آمدنی سے کورستان کی حفاظت ومرمت کی

جاسکتی ہے، نیز جو قبرستان تدفین سے متروک ہو چکے ہوں یا قانوناً ان سے روک دیے گیے ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس میں دینی ضرورت کے مطابق مسجد یا دینی مدرسہ قائم کر کے یا اس کو کسی ایسے کار خیر میں استعمال کر کے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی واقتصادی تربیت وترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل واقفین کو ثواب پہنچتا رہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مال حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کا وقف کرنا:

مالیر کوٹلہ میں حسینہ نام کی ایک عورت کا مورخہ ۹ جون کو انتقال ہوگیا، یہ پہلے طوائف تھی پھر بتوفیق الٰہی تائب ہوگئی اور محمد شریف نامی ایک شخص سے نکاح کر کے باقی زندگی پاکیزگی کے ساتھ گذاری، محمد شریف کا چند دن پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

مسماۃ حسینہ نے اس زمانے میں جب وہ طائفہ تھی ایک مکان خرید اتھا اور اسی میں اس کی رہائش تھی، انتقال سے قبل اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنا مکان وغیرہ کار خیر یا مسجد کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے۔

مسماۃ حسینہ کا وارث پہلے خاوند سے اس کا ایک لڑکا شبیر عرف بیر و میرٹھ میں موجود ہے وہ اپنی خالہ کے پاس رہتا ہے، اس کی خالہ اور شبیر کی مرضی بھی یہی ہے کہ مسماۃ حسینہ مرحومہ کی خواہش کے مطابق کیا جائے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مسلک ہے کہ جو مال زانیہ اپنے کسب سے معاملہ طے کر کے حاصل کرے وہ حلال ہے اگر چہ عقد حرام تھا اور صاحبینؒ کے نزدیک حاصل کردہ مال بھی حرام ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مفتیٰ بہ قول کیا ہے؟

۲-مسماۃ مذکورہ کا وارث اس کا لڑکا اگر وقف کرے تو کیا یہ وقف صحیح ہو جائے گا؟ درمختار کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مورث کا مال وارث کے لیے بھی حرام رہے گا: "**لکن في المجتبیٰ: مات وکسبه حرام فالمیراث حلال، ثم قال: لانأخذ بهذه الروایة، وهو حرام مطلقا علی الورثة فتنبه**" رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (دارالافتاء مالیر کوٹلہ پنجاب)

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اصل جواب سمجھنے کے لیے ان باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے:

۱-یہ کہ مکان مذکورہ اس کو کسی زانی نے بسلسلہ زنا نہیں دیا ہے، بلکہ مرثیہ نے زنا کے پیسہ سے یا کسی اور طرح سے اس کو خریدا ہے۔

اگر مال حرام یا کسب زنا سے خریدا ہو تو یہ مال حرام ہے، اور اگر خریدنے کی تیسری یا چوتھی صورت ہے تو اس کا حکم خود مرثیہ کے حق میں یہ ہے کہ مفتی بہ قول میں واجب التصدق نہیں ہے کما دل علیہ هذه العبارة:

۱-''أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أو لا ثم اشترى منه بها''۔

۲-''أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها''۔

۳-''أو اشترىٰ قبل الدفع بها ودفع غيرها''۔

۴-''أو اشترىٰ مطلقا ودفع تلك الدراهم''۔

۵-''أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم ثم قال بعد بحثٍ طويل: وقال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة: يطيب إلىٰ قوله والفتوىٰ على قول الكرخي'' (۱)۔

بلکہ مفتیٰ بہ قول کے اس جملہ ''وفي الثلاث الاخيرة يطيب الخ'' سے مملوک حلال اور جائز الاستعمال معلوم ہوتا ہے اور جب مورث کے لیے مملوک حلال اور جائز الاستعمال ہوگا تو وارثین کے لیے بدرجہ اولیٰ مملوک حلال اور جائز الاستعمال رہے گا۔

۲-یہ مکان خود وارثین کا مکسوب حرام نہیں ہے بلکہ وراثت میں ملا ہے اور مورث کا بھی بعینہٖ مکسوب حرام نہیں ہے، بلکہ بیش از بیش مکسوب حرام کے ذریعہ سے خریدا ہوا ہے اور بعینہٖ مکسوب حرام وہ قیمتیں ہیں جو اس کی خرید میں دی گئیں اور ان قیمتوں کے مالک کا علم نہیں اور ایسی صورت کا حکم شامی (۴/ ۱۳۰) میں یہ لکھا ہوا ہے:

'' قوله: إلا في حق الوارث الخ فانه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه''۔

پس جب یہ صورت ہے تو مملوک بالوراثت ہونے میں اور اس کے وقف کر دینے کی صورت میں کوئی کلام نہیں ہوگا۔

۱- شامی ۴/ ۲۱۹۔

اور یہ بات الگ ہوگی کہ وارث اگر تقویٰ برتے اور تنزہ کی خاطر صدقہ کردے تو یہ انتہائی تقویٰ اور تنزہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۹۸ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

وقف کے لیے تحریر ضروری نہیں، وقف زبانی بھی ہو جاتا ہے:

زید نے اپنی صحرائی زمین اور باغات اور مکان اور نقد روپیہ چار معتبر دیندار آدمیوں کے سامنے وقف کیا اور کہا کہ چونکہ وقف نامہ رجسٹرڈ کرانے میں ڈیڑھ دو لاکھ کا خرچہ ہے، اس لیے یہ جائداد مذکورہ ہے تو وقف ہی، لیکن خرچ سے بچنے کے لیے میں وصیت نامہ لکھوا کر اس طرح رجسٹرڈ کرادوں گا کہ وقف نامہ ہی سمجھا جائیگا۔

چنانچہ زید نے وصیت نامہ لکھوا کر رجسٹرڈ کرادیا۔ پھر اچانک زید کا انتقال ہوگیا، یہ وقف صحت اور ہوش وحواس کی حالت میں کیا تھا اور انتقال وقف کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد کیا، دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوا۔ چند امور دریافت طلب ہیں:

● کیا زبانی وقف چار معتبر دیندار آدمیوں کے سامنے شرعاً صحیح ہوگیا یا نہیں؟

مشترکہ جائداد کا وقف:

● اگر اس موقوفہ جائداد میں کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہو اور تقسیم کیے بغیر زید نے اپنا مبہم حصہ وقف کردیا ہو تو یہ وقف صحیح ہوگا یا نہیں؟

● روپیہ کا وقف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

زبانی وقف کے بعد خرچ سے بچنے کے لئے وصیت نامہ لکھنا:

● اگر زبانی وقف چار گواہوں کے سامنے کرے، پھر وصیت نامہ خرچ سے بچنے کے لئے لکھا، تو کیا متولی وقف کو یہ حق ہے کہ وہ وقف سے نظر انداز کر کے وصیت نامہ کی رو سے دو ثلث ورثا کو دے دے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

● وقف صحیح ہونے کے لیے تحریر کرنا یا رجسٹرڈ کرانا لازم نہیں ہے، بلکہ وقف زبانی کرنے سے بھی ہوجاتا ہے،

کیونکہ زبانی ہی اصل ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **"ومحله المال المتقوم وركنه الألفاظ الخاصة"** (۱)، البتہ سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس چیز پر وقف کیا ہے اور صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے یا نہیں۔ جب تک صرف منفعت کی جہت بھی واضح نہ ہو جائے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول مفتی بہ کے مطابق کوئی بھی منقح حکم نہیں لگ سکتا، لہٰذا یہ تشنگی دور ہونے کے بعد ہی کوئی حکم لگ سکے گا۔

● اگر اس جائداد موقوفہ میں صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے تو دوسرے شخص کے شریک ہونے کے باوجود، جب کہ وہ جائداد قابل تقسیم ہو حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جو کہ مفتی بہ ہے، یہ وقف جائداد صحیح شمار ہوگا کما دلت علیہ هذه العبارة: **"فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافا للثاني (الى أن قال) واختلف الترجيح والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل. بحر. وفي الدرر: وقال صدر الشهيد: وبه يفتي وأقر المصنف، وفي الشامي النعماني: ان قول أبي يوسف أوجه عند المحققين"** (۲)، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک اس جائداد کا قابل تقسیم ہونا، نیز اس پر جہت مؤبدہ میں صرف منفعت کا علم نہ ہو جائے، کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

● جائز ہے۔ اول تو اس لیے کہ اشیاء منقولہ کے تابع ہو کر ہے اور ضمن میں ہے، دوسرے یہ کہ اس کے رواج پر تعامل جاری ہے کما صرح بہ فی الشامی النعمانیۃ (۳/ ۳۷۴)۔

● اگر اس جائداد موقوفہ میں صرف منفعت جہت غیر مؤبدہ میں ہے اور یہ عقد وقف مرض الموت سے قبل حالت صحت میں ہوا ہے تو یہ وقف مکمل و تام ہو چکا ہے اور وقف مکمل ہو چکنے کے بعد واقف کو بھی کسی تغیر و تبدل کا حق نہیں رہتا، لہٰذا اس وصیت نامہ کے رجسٹرڈ کرا دینے سے بھی اس وقف کے لازم و صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کما دلت علیہ هذه العبارة **"فاذا تم ولزم فلا يملك ولا يعار ولا يرهن"** (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۵/۱۴۱۱ھ

موقوفہ زمین کی خرید و فروخت جائز نہیں:

عرض ہے کہ ایک زمین موقوفہ علی المسجد، بٹائی پر ایک کاشت کار کے قبضہ میں تھی، آزادی کے بعد جب ٹیننسی

۱- درمختار کتاب الوقف۔

۲- درمختار مع رد المحتار کتاب الوقف ۶/ ۵۳۴ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

۳- درمختار علی الشامی ۳/ ۳۶۷۔

(Tenancy) ایکٹ نافذ ہوا، جس کی رو سے کاشتکار کو یہ حق حاصل ہوا کہ کاشت کار زمین پر اپنے قبضہ کو نیز زمین کے اندر اپنے کاشت کرنے کو ثابت کر کے گورنمنٹ کے ذریعہ اس زمین کا مالک بن جائے، اور گورنمنٹ، مالک زمین کی رضامندی کے بغیر، مارکیٹ ویلو سے، بہت ہی کم نفع پر وہ زمین کاشتکار کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی مقررہ قیمت مالک زمین کو دلاتی ہے۔

چنانچہ اسی قانون کے تحت کاشت کار نے مذکورہ زمین موقوفہ علی المسجد پر قبضہ کر کے لے لینا چاہا، لہذا قیم ومتولی مسجد نے یہ زمین موقوفہ علی المسجد، زید (مشتری اول) کے ہاتھ فروخت کر دی، زید نے یہ کھیتی کی زمین خرید کر اس پر ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کی غرض سے اس زمین کے مختلف پلاٹ بنا دیئے اور اس میں سے ایک پلاٹ (قطعہ ارض) پر کچھ نقد رقم وغیرہ اس کاشت کار کو (جس کے قبضہ اور کاشت میں اب تک یہ زمین تھی بطور رشوت) دے کر اس کو قبضہ چھوڑنے اور ٹیننسی ایکٹ کا فائدہ اٹھانے کے حق سے دستبردار ہونے پر رضامند کر لیا اور وہ دست بردار بھی ہو گیا۔

اس کے بعد زید (مشتری اول) نے مذکورہ زمین کے مختلف پلاٹ ایک ایک کر کے مختلف لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کئے، چنانچہ زید سے بکر، (مشتری ثانی) نے بھی ایک پلاٹ، مارکیٹ کے دام سے خریدا، بکر (مشتری ثانی) کو خریداری کے وقت یہ علم نہ تھا کہ اصل میں یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، بکر مشتری ثانی نے اپنی رہائش کے لئے مکان تعمیر کرنے کی غرض سے یہ زمین (پلاٹ) خریدی تھی، چنانچہ خریدنے کے بعد اس نے مذکورہ زمین پر مکان کی تعمیر شروع کر دی، اب تک کچھ تعمیر ہوئی ہے، اور کام جاری ہے، اسی دوران تعمیر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ دراصل یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، زید (مشتری اول) کو خریدتے وقت نیز بکر (مشتری ثانی) کے ہاتھ یہ زمین (پلاٹ) فروخت کرنے سے پہلے پہلے درحقیقت اس زمین کا موقوف علی المسجد ہونا بتایا یا نہیں، بکر کو اس کی خبر نہیں ہے۔

اب دریافت یہ ہے کہ مذکورہ بالا حالات میں قیم ومتولی مسجد کی زید (مشتری اول) کے ہاتھ زمین موقوفہ علی المسجد کی یہ بیع شرعاً صحیح ہے یا باطل؟

۱- اگر صحیح ہے تو وقف غیر منقول کی بیع کن اعذار و اسباب کی بناء پر صحیح ہوتی ہے، اور اس سلسلہ میں کلی طور پر فقہی ضابطہ کیا ہے؟

۲- اگر فقہی نقطہ نظر سے یہ بیع، باطل اور کالعدم ہے، تو اب بکر (مشتری ثانی) کیا کرے؟ ایسی کوئی گنجائش اور اجازت ہے کہ اس زمین پر مکان تعمیر کر کے بکر، اس میں قیام کر سکتا ہے، اور یہ تعمیر جائز ہو؟

۳- شرعی حیثیت سے اس زمین پر تعمیر شدہ مکان میں رہائش شرعاً جائز نہ ہو تو بکر، زمین کی قیمت اور تعمیر مکان میں

اب تک جتنا خرچ ہو چکا ہے، اس کا حرجانہ اور نقصان زید (مشتری اول) سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ آپ کے ذہن میں اس زمین پر تعمیر مکان کی کوئی جائز صورت ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔

محمد حنیف (بڑودہ، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) **"فإذا تم (أی الوقف) ولزم لا یملک ولا یملک ولا یعار ولا یرھن"**(۱)۔

(۲) **"تحت قوله: وجاز شرط الاستبدال الخ، إعلم أن الاستبدال علی ثلاثة وجوه .... والثاني: أن لا یشترطه سواء شرط عدمه أو سکت لکن صار بحیث لا ینتفع به بالکلیة (إلی قوله) جائز الخ"**(۲)۔

(۳) **"وصرف نقضه إلی عمارته إن احتاج، وإلا حفظه لیحتاج إلا إذا خاف ضیاعه فیبیعه"**(۳)۔

(۴) **"ولا سیما في زماننا (إلی قوله) قال: نعم، لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ویحصل ذالک بالثاني"**(۴)۔

(۵) **"وھکذا في البحر (۵) وغیر ذلک في کتب الفتاوی أیضا"**۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وقف تام اور مکمل ہو جانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رہن رکھنا وغیرہ کچھ

۱- الدر المختار علی ہامش رد المحتار مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ ۳/ ۳۶۷ میں اسی طرح ہے: "لا یملک ولا یملک" جبکہ مکتبہ زکریا کے مطبوعہ نسخہ (۶/ ۵۳۹) میں صرف "لا یملک" ہے مگر علامہ شامی کی تشریح: "لا یملک أی لا یکون مملوکاً لصاحبه ولا یملک أی لا یملک التملیک لغیره بالبیع ونحوه" سے واضح ہو جاتا ہے کہ مکتبہ زکریا کے نسخہ میں طباعت کی غلطی ہے (متن الدر علی ہامش الشامی ۳/ ۵۰۷)۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۵۸۳۔

۳- الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۵۷۳، پوری عبارت اس طرح ہے: "(وصرف) الحاکم أو المتولي، حاوي (نقضه) أو ثمنه إن تعذر إعادة عینه (إلی عمارته إن احتاج وإلا حفظه لیحتاج) إلا إذا خاف ضیاعه، فیبیعه ویمسک ثمنه لیحتاج" (فی متن الدر علی ہامش الشامی ۳/ ۳۸۴)۔

۴- رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۵۵۰، ۵۵۱۔

۵- البحر الرائق ۵/ ۴۲۱، ۴۲۲۔

بھی جائز نہیں ہوتا، ہاں اگر ضائع ہوجانے کا ظن غالب ہوجائے، یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہوجائے تو اس کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں اسی موقوفہ کے متوازی ومماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کردی جائیں۔

پس صورت مسئولہ میں جب خریدار اول کو اس زمین کے قبضہ قابض سے تخلیہ کرانے میں بطور رشوت کے اس زمین کا ایک پلاٹ اور ایک رقم دینی پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قابض کا قبضہ اگرچہ غیر شرعی تھا مگر اتنا مستحکم اور مضبوط تھا کہ بغیر ان ایثارات کے تخلیہ دشوار تھا، لہذا اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس موقوفہ کے ضیاع کا قوی خطرہ ہوچکا تھا، ایسی حالت میں اس زمین کا وقف کی حفاظت کی خاطر فروخت کردینا درست تھا اور جب خریدار اول کے لئے اس کا خریدنا ان مذکورہ بالا عبارتوں کے ذریعہ درست تھا تو خریدار اول کو بطور خود مالک ہوجانے کے بعد خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی درست وجائز ہوگیا اور خریدار ثانی کو بھی جائز ہوگیا کہ وہ اب جس طرح جائز کاموں میں چاہے استعمال کرلے۔

البتہ ٹرسٹ وارکین وقف کے ذمہ لازم ہے کہ اس زمین کی رقم سے اس زمین کے متوازی ومتبادل کوئی جائداد حاصل کر کے جلد از جلد منشاء واقف کے مطابق وقف کردیں، ورنہ یہ لوگ سخت گنہگار اور عند اللہ مجرم ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۱۴۰۹ھ

مرض الموت کا وقف وصیت کے حکم میں ہے:

اپنی وفات سے چار پانچ گھنٹے قبل زید نے اپنی کل مقبوضہ جائداد (رہائشی مکان وکھلی خشک زمین) اس پوری جائداد کی تخمینی مالیت ۱۲ ہزار روپے ہوتے ہیں، جس میں زید کی اپنی کسبی جائداد چار ہزار روپے اور موروثی منقسمہ غیر منقسمہ ۸ ہزار مالیتی دونوں شامل ہیں ان میں سے ایک ثلث جس کی تخمینی قیمت دو ہزار ہوتی ہے مسجد کو وقف کرنے کے لئے وقف نامہ لکھا تھا، جس پر خود زید اور عادل گواہوں کے علاوہ ان کے حقیقی ورثاء (ایک بیٹا دو بیٹیاں شادی شدہ) کی دستخطیں موجود ہیں، اب جب کہ وقف نامہ پر عمل آوری کے لئے مسجد کمیٹی کی جانب سے اقدام کیا جانے لگا تو درج ذیل اختلاف مانع اقدام بن رہا ہے۔

۱- زید کا بیٹا وارث حقیقی معذور، اپاہج اور ناقابل کسب معاش ہے جس کی گزر بسر بود وباش کا کوئی انتظام نہیں۔

۲- گواہوں نے شہادت دی ہے کہ زید کے بیٹے نے وقف نامہ پر برضا ورغبت ہوش وحواس میں دستخط کئے تھے

مگراس وقت وہ مذکورہ شہادت سے منحرف ہے۔

۳- وقف نامہ مرض الموت میں لکھا گیا ہے جونا قابل قبول سمجھا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ زید اپنی جائداد کا کچھ حصہ وقف کر کے صدقہ جاریہ کا ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا جبکہ خود ان کا بیٹا ایسی کسمپرسی کی حالت میں ہے کہ بیٹے کو اس حال میں چھوڑ کر وقف کے ذریعہ ثواب حاصل کرنا گویا فرض کو چھوڑ کر مستحب کے اہتمام کرنے کے مترادف ہے۔

مگر گواہوں (عادل) کا کہنا یہ ہے کہ زید کا بیٹا لاچار ضرور ہے، مگر وقف شدہ جائیداد کے بغیر گزر بسر ممکن ہے۔

نیز زید کا بیٹا وقف نامہ کے مضمون سے پوری طرح آگاہی کے بعد ہی پوری رضا کے ساتھ اس پر دستخط ثبت کیا تھا جس میں کوئی جبر واکراہ نہیں۔

وقف نامہ اگر چہ مرض الموت میں لکھا گیا لیکن مرحوم نے مرض الموت سے قبل بثبات ہوش وحواس کئی بار (عادل) گواہوں کے سامنے مذکورہ جائداد (وقف) کرنے کا ارادہ اور اس کا اظہار کیا تھا اور مستندبات یہ بھی ہے کہ تحریری شکل میں لینے کے بعد دستخط کرتے وقت مرحوم مکمل ہوش وحواس میں تھے، یہ غلط ہے کہ وہ اپنا ہوش وحواس کھو چکے تھے، آپ براہ کرم اس نزاع کا تحقیقی مطالعہ کے بعد فیصلہ شرعی قلمبند فرما کر مشکور فرمائیں۔

۱- آیا یہ وقف نامہ من وعن درست ہے یا سرے سے درست ہی نہیں۔

۲- کیا کسی قسم کی ترمیم کے ساتھ اس کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، مثلاً زید کے بیٹے کو اس کی لاچاری کی بناء پر اس وقف شدہ ملکیت سے صرف تاحیات استفادہ کا حق دیا جائے۔ جواب باصواب اور قول فیصل عنایت فرمائیں تاکہ ارتفاع نزاع باہمی آسانی سے ممکن ہو سکے۔

عبدالحفیظ (جانگاؤں، ورنگل، اے پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مرض الموت کا وقف اگر چہ وصیت کے حکم میں ہوتا ہے اور ورثاء کو محتاج چھوڑ کر کل وقف کر دینا اگر چہ مذموم فعل ہے، ان تمام باتوں کے باوجود کل ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کا خرچ اور میت پر جو قرضہ ہو اس کو ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ کے ایک تہائی حصہ میں وصیت جاری ہوتی ہے اور اس ایک تہائی حصہ میں نافذ ہونے کے لئے ورثاء کی رضامندی بھی شرط نہیں ہوتی، ہاں ایک تہائی حصہ سے زائد میں ورثاء کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے مسئلہ۔ ''کما فی عامۃ

الکتب المعتبرة للفتاویٰ"(۱)۔

پس جب حسب تحریر سوال واقف کا کل ترکہ ۱۲ہزار کی مالیت کا ہے اور اس میں سے صرف دوہزار کی مالیت کی ایک دوکان مسجد کے لئے وقف کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ میت کی تجہیز وتکفین قرض کی ادائیگی کے بعد بھی دوہزار کی مالیت تہائی ترکہ کے اندر ہی رہے گی۔

پس اگر یہ مالیت (۱۲ہزار مالیت کی) بعد خرچ تجہیز وتکفین وبعد ادا قرض اگر قرض ہو تہائی ترکہ کے اندر ہے تو بلاشبہ یہ وقف صحیح ودرست ہے۔ بیٹا راضی ہو یا راضی نہ ہو۔

اگر تجہیز وتکفین اور بذمہ میت قرض میں چھ ہزار بھی خرچ ہو جاتے ہوں جب بھی ۲ہزار/۶ہزار کا تہائی رہے گا اور وقف صحیح رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۶/۱۴۰۱ھ

موقوفہ زمین بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین خریدنا:

۱- کسی آدمی نے کچھ زمین مسجد کے لئے وقف کیا اور پھر کسی وجہ سے اس وقف شدہ زمین کو فروخت کر کے دوسری جگہ زمین خرید کر کے اسی مسجد کے نام پر دیدیا کیا یہ جائز ہے؟

۲- کسی آدمی نے اپنی خاص زمینوں میں سے ایک پاؤ زمین کسی مسجد کے لئے زبانی طور پر بغیر رجسٹرڈ کئے وقف کر دی اس کے بعد اس وقف شدہ زمین کو دوسرے آدمی کو فروخت کر کے اپنی دوسری جگہ سے ایک پاؤ زمین اسی مسجد کے نام پر دیدینا از روئے شرع کیا حکم رکھتا ہے؟

مشترکہ زمین سے بلا اجازت شریک زمین وقف کرنا:

۳- ایک آدمی دس لڑکے ولڑکی کو چھوڑ کر انتقال کر گیا ان میں سے کچھ بالغ اور کچھ نابالغ ہیں، اس میں سے بڑے لڑکے نے کہا کہ میں نے ایک بیگھہ زمین مسجد کے لئے وقف کر دیا اور کہا کہ چھوٹے بھائیوں کو میں اپنے حصے سے ان کا حصہ دے دوں گا، تو یہ مشترکہ زمین سے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ ورثاء میں بالغ ونابالغ دونوں موجود ہے اور اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کرنا اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ محمد رفیق احمد

۱- ''أو بالموت إذا علق به أي بموته كإذا مت فقد وقفت داري على كذا فالصحيح أنه كوصية تلزم من الثلث بالموت لا قبله'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۲۹، ۵۳۰)۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱- اگر واقف نے وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہیں لگائی تھی تو وقف تام ہوجانے کے بعد اس عبارت "وأما الاستبدال ولو للمساكين آل بدون الشرط فلا يملكه إلا القاضي "(۱) کی رو سے یہ استبدال جائز نہیں ہوگا، لہذا اگر بغیر شرط استبدال کے یہ استبدال ہوگیا ہے تو واقف اس بدلنے میں گنہگار ہوا جس پر توبہ کرنا ضروری ہے، باقی دوسری زمین جو خرید کر وقف کی ہے وہ زمین بھی وقف ہوگئی اور اب اس میں بھی کوئی تبدیلی جائز نہیں ہے۔

۲- اس نمبر کا جواب بھی بالکل وہی ہے جو نمبر ایک کا ہے، رجسٹرڈ کرنے یا نہ کرنے سے اس حکم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

۳- جب ورثاء میں نابالغ بھی ہوں جن کی اجازت بھی شرعاً معتبر نہیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف مشاع کے جائز ہونے کے باوجود اس طرح وقف کرنا جائز نہیں تھا، وہ شخص اس میں گنہگار ہوا جس پر اس کو توبہ کرنا چاہیے(۲)۔

اور اس وقف کا حکم شرعی یہ ہوا کہ اگر ابھی تک اس زمین پر مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے تو اس کو تقسیم کرکے نابالغوں کا حصہ الگ کرکے محفوظ کرلیا جائے اور وقف کردہ رقبہ کی کمی کو وقف کرنے والے کے حصے سے پورا کرلیا جائے، پھر اس کو مسجد کے لئے وقف تسلیم کیا جائے اور اگر اس پر مسجد تعمیر ہوچکی ہو تو مسجد کو مسمار نہ کریں گے، بلکہ ان نابالغین کے حصے کے بقدر واقف کے حصے میں سے لے کر نابالغین کے لئے محفوظ کرلیں گے اور اس وقف کرنے والے سے اس کی اجازت لینی چاہیے اور وقف کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ نابالغین کا حصہ دے کر اس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدے، اگر اجازت نہ دے گا تو مزید گنہگار ہوگا اور اس میں نماز پڑھنا درست رہے گا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۶/۴ ۱۴۰۲ھ

موقوفہ اراضی کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے:

عرض خدمت یہ ہے کہ موضع باباپور تعلقہ یمگل ضلع نظام آباد (آندھرا پردیش) میں ایک درگاہ شریف موسومہ

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۸۵۔

۲- و"یعزز" فلا یجوز وقف مشاع یقسم خلافاً للثاني (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۳۴)۔

۳- ''ویزول ملکه عن المسجد والمصلي بالفعل وبقوله جعلته مسجداً عند الثاني وشرط محمد والإمام الصلوة فيه'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۴۴)۔

حضرت بابا مظہر شاہ ابدالؒ موجود ہے۔اس درگاہ شریف کے حسب ذیل مختلف خدمت گزار ہیں:

۱۔متولی-ان کے ذمہ درگاہ کی مسجد کی امامت کے علاوہ تمام خدمت گزاروں پر نگرانی کرنا ہے۔

۲۔آبدار-ان کا کام پانی مہیا کرنا ہے۔

۳۔مورچھل-ان بردار ان کا کام عرس شریف میں پنکھا جھلنا ہے۔

۴۔نقیمی-ان کا کام فاتحہ خوانی ہے۔

۵۔چراغدار-ان کا کام درگاہ شریف میں روشنی کا انتظام کرنا ہے۔

مذکورہ بالا تمام خدمت گزار نسل در نسل اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان تمام خدمت گزاروں کے لئے سابق دور میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ اراضیات بطور انعام شروط خدمت حکومت کی طرف سے دیئے گئے۔

ایک ہی خاندان کے چراغ دار ابتداء ہی سے اپنے اپنے دور میں خدمت چراغداری انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔چنانچہ اسی سلسلہ خاندان چراغداری کے مسمی عبدالحق اپنی زندگی میں چراغ داری کی خدمت انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔ان کو صرف ایک لڑکا شیخ محی الدین اور تین لڑکیاں مسماۃ مریم بی صاحب، حلیمہ بی صاحب، آمنہ بی صاحب تھیں۔عبدالحق صاحب کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے لڑکے شیخ محی الدین صاحب خدمت چراغداری انجام دیتے ہوئے مشروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے، ان کی خدمت کے مدنظر جائداد مشروط الخدمت موصوف کے نام حکومت کی جانب سے منتقل ہوئی۔شیخ محی الدین صاحب کا اپنی زندگی میں اپنی تینوں بہنوں (مریم بی صاحب، فاطمہ بی صاحب، آمنہ صاحب) کے ساتھ بہت بہتر سلوک رہا۔اس وقت اراضیات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، چنانچہ اپنے بھائی کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر ان تینوں بہنوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد مشروط الخدمت سے دستبرداری کی تحریر کرچکی ہیں جو محفوظ ہے۔

شیخ محی الدین صاحب کو نرینہ اولاد نہیں ہے، صرف ایک لڑکی طاہرہ بیگم ہے، موصوف نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی طاہرہ بیگم کے نام اپنی کل جائداد بشمول اراضیات مشروطۃ الخدمت ہبہ کردیا جو محفوظ ہے۔شیخ محی الدین صاحب کو انتقال کئے ۱۲رسال کا عرصہ ہورہا ہے، حسب ہبہ نامہ ان کی لڑکی طاہرہ بیگم اور ان کی زوجہ علیم النساء بیگم صاحب دونوں ماں اور بیٹی بلاشکایت درگاہ شریف کی خدمت چراغ داری انجام دیتے ہوئے تمام جائداد سے مستفید ہورہی ہیں، ان کی بلاشکایت کے خدمت گزاری کی تصدیق متولی صاحب وگرام پنچایت محفوظ ہے، حکومت نے ان دونوں کی خدمات کے مدنظر کچھ شروط

الخدمت اراضیات کو ان دونوں کے نام پٹہ کردیا ہے جس کو دس سال کا عرصہ ہورہا ہے۔ چنانچہ ہر سال یہ دونوں اپنے پٹہ کی اراضیات کی مالگزاری ادا کرتے آرہے ہیں۔ رسائل محفوظ ہیں۔

اب چالیس سال کے بعد جب کہ عبدالحق صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کے لڑکے شیخ محی الدین صاحب کا انتقال ہوگیا اور عبدالحق صاحب مرحوم کی مذکورہ تینوں لڑکیوں میں مسماۃ مریم بی صاحبہ اور حلیمہ بی صاحبہ کا انتقال ہوگیا جس کو ۲۰ سال کا عرصہ ہورہا ہے، زمینات کی قیمت بڑھ جانے سے مندرجہ ذیل ورثاء کا ادعا یہ ہے کہ شروط الخدمت اراضیات کو متروکہ دے کر اس کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔

دعویدار:۔ ۱۔ مریم بی۔ عبدالحق صاحب۔ مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب کی بہن لیکن انہوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد سے دستبرداری کی تحریر کرچکی ہیں، ان کو انتقال ہوئے ۲۰ر سال ہورہے ہیں۔

۲۔ حلیمہ بی صاحبہ۔ عبدالحق مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن لیکن ان کو انتقال کئے ۱۲ر سال ہورہے ہیں۔

۳۔ آمنہ صاحبہ۔ عبدالحق صاحب مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن موصوفہ زندہ ہیں، لیکن اپنی دونوں بہنوں کی طرح اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد مشروط الخدمت وغیرہ سے دستبرداری کی تحریر کرچکی ہیں جو محفوظ ہے۔

۴۔ محمودہ بی یہ دعویدار نمبر ۲ حلیمہ بی کی لڑکی ہے شادی شدہ ہے عمر ۵۰ سال ہے۔

۵۔ گوری بی ان کی عمر ۴۵ سال ہے

۶۔ صغریٰ بیگم ان کی عمر ۴۲ سال ہے

۷۔ کبریٰ بیگم ان کی عمر ۴۰ سال ہے

۸۔ عبدالغفار:۔ یہ دعویدار (۱) مریم بی صاحبہ کا بیٹا ہے، اپنی ماں مرحومہ کی جائداد مشروط الخدمت کا دعویدار ہے۔

۹۔ سکندر:۔ یہ دعویدار (۸) عبدالغفار کا بیٹا ہے دادی مرحومہ کی مشروط الخدمت اراضیات کا دعویدار ہے۔

۱۰۔ صبیحہ بیگم:۔ یہ دعویدار (۶) صغریٰ بیگم کی بیٹی ہے، اپنی نانی حلیمہ بی صاحبہ مرحومہ کی جائداد مشروط الخدمت

اراضیات کی دعویدار ہے۔

۱۱۔ مختار ۔ یہ دعویدار (۱۰) حسیبہ بیگم کا شوہر ہے، اپنی بیوی کی نانی حلیمہ بی صاحب مرحومہ کی جانداد مشروط الخدمت اراضیات درگاہ شریف جو شیخ محی الدین صاحب مرحوم کو وراثتاً سرکاری حیثیت سے ۱۹۵۴ء میں باضابطہ منظور ہوئی ہیں تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ گذر رہا ہے، اب مندرجہ بالا اشخاص جانداد مشروط الخدمت اراضیات درگاہ شریف کے دعویدار ہیں جب کہ اب تک انھوں نے کسی قسم کی خدمت انجام نہیں دی۔ اس صورتحال میں علمائے کرام ومفتیان عظام سے استدعا ہے کہ براہ کرم شرع شریف کی روشنی میں ان دعویداروں کا دعویٰ کس حد تک حق بجانب ہے؟

محمد ابراہیم (مکان نمبر ۸۔۳۔۱۱۔ا محلہ پھولانگ نظام آباد)

الجواب وبالله التوفيق:

چپہ اندار کی آراضیات بھی مشروط الخدمت وقف ہیں موقوفہ کا ہبہ وغیرہ کرنا درست نہیں ہے(۱)، بلکہ جب خاندان چپہ اندار پر وقف ہے تو جب تک چپہ اندار اولاد میں کوئی شخص رہے اور خدمات مشروطہ ادا کرتا رہے وہ اس وقف کا حقدار ہوگا اور جب اولاد کا سلسلہ منقطع ہوجائے تو اولاد اناث میں زیادہ قریبی ہوگا وہ اسی شرط خدمت کے ساتھ حقدار ہوگا۔ اس قاعدہ کے مطابق صورت مسئولہ میں موقوف علیہ کا قریبی رشتہ دار جو زندہ ہو وہ حقدار متصور ہوگا اور صورت مسئولہ میں زیادہ قریبی رشتہ دار صرف آمنہ بی زندہ ہیں، لہٰذا صرف وہی اس مشروطہ خدمت کے ساتھ حقدار متصور ہوں گی بشرطیکہ خدمت مشروطہ خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعہ کرائیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرائط واقف کے خلاف عمل:

۱۔ کسی موقوفہ یتیم خانے یا علمی ادارے کا شرائط واقف کے خلاف اس کے موجود کارکنان کی کاروائی درست ہے یا نہیں؟

۱۔ ”وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالىٰ فيزول ملك الواقف عنه الى الله تعالىٰ على وجه تعود منفعته الى العباد فيلزم ولايباع ولايوهب ولايورث“(ہدایہ ۲/ ۶۱۲، کتاب الوقف، مطبع یوسفی لکھنؤ، بدائع الصنائع ۵/ ۳۲۶، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔شرائط واقف مثل نص شارع کے واجب العمل ہوتے ہیں، اس کے خلاف کرنا جائز اور درست نہیں ہوتا(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

خائن کی تعریف اور اس کا حکم:

خائن کس کو کہا جاتا ہے اور اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خیانت کا ثبوت جبتک شرعی دلائل سے نہ ہوجائے اس وقت تک کسی کو خائن کہنا جائز نہیں (۲) اور دلیل شرعی سے ثبوت خیانت کے بعد خائن کو معزول کردینا ضروری ہے (۳) اعانت جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم اور اس پر اوقاف کی آمدنی صرف کرنا:

یہاں دہرہ دون میں ایک انجمن ہے جس کے سپرد مختلف اوقاف کا انتظام ہے، اس انجمن کا ہر تیسرے سال انتخاب عمل میں آتا ہے جس میں ہر بالغ سنی حنفی المذہب ووٹر ہوتا ہے جس کے لئے باقاعدہ ممبر سازی ہوتی ہے۔

ہر سال شب قدر پر شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ مگر سال گذشتہ انجمن نے اپنی میٹنگ میں پاس کرکے کہ مٹھائی تقسیم نہ ہو مٹھائی بند کردی ہے، اب نمازیوں نے اپنے طریقہ سے چندہ کرکے مٹھائی کا انتظام کیا تھا، اب شب قدر قریب ہے سو مٹھائی کا

۱- ''شرائط الوقف کنص الشارع إلی قوله: في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به''(الدر المختار علی الرد ۳/۵۷۵، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- ''لایعزله القاضي بمجرد الطعن في امانته بل بخیانة ظاهرة قرینة''(شامی ۳/۵۳۲، عثمانیہ)۔

۳- ''وإن عزله واجب علی کل مسلم یستطیعه فانه من قبیل انکار المنکر''(تقریرات الرافعی علی حاشیہ ابن عابدین ۶/۸۲، مکتبہ زکریا)۔

سول پھر ہورہا ہے، انجمن کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ مٹھائی انجمن نہیں دے گی، مگر چند ممبران انجمن اس پر بضد ہیں کہ حسب دستور سابق انجمن کو مٹھائی کا انتظام کرنا چاہئے، اوقاف کی پانچسو کی آمدنی ہے، آپ شرع کی روشنی میں بتلاویں کہ شب قدر میں شیرینی کی تقسیم کی مذہبی نوعیت ہے یا صرف رواج ہوگیا ہے، اب انجمن کو مٹھائی تقسیم کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم شرعی نقطۂ نظر سے بالکل بے اصل اور خلاف شرع ہے محض بے بنیاد رسم پڑگئی ہے، اوقاف کی آمدنی سے یہ شیرینی تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، اگر وقف کی آمدنی سے کوئی شیرنی تقسیم کرے گا تو اس پر شرعاً ضمان عائد ہوگا(۱)، پہلے جو شیرنیاں وقف کے مال سے تقسیم کی گئی ہوں گی انکا بھی یہی حکم ہے، ہاں اگر لوگوں نے اپنے ذاتی مال سے تقسیم کیا ہو تو کوئی ضمان نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۹/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم اوقاف بورڈ کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کرنا:

اگر مسلم اوقاف بورڈ سے روپیہ حاصل کر کے عیدگاہ کی تعمیر اور اسکے مصرف میں لگایا جائے تو جائز ہے یا نا جائز؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر مسلم اوقاف بورڈ میں اس مد کا روپیہ ہوتا ہے اور پھر دیتے ہیں تو جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''والواجب ان يبدأ بصرف الفرع الى مصالح الوقف من عمارته وإصلاح ماوهي من بنائه وسائر مؤناته التي لابد منها'' (بدائع الصنائع ۵/ ۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔

معذور کا متولی رہنا:

ایک ہمسایہ مسجد کا متولی ہے، دو ڈھائی سال سے اپاہج ہے، کرسی پر بیٹھے پڑے رہتے ہیں، نقل وحرکت بالکل نہیں کرسکتا، دوسرے آدمیوں کی امداد کے بغیر پیشاب پاخانہ مشکل، لحاف وغیرہ خود بخود استعمال نہیں کرسکتا، نماز وغیرہ اسی وجہ سے خانگی رہتی ہے۔ مسجد جانے کی ضرورت ہوتو تین چار آدمی کرسی پر اٹھا کرلاتے ہیں۔ ایسی حالت پر ہمسایہ کے لوگ متولی رہنے پر ناراض ہیں، کیونکہ اس سے کماحقہ ہر کام چلتا نہیں، بلکہ وہ زبردستی متولی رہنا چاہتا ہے، کچھ تعصبا اس کی طرفداری کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو مسجد کا متولی باقی رکھنے میں شرعاً کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ اطمینان بخش جواب مطلوب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

انتظام مسجد درست رکھنے کے لیے متولی کا مسجد میں آنا ہر وقت ضروری نہیں ہے، اگر یہ متولی پہلے سے مقرر ہے اور صحیح کام انجام دیتا تھا اور اب بھی غبن وغیرہ خرد برد وقف میں نہیں کرتا تو محض اس کی معذوریوں کی وجہ سے اس کو معزول نہ کیا جائے گا، ایسا کرنا درست نہ ہوگا، "**لایجوز للقاضی عزل الناظر لمشروط له النظر بلا خیانة**"(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

۱- شامی ۶/ ۵۸۰ کتاب الوقف مکتبہ زکریا۔

باب ما یتعلق بأحکام المساجد

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گم شدہ چیزوں کا اعلان کیسا ہے؟

مسجد کے مینارہ پر لاؤڈ اسپیکر کا ہارن رکھا ہوا ہے، باقی سامان یعنی ایمپلیفائر اور مائک وغیرہ مسجد کے اندر رکھے ہوئے ہیں، جس میں اذان کے علاوہ خرید وفروخت اور گم شدہ چیزوں کا اعلان پیسے لے کر کیا جاتا ہے، از روئے شرع یہ اعلان کرنا چاہیے یا نہیں؟

شفیق احمد (مسجد انصاریان اسوڑہ غازی آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر یہ لاؤڈ اسپیکر مسجد کے پیسے سے خرید اگیا ہے جب تو اس کا مینارہ پر رہنا درست رہے گا، باقی خرید وفروخت یا گم شدہ کا اعلان وغیرہ کوئی دنیوی کام کرایہ لے کر بھی کرنا درست نہ ہوگا (۱)۔

اور اگر چندہ کے پیسے سے خرید اگیا ہے اور چندہ دینے والوں نے ان سب کاموں میں استعمال کی نیت سے چندہ دیا ہے تو ان مذکورہ سب کاموں میں کرایہ لے کر بھی استعمال کرنا درست رہے گا، باقی اس صورت میں جس طرح مشین وغیرہ متصل اور الگ رکھی ہے، اسی طرح ہارن بھی مینارہ سے الگ رکھنا ضروری ہے، ہاں مینارہ سے الگ اور متصل رکھ سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/۱۴۰۱ھ

۱- "ویحرم فیہ السوال ویکرہ الإعطاء مطلقاً وقیل، ان تخطی وإنشاد ضالۃ" (الدر المختار علی ہامش الشامی ۴۴۳ ج ۱)۔

"عن أبی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: من سمع رجلاً ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لاردھا اللہ علیک فإن المساجد لم تبن لھذا" (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف ۶۸ مرتب)۔

امام کو مسجد کی آمدنی سے ایام رخصت کی تنخواہ دینا کیسا ہے؟

کیا جائداد اور مسجد کی آمدنی سے امام کو ایام رخصت کی تنخواہ دینا جائز ہے؟

شفیق احمد (مسجد انصاری اسوڑہ غازی آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر شروع ملازمت میں امام نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ایام رخصت کی تنخواہ بھی لوں گا، یا کمیٹی مسجد نے طے کر رکھا ہے تو بلا تکلف و بلا خدشہ ایام رخصت کی تنخواہ لینا دینا جائز رہے گا (۱)، اور اگر یہ سب باتیں نہ ہوں تو عرف عام میں جتنے دنوں کی رخصت میں تنخواہ دینے کا دستور ہو تو صرف اتنے ایام کی تنخواہ دینا درست رہے گا اور اس سے زیادہ ارکین مسجد کی صواب دید پر موقوف رہے گا (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۱/ ۱۴۰۹ھ

صدقہ، زکوٰۃ، چڑھاوے، چراغاں وغیرہ کی رقم مسجد میں لگانا اور لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

۱- زید کا صدقہ، خیرات، زکوٰۃ، چڑھاوے اور چراغاں کا پیسہ بینک میں جمع تھا اور وہ کسی مسجد میں مؤذن تھا، پھر اچانک اس کا انتقال ہوگیا، درانحالیکہ اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی پیسہ کے بارے میں وصیت فرمائی تو کیا ایک شخص یا مسجد کے ممبران اس کو بینک سے کسی طرح نکال کر مسجد میں لگا سکتے ہیں اور انہوں نے اس رقم سے مسجد کے اندر اگر پنکھا وغیرہ لگا ہی دیا تو کیا حکم ہے؟

۲- محکمہ اوقاف سارے ہندوستان میں جاری ہے، یہ مساجد و مقابر اور ان سے متعلق جائداد کی حفاظت کرتا ہے،

۱- "فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء" (الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی، ۱۱۸)۔

۲- "القاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح فينبغي أن يكون في المدارس، لأن يوم البطالة للاستراحة، وفي الحقيقة تكون للمطالعة والتحرير عند ذوي الهمة، الاشباه والنظائر مع شرح الحموی ۱۱۸ فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ وكذا لو بطل في يوم غير معتاد لتحرير درس إلا إذا نص الواقف على تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه كما قلنا وفي الفصل الثامن عشر من التتارخانية قال الفقيه أبو الليث: ومن يأخذ الأجر من طلبة العلم في يوم لا درس فيه أرجو أن يكون جائزاً" (فتاویٰ شامی، ۳/۳۸۰ کتاب الوقف مرتب)۔

اس کے لیے انتظامیہ سے چھ ہزار ایک سو پچاس فیصد کے حساب سے چندہ نگراں وصول کرتا ہے۔

اس بارے میں سوال یہ ہے کہ کسی مسجد کی دکانوں اور مکانوں کی آمدنی مناسب ہے اور اخراجات پورے ہوجاتے ہیں اور کمیٹی کل آمدنی اوقاف کونہیں بتلاتی، بعض بتلاتی ہے بعض چھپاتی ہے، تاکہ چندہ نگراں کوزیادہ نہ دینا پڑے، یہ چوری ہے یا خیانت ہے؟ اس طرح عمل کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس طرح کا بچا ہوا روپیہ مسجد کی تعمیر اور دیگر مسجد کے کاموں میں خرچ کرسکتے ہیں؟ نیز ان مذکورہ بالا افعال کی مرتکب انتظامیہ کا کیا حکم ہے؟

عبدالمجید (محلہ شیخ مسجد، اجین، ایم، پی)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- جو پیسہ اس کے مرنے کے بعد برآمد ہوا ہے، اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ پہلے اس کے نزدیک کے پھر دور کے خاندان کے لوگوں کو تلاش کر کے ان کو معلوم کیا جائے اور حسب قاعدہ وراثت ان کو دیا جائے، جب کوئی نہ ملے تو اس وقت مستحقین صدقہ پر صدقہ کردیا جائے، دینی تعلیم کے نادار طلبہ اور دینی علم کی خدمت کرنیوالے ناداروں کو دینا مقدم کیا جائے اور پھر دوسرے غرباء و مساکین کو دیا جائے۔

اس رقم کو مسجد میں نہیں لگا سکتے، اگر غلطی سے کچھ پیسہ مسجد میں لگ گیا ہو تو جتنا پیسہ لگ گیا ہے اتنا پیسہ خرچ کرنے والے لوگ اپنے پاس سے صدقہ کردیں۔

۲- ایسا پیسہ مسجد کی تعمیر میں اور دیگر کاموں میں صرف کردینا شرعاً مباح ہے، باقی چونکہ یہ قانوناً چوری ہے جس سے بچنا واجب ہے، اس لیے مباح کی وجہ سے واجب کو تو نہیں چھوڑا جائے گا اور ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/ ۴/ ۱۴۰۷ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

جگہ کی قلت کی بنا پر خارج از مسجد اقتداء کرنے کا حکم شرعی:

دہلی کے ایک مخصوص علاقہ میں ایک شاہی مسجد واقع ہے، جو کہ کافی وسیع اور کھلی ہوئی ہے اور گنجان آبادی کے علاقہ

میں آباد ہے، جس کی حدودِ اربعہ اور شان وشوکت جامع مسجد سے کافی حد تک مشابہ ہے، مذکورہ مسجد کا صحن بھی اچھا خاصا وسیع ہے، جس کے تینوں جانب وضو خانہ واقع ہے، مذکورہ مسجد میں صدر دروازہ کی جانب مشرق میں سیڑھیاں ہیں اور سیڑھیوں کے دونوں جانب وسیع وضو خانے تعمیر شدہ ہیں، وضو خانہ اور سیڑھیوں کے قریب پندرہ بیس فٹ چوڑا راستہ اور دونوں جانب سبزہ زار واقع ہیں، جن کے بعد ایک سبز خطہ ہے جس میں گھاس لگی ہوئی ہے اور جس کے چاروں جانب خاردار جھاڑیوں کی باڑھ ہے، اس خطہ میں اکثر نماز جنازہ ہی ہوتی ہے، ساتھ ہی جمعہ کے دن عوام کی زیادتی کے سبب اس مذکورہ خطہ میں جہاں نماز جنازہ ہوجاتی ہے، جمعہ کے دن نمازی اپنی نماز اس جگہ بھی ادا کر لیتے ہیں، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے۔

تاہم چند افراد کا خیال ہے کہ اس خطہ میں نماز جمعہ ادا نہیں کی جاسکتی اور اس کو شرعی اعتبار سے غلط بھی قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تسلسل نماز با جماعت برقرار نہیں رہتا، اس لیے یہاں شرعی اعتبار سے نماز جائز نہیں ہے۔

اسلم قادری (کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے اندرونی صحن بھر جانے کے بعد جہاں سیڑھیوں کے دونوں طرف وضو خانے ہیں، اگر وہاں بھی دو، دو، تین، تین نمازیوں کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، اسی طرح سیڑھیوں کے دونوں طرف جو سبزہ زار ہیں، اگر وہاں بھی دو تین کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، تو وہاں بھی زائد نمازی کھڑے ہوجائیں۔

اسی طرح سیڑھیوں کے نیچے جو راستہ ہے وہاں بھی زائد نمازی صف باندھ کر نماز ادا کرتے ہوں تو صفوں کا تسلسل ختم نہ ہوگا اور اس صورت میں نچلے سبزہ زار میں جہاں نماز ادا کی جاتی ہے وہاں بھی زائد نمازی نماز ادا کرلیں تو بلاشبہ سب کی اقتداء اور نماز درست ہوجائے گی، اسی طرح وضو خانوں اور راستے میں یا سیڑھیوں کے دونوں طرف سبزہ زاروں میں صف بنا کر نماز ادا کرنے کی جگہ نہ رہنے کی وجہ سے نماز نہ پڑھی جاسکے جب بھی اس مجبوری کی وجہ سے انقطاع صفوف کا حکم نہ ہوگا اور سبزہ زار جنازہ گاہ میں زائد مقتدیوں کا یعنی ایسے مقتدیوں کا اقتدا کرنا جو اندرونِ مسجد کے بھر جانے کی وجہ سے وہاں اقتدا کر کے نماز ادا کریں تو اقتدا صحیح اور نماز درست ہوجائے گی۔

ہاں آگے کے حصہ میں صف قائم ہوسکے اور پھر اس کو اتنا خالی چھوڑ کر جس میں ۲،۳ صفیں ہوسکتی ہوں وہاں صف قائم نہ کی جائے اور صرف سیڑھی کی جگہوں میں نماز ادا کی جائے تو انقطاع صفوف ہونے کی وجہ سے وہاں اقتدا صحیح نہ ہوگی اور نماز

ادانہ ہوگی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۴/ ۱۴۰۶ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

سود لینے، جاندار کی تصویر بنانے اور بلیک مارکیٹنگ کرنیوالوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگانا کیسا ہے؟

۱-زید سودی لین دین کرتا ہے جس کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں اور اکبر ایسی ساڑیاں تیار کراتا تھا جن پر جانداروں کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، کیا ایسے لوگوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے؟

۲-ایک شخص نے اپنی زمین پڑوسی کے ہاتھ فروخت کردی اور چند روپے بیعانہ کے طور پر لے لیے اور کہدیا کہ جیسے جیسے مجھ کو ضرورت ہوگی روپے لیتا رہوں گا، اس درمیان مسجد کے ذمہ داروں نے اس شخص پر زبردستی دباؤ ڈال کر مسجد کے لیے وہ زمین حاصل کرلی، زمین خریدنے والے سے اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہیں کی اور نہ اس کو راضی کیا اور نہ آج تک وہ راضی ہے۔

اس طرح سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد کی تعمیر ہوسکتی ہے؟

۳-چند لوگوں نے گاؤں کے عوام سے دستخط کرا کے گورنمنٹ سے راشن دکان کا لائسنس حاصل کیا کہ اس کے ذریعے سے مٹی کا تیل، شکر اور سیمنٹ وغیرہ حاصل کر کے راشن کارڈ پر عوام میں تقسیم کی جائیں گی، جو لوگ راشن کارڈ حاصل کرنے جاتے ہیں ان کے کارڈ پر جتنا لکھا جاتا ہے اس کا نصف ان کو دیا جاتا ہے، ان کا بقیہ نصف اور اس کے علاوہ تمام کا تمام بلیک کردیا جاتا ہے۔

کیا بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے؟

نوٹ: اگر مسجد کے ذمہ داروں نے جان بوجھ کر ایسا کردیا ہے اور شریعت کی نگاہ میں یہ صحیح نہیں ہے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔　　　　ابو اسلم (اعلو ضلع اعظم گڑھ)

۱-　"ویمنع من الاقتداء تجری فیہ السفن أو خلاء فی الصحراء أو فی مسجد کبیر جداً، کمسجد قدس یسع صفین فأکثر إلا إذا اتصلت الصفوف فیصح مطلقاً، کأن قام فی الطریق ثلاثۃ، وکذا اثنان عند الثانی لا واحداً اتفاقاً قال الشامی تحت قولہ یسع صفین: نعت لقولہ خلاء والتقیید بالصفین صرح بہ فی الخلاصۃ، والفیض والمبتغی وفی الواقعات الحسامیۃ، وخزانۃ الفتاوی: وبہ یفتی بہ" (فتاویٰ شامی ۱/ ۳۹۴، باب الامامۃ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-سود کا روپیہ اور جانور کی تصویر بنانے کی مزدوری کا روپیہ حرام ہوتا ہے، حدیث میں سودخور وغیرہ پر لعنت کی گئی ہے، لہٰذا سود کے روپیہ کا حرام ہونا ظاہر وبیّن ہے(۱)، اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں، اگر ایسی ساڑیاں وغیرہ وغیر مسلموں سے تیار کرائیں تو تیار کرنے والا گنہگار ہوگا جس سے اس کو باز آنا اور توبہ کرنا ضروری ہے، باقی وہ ساڑیاں یا ان کی قیمت حرام شمار نہیں ہوگی۔

غرض حرام پیشہ کرنے والا جب مسجد کے لیے روپیہ دے تو اس سے کہا جائے کہ حلال پیسہ مسجد کے لیے دو، حرام در حرام مشتبہ مت دو، پھر وہ شخص کہے کہ میں حلال ہی پیسہ دے رہا ہوں تو چوں کہ وہ مسلمان ہے، آخرت سے ڈرتا ہے قرض لے کر بھی دے سکتا ہے، اس لیے اس کی بات تسلیم کرلیں گے اور جب تک دلیل شرعی سے یہ بات ثابت نہ ہوجائے کہ واقعی حرام ہی پیسہ دیا ہے، اس کا پیسہ لے سکتے ہیں اور مسجد میں لگا بھی سکتے ہیں۔

۲-جب بیعانہ کے طور پر صرف چندروپے لیے تو بیع تمام نہیں ہوئی اور نہ واقع ہوئی بلکہ صرف وعدہ بیع ہوا نہ کہ ایقاع، ایسی حالت میں اس وعدہ شدہ زمین کو اگر دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے تو یہ بیع منعقد ونافذ ہوگی اور اس پر مسجد تعمیر کرنا بھی درست ہوجائے گا، البتہ اس وعدہ خلافی کا گناہ بیعانہ لینے والوں کو ہوگا اور بیعانہ کا پیسہ واپس کردینا لازم ہوگا۔

۳-بلیک کرنا قانونی چوری ہے جس کی بغیر وجہ شرعی اجازت نہیں اور اس رقم کو مسجد میں لگانا درست نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/ ۴/ ۱۴۰۷ھ

مسجد کا مکان ایسے قصاب کو کرایہ پر دینا جو خنزیر وغیرہ کاٹے:

۱-مسجد کے پاس ایک مکان ہے، اس مکان کو قصاب کو کرایہ دینا جبکہ وہ اس میں خنزیر اور گائے وغیرہ ہر قسم کا حرام

۱- "عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن الله آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه" (رواہ مسلم وغیرہ)، "وفي التوضيح قال اصحابنا وغيرهم تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره فحرام بكل حال، لأن فيه مضاهات بخلق الله إلى قوله وبمعناه قال جماعة العلماء مالك وسفيان وأبو حنيفة وغيرهم انتهى" (عمدۃ القاری، ۷/ ۲۲)۔

گوشت کاٹ کرفروخت کرنا ہے جائز ہے یا نہیں؟

عبدالصمد گجراتی (گلوسٹرلندن)

الجواب وبالله التوفيق:

في متن الدر على هامش الشامي: "وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة لا بغير هاعلى الأصح، ليتخذ بيت نار، أو كنيسة أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وقالا: لاينبغي ذالک، لأنه إعانة على المعصية، وبه قالت الثلاثة" "وقال الشامي: هذا عنده أيضاً، لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه، فصار كبيع الجارية ممن لايستبرئها أو يأتيها من دبر، وبيع الغلام من لوطي، والدليل عليه أنه لو آجره للسكنى جاز وهو لابد له من عبادته فيه"(۱)۔

"وفي الدر على هامش الشامي (۵/۲۵۰): وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذ خمراً إلى قوله أن قوله ممن أي من كافر، أمابيعه من المسلم فيكره، ومثله في الجوهرة"۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ کرایہ پر لینے والا قصاب اگر مسلمان ہوتو جانتے ہوئے کہ وہ اس میں حرام گوشت وغیرہ فروخت کرنے کا کام کرے گا تو اس کو نہ دینا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسا پیشہ ہی نہ کرے، بلکہ جائز کام کرے اور اگر وہ غیر مسلم ہوتو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ مکان مسجد سے بالکل متصل ہو کہ خنازیر کا شور وشغب وغیرہ مسجد میں آئے گا یا اس کا دروازہ بالکل مسجد کے سامنے ہو کہ تمام مصلی اسی راستے سے نماز کے لیے آتے ہوں اور آتے ہوئے یا نماز پڑھتے ہوئے اس کے اس فعل سے ان کو کراہت واذیت ہوتی ہے، یا ایسا ہو کہ جس سے مسجد کی تلویث کا خطرہ ہوتو چوں کہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور اس کی صفائی، ستھرائی اور تعظیم وتکریم واجبات شرعیہ میں سے اور مقاصد شرعیہ میں سے ہے: **كما قال تعالىٰ: "ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب"(۲) وفي الخبر: "تحريم المحرمات واجب"** ہر وہ چیز جس سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہو احتیاطاً واجب ہے(۳)۔

۱- فتاویٰ شامی ۵/۲۵۱، فصل فی البیع۔

۲- سورۂ حج: ۳۲۔

۳- "وكذا يكره تطوع عند إقامة صلوٰة مكتوبة إلى قوله وكذا كل ما يشغل باله عن أفعالها ويخل بخشوعها كائناً

اوراگر وہ مکان مسجد سے متصل نہ ہواور نہ اس کا دروازہ مسجد کے سامنے ہوتو لندن جیسے ملک وشہر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کرایہ پر دینا جانتے بوجھتے بھی جائز ہے، مگر چونکہ صاحبین رحمہما اللہ کے یہاں جانتے بوجھتے دینے میں اعانت علی المعصیۃ کے ایہام کی وجہ سے دینا اچھانہیں، اس لیے اگر چہ مفتی بقول ابوحنیفہؒ کا ہوگا مگر احتیاط نہ دینے میں ہوگی، اوراگر علم نہ ہوکہ وہ ایسا کام کرے گا تو باتفاق دینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۵/۶/ ۹۸ ۱۳ھ

اگر مسجد کی زمین پر کسی نے غلطی سے گھر تعمیر کرلیا تو کیا حکم ہے؟

گاؤں کے پردھان نے غلطی سے صرف گاؤں سماج کی سمجھ کر وہ زمین ایک غریب مسلمان کو دے دی بعد میں معلوم ہوا کہ زمین تکیہ کی ہے، اس سے پہلے اس مسلمان نے اس پر تعمیر کرلی معلوم ہونے پر اس سے کہا گیا جبکہ اس نے اس پر تعمیر کرلی ۔کیا وہ تکیہ کی اس زمین کا حق دار ہوسکتا ہے یا وہ اس کا کچھ معاوضہ دے کر اس کو رکھ سکتا ہے، جب کہ اس نے اس کا معاوضہ پردھان کو دے دیا تھا، اس کے بارے میں شریعت کی رو سے کیا حکم ہے؟

سعید احمد (مقام کھیڑا افغان سہارنپور)

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال وہ زمین مسجد ہی کی شمار ہوگی، اگر پردھان کی غلطی سے اس زمین پر کسی مسلمان کا گھر بن گیا ہے تو اب اس گھر کو گرانے کا حکم نہیں دیا جائے گا، بلکہ شرعاً پردھان کے ذمہ ہے کہ ایسی ہی کوئی زمین جو سماج کی ہو مسجد کے لیے دیدے اور جب اس زمین کے عوض دوسری زمین مسجد کو مل جائے گی تو اب وہ زمین مسجد کی شمار ہوگی ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۸/ ۱۳/ ۸۷ ۱۳ھ

مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا کیسا ہے؟

میں شیرکوٹ کسی کام سے گیا، سوچا کہ نماز ادا کرلوں وضوء کر کے سنتیں ادا کیں، کچھ وقت جماعت میں باقی تھا، باہر سے ایک شخص آیا اور آ کر سلام کیا، مولوی صاحب نے جو کہ امام صاحب تھے، ایک دم اس شخص سے کہا کہ مسجد میں سلام کرنا منع

ہے، کیونکہ میں بھی مسجد میں جاتا ہوں تو سلام کرتا ہوں، کیا واقعتاً مسجد میں سلام کرنا منع ہے؟

شمشاد حسین (بیڑی، سگریٹ مرچنٹ بجنور)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد میں سلام کرنا مطلقاً منع نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں منع ہے جب ان لوگوں کو مخاطب بناکر سلام کیا جائے جو کہ قرآن کی تلاوت اور تسبیح میں مشغول ہیں یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں: ”**والذین جلسوا في المسجد للقراءة والتسبيح أو لانتظار الصلوٰة ما جلسوا فيه لدخول الزائرين عليهم، فليس هذا أوان السلام فلا يسلم عليهم**“ (۱)، ہاں البتہ داخلہ کے لیے جو سلام ہوتا ہے اس کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں: ”**السلام علينا وعلىٰ عباد الله الصالحين، وإذا دخل الرجل في بيته يسلم عليهم علىٰ أهل بيته، وإن لم يكن في البيت أحد، يقول: السلام علينا وعلىٰ عباد الله الصالحين**“ (۲)، جب اپنے گھر میں سلام کرنے کا حکم ہے تو مسجد میں بطریق اولی ہوگا، کیونکہ مسجد میں فرشتوں کا ہونا ظاہر وغالب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۳/۱۴۰۱ھ

کسی کا مکان وغیرہ توڑ کر جبراً مسجد تعمیر کرنا:

میرے پاس ایک مکان تھا جس کا مالک میں تھا اور دو یتیم بچوں کے نام کر دیا تھا، مگر محلّہ کے چند لوگوں نے اس مکان کو توڑ کر مسجد بناڈالی ہے، کیا اس صورت میں مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

نذیر احمد (جیوا تھ مظفرنگر)

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی کا مکان اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر توڑ کر مسجد بنالینا جائز نہیں ہے اور اگر واقعہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے

ما کان“ (الدر المختار علی الشامی، ۱/ ۴۵۴، کتاب الصلوۃ)۔

۱- فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۳۲۵۔

۲- فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۳۲۵۔

ایسا کیا ہے ان پر لازم ہے کہ مالکِ مکان کو راضی کر کے اس سے اجازت لے لیں اور راضی کرنا اگر چہ قیمت دے کر ہو جب بھی قیمت دے کر راضی کرنا لازم رہے گا، ورنہ سب لوگ عاصی و گنہگار ہوں گے اور نماز بکراہت ادا ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۳/۱۴۰۰ھ

غیر مسلم کی رقم مسجد میں لگانا:

اگر کوئی غیر مسلم بطور امداد کے مسجد میں کچھ دے تو مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر غیر مسلم مسجد کی امداد کو اپنے عقیدے میں اچھا اور نیک کام قرار دیکر کرتا ہے اور اس سے لینے کی وجہ سے خطرہ نہیں ہے کہ یہ آئندہ مسلمانوں سے پوجا پاٹ وغیرہ کے لئے یا کسی دنیوی غلط کام میں مسلمانوں کو استعمال کرے گا تو اس کی امداد لے لینا بلا شبہ جائز و درست ہوگی، ورنہ کسی لطیف حیلہ سے ٹلا دیا جائے کہ بد اخلاقی اور بدنمائی بھی نہ ہو اور کام بن جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱/۱۴۰۴ھ

کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا اور اس کو ایصالِ ثواب کرنا:

اگر کوئی غیر مسلم کسی مسجد میں پنکھا یا کوئی اور چیز اس طرح کی ایصالِ ثواب کے لیے دے دے اور اس پر اپنا نام بھی درج کرا دے، تو کیا یہ جائز ہے، نیز مسجد میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

حافظ عبدالغفار (سورج کنڈ سردھنہ میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر کے لیے یا اس کے کسی کام کے لیے کوئی چیز دینے کو اپنے عقیدہ

میں نیک کام سمجھ کر دے اور اس سے یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا یا ان پر احسان جتلائے گا تو اس کا مسجد کے لیے دینا جائز رہے گا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا بھی صحیح رہے گا (۱)، باقی غیر مسلم کو مرنے کے بعد ایصال ثواب کرنا درست نہیں ہے (۲)، اس لیے ایصالِ ثواب کرنے کے لیے درست نہ ہوگا، اسی طرح اپنے نام کا کتبہ وغیرہ لگانے کی شرط لگاتا ہے تو اس صورت میں بھی لینا درست نہ ہوگا۔

مسجد میں جو چیز دی جاتی ہے اس کا ثواب ملتا ہے، اب ایصالِ ثواب پر دینے کا کیا مفہوم ہے، واضح ہونے کے بعد جواب ہو سکے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۸/۱/۱۲ھ
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتاحی

مسجد کی چھت پر امام کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں:

ایک مسجد ہے، اس کے دائیں اور بائیں دونوں جانب سڑکیں ہیں اور جدار قبلہ کے آگے مسجد کی کوئی زمین نہیں ہے، ایک صاحب اس میں امامت کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ تعمیر کرایا جا سکتا ہے یا نہیں؟　　　محمد نجم الدین (علی گڑھ)

۱- حنفیہ کے نزدیک کافر کے وقف کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک قربت ہو، ظاہر ہے کہ مسجد میں خرچ کرنا جیسے مسلمانوں کے نزدیک قربت ہے کفار وہنود جو کچھ مسجدوں میں دیتے ہیں وہ بھی اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے کفار وہنود بھی مسجدوں میں خرچ کرنے کو قربت اور قابل ثواب جانتے ہیں۔

"قوله: وأن يكون قربة في ذاته الخ قال الشامي: فتعين أن هذا شرط في وقف المسلم فقط، بخلاف الذمي لما في البحر وغيره: أن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء أو على مسجد القدس، بخلاف الوقف على بيعة فإنه قربة عندهم فقط، أو على حج أو عمرة فإنه قربة عندنا فقط، فأفاد أن هذا شرط لوقف الذمي فقط، لأن وقف المسلم لايشترط كونه قربة عندهم بل عندنا كوقفنا على حج وعمرة، بخلافه على بيعة فإنه غير قربة عندنا بل عندهم" (فتاویٰ شامی ۳/ ۳۶۰ کتاب الوقف)، عبارت مذکورہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے نیز معلوم ہوا کہ جس طرح اہل کتاب کے نزدیک بیت المقدس میں صرف کرنا کار ثواب ہے اسی طرح ہندوستان کے کفار کے نزدیک بھی مساجد میں خرچ کرنا قربت ہے اسی وجہ سے سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے کفار ہنود کے روپیہ کو مسجد میں صرف کرنا جائز لکھا ہے کما فی فتاویٰ گنگوہی بقدوۃ (مرتب)۔

۲- مشکوۃ شریف میں وارد ہوا ہے کہ ایک شخص کافر نے سو غلام آزاد کرنے کی وصیت کی تھی، اس کے بیٹے نے حضورؐ سے پوچھا: "فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنه لو كان مسلماً فأعتقتم عنه أو تصدقتم أو حججتم عنه بلغه ذلك"، (رواہ ابو داؤد) یعنی آپ نے فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کو اعتاق وصدقہ وحج کا ثواب ملتا اور جب کافر کو ثواب نہیں ملے گا تو ایصال ثواب کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں ہے (۱)، درمختار وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، ہاں غسل خانہ، وضو خانہ، استنجا خانہ وغیرہ جو فناء مسجد کے درجہ کی عمارت ہو، اس کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ جو جگہ ایک مرتبہ عین مسجد ہو جاتی ہے، یعنی محض نماز و ذکر وغیرہ عبادات خالصہ محضہ کے لیے وہ قیامت تک کے لیے تحت الثریٰ سے لے کر عنانِ سماء تک مسجد ہو جاتی ہے، کما فی کتب الفقہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۴/ ۱۴۰۶ھ

مسجد یا مدرسہ کی رقم شیئرز میں لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

کیا کسی مدرسہ یا مسجد کی رقم اس بازارڈاک کے شیر ''حصص'' میں لگا کر اس میں سے مدارس اور مسجد کے لیے نفع حاصل کرنا جائز ہوگا؟

محمد خیر الاسلام (دارالافتاء دارالحدیث نوگاؤں آسام)

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسجد یا مدرسہ کے پیسہ سے بازارڈاک ''حصص'' خریدنا چند وجوہ درست نہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ دینے والے کی منشا عموماً یہ ہوتی ہے کہ اس کا پیسہ بعینہٖ اس کارِ خیر میں صرف ہو اور یہ چیز اس کی منشا کے خلاف ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کبھی نقصان ہوگا تو ان لگانے والوں پر ضمان واجب الادا ہوگا جو جھگڑے اور نزاع کا سبب ہوگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ڈاک میں جو چیز ''سودا'' مبیع مثمن ہے وہ نہ تو موجود ہوتی ہے نہ مملوک و مقبوض یا معلوم

۱- ''لو بنیٰ فوقه بیتاً للإمام لایضر، لأنه من المصالح، أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع، ولو قال: عنيت ذالک لم یصدق تاتار خانية'' (الدر المختار ۳/ ۳۷۱) ''وكره تحريما الوطء فوقه والبول، والتغوط، لأنه مسجد إلیٰ عنان السماء، قال الشامي تحت قوله إلى عنان السماء: بفتح العين وكذا إلیٰ تحت الثریٰ كما في البيري عن الاسبيجابي'' (فتاویٰ شامی، ۱/ ۴۴۱، مطلب فی أحکام المساجد)۔

کچھ بھی نہیں ہوتی اور بیع مالم یملک، وبیع مالم یوجد، وبیع مالم یقبض، بیع مجہول نا جائز ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

مساجد میں قمقمے وغیرہ لگانا شرعی نقطۂ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

آج کل مساجد میں قمقموں اور دیگر آرائش کی چیزوں کا لگایا جانا بکثرت جاری ہے، شرعی نقطۂ نظر سے ان چیزوں کا مساجد میں لگانا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

مسجدوں میں ضرورت سے زیادہ قمقمے لگانا اسراف کے حکم میں ہے اور ضرورت کے مطابق لگانا جائز رہے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مسجد کو شہید کرنا:

بينوا القول المفتىٰ به في مذهب الاحناف لاثنتان أسئلة آتية:

(۱)　"هل يجوز هدم المسجد الذي لم يبل للإعادة ثانياً"۔

مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا:

(۲)　"هل يجوز نقل المسجد من موضع الىٰ موضع آخر"۔

عبدالغفور مولوی (گوپال گھاٹ، کیرالہ)

۱-　"ويؤيده ما في الهداية: ولا يجوز بيع السمک قبل أن يصطاد، لأنه باع مالا يملكه ولا في حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد، لأنه غير مقدور التسليم، ولابيع الطير في الهواء، لأنه غير مملوک قبل الاخذ" (الهدايه مع الدرايه، ۳۳ ج ۳ باب البيع الفاسد)۔

۲-　"ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها" (فتاوی شامی ۱/ ۴۴۳، مطلب فی احکام المساجد)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-لایجوز هذ الغیر الباني کما في الدر المختار: أراد أهل المحلة نقض المسجد وبنائه أحکم من الأول أن الباني من أهل المحلة لهم ذالک وإلا لا، وفي رد المحتار عن الهندية:'' مسجد مبنی أراد رجل أن ينقضه ويبنيه أحكم، ليس له ذالک، لأنه لاولاية له، إلا أن يخاف أن ينهدم إن لم يهدم''(۱)۔

۲-''لایجوز هذا، لأن المسجد يبقى مسجدا عند الإمام والثاني: (أبي يوسف) أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتیٰ هذا في الدر من كتاب الوقف''(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شہید شدہ مسجد کے ملبوں کو فروخت کرنا؟

۱-انهدم المسجد أو هدم ولم يكن بناء المسجد الجديد في طراز جديد، هل يجوز في هذه الحالة بيع أشياء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغير ها؟

عبدالغفور مولوی (پالگھاٹ، کیرالہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

لایباع في هذه الحالة أشياء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغيرها بل ينقل إلى مسجد آخر يحتاج إليها بعد المشورة من أهل المحلة وأراكين المسجد۔

نعم إن لم يكن هناک مسجدمحتاج ويضيع تلک الأشياء إن لم يبع، فيباع بعد مشورة الأراكين وأهل المحلة بقيمة مناسبة، وتحفظ تلک القيمة إن أمكن بناء المسجد الجديد وإلا يرسل إلیٰ مسجد اخر يحتاج إلى ذالک، وهذا يؤخذ من الدرو الرد وغير ها من كتب الفتاویٰ المعتبرة

۱- شامی ۳/ ۳۷۰ کتاب الوقف۔

۲- ''ولو خرب ماحوله واستغنی عنه يبقیٰ مسجد أ عند الأمام والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتیٰ ''حاوی القدسي'' (الدرالمختار علی الشامی ۳/ ۳۷۰ کتاب الوقف) (مرتب)۔

عند الأحناف (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۳/ ۱۴۰۱ھ

احکام المساجد سے متعلق اہم مفصل فتویٰ:

ہمارے موجودہ شہر کے بالکل وسط میں ایسا علاقہ ہے جس کے چاروں طرف بازار ہے، سامنے عمارات بنائے معدوم کی شاندار پرشکوہ عمارت ہے اور اطراف سے شہر میں آنے والی بسوں کا اسٹینڈ بھی اس کے قریب ہے، بس اور ٹرافک سے ایسے بھرپور علاقہ میں کھجوری نامی مسجد تاریخی واقع ہے، مذکورہ مسجد کے چاروں طرف مسجد کی مملوک زمین پر دکانیں ہیں جو سالہا سال سے کرایہ پر دی ہوئی ہیں، حکومت کے ضابطہ قانون کی رو سے مسجد کی توسیع کے لیے ان دکانوں کا قبالہ مسجد کو حاصل ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے، جائے وقوع کی درج بالا خصوصیات کی وجہ سے نمازیوں کی کثرت تعداد کی بناپر موجودہ مسجد بالکل ناکافی ہونے اور آج سے بیس سال قبل کے فرقہ وارانہ فساد میں اس کو کافی نقصان پہونچنے نیز اس کی عمارت نہایت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے مسجد عرصہ دراز سے ازسر نو تعمیر طلب تھی، قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی تعمیر نومؤخر ہوتی رہی اور اب اس کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے، موجودہ مسجد نمازیوں کی تعداد کی بنسبت نہایت تنگ ہے اور اس میں ہوا، روشنی وغیرہ کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی حبس رہتا ہے اور تاریکی بھی رہتی ہے، دکانوں سمیت مسجد کی مملوک زمین کا مجموعی ایریا (علاقہ) پانچ

---

۱ — "ومثله حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد، والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض" (الدرالمختار علی هامش الشامی، ۳۷۱ ج ۳ کتاب الوقف) (مرتب)۔

"قال الشامي تحت قوله ومثله حشيش المسجد: أي الحشيش الذي يفرش بدل الحصر كما يفعل في بعض البلاد، قال الزيلعي :وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه إذا استغنى عنهما يرجع إلى مالكه عند محمد وعند ابي يوسف ينقل إلى مسجد آخر وعلى هذا الخلاف الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما وصرح في الخانية بأن الفتوىٰ على قول محمدؒ، قال في البحر: وبه علم أن الفتوىٰ على قول محمدؒ في آلات المسجد وعلىٰ قول أبي يوسف في تأبيد المسجد۔ والمراد بآلات المسجد نحو القنديل والحصير، بخلاف أنقاضه لما قدمنا عنه قريباً من ان الفتوىٰ على ان المسجد لايعود ميراثاً، ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر" (فتاوی شامی ۳/ ۳۷۱ کتاب الوقف)۔

"والذي ينبغي متابعة المشائخ المذكورين في جواز النقل بلافرق بين مسجد أوحوض، كما أفتىٰ به الإمام أبو شجاع ولا سيما في زماننا فإن المسجد أوغيره من رباط أو حوض إذا لم ينقل يأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد، وكذالك أوقافه ياكلها النظار أوغيرهم" (فتاوی شامی ۴/ ۳۷۲ کتاب الوقف) (مرتب)۔

ہزار اسکوائر فٹ ہے، جس میں سے بارہ سو اسکوائر فٹ علاقہ پر مسجد واقع ہے اور باقی اڑتیس سو اسکوائر فٹ علاقہ پر دکانیں ہیں جن پر کرایہ دار قابض ہیں، نمازیوں کی تعداد کے اعتبار سے موجودہ مسجد کی چارگنی توسیع اشد ضروری ہے۔

مسجد کی دکانیں مسجد کی ملکیت ہونے کے باوجود ناممکن الحصول ہونے کی وجہ سے تحتانی مسجد کی توسیع بالکل ناممکن ہے، اب توسیع کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ مسجد کے اوپر ایک منزل تعمیر کرلی جائے اور مسجد سے ملحقہ دکانوں کی چھت والا حصہ فوقانی مسجد میں شامل اور داخل مسجد کرلیا جائے۔

بایں طور کہ تحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کی توسیع بقدر کفایت وضرورت ممکن ہے، پھر فوقانی مسجد کی یہ توسیع صرف جانب مشرق میں ممکن نہیں بلکہ جانب غرب ''سمت قبلہ'' ہی میں ممکن ہے، نیز کما حقہ دائیں بائیں جانب بھی ممکن نہیں، اب مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے جانب غرب ہی میں فوقانی مسجد کی تعمیر کا نقشہ تیار کیا ہے، تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد کی تحتانی اور فوقانی دونوں منزلیں پنج گانہ نماز باجماعت میں امام کے تحتانی مسجد میں امامت کے لیے کھڑے رہنے کی صورت میں فوقانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ میں واقع صفوف کا تقدم علی الامام لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں، علاوہ ازیں توسیع کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ لہٰذا درج ذیل امور دریافت طلب ہیں:

۱-جانب غرب دکانوں کی چھت پر واقع فوقانی مسجد کا توسیع شدہ حصہ صحتِ اعتکاف وغیرہ دیگر احکام مسجد کے اعتبار سے مسجد شرعی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ بعض حضرات کو درج ذیل عبارت: '' **وحاصله أن شرط كونه مسجداً أن يكون سفله وعلوه مسجد الينقطع حق العبد منه لقوله تعالىٰ: وأن المساجد لله، بخلاف ما إذا كان السرداب أو العلو موقوفاً لمصالح المسجد، فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر الرواية وهناك روايات ضعيفة مذكورة في الهداية والبحر الرائق** (ج۵ كتاب الوقف باب احكام المساجد ۱۷، رد المحتار ج۳ مطبوعہ نعمانیہ دیوبند احکام المساجد ۳۷۰) کی وجہ سے مذکورہ فوقانی مسجد کی دکانوں پر توسیع شدہ حصہ کو عدم انقطاع حق عبد کی وجہ سے مسجد شرعی قرار دینے میں تامل ہے۔

۲-اگر مسجد فوقانی کا مذکورہ توسیع شدہ حصہ مسجد شرعی نہ ہو تو اشکال یہ ہے کہ بناء ابتدائی اولین تعمیر کے وقت شروط مذکورہ فی کتب الفقہ کی رعایت کے ساتھ تحتانی حصہ مسجد میں کرایہ کی دکانیں وغیرہ بنانا جائز ہے اور فوقانی حصہ مسجد شرعی ہوگا، حالانکہ یہاں بھی تو دکانوں والے تحتانی حصہ کے ساتھ بالکلیہ انقطاع حق عبد نہیں ہے، لہٰذا بناء ابتدائی اور بناء ثانی کی توسیع مسجد فوقانی میں وجہ فرق کیا ہے؟

۳-اگر مسجد فوقانی کا مذکورتوسیع شدہ حصہ مسجد شرعی ہوتو مذکورہ بالا حالت میں مفتی اعظم ہند حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے درج ذیل فتوی کی بنیاد پر امام کو تحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ کے اندر فرض نماز با جماعت میں کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں؟

نقل فتوی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ:

سوال: مسجد کی چھت پر نماز با جماعت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مسجد کی چھت پر نماز کی جماعت جائز ہے اور اگر گرمی وغیرہ کے عذر کی وجہ سے ہوتو کسی قسم کی کراہت بھی نہیں ہے، البتہ بلا عذر ہوتو اس بنا پر کہ جماعت کی اصلی جگہ نیچے کا درجہ اور محراب ہے اوپر جماعت کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

جواب: از حبیب المرسلین نائب مفتی:

تشریح اس کی یہ ہے کہ گرمی کی ایسی شدت ہو کہ خشوع وخضوع قائم نہ رہے تو مسجد کی چھت پر نماز با جماعت وسنن ونوافل پڑھے تو مکروہ نہ ہوں گے اور اگر اس قسم کی شدت نہ ہوتو مسجد کی چھت پر نماز با جماعت وغیرہ مکروہ ہوگی، فتاوی عالمگیری میں ہے: "**الصعود علی کل سطح مسجد مکروہ، وهذا إذا اشتدت الحر یکرہ أن یصلوا بالجماعة فوقه إلا إذا ضاق المسجد فحینئذٍ لا یکرہ الصعود علی سطحه للضرورة**" (کذا فی الغرائب ۳۵۶/۵)۔ فقط والسلام

حبیب المرسلین (نائب مفتی مدرسہ امینیہ دہلی، کفایت المفتی، ۳/۵۵)

المستفتی: سکریٹری (مسجد سبھا شہر بڑودہ انڈوی جامع مسجد بلڈنگ بڑودہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دکانوں کی عمارت وزمین سب موقوفہ علی المسجد ہیں اور مسجد سے بالکل متصل ہیں اور مسجد کی توسیع کی اشد ضرورت ہے اور مع ان مکانوں کے توسیع مسجد ناگزیر ہے، مگر دکان دار دکان خالی نہیں کر رہے ہیں اور قدیم مسجد اتنی چھوٹی ہے کہ اس پر دو منزلہ عمارت بنا کر بھی ضرورت توسیع پوری نہ ہوگی۔

ایسی صورت میں دکان خالی نہ کرنے والے شرعاً غاصب اور گنہگار رہیں گے، پھر اس میں محض اوپر مسجد بنالی جائے

تو یہ حصہ مسجد شرعی نہ ہوگا کیونکہ مسجد شرعی ہونے کے واسطے شرط ہے کہ مسجد کے نیچے اور اوپر سب کا سب مسجد ہو **کما فی البحر** (۵/۲۷۱): ''**وحاصله أن شرط كونه مسجداً أن يكون سفله وعلوه مسجداً لينقطع حق العبد**''
اور یہاں ایسا نہ ہوگا، کیونکہ ان دکانوں میں بیع وشرا بھی ہوگا اور ان میں حائضہ نفساء اور جنبی کا آنا جانا بھی ہوگا اور ان میں بول وبراز وغیرہ سارے ہی اعمال جو مسجد میں ممنوع ہیں، ہوسکیں گے، لہٰذا اتخلاص نہ ہوگا اور ذمہ داران مسجد کے تخلیہ سے عاجز ہونے کی وجہ سے ان تمام معاصی کا بدترین وبال آخرت میں عذاب ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی دکان نہ خالی کرنے والوں پر عذاب میں پڑجانے کا قوی اندیشہ ہے اور عجب نہیں کہ آیت کریمہ: ''**إنما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر**''(۱) کے خلاف کرنے پر علاوہ عذاب آخرت کے دنیا میں کسی شدید ترین وبال میں ابتلاء نہ ہوجائے۔

نیز چوں کہ ذمہ داران مسجد تخلیہ سے عاجز ہوں گے، اس عجز کی وجہ سے اور توسیع شرعاً ہونے کی وجہ سے ان دکانوں پر مسجد بنالینے کی بنا پر یہ ذمہ داران عنداللہ'' **لايكلف الله نفساً الا وسعها**''(۲)، ''**ولا تزر وازرة وزر اخرىٰ** (۳)'' کے مطابق ماخوذ وگنہگار نہ ہوں گے۔

البتہ یہ مسجد تحت الثریٰ تک شرعی مسجد شمار ہوگی اور اس پر نماز با جماعت ادا کرنا درست رہے گا اور انشاء اللہ سب کو شرعی مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب ملے گا اور جو کچھ وبال ہوگا وہ سب دکان خالی نہ کرنے والوں پر شرعاً ہوگا۔

اتنی تمہید کے بعد استفتاء میں مذکورہ تینوں نمبروں کا حکم خود بخود نکل آیا، کیوں کہ اس تمہید سے اس نو تعمیر مسجد کا مسجد شرعی ہونا واضح ہوگیا اور تینوں نمبروں کا اشکال اس نو تعمیر مسجد کے مسجد شرعی نہ ہونے کا یقین یا اس میں شک واقع ہونے پر تھا اور وجہ اشکال تو خود بخود ختم ہوگئی، پس امام اگر جانب غرب میں دکان کے اوپر کھڑا ہو اور مقتدی خواہ نو تعمیر حصہ پر رہیں یا قدیم مسجد کے حصہ پر سب کی نمازیں بلا کراہت ادا ہوں گی، اسی طرح نو تعمیر حصہ میں اعتکاف وغیرہ جملہ امور صحیح ہوں گے۔

هذا ما عندي من الشرع الشريف فإن كان صوابا فمن الله وإن كان خطأ فمن نفسي فنتبرأ منه فحينئذ يرجعون الى غيري، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۹/۹/۱۲ھ

۱- سورۂ توبہ ۱۸۔
۲- سورۂ بقرہ ۲۸۶۔
۳- سورۂ اسراء ۱۵۔

مسجد میں پینٹ کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

آج کل مساجد میں پینٹ کا استعمال بکثرت جاری ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد میں ایسا پینٹ استعمال کرنا جس میں بدبو ہوتی ہو ممنوع ہے، اگر بدبو زیادہ دیرپا ہو تو ناجائز اور استعمال مکروہ تحریمی ہوگا جس سے اجتناب لازم ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محراب سے مراد کیا ہے؟

محراب سے مراد کیا ہے؟ مسجد کے ہر در میں جو محراب خانہ کنارہتا ہے جس میں لوگ آتے جاتے ہیں، محراب کی تعریف میں آتا ہے، یا پچھلی دیوار کے درمیان ممبر کے قریب جو محراب بنی رہتی ہے صرف وہی محراب ہے، وضاحت فرمائیں! اور یہ بھی واضح کریں کہ ممبر کے قریب کی محراب کے علاوہ مسجد کے دوسرے در میں اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اور اس کے صحن میں مقتدی کھڑے ہوں تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پور، صدر، اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

قبلہ کی دیوار میں بالکل درمیان میں جو محراب نما بنایا جاتا ہے وہ مراد ہے، تاکہ امام کے درمیان دونوں طرف صفوں کی مقدار برابر رہے۔ پس اس محراب کو چھوڑ کر اور جگہ یا کسی اور در میں کھڑے ہونے سے اگر امام کے دونوں جانب کی صفیں

۱- "وأكل نحو ثوم، ويمنع منه، وكذا كل موذ ولو بلسانه، قال الشامي تحت قوله "وأكل نحو ثوم": أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان أكل الثوم والبصل المسجد إلى قوله: ويلحق بما نص عليه في الحديث كل ماله رائحة كريهة ماكولا أو غيره، وإنما خص الثوم هنا بالذكر" (فتاویٰ شامی، ۱/ ۴۴۴)، مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ ہر بدبودار چیز کھا کر بدبو جانے سے قبل مسجد میں جانا مکروہ ہے اور علت بدبو ہے لہٰذا بدبودار پینٹ کا استعمال مکروہ ہے چونکہ عبارات میں ماکولاً کے ساتھ أو غیرہ کی بھی قید ہے (مرتب)۔

برابر نہ رہیں، کم وبیش ہوجائیں، تو کراہت تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اسی طرح اگر کسی درمحراب نما کے اندر امام کھڑا ہو اور سب مقتدی باہر صحن میں کھڑے ہوں تو اگرچہ تعادلِ طرفین حاصل ہو مگر اساءت ہوگی اور کراہت ہوگی ورنہ کوئی حرج نہ ہوگا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۳/ ۱۴۰۱ھ

غیر مسلم کا چندہ مسجد میں لگانے کا حکم:

کافر غیر مسلم کا روپیہ چندہ لے کر مسجد میں خرچ کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کافر اگر اپنے عقیدہ کے مطابق ثواب سمجھتا ہے اور بدلہ لینے یا احسان وغیرہ رکھنے کا احتمال نہ ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں ہے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

بحالت کفر کمایا ہوا پیسہ اور اس کو مسجد ومدرسہ میں صرف کرنا کیسا ہے؟

ایک نومسلم کفر وشرک کی حالت میں تھے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو اپنی دولت بھی ساتھ لیتے آئے، ان کے اس مال ودولت کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اگر وہ اس دولت کو اسلامی نیک کاموں مثلاً مسجد یا مدرسہ میں خیرات کریں تو کیا حکم ہے؟ اور مدرسہ ومسجد والوں کو ایسی رقم لینی چاہیے کہ نہیں، اگر لے لیا ہو تو کیا کریں؟

محمد ابراہیم باوا (لندن)

۱- ''السنة أن يقوم في المحراب ليعتدل الطرفان، ولو قام في إحدى جانبي المسجد يكره (فتاویٰ شامی، ۱/ ۳۸۲، باب الإمامة)۔

۲- ''وأن يكون قربة في ذاته ...... إن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم'' (شامی ۳/ ۳۹۷، مکتبہ عثمانیہ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی مذہب میں حلال و جائز نہیں ہوتے اور ان پر کسی مذہب میں ملکیت صحیح قائم نہیں ہوتی، جیسے چوری کا پیسہ، ڈاکہ اور غصب کا پیسہ۔

ایسا پیسہ بحالت کفر بھی کمایا ہوا اگر کوئی نومسلم اپنے ساتھ لائے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کی ملک میں کسی مناسب انداز سے پہنچا دیں(۱)۔ اگر یہ ممکن نہ ہو اور مالک ثواب پانے کا اہل ہو مثلاً ''مسلمان ہو'' تو اس کو ثواب پہونچانے کی نیت سے صدقہ کردے اور اگر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مالک مسلم ہے یا کافر تو ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کر کے جلد از جلد اپنی ملک سے نکال دے(۲)۔

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ مسلمان کے لیے شرعاً حلال و جائز نہیں ہوتے اور غیر مسلم کے لیے حلال و جائز ہوتے ہیں اور غیر مسلم اس کا مالک بملک صحیح ہو جاتا ہے، جیسے شراب کے کاروبار کا پیسہ، خنزیر کے کاروبار کا پیسہ، ایسا پیسہ ان کے لیے حلال و جائز ہوتا ہے(۳)، اور اس پر مالک بملک صحیح ہو جاتے ہیں۔

اگر کفر کی حالت کا پیسہ لے کر مسلمان ہو جاویں تو اس کے صحیح مالک ہو گئے ہیں اور جس نیک کام میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں، مسجد میں، مدرسہ میں ہر جگہ خرچ کر سکتے ہیں، یہی حکم ان کے گانے بجانے کے پیسہ کا بھی ہے، اس لیے کہ وہ اس کے صحیح مالک ہو گئے تھے اور وہ ان کے لیے حلال و جائز تھا اور مسلمان ہونے کے بعد قدیم مسلمان بھی وہ پیسہ ان سے لے سکتا ہے اور نہیں نیک کاموں میں خرچ کر سکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۰ھ

۱- ''ویردونها أي: الأموال الخبيثة إلی أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه'' (فتاویٰ شامی، ۵/ ۲۴۷)۔

۲- ''وأما إذا کان عند رجل مال خبیث فإما إن ملکه بعقد فاسد أو حصل له بغیر عقد ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه ویرید أن یدفع مظلمته عن نفسه فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء ''إلی قوله'' ولکن لا یرید بذلک الأجر والثواب، ولکن یرید دفع المعصیة عن نفسه ویدل علیه مسائل اللقطة'' (بذل المجہود فی حل ابی داؤد ۱/ ۳۷ کتاب الطہارۃ)۔

۳- ''لانا أمرنا بترکهم وما یعتقدون'' (الدر المختار مع الشامی ۲/ ۳۸۷ باب نکاح الکافر)۔

غیر مسلم کا روپیہ مسجد میں لگانا:

کافر کا روپیہ مسجد کی تعمیرات میں لگنے کی کیا صورتیں ہیں جائز ہے یا کہ نہیں؟

مفتی حسن انصاری (مقام گڈھی سیلم پور، مرادآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

غیر مسلم اگر مسجد میں روپیہ وغیرہ دینا اپنے عقیدہ میں نیک کام سمجھتا ہے اور لے لینے میں یہ خطرہ نہ ہو کہ آئندہ وہ اپنے پوجا پاٹ کے لئے امداد طلب کرے گا یا اس کے دباؤ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا تو اس کا روپیہ لینا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا جائز ہے ورنہ احتیاط و اجتناب لازمی ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۱۴۰۰ھ

خادم مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی آمدنی امام و معلم پر صرف کرنا:

۱- پیر مرحوم جناب خورشید صاحب نے بوقت تعمیر چودہ بنگلہ میں دھلائی بازار مسجد بنوانے کے لئے اطراف کے لوگوں سے روپیہ و زمین چندہ میں جمع کیا، مسجد اور اس کے متعلقات کاموں سے فارغ ہو کر سات کدار چار جستی زمین چندہ جمع کیا مسجد اور اس کے متعلقات کے لئے خرید کیا اور وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کا خادم استعمال کرے، اس وقت اس مسجد کے اطراف میں کوئی مسلم مقیم نہیں تھا صرف غیر مسلم کا ہجوم تھا اب کچھ مسلمان مقیم ہو گئے ہیں، ان کے لئے امام اور بچوں کی تعلیم کی ضرورت ہے، نیز ان کے لئے مستقل تعلیم کا انتظام کرنا ناممکن ہے، لہذا اس علاقہ کے اصحاب کی صلاح و مشورہ سے ان کی آمدنی کو امام اور معلم دونوں پر تقسیم کرنا جائز ہے یا کہ نہیں یا ایسے امام متعین کر لے کہ دونوں کام انجام دے سکے اور بچوں کی تعلیم بھی انجام دے سکے۔

مسجد کی زمین غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا:

۲۔ مذکورہ مسجد صرف بازاری لوگوں کے لئے بنوائی گئی تھی، اس وقت بازار دوسری جگہ ہونے کا اندیشہ ہو رہا ہے اگر

۱- ’’وأما الإسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم‘‘ (البحر الرائق ۵/ ۳۱۶ مطبوعہ مکتبہ زکریا، نیز دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۳۵۲، شامی ۶/ ۵۲۲)۔

دوسری جگہ ہوجاوے تو کوئی مسلم یہاں نہیں رہیں گے، اس وقت مسجد کی جگہ کی حفاظت کرنا جوضروری ہے مشکل ہوگئی ہے، لہذا مذکورہ جگہ غیر مسلم سے فروخت کرنے کے لئے کوئی صورت جواز کی ہے یا نہیں، واضح ہو کہ مذکورہ نصف کدارزمین مالک نے مسجد کے لئے وقف کیا تھا، اس سے کچھ زمین غیر مسلم کے قبضہ میں نیز بوقت تبدیل مقبوضہ زمین غصب ہوسکتی ہے۔

۳۔ دریافت ہے کہ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے لئے چندہ ہوا ہے اور وقف نامہ میں شرط لگائی گئی ہے کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کے خادم استعمال کرے۔

مسجد کے خادم امام، موذن فراش وغیرہ تو ہوسکتے ہیں لیکن بچوں کے معلمین نہیں ہوسکتے ہیں، لہذا اس آمدنی سے معلمین کی تنخواہیں نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے اگر انتظام کرنا ہے تو دوسرا انتظام کرنا ضروری ہوگا، شرائط واقف کا لحاظ جب تک نص شرعی کے خلاف نہ ہو واجب ہے کما ہو مصرح فی الفقہ (۱)۔

۲۔ کوئی زمین جب مسجد ہوجاتی ہے تو قیامت تک کے لئے مسجد ہوجاتی ہے، اس کو فروخت کرنا یا کسی دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہوتا، بلکہ جس طرح ممکن ہو حفاظت ہی کرنا واجب رہے گا علی القول المفتی بہ (۲)، جب خدانخواستہ وہاں مسلم آبادی بالکل نہ رہے، اس وقت اس جزء کا سوال کر کے جواب معلوم کرلیں۔

۳۔ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

۱- ''شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع'' (شامی ۳/ ۴۹۹، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- ''المسجد لایخرج عن المسجدية ابداء (شامی لاتجيم ۳/ ۵۳۱، مطبعه عثمانيه)، "قال أبو يوسف: ان المسجد اذا خرب واستغنى الناس عنه يبقى مسجدا إلى يوم القيمة كذا في البدائع، وقول ابي يوسف يبقى المسجد بعد خرابه والمفتى به كما صرح به في الحاوي القدسي'' (البحر الرائق ۴/ ۵۰۴)، لاخلاف فی بطلان بیع الوقف لانہ لایقبل التملیک والتملک (شامی ۴/ ۴۲۴، مطبعہ عثمانیہ)۔

۱-مسجد کی موقوفہ زمین کا تبادلہ:

اسکول یا مدرسہ کے متصل مسجد کی کچھ زمین ہے ان زمینوں کو اسکول کی ضرورت ہونے کی بناء پر اس کے بدلہ میں مسجد کو دوسری جگہ دوسری زمین دی جاسکتی ہے یا کہ نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ وہ زمین اسکول کے متصل ہونے کی وجہ سے پیداواری میں بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

۲-مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی وصیت کی تو کیا اس سے رجوع صحیح ہے:

کسی شخص نے ایک بیگھہ زمین اس طریقہ سے وقف کی کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہوجائے گی، اب سوال یہ ہے کہ وہ شخص اپنی زمین ہی میں اپنی زندگی ہی میں وقف مسجد کو باطل کر کے کسی دوسری جگہ وقف کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- جو زمین مسجد کی ہوجاتی ہے اس کو دوسری زمین سے تبدیل کرنا یا کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنا خواہ کوئی دینی ہی مدرسہ کیوں نہ ہو جائز نہیں ہے، ہاں اگر نقصان کا قوی اندیشہ ہو اور مسجد کو خود اس زمین کی نہ اس وقت کوئی ضرورت ہو اور نہ آئندہ ضرورت ہونے کی توقع، پھر اور تبدیل کرنے میں مسجد کا زیادہ نفع ہو پھر تو وہاں کے ذمہ دار و دیندار مسلمانوں کے مشورہ سے تبدیل کرسکتے ہیں (۱)، بلا مشورہ تنہا متولی یا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے یا اسی طرح بعد مشورہ مذکورہ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ اس زمین میں دینی مدرسہ کھول دیا جائے اور مدرسہ پر مناسب کرایہ رکھ کر مسجد کو دیا جائے، لیکن یہ یاد رہے کہ اس صورت میں وہ زمین مدرسہ کی نہ ہوجائے گی مسجد ہی کی رہے گی، مسجد کو جب ضرورت ہوگی خالی کر کے اپنا قبضہ وتصرف سب اس پر کرسکتی ہے۔

۲-ان الفاظ سے وقف کرنے میں (کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہوجائے گی) وقف تام نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی حقیقت ایک وصیت کی ہوجاتی ہے اور موصی کو اپنی زندگی میں اپنی وصیت ختم کر کے دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز رہتا ہے (۲)۔

۱- "صار بحيث لاينتفع به بالكلية بان لايحصل منه شئ اصلا اولا يفي بمؤنته فهوايضا جائز على الاصح اذا كان باذن القاضي ورأيه المصلحة فيه" (شامی ۴/۳ ۵۳، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- "يصح للموصي الرجوع عن الوصية" (ہندیہ ۶/ ۹۲، رشیدیہ پاکستان)۔

اس لئے صورت مسئولہ میں یہ وقف تام نہ ہوا بلکہ وصیت کی حقیقت ہوگی جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے دوسری جگہ صرف کرسکتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد موقوفہ ہوتی ہے یا مملوکہ؟

۱- ایک صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ایک مسجد شمشاد بلڈنگ میں اپنی زمین اور اپنے پیسے سے بنوادی، محلہ کے مسلمانوں اور بازار کے دوکاندار مسلمانوں کے لئے اب یہاں کی ملکیت ہے یا وقف ہے۔

احاطہ مسجد میں امام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے:

۲- عرصہ بیس ۲۰ سال سے ان کے ورثہ نے انتظام کرنا چھوڑ دیا ہے، اس عرصہ میں آبادی بڑھی، مسجد کی ضروریات کے لئے مسلمانوں نے زمین خرید لی تھی اور انتظام بھی کرتے رہے امام بھی رکھا اور پنجوقتہ اور جمعہ کی نماز بھی ہوتی رہی ہے، نمازی بھی بڑھے اور امام کے لئے حجرہ کی ضرورت پڑی مسجد میں کوئی حجرہ نہیں ہے، اس سے امام کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لہذا کمیٹی نے اندرون مسجد میں برآمد اور حجرہ ہونے کی بناء ڈالی ہے اس کے اوپر ایک شخص نے اعتراض کیا ہے عرض ہے کہ کمیٹی کو اس کے بنوانے کا حق ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- مسجد قرار دیئے جانے کے بعد کسی کی ملک نہیں رہتی ہے، بنوانے والے کی بھی ملک نہیں رہتی بلکہ وقف علی اللہ اور خاص اللہ کی ملک ہوجاتی ہے (۱)۔

۲- مسجد کے صحن میں امام کے لئے یا کسی اور کام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے، واقف اور بانی مسجد کو بھی جائز نہیں ہے پھر دوسرے کا کیا شمار (۲)، ہاں نمازیوں کو دھوپ، برسات، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے سائبان بناسکتے ہیں اور صرف

۱- ''وأما حکمہ (الوقف) فعندھما زوال العین عن ملکہ إلی اللہ تعالی'' (ہندیہ ۲/ ۳۵۲، رشیدیہ)۔

۲- ''لو تمت المسجدیۃ ثم أراد البناء منع: ولو قال: عنیت ذالک لم یصدق (تاتارخانیہ) فاذا کان ھذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیجب ھدمہ'' (الدرالمختار ۱/۹ ۷ ۳، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

نماز پڑھنے کے کام میں لاسکتے ہیں، اگر امام کے لئے حجرہ کی ضرورت ہو تو انہی بزرگ سے جنہوں نے پہلے مسجد کے لئے زمین دی ہے پھر مانگ لی جائے۔

مفت نہ دیں تو قیمت دیکر لی جائے، غرض مسجد کے حدود کے اندر حجرہ امام بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی پرانی لکڑی کو فروخت کرنا:

ایک بہت پرانی مسجد ہے، اس کا کچھ حصہ شہید ہوگیا ہے منہدم ہوگیا ہے، اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پوری مسجد شہید کر کے دوبارہ بناویں، اس میں جو قدیم لکڑی لگی ہے اس کو فروخت کردیں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر لکڑی فروخت نہ کرنے سے خراب ہوجائے اور مسجد کو آئندہ کوئی ضرورت نہیں ہوگی تو اس کو فروخت کرسکتے ہیں، لیکن اس لکڑی کی قیمت کو اس مسجد میں خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ مہذب (ص ۴۵۱) میں ہے: "**والثاني يجوز بيعه لانه لا يرجى منفعة فكان بيعه أولىٰ من تركه الخ**"(۱)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مسجد کا متولی کون ہوگا؟

۱- زید اپنی قیمتی خاص زمین اس شرط پر حوالہ کیا کہ اس زمین پر مسجد تعمیر کی جاوے، ایک مدت کے بعد ایک مالدار آدمی نے کافی رقم صرف کر کے مسجد کی بناء ڈالی، بعد از اں دوسرے اشخاص نے بھی اپنی خاص رقموں سے مسجد کی تعمیر کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا اور بیرون مقامات سے اس کے لئے چندہ وصول کئے گئے، اب مسجد آباد ہے، اول واقف جس نے زمین

۱- "وما انهدم من بناء الوقف وآلته صرفه الحاكم في عمارة الوقف ان احتاج اليه وان استغنى عنه امسكه حتى يحتاج الى عمارته فيصرفه فيها" (عالمگیری ۲/ ۳۶۹، رشیدیہ پاکستان)۔

وقف کی مرحوم ہوگیا ہے، اس کی نسل سے چند نرینہ اولاد بھی ہیں، اب انکا دعویٰ ہے کہ مسجد بھی ہماری تولیت میں ہونی چاہئے، کیونکہ یہ زمین ہمارے والد کی ہے۔

اور مسجد کے لئے جس نے کافی رقم خرچ کی وہ کہتا ہے کہ میں نے مسجد بناڈالنے میں ۲۰۰۰ہزار روپیہ خرچ کردیا لہٰذا میں مقدم ہوں۔

۲-ہمارے شہر میں ایک مکتب ہے، یہ زید کے صرف خاص سے بناہوا ہے، اس مکتب کو چلانے کے لئے چند مکانات اور دوکانیں وقف کئے گئے ہیں۔اور تعلیم دین کی شرط بھی لگادی گئی ہے زید کی موجودگی میں آپ خود متولی بنارہا ہے زید کے بعد یکے بعد دیگرے متولی بنتے رہے ہیں اور اس مکتب کی نگرانی اور دیگر مکانات کی نگرانی ہوتی رہی، اب موجودہ متولی جوزید کے وارث سے نہیں ہے کرایہ اور مصارف میں چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے متعلق واحباب کے لئے واقف اصل زید کے وارثین میں کسی کے لئے ۳۰روپیہ کرایہ کے مکان کے ۲۰روپیہ وغیرہ رعایت کرتا ہے اور جو منشی مقرر ہے وہ بھی رشوت لیکر چھوڑدیتا ہے آیا ازروئے شریعت یہ حرکات جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اس صورت میں خاص کر جب نزاع بھی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اہل محلہ کی ایک ایسی کمیٹی بنالیجائے جس میں اول واقف کی اولاد میں سے بھی ایک دیانتدار امانتدار صالح آدمی ممبر ہو اور جس نے تعمیر میں کافی رقم خرچ کی ہے وہ بھی اس کا ممبر ہو اور ایک ایسا عالم دین جو مسجد و اوقاف کے احکام ومسائل سے واقف ہو اس کو بھی شریک کرلیا جائے اور شریعت کی روشنی اور حدود کے اندر تمام معاملات آپس کے مشورے سے طے کرلیا کریں اور اسی کے مطابق عمل کیا کریں۔

ذاتی ونفسیاتی بات کو دخل نہ دیا کریں، ہر شخص یہ خوب سمجھ لے اور ہر وقت متحضر رکھے کہ نیک کام بھی اخلاص سے قبول ہوتا ہے، نام آوری، حکومت اور بڑائی کا تخیل نیکی کو برباد اور گناہ لازم کردیتا ہے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنادیتا ہے۔

۲-اس میں بھی ۲ کی طرح ایک ایک کمیٹی بنا کر عملدرآمد کیا کریں، خیانت کے شرعی ثبوت کے بعد بھی ڈھیل دینا گناہ اور اعانت معصیت بھی معصیت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

مسجد کی آمدنی مدرسہ یا دوسرے گاؤں کی مسجد پر صرف کرنا:

ہمارے دادا نے کچھ زمین صحن مسجد میں وقف کیا تھا تا حیات وہ خود متولی رہے، ان کے بعد ہمارے والد ذاکر محمد احسن متولی ہوئے اور اس وقت متولی ہم ہیں، مسجد کی زمین کی آمدنی مسجد کے سالانہ خرچ سے زائد ہے اور مسجد کی عمارت مکمل ہے آمدنی کا روپیہ ۲۲۰۰ ہے۔

۱- مسجد کے پاس ایک مدرسہ ہے جو کہ مسجد کی آمدنی سے والد صاحب نے بنایا تھا، اب اس کی عمارت کو مرمت کی ضرورت ہے اس روپیہ سے مرمت ہو سکتا یا کہ نہیں۔

۲- قریب کے دوسرے گاؤں میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، وہاں کے لوگوں کی مالی حالت خراب ہے، کیا اس مسجد کے کچھ روپیہ اس مسجد کی تعمیر میں دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خدا کا شکر ہے اور آپ لوگوں کی مساعی نیک کا ثمرہ ہے کہ مسجد مالدار ہے، لیکن مسجد کے روپیہ سے مدرسہ کی تعمیر جو ہوئی وہ غلط اور ناجائز ہوئی، اس لئے آئندہ بھی مرمت مدرسہ مسجد کے روپیہ سے جائز نہیں ہے (۱)۔

یہ قریب کے گاؤں میں جو مسجد تعمیر ہو رہی ہے اگر وہاں ضرورت ہو اور اس مسجد کو جس کا روپیہ ہے مستقبل میں ضرورت متوقع نہیں ہے اور نہ اس وقت کچھ دقت پیش آنے کا احتمال ہے تو اس مسجد پر خرچ کر سکتے ہیں (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''الواجب أن یبدأ بصرف الفرع الی مصالح الوقف من عمارته واصلاح ماوهي من بنائه وسائر مؤوناته التي لابد منها'' (بدائع الصنائع ۵/ ۳۳۰)۔

۲- ''الفتوی علی أن المسجد لایعود میراثا ولایجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر'' (شامی ۳/ ۵۱۳)، اس کے اگلے صفحہ پر ہے: ''والذي ینبغي متابعة المشائخ المذکورین في جواز النقل بلا فرق بین مسجد أو حوض کما أفتی به الإمام أبو شجاع والإمام الحلواني وکفی بهما قدوة لاسیما في زماننا'' (شامی ۳/ ۵۱۴)۔

متولی کا مسجد میں چندہ کرنے سے روکنا:

یہاں ایک انجمن اوقاف ہے جس کے زیر انتظام جامع مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور قبرستان وغیرہ ہیں۔

کیا اس انجمن کے ممبران یا متولی اور صدر کو شرعاً یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی انتظامی یا دینی مصلحت سے کسی خاص شخص یا اشخاص کو کوئی خاص مدرسہ کا چندہ کرنے کی جامع مسجد میں اجازت نہ دیں اور اجازت نہ دینے کی صورت میں اگر وہ شخص یا اشخاص انجمن کے ممبران یا متولی وصدر کے حکم کو ماننے سے انکار کریں اور علی الرغم چندہ کرنے کی کوشش کر کے انتظامی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں تو شرعاً انکا یہ فعل کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

متولی یا صدر یا جو انتظام کا ذمہ دار بنایا گیا ہو اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دینی و انتظامی مصالح کے تحت جامع مسجد میں چندہ اور سوال کرنے والے کو روک دیں یا اجازت نہ دیں، لیکن ضرورت مندمدارس عربیہ ودینیہ یا اہم دینی امور کے لئے بوقت ضرورت اس شرط کے ساتھ دے دینا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، گردنوں پر سے پھلانگا نہ جائے، نمازیوں کے سامنے سے گذرا نہ جائے موجودہ وقت میں نہ یہ کہ مباح ہے بلکہ مندوب ومناسب ہے کما یستفاد من کتب الفتاوی(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح فخر الحسن غفرلہ دار العلوم دیوبند

محکمہ کی اجازت کے بغیر مسجد میں بجلی کا استعمال:

زیر تعمیر جامع مسجد موضع الو کے کارکنوں نے جامع مسجد مذکورہ بالا کی تعمیر کے لئے پانی کی ضرورت اور اسکی کمی کے پیش نظر مسجد کے پرانے کنویں میں جس کا پانی گرمی کے دنوں میں بہت کم ہو جاتا تھا اور جمعہ کے دن خاص طور سے وضو وغیرہ کے لئے سخت پریشانی ہوتی تھی، ٹیوب ویل کی بورنگ کرائی اور اسے چالو کرنے کے لئے محکمہ بجلی میں کنکشن کی درخواست دی اور اس کے لئے ضروری رقم بھی ساتھ ہی جمع کر دی، چونکہ مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا اور کنویں کے ہینڈ پانپ سے تعمیر

۱- "والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي ولا يتخطى الرقاب ولا يسأل إلحافا بل لأمر لابد منه فلا بأس بالسوال والإعطاء" (رد المحتار ۱/ ۵۵۴)۔

کے لئے مطلوب پانی کی مقدار فراہم نہیں ہو رہی تھی اور کام میں حرج ہوتا تھا، اس لئے محکمہ بجلی کے مقامی افسران جو کہ مبارکپور بجلی کالونی میں رہتے ہیں، سے جلد از جلد کنکشن جوڑنے کی درخواست کی گئی تا کہ پانی کی کمی دور ہو جائے اور تعمیر میں آسانی ہو، چونکہ دفتری کارروائی میں بہت دیر ہوتی ہے، اس لئے مسجد کی فوری ضرورت کا احساس اور لحاظ کر کے ان مقامی افسران نے یہ کہ کر کہ یہ دھرم کا کام ہے جب تک باقاعدہ کنکشن نہیں مل جاتا آپ لوگ مین لائن سے ڈائرکٹ تار لگا کر مسجد کا کام نکالئے۔ بجلی کے ذریعہ ٹیوب ویل چلانے کی اجازت دیدی۔ اس سلسلہ میں محکمہ بجلی کے کسی ملازم یا افسر کو کوئی نذرانہ یا بخشش یا رشوت کبھی بھی نہیں دی گئی۔ اور نہ انھوں نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی مطالبہ یا اس کی خواہش کا اظہار کیا، محکمہ بجلی کے ان مقامی افسران کی اجازت کے بعد تقریباً ۹ ماہ تک باقاعدہ کنکشن نہیں ملا، اور مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں بوقت ضرورت مذکورہ بالا طریقہ سے ٹیوب ویل چلا کر پانی حاصل کیا گیا، مصلیان مسجد اس سے غسل اور وضو بھی کرتے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح بلا باقاعدہ کنکشن ملے ہوئے ڈائرکٹ کنکشن جوڑ کر ٹیوب ویل چلانا اور اس سے حاصل شدہ پانی سے مسجد تعمیر کرنا کیسا ہے؟ اور اس تعمیر شدہ مسجد کا کیا حکم ہے؟ اور اگر خدانخواستہ شریعت کے نزدیک یہ کام غلط تھا تو اب اس کی تلافی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

(نوٹ) سوال میں مذکورہ ۹ ماہ تک مقامی افسران اور ملازمین کی اجازت سے جو بجلی استعمال کی گئی اس کا کوئی معاوضہ گورنمنٹ کے خزانہ میں آج تک جمع نہیں کیا گیا اور جن افسران اور ملازمین نے بجلی استعمال کرنے کی اجازت دی تھی ان کو گورنمنٹ نے یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ کسی کو بھی اس طرح بجلی استعمال کرنے کی اجازت دے۔

ابوالقاسم (مبارک پور، اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ صورت کا از روئے فتوی شرعی حکم یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنا غلط ہوا، ایسا کرنے والے گنہگار ہوئے اور ان پر اس عمل پر تائب ہونا ضروری ہے اور توبہ یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ یہ بھی کریں کہ ۹ ماہ تک بجلی کا جتنا قانونی چارج ہوتا ہے اتنا کسی نہ کسی حیلہ و ذریعہ سے محکمہ کی ملک میں داخل کر دیں۔ باقی یہ مسجد شرعی مسجد قرار پائے گی اور جن لوگوں نے اس پانی سے غسل، وضوء وغیرہ کیا ہے ان سب کی نمازیں ادا ہو گئیں۔ اگر ایسا غلط عمل کرنے والے (ذمہ داران) غریب ہوں، ۹ ماہ تک

کا بجلی کا اصلی چارج دینے کی طاقت نہ ہو تو ان کے ساتھ تبرع کر کے بذریعہ عام چندہ اس رقم کی ادائیگی کرا دینا بہتر ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۳/۲ ۱۴۰ھ

اختلاف کی بنا پر جدید مسجد کی تعمیر:

ایک مسجد باہمی جھگڑے اور خاص طور پر امام کے ساتھ ذاتی اختلافات کی بنا پر بنائی گئی جب کہ پہلے سے یہاں مسجد موجود تھی اور سارے گاؤں کے لوگ اس میں نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ جہاں دوسری مسجد بنائی گئی ہے اس آدھی زمین ایک دوسرے شخص کی ہے جو مسجد بنانے کے صرف اس لئے حق میں نہیں تھا کہ یہ تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے گی مگر بنانے والوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور یہ کہا کہ ہمیں مسئلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم مسجد بنا کر چھوڑیں گے، چنانچہ مسجد بن گئی اور جسکی زمین دبائی گئی تھی وہ اب بھی ناراض ہی ہے، ایسی صورت میں اس نو تعمیر مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ اس کے بننے سے گروہ بندی ہوئی ہے، اگر کبھی پورا گاؤں آپس میں میل جول کر لے، باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں تب اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں، یا پھر بھی زمین والے کی رضامندی ضروری ہوگی؟

عبد السلام (نندیراہ، راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جھگڑے اور ذاتی اختلاف کی بنا پر بنانا نا جائز فعل ہوگا اور سخت گناہ کا کام ہوگا، اسی طرح دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت ومرضی سے بنالینا بھی نا جائز اور حرام فعل کا ارتکاب ہوگا۔

البتہ جب مسجد بن گئی اور اپنے اور غیروں نے سب نے اس کو مسجد سمجھ لیا اور مسجد کہہ دیا تو اس میں شعائر اللہ ہونے کی شان پیدا ہوگئی، اس کو اب گرانا اور مسمار ومنہدم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اب ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کر کے دونوں مسجدوں کو

۱- ''لا یجوز لأحد أن یتصرف في ملک غیرہ بلا إذنه أو وکالة منه أو ولایة علیه وإن فعل کان ضامنا'' (شرح المجلہ لسلیم رستم باز المبنانی ۶۱/۱ مادہ رقم: ۹۶) ''عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال قال رسول الله ﷺ: ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منه'' (مشکوۃ ص ۲۵۵)۔

آباد کرنے کی کوشش کی جائے (۱)، اور جس کی زمین پر بغیر اس کی اجازت و مرضی کے مسجد بنالیا ہے اس سے اجازت حاصل کیا جائے اور اجازت چاہے مفت دے یا قیمت لے کر دے، جس طرح دے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس شخص پر بھی ضروری ہے کہ اجازت دیدے خواہ معاوضہ لے کر ہو یا بلا معاوضہ لئے ہو (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۹/۲ ۱۴۰ھ

بچے اور پاگلوں کا مسجد میں داخل ہونا:

بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں داخل کرنا کیسا ہے؟ یہاں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ نابالغ بچے اور پاگل جماعت میں بے دھڑک شامل ہوتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ناسمجھ بچوں اور پاگلوں کا مسجد میں لے جانا حرام ہے، اس سے خدا کے گھر کی بے حرمتی ہوتی ہے، سختی سے روکنا چاہئے، کیونکہ خدا کے گھر کی بے حرمتی خدا کے غضب کے نزول کا سبب ہے، "**و یحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجسهم وإلا فیکره**"، حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچاؤ اپنی مسجدوں کو بچوں سے اور پاگلوں سے اور بیع و شراء سے اور شور غل وغیرہ سے اور مسجدوں میں خوشبوں کی دھونی دیا کرو اور ان میں آفتابے رکھا کرو (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

۱- ''وفی شرح المنیة للحلبی: بنی مسجدا فی أرض غصب لا بأس بالصلاۃ فیه" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۴۴)۔

۲- ''ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبه أرض لرجل تؤخذ أرضه بالقیمة کرها کذا فی فتاوی قاضی خان'' (فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۴۵۶)۔

۳- "قوله ویحرم لما أخرجه المنذری مرفوعاً "جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم و شراء کم و رفع أصواتکم و سلّ سیوفکم وإقامة حدود کم، و جمروها فی الجمع واجعلوا علی أبوابها المطاهر بحر" (شامی ج ۱ ص ۴۸۲، رد المحتار علی الدر ۲/ ۴۲۹، باب مفسد وما یکرہ فیہا، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

شرابی کو مسجد سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟

ایک شخص نے اپنے ساتھی کو نماز کے لئے بلایا ہے اور اسکے ساتھ مسجد نماز کے لئے گیا ہے، مسجد میں داخل ہونے تک یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ شراب پیئے ہوئے ہے، اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا تو اس نے نادم ہوکر اتنا کہا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے۔

اب اس ساتھ لانے والے کو مسجد سے چلے جانے کے لئے کہنا درست ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں شرابی کو مسجد سے چلے جانے کے لئے کہنا درست ہے، اب وہ شرابی واپس نہ جائے اور ویسے ہی نماز پڑھ لے تو اس لانے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۹/۲۴/ ۱۳۸۵ھ

اس لئے درست ہے کہ اس کے منھ سے شراب کی بو جو نکلے گی وہ باعث ایذاء ہوگی اور نشہ میں ایسی حرکات کر سکتا ہے جس سے مسجد کی بے حرمتی ہو۔

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دار العلوم دیو بند

مسجد کے لئے وقف شدہ ڈول اور رسی کا حکم:

مسجد کے اندر پانی کا کنواں ہے اور اس پر ایک ڈول ہے جس سے پنجوقتہ نماز و جمعہ کی نماز کے لئے وضو کا پانی کھینچا جاتا ہے، اس ڈول سے پڑوسی لوگ اپنے گھروں پر پانی لے جاتے ہیں اور بے نمازی لوگ غسل کرنے والے کپڑے بھی دھوتے ہیں یہ عمل جائز ہے یا نا جائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

وہ ڈول رسی اگر وقف کے مال سے خرید اگیا ہے جب تو محض نماز اور طہارت کی ضرورت میں استعمال کرسکتے ہیں،

نہ اس کو گھر پر پانی لیجانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور نہ بے نمازی لوگ اپنی کسی ضرورت میں استعمال کر سکتے ہیں، اور اگر وہ رسی ڈول وقف کے مال سے نہیں خرید اگیا ہے بلکہ کسی نے اپنی ملک سے رکھے ہیں اور وہاں کا عرف یہی ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں جب بھی یہی حکم سابق ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں، ہاں اگر دینے والا تصریح کردے کہ جو شخص چاہے استعمال کرے تو ہر شخص استعمال کر سکتا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امام کے ساتھ سخت کلامی:

امام صاحب کے ساتھ سختی سے بات چیت کرنا یا انکی بے ادبی یا بدتمیزی کرنی کیسی ہے اور توہین کرنی وغیرہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

امام کے ساتھ سخت کلامی یا بے ادبی و گستاخی یا توہین کرنا یا ان پر حکومت کرنا اور اعتراض گانٹھنا بالخصوص غلط طریقہ سے بہت ہی برا اور عند اللہ مبغوض ہے، امام کے پاس و ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ایسی جگہ جہاں سو سال کے بعد مکانات منہدم کر دیئے جاتے ہوں وہاں مسجد کا حکم:

۱- ہمارے شہر میں دس بارہ سال سے ایک گرجا خرید ا ہے اور اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال فرمارہے ہیں، ایک مہینہ پہلے حضرت مولانا ابرار الحق صاحب تشریف لائے ہوئے تھے، حضرت والا نے اپنے معمول کے مطابق فرمایا کہ کیا شرعی مسجد نہیں بنائی گئی کہ ابھی تک اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، لوگوں کو حضرت والا نے توجہ دلائی اور لوگوں کے ذہن کو صاف کیا، یہاں کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ حکومت کا قانون ہے کہ جب مکانات سو ۱۰۰ سال

۱- دیکھئے: مطلب مراعاۃ غرض الواقفین واجب والعرف یصلح مخصصا، (رد المحتار علی الدر ۶/ ۶۶۵، مکتبہ زکریا)۔

کے ہوجاتے ہیں اس کوحکومت گرادیتی ہے اور وہاں کے رہنے والے اس شہر میں دوسری جگہ منتقل ہوجاتے ہیں اس وقت اس مسجد کو کون آباد کرے گا، اس وجہ سے یہاں اکثر شہروں میں لوگوں نے مکانات کو عبادت خانہ بنارکھا ہے، خدمت اقدس میں عرض ہے کہ اس عبادت خانہ کے اوپری حصہ میں پانچ وقت کی نماز جمعہ وعیدین پڑھتے ہیں، تقریباً ۳۰۰ افراد اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور نیچے تہہ خانہ ہے تو اس میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے بچے پڑھ رہے ہیں مگر اوپر کے حصہ کی چار صف تک مسجد کی نیت کرلی جائے، اور تہ خانہ کو مصالح مسجد مثلاً مکتب مسجد کا سامان، میت رکھنے کے لئے چارپائی وغیرہ ضروریات کے لئے استعمال کریں تو شرعی طور پر اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲-اور اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنے کے بعد خدانخواستہ اس جگہ کو حکومت نے آبادی کو وہاں سے منتقل کردیا تو شوری کے آدمی عند اللہ مجرم ہوں گے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس بات کا سوچنا کہ اس کے بعد کون آباد رہے گا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

الیس بوئیات (۳-سارتھ کنگ اسٹریٹ باٹلے انگلینڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱و۲) حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہ کا توجیہ دلانا صحیح وبرمحل ہے، عبادت خانہ میں جتنا ثواب ملتا ہے مسجد شرعی میں کم ازکم اس سے پچیس ۲۵ گنا زیادہ ثواب ضرور ملتا ہے (۱)۔ ورنہ روایات اس سے زائد کی بھی ہیں اور مسجد شرعی وہ جگہ ہوتی ہے جس کو نماز پڑھنے کے واسطے قیامت تک کیلئے وقف کردیا گیا ہو، اس جگہ اور عمارت کو مالک نے برائے مسجد وقف کردیا ہو، وقف کرنے سے وہ جگہ ومکان واقف کی ملک سے نکل کر اللہ کی ملک میں مفتی بہ قول میں داخل ہوجاتی ہے اور تا قیام قیامت وہ جگہ ومکان مسجد ہی قرار پاتا ہے، مسجد کے اوپر عنان سماء تک اور نیچے تحت الثری تک سب بحق مسجد خالص ہوکر محفوظ ہوجاتا ہے، اس لئے اس کے اوپر و نیچے کسی طرف نماز وذکر وتلاوت یعنی عبادات خالصہ کے علاوہ کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں رہتا حتی کہ امام وموذن کے لئے اس کے اوپر نیچے کوئی کمرہ تعمیر نہیں کرسکتے حالانکہ امام وموذن عین ضروریات مسجد میں سے ہوتے ہیں اور انہی وجوہ سے غسل خانہ ووضوخانہ وغیرہ بھی مثل کمرہ موذن وامام کے ہیں مسجد کے اوپر یا نیچے بنانا

۱- ''صلوۃ الرجل فی جماعۃ تضعف علی صلواتہ فی بیتہ وفی سوقہ خمسا وعشرین ضعفا'' الحدیث (رواہ البخاری واللفظ لہ ومسلم وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ، الترغیب والترہیب للمنذری ۱/۲۵۹)۔

درست نہیں ہے، اس طرح مکتب ومدرسہ خواہ دینی تعلیم کا ہو یا میت کے غسل ولانے وغیرہ کی جگہ بھی یا مردہ رکھنے کے لئے فریز وغیرہ رکھنے کی جگہ کو بھی عین مسجد کے اوپر نیچے قائم کرنا جائز و درست نہیں ہے، اگر ضرورت ہو تو امام وموذن کے کمرہ کی طرح حاشیہ ومسجد میں خواہ متصل عین مسجد کے ہو رکھنا چاہئے، ہاں عین مسجد کے اوپر و نیچے خاص مسجد کا سامان جیسے مسجد کے لوٹے جاءنماز وغیرہ رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں متعین کر کے کمرہ کی شکل بھی دے سکتے ہیں، اس لئے مالکان عبادت خانہ کو مسئلہ خوب سمجھا کر اور شرعی مسجد کی فضیلت سمجھا کر ترغیب دینا چاہئے کہ وہ عبادت خانہ برائے مسجد وقف کر کے مسجد شرعی قرار دے دیں، بے انتہاء ثواب اور حصول خیر و برکت کا کام ہوگا، رہا یہ اشکال کہ یہاں کے قانون حکومت کے ماتحت سو ۱۰۰/ برس کے بعد گرانے والے پلان میں آکر وہ جگہ یعنی مسجد بھی گرادی جائیگی تو ایسی صورت میں اس نیت کرنے والے پر تو کچھ وبال نہ آئے گا، اگر اس جگہ دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل جائے تو چونکہ اس جگہ کے مسلمان متفرق ہو چکے ہوں گے آباد کون کرے گا یہ اشکال شرعاً معتبر وصحیح نہیں ہے، اولاتو اس لئے کہ بعض لوگوں سے کچھ اس طرح سننے میں آیا ہے اگر گرجا گھر اور شرعی مساجد جو حکومت کے نزدیک بھی شرعی مسجد تسلیم ہو چکی ہو وہ اس کو گرانے والے پلان سے مستثنیٰ ہوتی ہے اگر ایسا ہو تو یہ خلجان رہ جاتا ہے وہاں کے مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے بعد کون آباد کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس گرادینے کے بعد پھر چند مہینوں میں وہ جگہ لوگوں سے آباد بھی ہوتی ہوگی، اس وقت اس جگہ کو بکثرت مسلمان لے لیں یا لینے کی سعی کریں کامیاب ہو گئے تو اس سعی کو ثواب کے ساتھ ساتھ احیاء دین واحیاء مشاعر کا بھی ثواب ملے گا ورنہ اس سعی کا ثواب تو ضرور ملے گا اور یہ بھی نفع سے خالی نہیں اور ثانیاً اس کے لئے یہ گرجا گھر اور مساجد شرعی بھی اس گرانے کے پلان میں آتے ہوں جب بھی اس مذکورہ بالا سعی وغیرہ کا ثواب کہیں جاتا نہیں اور چونکہ یہ گرانا اور آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ وغیرہ منتقل کرنا خود اپنے اختیار وخوشی سے نہیں ہوگا اور وہ خود اپنا فعل نہیں ہوگا۔

بلکہ حکومت قہری طور پر ایسا کرے گی اور مسلمان معذور ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے: **"ولاتزر وازرة وزر اخرىٰ"** (۱)، ایک شخص کی غلطی کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاتی اور احادیث صحیحہ میں آتا ہے: **"رفع عن امتّي الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه أو كما قال عليه الصلوٰة والسلام"** (۲)۔

یعنی سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت سے خطاء ونسیان اور اس چیز کا گناہ ووبال مرتفع کردیا گیا ہے

۱- سورۂ فاطر: ۱۸۔

۲- "تكرر هذا الحديث في كتب الفقهاء والأصوليين بلفظ: رفع عن امتي ولم نره في الاحاديث المتقدمة عند جميع من اخرجه" (التلخیص الحبیر ۱/ ۵۱۱، مؤسسۃ القرطبہ جامع صغیر للسیوطیؒ)۔

جس میں وہ مکرہ (معذور) ہو، اس آیت کریمہ وروایت کی بنیاد پر اس تغیر کا وبال مسجد کی نیت کرنے والوں اور وقف کرنے والوں پر بالکل نہ پڑے گا، بلکہ کیا عجب کہ مخلص کی سعی اللہ تبارک وتعالی کو اتنی پسند آجائے کہ اس کی برکت سے اس کے گرانے کا پلان یا معابد ومساجد گرانے کا پلان منتفی ہو جائے اور اگر منتفی نہ ہو تو بھی " **انما الاعمال بالنیات** "(۱) کے تحت اور "**نیة المومن خیر من عمله**" (۲)، کے تحت ثواب تو کہیں جاتا نہیں، اس لئے قول کی توجہ اس طرف منعطف کر کے ان عبادت خانوں کو شرعی مساجد بنانے میں پوری سعی کرنا چاہئے اور الدال علی الخیر کفاعلہ کے مطابق سعی سے بھی پورا عمل کرنے والے کے ثواب کی نیت رکھنا چاہئے اور خلاصہ جواب یہ نکلا کہ اس نیت کرنے کے بعد اگر خدا نخواستہ اس جگہ کو حکومت نے لے لیا اس جگہ کی بستی کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جب بھی یہ نیت کرنے والے اور شرعی مسجد قرار دینے والے مجرم وماخوذ نہ ہوں گے بلکہ یہ نیت وسعی باعث اجر وثواب وباعث خیر وبرکت بنے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۱/۱۴۰۲ھ

۱-مسجد کی آمدنی سے امام کی آمد ورفت کا کرایہ دینا:

مسجد میں جو امام ہے اس کے گھر آنے جانے کا کرایہ دینا طے ہے، اگر کسی وقت روپئے لوگ اپنے پاس سے نہ دے سکیں پورا یا کچھ کمی رہ جائے اور مسجد کی آمدنی میں سے دیدیں تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

۲-امام کے ناشتہ وغیرہ کا نظم مسجد کی آمدنی سے:

امام صاحب کے ناشتہ کا انتظام مسجد کی آمد سے کر دیں اور مسجد میں جلانے کے لئے مٹی کا تیل، آٹا اور ماچس اگر بخوشی لوگ اجازت دیدیں، اسٹوپ اور حجرہ میں روشنی کے لئے جلانا جائز ہے یا نہیں؟

۳-مسجد کی آمدنی سے انعام دینا:

جیسا کہ اب دستور ہو گیا ہے کہ کوئی شخص مسجد کی امداد کرتا ہے تو اس کو مائک پر بولا جاتا ہے اس کو سن کر لوگ اور دیتے ہیں اور بعض جگہ امام کو کبھی کبھی پڑھنا پڑ جاتا ہے یعنی نظم وغیرہ تو اس سلسلہ سے اچھی آمدنی مسجد کو ہو جاتی ہے تو اس میں سے یعنی مسجد کی آمدنی سے کچھ بطور انعام امام صاحب کو دیدیں تو جائز ہے یا نہیں؟

۱- متفق علیہ، مشکوۃ ۱۱۔

۲- ضعیف کما قالہ العراقی، اسنی المطالب ۱/ ۳۰۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

الجواب وبا الله التوفيق:

۱-اگر گھر آنے جانے والے کا کرایہ لینے دینے کا معاملہ مسجد کے ذمہ داروں اور اراکین مسجد سے طے ہے کہ مسجد کے پیسے سے دیدیا جایا کرے جب تو ایسے وقت میں مسجد کے پیسہ لیکر خرچ کرلیں اور بعد میں مسجد کے ذمہ داروں کو بتلا دیں اور اگر اس طرح معاملہ طے نہیں تو مسجد کے پیسے سے لینے کے بجائے کسی سے قرض لیکر کام چلائیں اور بعد میں طے شدہ معاملہ کے مطابق وصول کرلیا کریں۔

۲-امام کے ناشتہ کا انتظام مشورے سے طے ہے تو کرسکتے ہیں ورنہ نہیں اور مسجد کے صحن میں بھی جو عین مسجد قرار پا چکا ہو اس میں مٹی کا تیل اور کوئی بدبودار چیز کا استعمال جائز نہیں (۱)، ہاں اگر وہ حصہ صحن میں مسجد نہ ہو بلکہ وضو خانہ وغسل خانہ وغیرہ کا جزء ہو تو وہاں جلا سکتے ہیں۔

۳-مسجد کی آمدنی بڑھانے کے لئے سادہ اور خموش طریقہ افضل ہے یہ مذکورہ طریقہ اچھا نہیں، باقی اگر اس طرح وصول کرلی گئی ہو اور اس میں سے بطور انعام کے امام صاحب کو بھی کچھ دیدیا تو اس کا لے لینا امام صاحب کو جائز رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/ ۸/ ۱۴۰۲ھ

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگانا:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ (عشرہ) نہیں لگ سکتا ہے، جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۲ھ

۱- ''من أكل ثوما أو بصلا فليعتزلنا او يعتزل مسجدنا'' (بخاری ۲/ ۸۲۰، باب ما یکرہ من الثوم والبقول)۔

عیدگاہ کے لئے وقف شدہ زمین کا مصرف:

ایک آراضی جو کہ ۱۶ ڈسمل کی تھی جس میں ہم ۱/۲ کے حصہ دار تھے وہ ہم دونوں حقداروں نے عیدگاہ کے لئے قریب پانچ سال ہوئے بخوشی دیدی تھی اور نماز عید الفطر اور عید الاضحیٰ چار سال سے وہاں متواتر ہوتی رہی، عمارت کسی طرح کی نہیں بنی اور نہ کسی طرح کی بنیاد پڑی، اب پبلک میں دو پارٹیاں ہونے پر اعتراض ہوا ہے کہ ہم لوگ قریب کے گاؤں میں نماز پڑھیں گے، ہم لوگ تھوڑے ہونے پر مجبوراً خاموش رہے ہیں، اب اس میں عیدگاہ بننے کی کوئی امید نہیں ہے اب اس آراضی کا کیا ہونا چاہئے وہ بیکار پڑی ہے پہلے اس میں کاشت ہوتی تھی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس جگہ مسجد بنا دیجائے، بہرحال یہ جگہ وقف ہو چکی اور کسی ذاتی خرچ میں بھی نہیں آسکتی ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا:

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد بنانے میں بینک سے سودی قرضہ لے اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کرے تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

ابراہیم باوا

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک سے بھی سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں، اس لئے ایسا پیسہ لے کر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا کب جائز ہوگا؟

کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں گے تو گنہگار ہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسے سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا، البتہ چونکہ مسجد اسلام کے اعلیٰ شعائر میں سے ہے، اس

۱- ''لأنه لا يقبل التمليك والتملك'' (شامی ۴/ ۴۴۲، مطبعہ عثمانیہ)۔

لئے اس کی عظمت واظہار کے پیش نظر مساجد کا عام مکانوں سے اعلی وارفع بنانا أفضل واحسن ہے، اس لئے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہئے (۱)۔

"**انما یعمر مساجد اللّٰہ من آمن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوۃ**" (۲) کی أضیلت حاصل کرنے پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۰ھ

مسجد کی تعمیر کے لیے سودی قرض لینا کیسا ہے؟

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد تعمیر کرنے میں بینک سے سودی قرض لیں اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کریں تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ فقط والسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک سے سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے ایسا پیسہ لے کر تعمیر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا جائز نہ ہوگا۔

کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں تو گنہگار رہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسہ سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا۔

البتہ چوں کہ مسجد اسلام کے اعلیٰ شعائر میں سے ہے، اس لیے اس کی عظمت اور اظہار کے پیش نظر مساجد کا مکانوں سے اعلیٰ وارفع بنانا أفضل واحسن ہے، اس لیے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہیے: "**إنما یعمر مساجد اللّٰہ من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر و اقام الصلوٰۃ**" الخ (۳) کی أضیلت حاصل کرنے

۱- "أما لو أنفق في ذلک مالاً خبیثاً ومالاً سببه الخبیث والطیب فیکره، لأن اللہ تعالی لا یقبل إلا الطیب، فیکره تلویث بیته بما لا یقبله" اھ (شامی زکریا ۔ رد المحتار علی الدر المختار ۲/۴۳۱ قبیل مطلب فی أفضل المساجد)۔

۲- "إنما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر وأقام الصلاۃ وآتی الزکوۃ ولم یخش إلا اللہ فعسی أولئک أن یکونوا من المهتدین" (سورۂ توبہ: ۱۸)۔

۳- سورۂ توبہ: ۱۸۔

پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۰ھ

مسجد سے متصل صحن کا حکم:

محلہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، مسجد مذکور سے متصل ایک حجرہ بھی بنا ہے جس میں مؤذن وغیرہ رہتے ہیں، حجرہ مذکور کے سامنے جو صحن وفرش ہے وہ مسجد کے صحن اور فرش کے ساتھ ملا ہوا ہے، بعض مرتبہ جب زیادہ لوگ آجاتے ہیں تو جب مسجد کے صحن میں لوگ صف بناتے ہیں تو اس کا سلسلہ حجرہ والے صحن تک چلا جاتا ہے، اب اس میں دریافت یہ کرنا ہے؟

۱۔ حجرہ والے صحن کا کیا حکم ہے، وہ مسجد میں داخل مانا جائے گا یا مسجد سے خارج مانا جائے گا؟

۲۔ جو لوگ حجرے والے صحن میں نماز پڑھیں گے ان کو بھی مسجد میں پڑھنے والوں کے برابر ثواب ملے گا یا کچھ کم ملے گا۔

۳۔ حجرے والے صحن میں مؤذن وغیرہ گرمیوں میں چارپائی بچھا کر سوسکتے ہیں کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ محض مصلیوں کی زیادتی سے وہاں سلسلہ پہنچ جانے سے اس صحن کو مسجد کا حکم نہ دیدیں گے جب تک کہ اس کو مستقلا اور بالاصل مسجد قرار نہ دے لیا جائے۔

۲۔ کچھ کم ثواب ملے گا جس طرح دیر سے آنے والے کو پہلے آنے والے کے اعتبار سے کچھ کم ثواب ملتا ہے۔

۳۔ جب تک اس صحن کو مستقلا مسجد قرار نہ دے لیا جائے اس وقت تک کوئی سوء ادبی نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد سعید جمیل الرحمن محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم

مسجد کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلانا کیسا ہے؟

۱۔ مسجد کی دوکانوں یا مکانوں کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلائی جاسکتی ہے؟

۲-جبکہ کچھ دوکانیں مسجد کی جائداد میں بنی ہوئی ہیں جو کہ چندہ سے اور مسجد کی دیگر آمدنی سے تعمیر ہوئی ہیں۔
۳-کچھ دوکان اور مکان کچھ مرحومین نے مسجد کے نام وقف کر دئے تھے، ان کی بھی آمدنی آتی ہے۔
۴- محلے والے بہت غریب ہیں اور تھوڑے کچھ مالدار بھی ہیں۔
۵-مگر مالدار اتنے چندہ نہیں دیتے جس سے مسجد کے حمام کی لکڑی پوری ہو جاویں عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

لکھی ہوئی پانچوں صورتوں پر نظر کر لی گئی، ان تمام آمدنیوں سے مصلیوں کے لئے پانی گرم کر سکتے ہیں جائز ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی، سید محمود عفی عنہ مفتی دار العلوم دیوبند

مسجد کی آمدنی دوسرے کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

یہاں کے پنچایتی لوگ شادی گھر کا لڑکا اور لڑکی سے مسجد کے نام سے لڑکے والے سے ایک سو روپیہ اور لڑکی والے سے مسجد کے لئے پندرہ روپیہ لیتے ہیں اور روپیہ مسجد کے فنڈ میں رہتا ہے، اس روپیہ سے مسجد کے لئے کچھ زمین بھی خریدی گئی ہے اس زمین سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مسجد کے فنڈ میں جمع رہتی ہے اور اسی روپیہ سے مسجد کا تمام کام ہوتا ہے اور پیش امام کو تنخواہ دیجاتی ہے اور گاؤں والے پیش امام کو باری کر کے چار مہینہ میں ایک آدمی ایک دن کھانا کھلاتا ہے جس میں غریب اور بیوہ بھی شامل ہیں، اس لئے سال میں ایک مرتبہ مسجد کے دھان اور روپیہ سے کھانا پکا کر تمام پنچایت کے لوگ بلا فرق وخت کے بانٹ کر کھانا لیکر کھاتے ہیں۔

۱-کیا مسجد کے روپیہ کو گاؤں والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ روپیہ ہمارا ہے ہم دیتے ہیں اس لئے ہمارا حق ہے، ہم مسجد میں خرچ کریں یا جس راستہ میں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں، کیا جائز ہے؟

۱-　"مسجدله مستغلات وأوقاف، أراد المتولي ان يشتري من غلة الوقف للمسجد دهنا أو حصيرا أو حشيشا او اجرا وجصا لفرش المسجد أو حصى قالوا ان وسع الواقف ذالك للقيم وقال: تفعل ماترى لمصلحة المسجد كان له ان يشترى للمسجد ماشاء" (فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۶۱، رشیدیہ پاکستان)۔

۲۔ کیا مسجد کے نام کا روپیہ مسجد کو چھوڑ کر دوسرے کسی کام میں لگانا جائز ہے۔

۳۔ کیا یہ کہہ کر کہ بیوہ اور غریب لوگ پیش امام کو کھانے کو دیتے ہیں وہ پنچائیت کی طرف سے کچھ پاتے نہیں ہیں، اس لئے انکو خوش رکھنے کے لئے تاکہ وہ پیش امام کو کھانا دیں، اس وجہ سے سال میں ایک دفعہ مسجد کے روپئے سے کھانا پکا کر اس کو فاتحہ دلا کر تمام پنچایت کے لئے کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟

۴۔ مسجد کے روپیہ سے چار مچھلی خرید کر مسجد کے تالاب میں ڈال دیا جائے اور جب مچھلی بڑی ہو جائے تمام پنچایت اس کو پکا کر کھانا کیسا ہے؟ جو مسجد کے روپئے سے مسجد کے تالاب میں ڈالا گیا تھا، یہ فعل کیا جائز ہو سکتا ہے یا کہ نہیں؟

۵۔ کیا مسجد کے روپئے سے بارہ وفات اور گیارہویں شریف میں مٹھائی منگا کر فاتحہ کرنا اور تمام پنچایت کا اس مٹھائی کو بلا اجازت کے بانٹ کر کھانا کیسا ہے، کیا جائز یا کہ نہیں؟

۶۔ مسجد کے روپیہ سے کسی انجمن یا لائبریری کو یا کسی غریب کو دیا مسافر کو یا کسی مدرسہ کو دینا یا کہ مولوی صاحب کا وعظ سنکر اس کو دینا، یا وعظ کے واسطے کسی مولوی صاحب کو اس روپیہ سے دینا یا کہ گاؤں کا راستہ کی مرمت کرانا یا کسی سرکاری پیر کا مزار بنانا یا کہ عیدگاہ بنانا یا کہ گاؤں کے پانی کے لئے کنواں کھودوانا وغیرہ یہ تمام کام مسجد کے روپیہ سے کرنا کیسا ہے؟

۷۔ مسجد کے روپئے سے پیش امام کو تنخواہ دینا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنی جو رقم یا جو چیز مسجد کو دیدی جاتی ہے وہ مسجد کی ہو جاتی ہے، اب اس کا استعمال کسی اور جگہ میں جائز نہیں رہتا ہے، خود دینے والے کو بھی دینے کے بعد یہ اختیار نہیں رہتا ہے تو دوسروں کا کیا شمار، اب وہ چیزیں مسجد پر وقف اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت خاصہ ہو جاتی ہیں (۱) اب اپنی مملوک چیز جیسا معاملہ اسکے ساتھ کرنا سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث ہوتا ہے اس لئے ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں غلط اور ناجائز ہو رہی ہیں، بجائے ثواب الٹا گناہ ہوگا، دنیا میں بھی اس کا وبال پڑنے کا ڈر ہے۔

۱- ''أما تعريفه إلى قوله: وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالىٰ على وجه تعود منفعته الى العباد فيلزم ولايباع ولايوهب ولايورث كذا في الهداية، وفي العيون واليتيمة: ان الفتوى على قولهما كذا في شرح الشيخ ابي المكارم للنقاية'' (عالمگیری ۲/ ۳۵۰، رشیدیہ پاکستان)۔

۷۔امام مسجد کوتنخواہ دینا یہ مسجد ہی کا کام ہے جائز ہے(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

توسیع کی غرض سے مسجد کے متصل قبرستان اورحجرہ کومسجد میں شامل کیاجاسکتاہے یانہیں؟

مسجد کے دائیں جانب ایک حجرہ ہے اور بائیں جانب کچھ جگہ پڑی ہوئی ہے،جس میں دوقبریں ہیں،ایک توبوسیدہ ہورہی ہے اوردوسری صحیح ہے اورمسجد کے اندرکی جانب دوصف ہوجاتی ہے،لیکن سردی کی وجہ سے نمازی رمضان شریف میں کافی ہوجاتے ہیں،جولوگ باہر رہ جاتے ہیں وہ بہت کم ہیں،جوقرآن سنتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اوردن میں توہم فرض وسنت پڑھ کر چلے جاتے ہیں تھوڑا ٹائم لگتا ہے مگر رمضان شریف میں اتنی دیرسردی میں کھڑانہیں ہواجاتا ہے،خیال یہ ہے کہ اگرآپ صاحب اس بات کی اجازت دیں کہ دائیں جانب کاحجرہ جومسجد سے ملاہوا ہے اس کومسجد میں ملالیاجاوے اوربائیں جانب جو جگہ ہے اس کوبھی ملالیاجاوے مسجد قبرستان میں ہے،لیکن آبادی زیادہ ہونے کے بعدشہر میں ہوگئی ہے،اس قبرستان میں دفن اموات بھی اب بندہوگئیں ہیں،پچاس ساٹھ سال قبل دفن ہوتے تھے۔

الجواب وبالله التوفيق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں بہت پرانی اوربوسیدہ ہوجائیں اگرچہ بالکل بےنشان نہ ہوئی ہوں جب بھی اس کوبرابر کےنشان مٹاکر مسجد بناسکتے ہیں اورجب پچاس سال سے زائد سے وہاں مردے دفن نہیں ہوتے بلکہ آبادی بڑھنے سے وہ قبرستان آبادی میں آگیا ہے تواگر اس قبرستان کی زمین موقوف بھی ہوجب بھی اس پرمسجد بنالینا منشاواقف کے خلاف ظاہر و متبادر نہ ہوگا،اورحجرہ توبظاہر متعلق مسجد ہی ہے،لہذا ایسی صورت میں جب مسجد میں تنگی ہے اورتوسیع کی ضرورت ہے تونشانات قبرمٹاکر مسجد کے دونوں جانب توسیع کرسکتے ہیں(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور۱۱رشعبان ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ''لاتصح الإجارة الی قوله: ولا لأجل الطاعات مثل الأذان، والحج، والإمامة وتعليم القرآن، والفقه، ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان‘‘(الدرالمختار علی الرد۵/۳۶،عثمانیہ)۔

۲- ''وتتخذ مسجدا، الماروي ان مسجد النبيؐ كان قبل مقبرة للمشركين فنبشت كذا في الواقعات‘‘(ردالمحتار۱/۸۳۵، مطلب فی دفن المیت)۔

مال حرام سے بنی ہوئی مسجد کا حکم:

مسجد کی تعمیر مال طیب اور حلال سے ہونی چاہئے مال خبیث اور حرام سے نہیں سوال یہ ہے کہ ایک مسجد مال خبیث اور طیب دونوں سے ملا کر بنی، ایسی مسجد میں نماز مقبول ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا رشید صاحب گنگوہی مکروہ تحریمی کہتے ہیں اور اعادہ ایسی نماز کا واجب ہے یا نہیں اور ایسی مسجد کا شہید کردینا شعار اسلام کی وجہ سے باطل ہوگا اور دوسری نئی مسجد کی تعمیر لوگوں کے لئے شاق اور تکلیف مالا یطاق سے کم نہیں، اب نماز کی اصلاح کے لئے ایسا کیا جائے کہ جو لاگت یا خرچ مال خبیث اس مسجد میں لگا ہے صحیح حساب کر کے اپنی پاک اور حلال کمائی کے اتنی رقم یا تو مالک تک اور عدم رسائی میں کل رقم غرباء ومساکین ہی میں تقسیم کردیا جائے کہ مجبوری کے وقت یہی حکم ہے کیا ایسا کرنا درست ہوگا اور اس تبدل اموال الخبیثہ باموال الطیبہ کے بعد مسجد میں نماز بلا کراہیت درست ہونے لگے گی یا نہیں، اور اب یہ اور مسجدوں کی طرح اسس علی التقوی کی مصداق ہوگی یا کہ نہیں جو مسجد مال خبیث سے بنائی گئی ہے اس میں نماز مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے، اب اگر ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کا سابقہ پڑ جائے یا جماعت ہی کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوجائے تو ایسی مسجد سے گھر کی نماز باجماعت اول ہوگی یا نہیں؟ مسئلوں کا جواب محققانہ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کوئی مسجد اگر محض خبیث مال سے بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور اگر خبیث اور طیب دونوں سے ملاکر بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور پھر ہر حکم میں تفصیل ہے جو صورت واقع ہوئی ہو اسی کو دریافت فرمائیے، ہاں اتنا سن لیجئے کہ اگر طیب وپاکیزہ مال بھی اس میں لگا ہو اور نصف سے زائد لگا ہے تو اس میں نماز جائز ہوگی، اس طرح خبیث مال سے مراد اگر یہ ہے کہ خباثت محض معاملہ میں ہے حاصل شدہ مال میں نہیں ہے تو اس صورت میں بھی نماز جائز ہے گو بطریق خبیث حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو بھی خبیث کہیں کما صرح بہ الفقہاء، باقی تطہیر واصلاح کا طریقہ جو آپ نے لکھا ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اگر وہ باقی ہیں تو نہ اس کا عوض دے اور نہ اس کو بعینہ تصدق کرے بلکہ اس میں خرچ شدہ حرام رقم کی مقدار اپنا دوسرا پاک وطیب مال اس کے عوض میں تصدق کرے جب بھی مفید مطلب نہیں اور تطہیر اس مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ خبیث وحرام شئی بعینہ ابتک موجود ہے اور خبیث وحرام شئی جب تک بعینہ موجود ہو اس کا حکم فقط یہ ہے کہ یا تو اس شئی کو اس کے جائز مالک کے پاس واپس کردیا جائے اور یہ نا ممکن ہو تو خود اس شئی کو اپنی ملک سے نکال کر فقراء کو دیدے اور تصدق کردے اور یہاں یہ دونوں نہیں ہوا اور نہ ممکن ہی

ہے جیسا کہ آپ خود اس کو تسلیم کررہے ہیں، اس طرح دوسرے لوگ جو اپنے طور پر کریں گے اس سے بھی اس خبیث وحرام شئی کا تصدق نہ ہوگا بلکہ وہ بعینہ وبلی حالہ موجود رہے گی پس اگر تطہیر واصلاح واجب ہی ہو تو اس طرح کرلیں کہ اس مسجد کو ہٹا کر پھر سے جدید تعمیر جائز وحلال مال سے کر کے اس میں نماز پڑھیں (۱)، یہ صورت بالخصوص ہمارے دیار میں فی زمانناً بالکل جائز ہوگی اور اس کے علاوہ بھی حدود وضوابط میں داخل ہو کر اباحت صلاۃ کے لئے کافی ہو جائے گی وھوالمراد اور نماز پڑھنے کے لئے پختہ وریختہ ہی عمارت ہونا ضروری نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد سعید، محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

اور جواز نماز بلا کراہیت کے لئے یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ صرف فرش اکھڑوا دیا جائے اور جائز وحلال آمدنی سے دوسر افرش بنوایا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

مسجد کی آمدنی کو دوسرے کار خیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

۱- مسجد کی آمدنی سے مصلیوں کی دینی کتابیں مثلاً قرآن، حدیث، رسالہ دینیات یا وہ کتابیں جو دین کا علم سکھانے میں ممد ومعاون ہوں خریدنا درست ہے یا نہیں، جبکہ مسجد کی آمدنی کے سارے اخراجات کو بدرجہ اتم پورا کر کے کافی مقدار میں بچی رہتی ہے، اسی طرح اگر مسجد کی آمدنی میں کشائش گنجائش ہو تو اس سے ایک چھوٹے مکتب کی بناڈالنا جو مصلیوں کو علم سکھانے کے مقصد سے کھولا جائے گا یا اس آمدنی سے ایسے معلمین کی تنخواہ دینا جو مصلیوں کو ضروری مسائل سے واقف کراتے ہیں یا وعظ ونصیحت سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہتے ہیں جائز ہوگا یا کہ نہیں، مسجد میں آمدنی کا ذریعہ ایک تو آراضی موقوفہ مسجد سے ہے، دوسری وقتاً فوقتاً عوام الناس کی اعانت ہے، دونوں کا حکم یکساں ہے یا کچھ فرق ہے؟

۲- ایک مسجد کی تعمیر آراضی موقوفہ للمسجد اور عام لوگوں کی اعانت سے ہوئی، مسجد مکمل ہو جانے کے بعد مسجد کی

۱- ''عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولايقبل الله الا الطيب'' (مشکوۃ ص ۱۶۷ باب فضل الصدقۃ)۔

آراضی موقوفہ سے بڑھتی ہوئی آمدنی دیکھ کر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اپنے موقوفہ روپیوں کو جو مسجد میں لگایا ہے مسجد کی آمدنی سے وضع کرلیں اور ان روپیوں سے دوسرے کار خیر مدرسہ وغیرہ کی اعانت کریں، ظاہر ہے کہ موقوف جائداد میں تصرف بالکل روا نہیں لیکن یہاں جبکہ مسجد کی زمین کی آمدنی وسیع پیمانہ پر مسجد کے جملہ مصارف پورا کرکے بچی رہتی ہے، اس سے لوگ اپنے موقوفہ روپیوں کی تبدیل چاہتے ہیں اور مقصد خدمت خلق ورعایہ پروری ہے اس کی پوری تحقیق فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اس میں سب ناجائز ہے جب کوئی چیز مسجد کی ہو جاتی ہے خواہ وقف سے یا عطاء سے از قبیل عروض ومال ہو یا نقد کسی حال میں بھی اس کو مسجد کی ملک سے نکالنا یا کسی دوسرے مصرف میں پیش کرنا خود واقف کو بھی جائز نہیں پھر دوسرں کا کیا شمار ہوگا؟

۲-بالکل جائز نہیں کما مرآنفا اگر لوگوں کو زیادہ شوق ہو یا زیادہ ضرورت ہو تو اپنے مملوکہ اموال سے کریں مسجد کی آمدنی یا مال سے ہرگز نہ کرے، مدرسہ خواہ دینی ہو یا دنیوی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ

غصب شدہ زمین میں مسجد بنانے اور نماز پڑھنے کا حکم:

ایک مسجد میں اس کے حقیقی وواقعی رقبہ سے جو سرکاری کاغذات میں درج ہے زیادہ زمین بجبر بحیثیت غصب شامل کرلی جائے اور اس غصب شدہ اراضی میں مسجد کی آمدنی بذریعہ دوکانات بڑھائی جاوے یا غلہ خانہ اور حمام یا دارالوضوء بنایا جائے، آراضی غصب شدہ خواہ کسی کی ملک ہو یا کسی کے حق آسائش یا راستے کی ہو ایسا کرنے والے حضرات کا کیا حشر ہے اور اس مسجد میں نماز پڑھنے کا کیا نتیجہ ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسجد میں کسی دوسرے شخص کی زمین غصب کے طور پر لیکر شامل کرنا جائز نہیں، اگر غصب کے ذریعہ کوئی زمین حاصل کی جائے اور مالک زمین رضامند نہ ہو تو اس کا استعمال کرنا اور اسپر نماز پڑھنا کچھ بھی جائز نہ ہوگا **نوٹ:** لیکن اگر کسی

کے ارض مغصوبہ میں نماز پڑھ لی تو درست ہوجائے گی)(۱) ایسا شخص عند اللہ سخت مجرم اور باعث غضب خداوندی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

مسجد میں نکاح کا سہرا پڑھنا:

مسجد میں سہرا نکاح کے موقع پر پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں جواب مکمل تحریر فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کی بناء جماعت کے لئے ہوئی ہے اور معصیت کا مسجد میں کرنا مطلقاً ممنوع ہے، اب اگر کوئی ایسے امر کے لئے مسجد میں جائے جو نہ طاعت ہے نہ معصیت بلکہ مباح ہے تو اس لئے خاص مسجد میں جانا مکروہ ہے، لیکن پہلے سے وہ شخص مسجد میں حاضر ہے اور اتفاقاً اس مباح کی حاجت پیش آگئی ہے اور اس کی نیت سے مسجد میں نہیں گیا تھا، بلکہ کسی طاعت کے لئے آ گیا تھا اور وہاں اس مباح میں بھی اشتغال ہوگیا، تو بشرط عدم اکثار جائز ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سہرا حدود شرعیہ کے اندر اور بغرض سہرا مسجد میں نہیں گیا ہے اور سادگی کے ساتھ اسکو پڑھتا بھی ہے، اس کے اندر ایسا ترنم نہ ہو جو گانے کے قریب ہو جاوے کہ حاضرین اس سے لذت محسوس کرنے لگیں، ان قیود کے بعد پڑھنے کی اجازت ہوگی، لیکن نہ پڑھنا اولیٰ ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

چھوٹے سے محلّہ میں دو مسجد کی بنیاد ڈالی تو کیا حکم ہے؟

تیرہ گھر کا ایک چھوٹا سا موضع ہے جس میں ایک مسجد بھی تھی، عوام کی بے توجہی سے وہ مسجد منہدم ہوگئی، بعد میں رائے عامہ سے ایک کشادہ جگہ میں نیو ڈالی گئی جب مسجد کی دیوار کچھ اونچی ہوئی تو پھر لوگوں کی اڈّے میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور تیسری جگہ مسجد کا بنانا طے ہوا اور اس تیسری جگہ بھی نیو کھودی گئی اور کچھ رقم بھی بطور چندہ اکٹھا کی گئی اور دوسری مسجد جس کی

۱- ''وفی شرح المنیۃ للحلبی: بنیٰ مسجدا فی ارض غصب لاباس بالصلوٰۃ فیہ''(ردالمحتار ۱/ ۳۵۴، ط، مکتبہ ثانیہ)۔

دیوار کچھ بلند ہوچکی ہے اس میں قدرے سامان موجود ہے اب محلہ مذکورہ کے لوگ متفق ہوکر یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک مسجد کا بنانا ازروئے شریعت جائز ہونا اور ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد پر لگانا ہونا تو بہتر تھا۔ جواب میں سارے مقامی علماء نے انکار کردیا یہ جواب پاکر محلہ والوں نے ہر ایک مسجد کا بنانا بند کردیا ہے بس ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں صرف ایک مسجد بنانا جائز ہوسکتا ہے اور نمازی مشکل سے محلہ مذکورہ میں پانچ چھ ۶ ہوں گے، نیز ایک مسجد کی اذان کافی ہوسکتی ہے یا کہ نہیں، یا ہر ایک میں اذان دینا ضروری ہے، یوں ہی نماز صرف ایک مسجد میں جماعت سے ادا کی جاتی ہے، باقی دو جگہیں ترک کردی جائیں کیا قباحت لازم آئے گی اگر ان تین سے ایک کو جامع مسجد قرار دیا جائے درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مقامی علماء کا انکار کرنا درست اور صحیح ہے ایک مسجد کا سامان وغیرہ دوسری مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے ''**وفی ردالمحتار(ج ۳/ ۵۷۴) قول أبی یوسف إنه لا یجوز نقله ونقل ماله إلیٰ مسجد آخر**''، اور جوجگہ ایک مرتبہ مسجد کے لئے متعین کردی جائے وہ الی یوم القیامۃ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلی مسجد جو لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے مسمار ہوچکی ہے اسے الاول فالاول کے اصول کے تحت تعمیر کرلی جائے اور باقی دونوں کی پوری حفاظت کی جائے اب اگر کوئی مسجد اس مسجد کے سامان وغیرہ سے مستغنی ہو تو اس سامان وغیرہ کو دوسری مسجد میں لگانا جائز اور درست ہے۔ ''**وفی ردالمحتار(۳/ ۵۷۴) قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه إذا استغنی عنهما- إلی قوله - ینقل إلی مسجد آخر**''(۱) لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں نامکمل مسجدوں کا چندہ وغیرہ اول مسجد میں لگانا درست و صحیح ہے۔

اور اگر پہلی مسجد آبادی سے دور یا کنارے واقع ہو تو جو مسجد بھی قریب ہو اس کی تعمیر کی جاوے اور بقیہ کی حفاظت کی جاوے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار ۳/ ۵۱۳، مطبع عثمانیہ۔

صحن مسجد میں وضو خانہ کا حکم:

مسجد کے آداب کے مطابق مسجد میں کلی کرنا، وضو کرنا درست نہیں ہے، ہمارے یہاں کی مسجد میں صحن ہے جو مسجد میں ہی شمار ہوتا ہے اس صحن میں جنوب کی دیوار میں ایک موری بنا رکھا ہے اور اسی موری کے سہارے صحن میں ایک پتھر مشرق سے مغرب کی لمبائی میں بچھا ہوا ہے، برائے مہربانی اس پتھر کا بچھانا مسجد کے صحن میں درست ہے یا کہ نہیں اور اس پر نماز پڑھنا، وضو کرنا یا وہاں کلی کرنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

وضو خانہ کا نقشہ منسلکہ دیکھا اسکا حکم شرعی یہ ہے کہ مسجد تعمیر ہوتے وقت میں اس جگہ کو وضو خانہ کی نیت سے تعمیر کیا ہے جب تو بلا تکلف وہاں وضو جائز ہے، اور مسجد کی تعمیر میں وہاں وضو کی نیت نہیں تھی بلکہ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد سے خارج کر کے وہاں وضو کرنا شروع کیا گیا تو یہ درست نہیں ہے(۱) موری کا وہاں بنا ہوا ہونا پھر وہاں ایک لمبا پتھر بچھا ہوا ہونا جو خاص وضو کے لئے ہے یہ سب اس بات کا قرینہ ہے کہ بانی مسجد کے ذہن میں وہ جگہ وضو خانہ ہی کے لئے ہے، البتہ اہل مسجد کے متصل ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ سب عمل بوقت تعمیر کے ہیں غرض بانی مسجد سے تحقیق واقع کر کے پھر حکم مذکورہ دونوں شقوں میں سے جو ہو منطبق کر لیا جاوے علی الاطلاق کوئی بات یا نکیر نہ کی جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے؟

جھگڑے کے سبب بستی کے مسلمان دو فریق ہو گئے ہیں، ایک فریق کو ہندوؤں نے مشورہ دیا کہ ہم چندہ دیں گے تو دوسری مسجد بناؤ اور پہلی مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دو، چنانچہ ایسا ہی ہوا دوسری مسجد تیار ہو گئی اور چند مہینے اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہے اس کے بعد اختلاف دور ہوا تو پہلی ہی مسجد میں نماز پڑھنے لگے اور دوسری مسجد میں تالا ڈالا کہ دوسری مسجد جو ہندو مسلم کے چندہ سے تیار ہوئی ہے اس کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے۔

۱- ''لأن المسجد لایخرج عن المسجد أبدا'' (شامی جدید علی الدرر ۶/ ۵۴۷، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفيق:

جب مسجد بن گئی تو اب وہ مسجد ہی ہے اور رہے گی اس میں تالا لگانا جائز نہیں ہے (۱)، اس کو آباد رکھنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

مسجد میں استنجا خانہ بنانا:

قریب تین ہفتہ ہوا ہے کہ سلسلہ روزگار میرا سفر دہلی کا ہوا اور صدر بازار میں مال خرید نے کی غرض سے ٹھہرا، صدر بازار میں ایک مسجد ہے جو بڑی ہے، ہزاروں آدمیوں کی نماز پڑھنے کی جگہ ہے، نمازی زیادہ بیوپاری ہوتے ہیں، قریب قریب دوسو آدمی ہوجایا کرتے ہیں، میرا قیام دو روز تک ہر نماز کی جماعت میں شرکت کا ہوا، اسی مسجد میں لیکن اتنی بڑی مسجد میں استنجا خانہ کے لئے باہر جانا پڑتا ہے سرکاری پاخانہ ہے جو مسجد سے کچھ دور ہے قریب قریب ایک سو قدم پر ہے، وہاں ڈھیلے رکھے ہوئے ہیں ان سے صاف کر لیجئے پھر طہارت آ کر غسل خانہ میں کر لیجئے، میں نے کہا کہ اس کو کسی عالم یا مولوی سے معلوم کرو۔ دریافت ہے کہ کیا مسجد میں استنجا خانہ بنانا ضروری نہیں ہے جبکہ جگہ موجود ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد کے قریب مصلیوں کے لئے استنجاء خانہ بنانا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، دہلی میں اس کا رواج اس لئے متروک ہے کہ استنجاء خانہ کو پاخانہ بنا ڈالتے ہیں اور گندہ رکھتے ہیں اور منتظمین مسجد قابو پانے سے عاجز رہتے ہیں، اس لئے منتظم لوگوں نے یہ سلسلہ ہی ختم کردیا۔ خود وہاں کے لوگوں سے ایسا ہی سننے میں آیا ہے ورنہ شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''لأن المسجد لايخرج عن المسجدية أبدا'' (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۵۴۷، مکتبہ زکریا دیوبند)، '' اما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع'' (ردالمحتار علی الدرر ۶/ ۵۴۸، مکتبہ زکریا)۔

جہاں استنجا خانہ بنانے سے مسجد کی بے حرمتی ہو، وہیں استنجا خانہ بنانے کا حکم:

ایک مسجد ہے جو پہلے ایک درجہ تھی اب تقریب دو سال کے ہوتا ہے کہ دو درجہ ہوگئی ہے، اس مسجد میں استنجا خانہ پہلے سے موجود تھا، اس کا راستہ پہلے مسجد کے باہر سے عام راستہ پر تھا کہ عرصہ سات سال کا ہوا اس کا راستہ باہر سے بند کر کے مسجد کے اندر سے بنادیا گیا ہے، کیونکہ باہر سے استنجا خانہ کا راستہ رہنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی تھی اور گناہ ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کے سامنے ایک اسکول ہے اس کے عام راستہ پر رہنے سے ہر مذہب کے لوگ استنجا کرتے تھے اور مثلاً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، قبلہ رو ہو کر پیشاب کرنا، اب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، لہذا ایک استنجا خانہ اور بنالیا گیا جو پہلا استنجا خانہ تھا اس کی چھت پر بنالیا گیا ہے، اس کا راستہ باہر سے آسکتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

وہی پہلے والا استنجا خانہ پھر باہر سے کھولنے میں مسجد کی بے حرمتی حسب سابق لوٹنے کا خطرہ نہ ہو تو کھولا جاوے ورنہ نہیں، بے حرمتی سے حفاظت واجب ہے (۱)۔

البتہ استنجا خانہ کی چھت پر جہاں غسل خانہ بنا ہوا تھا اگر وہاں استنجا خانہ بنانے پر مسجد کی بے حرمتی نہ ہوتی ہو تو وہاں بھی بناسکتے ہیں، اسی طرح مسجد سے باہر قریب تر جگہ میں جہاں بھی استنجا خانہ بنانے سے کام چل جاوے اور مسجد کی بے حرمتی سے محفوظ رہے، بناسکتے ہیں، الغرض استنجا خانہ بنانا محض اپنی اور مصلیوں کی سہولت کے لئے ہے بذات خود واجب نہیں ہے اور نہ مقصود اصلی ہے اور مسجد کی حفاظت اور مسجد کا بے حرمتی سے بچانا واجب اور مقصود اصلی میں ہے، لہذا یہ مقدم رکھا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی اینٹ مدرسہ میں یا مدرسہ کی مسجد میں لگی تو کیا حکم ہے؟

ہمارے یہاں پر ایک ہی ساتھ مسجد اور مدرسہ اور حجرہ یہ تینوں عمارتیں شہید کی گئیں اور اس کے بعد تعمیر کی گئی، اب

۱- ''فکان فی جعلہ مسجدا ضرورۃ بخلاف جعل المسجد طریقا'' (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۵۴۷، مکتبہ زکریا)۔

چونکہ یہ قریب قریب ہیں ان کے شہید کرنے کے وقت کا صحیح اندازہ کسی صاحب کو نہیں ہے کہ مسجد کی اینٹ یا سامان مدرسہ میں لگایا مدرسہ کا مسجد میں لگا اور ایک آدمی کہتا ہے کہ لگا نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ مدرسہ کی اینٹ لگی ہے لیکن کتنی مقدار میں لگی ہے ہم کو یہ دھیان نہیں ہے، اب اس کا کیا ہونا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جو لوگ اس تعمیر کے کارکنان تھے وہ لوگ ذمہ دار ہیں آپ لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، بےفکر مسجد میں نماز پڑھیں، کارکنان کو چاہئے کہ اندازہ کرکے جتنا سامان ادھر کا ادھر لگا ہو اس کا تاوان وہ خود دیں اگر نہ دیں گے تو خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے(۱) آپ لوگوں سے مطلب نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ سید احمد علی سعید

مسجد میں دی ہوئی چیزیں واپس لینا:

زید کی بستی جس کی آبادی بہت مختصر ہے تقریباً ۲۵ گھر مسلمان رہتے ہیں، یہاں ایک ہی مسجد ہے، نمازیوں کی تعداد بہت مختصر ہے کبھی نماز کی جماعت ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی ہے، ایسی صورت میں بکر اور زید میں نزاع ہو گیا ہے، لہٰذا بکر نے عید کی نماز مسجد کے تین گز کے فاصلہ پر علیحدہ پڑھی اور بکر نے کچھ مصلی اور دری مسجد میں دیا تھا اور کچھ اینٹ بھی، اب وہ اپنی چیزیں واپس کرنا چاہتا ہے اور دوسری مسجد بنانے کو تیار ہے اس کے لئے عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد میں دی ہوئی اینٹ وغیرہ اگر چہ جب تک خرچ نہ ہو چکی ہوں دینے والا واپس لے سکتا ہے، لیکن صورت مسئولہ میں بکر کے یہ افعال کسی طرح صحیح نہیں، اگر واقعات ایسے ہی ہیں جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو بکر کو فوراً باز آنا چاہئے

۱- ”ولایجوز نقلہ ونقل مالہ إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیہ اولا وھو الفتوی“(رد المحتار علی الدر ۶/ ۵۴۸، مکتبہ زکریا، مطلب فیما لو خرب المسجد أو غیرہ)۔

اور ہرگز اختلاف نہیں کرنا چاہئے مل جل کر رہنا اور کام کرنا ضروری ہے، ورنہ ساری خرابیوں کا وبال ان پر پڑے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

جواب صحیح ہے: ایسے چھوٹے گاؤں میں نماز عید درست نہیں ہے۔ محمود عفی عنہ۔

دوسری مسجد کی تعمیر کے بعد پرانی مسجد کا حکم:

ایک گاؤں میں پہلے ایک ہی مسجد تھی، بعد میں نمازی زیادہ ہونے کی وجہ سے گاؤں والوں نے مشورہ کر کے دوسرے محلہ میں اس مسجد کو منتقل کر دیا، واضح رہے کہ کو پرانی مسجد باقی نہیں ہے لیکن جگہ سجدہ باقی ہے اور اس جگہ ہر سال نماز عیدین پڑھی جاتی ہے ایسے گاؤں کے آدمیوں میں کسی بات پر نزاع ہوگیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی مسجد کے محلہ والے اس کو آباد کرنا چاہتے ہیں، دریافت یہ کہ کیا اس پرانی مسجد کی جگہ پر پھر مسجد قائم ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جب ایک مرتبہ مسجد ہو جاتی ہے قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے(۱)، اس کو ویران یا ترک نہیں کرنا چاہئے دونوں مسجدوں کو نماز پنجگانہ سے آباد کرنا چاہئے۔ تنازع البتہ نہایت بری چیز ہے (۲)، اس کو جہاں تک جلد ہو سکے ختم کر دینا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مسجد کے صحن کے کچھ حصہ پر مسجد کی آمدنی کی خاطر دوکان کی تعمیر:

مسجد کے لیے پورب کی طرف لب روڈ کچھ دوکانیں تعمیر کرانے کا پروگرام ہے، دوکانوں کے لیے اندر کی موجودہ

۱- "ولوخرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الامام والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتى" (الدرالمختار ۳/ ۳۷۱)۔

۲- "والفتنة اشد من القتل" (سورۂ بقرہ ۱۹۱)۔

زمین حساب سے کچھ کم پڑرہی ہے، مسجد کا موجود فرش جو بعد میں بڑھایا گیا ہے، اگر اس فرش کی تین فٹ زمین دوکانوں میں شامل کرلی جائے تو دوکانیں اچھی اورزیادہ کارآمد ہوں گی، مسجد کے مفاد کی خاطر کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

فرش کا جو حصہ اگر چہ ضرورتاً مسجد میں داخل کرلیا گیا اور مسجد قرار دیدیا گیا، تو وہ مسجد ہی کے حکم میں ہوگیا، اب اس میں سے ایک آدھ فٹ بھی دوکانوں کے لیے نہ لیا جائے، چاہے یہ لینا مسجد کے مفاد میں ہی کیوں نہ ہو، جائز نہ ہوگا، بکذا فی الردوفی الدروغیرہ (۱)، دوکانیں کشادہ نہ ہونے سے یا کہ آمدنی نہ ہونے سے یا بالکل دوکانوں کی تعمیر نہ کرنے میں بھی کوئی گناہ نہ ہوگا، اور اجزاء مسجد لے لینے میں سخت گناہ ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد کے چندہ سے دوکان واستنجا خانہ کی تعمیر:

مسجد کے چندہ سے مسجد کے لیے دوکان، پیشاب خانہ اور غسل خانہ وغیرہ ضروریات کی تعمیر درست ہے یا نہیں؟ جواب کا شدید انتظار ہے۔

الطاف الرحمٰن (اعظم گڈھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے چندہ سے ان مذکورہ تمام ضروریات کی تعمیر درست ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۲/۱۴۰۱ھ

ایک سنوی موقوفہ زمین کے متعلق استفتاء:

ملک آسام میں جو لوگ بودوباش کرتے ہیں، وہاں تین قسم کی زمینیں ہیں:

۱-ایک سنوی یا یکسنیہ، ۲-میعادی، ۳-توضیح۔ تینوں کی تفصیل منسلکہ مسودات میں دی گئی ہے۔ مبحوث عنہا پہلی قسم

۱- ’’کما جاز جعل الإمام الطریق مسجداً لا عکسہ‘‘ (الدر المختار علی ہامش الشامی ۳/۳۸۳ کتاب الوقف (مرتب))۔

کی زمین ہے۔

چونکہ مسجد، قبرستان، عیدگاہ، درسگاہ ایسی زمینوں میں ہیں اور کروڑوں بیگھے زمین ایسے اداروں کے لیے وقف ہیں، سرکار کی طرف سے وقف نامہ کی رجسٹری بھی ہوتی ہے، سلفاً خلفاً وقف قائم پر عمل استمراری بھی ہے، اس کے خلاف آج تک کوئی فتویٰ نہیں ہے کہ ایسی زمینوں میں وقف صحیح نہیں۔

ایک شخص نے ایک زمین مسجد کی خاطر وقف کی تھی، پھر کسی وجہ سے اس کی وفات کے بعد اس کے وارث نے یہ زمین واپس لینی چاہی، حالانکہ حکومت کی طرف سے یہ زمین "امباڑی لاجیت تیار پورب مسجد" کے لیے وقف نامہ کی رجسٹریشن حاصل کرچکی تھی، اس کی آمدنی پندرہ سال تک اس مسجد میں لگ چکی تھی، اب مسئلہ کھڑا ہوا کہ یہ زمین واپس لے سکتا ہے یا وقف ثابت ہوتو واپس نہیں لے سکتا، ورنہ لے سکتا ہے۔

بعض فقہاء کرام نے فتویٰ صادر فرمایا کہ وقف ثابت ہونے کے لیے ملک بات واقف کی ہونا ضروری ہے اور ایکسنوی زمین میں ملک بات حاصل نہیں۔

دوسرے گروہ نے وقف ثابت ہونے کا حکم دیدیا اور کہا کہ ملک بات ایک سنوی زمین پر بھی حاصل ہے اور استدلال میں شامی کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں: "إن الواقف لأرض من الأراضي لایخلو إما یکون مالکاً لها من الأصل بأن کان من أهلها حین یمن الإمام علی أهلها، فإن کان الأول فلا في صحة وقفه لوجود ملکه الخ وإن وصلت إلی یده بإقطاع السلطان إیاها له، أو بشراء من بیت المال، فإن کان الأول فإن کانت مواتا أو ملکا للسلطان صح وقفها الخ" (۱)۔

ایک سنوی زمین ان دونوں قسم کے اندر داخل ہے بنابریں وقف صحیح ہے، انتہی

امید ہے کہ تمام دستاویزات پر بنظر غائر توجہ مبذول فرما کر ایک محقق اور مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔

عبدالرحمن (قاضی شریعت ہوجائی ضلع ججیت، آسام)

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب ایک سنوی زمین میں کروڑوں بیگھے زمین دینی اداروں کے لیے وقف ہیں تو ظاہر ہے کہ

۱- شامی ۴۸۲/۳، کتاب الوقف۔

ان اداروں کے اعتبار سے سیکڑوں مسجدیں بھی بنی ہوں گی اور سب کا وقف ہونا شرعاً مسلم ہے، اسی طرح بیسیوں سے زائد قبرستان بھی موقوفہ ہوں گے اور ان کا بھی وقف ہونا ظاہر ہے اور شروع سے یہ معمول چلا آرہا ہے اور حکومت نے کبھی کوئی ایکشن نہیں لیا تو حکومت کی جانب سے ان امور کا یہ اذن حالی ہوا جو شروع ہی سے وجود تملیک کا قرینہ بنا۔

پھر جب ان اوقاف کا اور ایسی زمینوں کے بیع وشراء کا رجسٹریشن بھی برابر ہوتا چلا آرہا ہے، حالانکہ رجسٹریشن کا محکمہ حکومت کا نہایت اہم محکمہ ہے، کوئی رجسٹرار حکومت کی بغیر اذن واجازت کے رجسٹریشن کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تو یہ چیز بھی شروع ہی سے وجود تملیک بلکہ ظہور تملیک پر دلیل بنی، اور پھر جب اکیس سال گذر جانے پر بھی حکومت ان مذکورہ بالا امور پر اعتراض کرنے کے بجائے کچھ معمولی رقم لے کر ہمیشہ کے لئے ملکیت نامہ لکھ دیتی ہے تو یہ چیز قانوناً بھی ظہور ملک کی دلیل بنی۔

اور جب یہ معمول شروع ہی سے چلا آرہا ہے تو اس معمول کا جاری وساری اور دائم رہنا استصحاب حال بھی ہوا، اور ایسے امور میں "بقاء ما كان على ما كان" (۱) کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق یہ استصحاب حال بھی دلیل بنتا ہے۔

اس لیے بلاشبہ یہ تمام اوقاف شرعاً صحیح ونافذ قرار پائیں گے، اور اس کے خلاف فتویٰ دینا یا ان اوقاف کو وقف غلط یا وقف غیر صحیح کہنا کسی طرح درست وصحیح نہ ہوگا، اور انہی سب قرائن ووجوہ سے کبھی کسی عالم وفقیہ نے ان اوقاف کو ناجائز یا غیر شرعی وغیرہ نہیں فرمایا۔

اور یہ کہنا کہ صحت وقف کے لئے موقوفہ پر واقف کی ملکیت باتہ ہونا شرط یا لازم ہے صحیح نہیں جیسا کہ ردالمحتار کی ص ۳۹۲ والی عبارت جس کو فریق ثانی نے اپنے استدلال میں پیش کیا ہے، اس کے بعد والی عبارت ص ۳۹۳ سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، نیز درمختار کتاب الوقف کے شروع میں ہی اس متن (ویزول ملکہ) کے تحت شراح نے جو لکھا ہے اس سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، اور "ولا يقسم إلا عند هما فيقسم المشاع وبه أفتى قارى الهداية وغيره الخ" (۲) اس عبارت سے تو یہ بات خوب واضح ہوجاتی ہے کہ شئے موقوفہ پر واقف کی ملکیت باتہ بوقت وقف ملکیت باتہ شرط یا لازم ہی نہیں، کیونکہ شئے مشاع ومشترک میں اس کے ہر جزء پر شریک کی ملک بالیقین ہوتی ہے، اس کے باوجود جب کوئی شریک اس مشترک کا ایک متعین حصہ (مثلاً نصف یا جو حصہ مراد ہو) مشاعاً وقف کردیتا ہے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ وقف درست ہو

۱- الاشباہ والنظائر مع شرح حموی، ص ۷۷، الفن الاول۔

۲- درمختار علی ہامش الشامی ۳/۳۶۸۔

جاتا ہے، حالانکہ اس پورے موقوفہ حصہ پر بوقتِ وقف واقف کی ملکیت باقی نہیں ہوتی، بلکہ اس موقوفہ کے تقسیم کرالینے اور قبضہ کرالینے کے بعد ملک باتہ اس پر ثابت وقائم ہوتی ہے، اور بوقتِ وقف تمام اجزاء موقوفہ پر ملکیت یا تو فی الجملہ تھی یا محض ملاؤں کے اعتبار سے تھی پھر بھی اس وقف کو مفتی بہ قول میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

اور صورتِ مبحوث عنہا میں جب اس شخص نے اپنی زمین برائے مسجد وقف کی تھی اور وقف کا رجسٹریشن بھی کرادیا تھا اور اس زمین موقوفہ پر مسجد دس پندرہ سال سے برابر قابض ودخیل چلی آرہی ہے اور ہمیشہ اس کی آمدنی اپنے تصرف میں لارہی ہے تو یہ کہنا کہ اس پر واقف کی ملک بات نہ تھی، اس لیے یہ وقف صحیح نہیں ہے، یہ غلط ہے، بلاشبہ یہ وقف صحیح ہے، اور اب اتنے دنوں کے بعد اس وقف کو صحیح نہ ماننا اس ضابطہ شرعیہ ”**تاخیر البیان عن وقت الحاجة لایجوز**“ (۱) کے بھی خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر وغیرہ مفید ہے۔

پھر اس اعتراض کا اگر وقت تھا تو وقف کرنے کے وقت تھا، اب اتنے دنوں کے بعد اور واقف کے مرجانے کے بعد اس بات کو اٹھانے والوں کو مبہم کرتا ہے، اور مبہم کا قول شرعاً حجت نہیں بنتا (۲)۔

اور اگر بوقت وقف کسی وجہ سے ملک بات نہ بھی رہی ہو جب بھی وقف کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، جیسا کہ ابھی وقف مشاع کے جواز کی تقریر سے ثابت ہوچکا۔

لہٰذا اب وقف کے صحیح ہونے میں کسی کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۴/۱۴۰۹ھ

مسجد کی سابق عمارت گرا کر دوسری جدید تعمیر کا حکم:

التمس منک أن تجیب جوابا واضحا بشریعة الاسلامیه لسوال الذی تحت هذه الرسالة، فان بلدی ادرا مفتنم بضلعة تنجاور من ریاسة تاملناد، ففی بلدنا مسجد الجامع القدیم بنی المسجد الجامع المذکور قبل ثلاث مائة وخمسون سنة وکل جدارها ومبنیها بحجر السوداء یصلون الجمعة المسلمون فیه بغیر راحة ولا واسعة وقد یمکن ان یصلون فیه مائة وخمسون نفرا ومجموع نفر من

۱- قواعد الفقہ ۶۷، ناقلا عن شرح السیر الکبیر ۱۵۷/۳۔

۲- المبہم لیس بحجة ناقلا عن شرح السیر الکبیر ۱۹۸۹، ۲۰۹/۱۔

بلدنا کانوا مسلمین قریبا خمسة عشراً آلافاعدداً ولذ عزمنا أن نبني مسجداً جدیدا في هذا المکان الذی کان مسجداً قدیماً مع الراحة الواسعة

فحینئذ ینکر بعض العلماء من بلدنا ویقولون من سبب انکارهم هدم مسجد القدیم وبنی مسجد جدید اختلاف الشریعة وحرامها، وقد وقع الفساد عندنا بأقوالهم، فالتمس عندک العظام ان تفتي فتوی واضحا لبنی المسجد الجدید۔

ای: هل بنی مسجدا جدیدا بعدانهدام المسجدالقدیم للراحة والواسعة من المسلمین المصلین؟ام لا؟

فاکتب فتویک بسرعة، إني أتوجه إلیها والصلوة والسلام علی محمد واله وصحبه أجمیعین والحمدلله رب العالمین۔

الجواب وبالله التوفیق:

حامداً ومصلیا ومسلماً. فاعلموا أن تأسیس هذ االمسجد ولو کان من أزید ثلثه مائة وخمسین سنة، ولکن کان تعمیره مستحکماً من الأحجار السوداء، ولم یتزلزل إلی الآن بل بقي قابلا؛ لأن یصلي فیه من غیر خوف الهدم والخطر علیه، فلا یجوز إهدامه بوجوه سنذکرهاانشاء الله بل إن ضاق علی المصلین فیلزم علیهم أن یبنوا مسجداً آخر في مقام اخر بحیث یرفع الضیق والاحتیاج، وإن لم تتیسر الأرض الواسعة حسب الضرورة فلهم أن یبنوا مسجداً علی منازل منزلا علی منزل حسب الضرورة وحسب استطاعتهم

وأما حکم عدم الاهدام فبوجوه: الأول أن المسجد وقف ومراعات غرض الواقفین واجبة ففي الإهدام من غیر داعیة الاهدام ارتکاب خلاف الواجب فیخشی أن یکون مواخذاً عند الله من هذاالارتکاب۔

وأما ثانیا فإن المساجد من شعائر الله وقال تعالیٰ: ”ومن یعظم شعائر الله فإنها من تقوی القلوب“، فیه إشارة إلی تحفیظ شعائرها فلایجوز استماسها من غیر أن یکون علی شرف الهدم یبقی

استعمالها يبقى استعمالها من خوف الهدم والخطر عليه

وأما ثالثاً۔ إن المساجد انموذجة من السلف وتذكار للخلف، فيكون للعبر والتحريض لا للاستئناس۔

وأما رابعاً۔ إنه في ملک غير اسلامي فإهدامه من غير وجه شرعي داع إلى خوف الهدم والخطر ينفتح باب الإهدام عن أعداء الدين من غير وجه شرعي، هذا ماعندي من الله حكم الشرع الشريف، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱۱/۱۴۱۰ھ

نابینا کو مسجد کا سفیر بنانا:

موضع تیترواڑہ کی جامع مسجد اس وقت نہایت بوسیدہ خطرناک صورت میں ہے، اس کی جدید تعمیر کے لئے چندہ کی ضرورت ہے، اس میں ایک سفیر کی ضرورت ہے وہ ایک نابینا آدمی جنکا نام ملاشجاعت ہے سفیر رکھدیا ہے اوران کے ہمراہ محمد علی پسر نصیر الدین برائے خدمت بھیجا جاتا ہے اوران نابینا کو سفیر مقرر کیا جاتا ہے، ان کی سفارت میں کوئی شرعی خرابی تو نہیں ہے تحریر فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اگر معتاد سجد ہے تو شرعی کوئی نقص نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد میں تدفین درست نہیں ہے:

متولی مسجد صاحب اپنی قبر مسجد ہی کے اندر ایک گوشہ میں بنوانا چاہتے ہیں شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟ یہ مسجد ۶۵/ سال سے آباد ہے، پنجوقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے۔

مظہر پاشا حیدرآباد دکن

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جس جگہ قرار پا جاتی ہے اس کے بعد اس میں کسی قسم کا تصرف شرعاً درست نہیں ہوتا ہے اور جب نماز جنازہ کا حکم بھی یہ ہے کہ وہ خارج مسجد ادا کی جاتی ہے تو پھر مسجد میں تدفین شرعاً کس طرح درست ہو سکتی ہے؟(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/۱۴۰۱ھ

۱- ”فإذا تم ولزم لایملک ولایملک ولایعار ولا یرھن، قال الشامي: أي لایکون مملوکاً لصاحبه ولا یملک أي لایقبل التملیک لغیرہ بالبیع ونحوہ لاستحالة تملیک الخارج عن ملکه“(شامی ۳/۳۷۶ کتاب الوقف)۔

باب ما یتعلق بأحکام المدارس

زکوٰۃ وصدقۃ الفطر کی رقم بغیر حیلۂ تملیک کے مدرسین کی تنخواہ یا تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں:

ان مدارس کے بارے میں جن میں بیرونی طلبہ زیر تعلیم ہیں اور قیام وطعام بذمہ مدرسہ ہے، معطی کی رقم زکوٰۃ دیتے وقت یہ نیت ہوتی ہے کہ جو اپنے ذمہ زکوٰۃ ہے وہ ادا ہو جائے، یہ تو ہوتا نہیں کہ اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر خرچ کرو بلکہ سفیر یا مدرسہ کے مہتمم کے کہنے پر مدرسہ زکوٰۃ لیتا ہے تو زکوٰۃ دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ کے مدرسہ میں کیا کیا مقام ہیں۔ تنخواہ معلمین، طلبہ کے قیام وطعام ولباس، مدرسہ کی توسیع، مدرسہ کے دیگر اخراجات وغیرہ مہتمم مدرسہ رقم زکوٰۃ کی حیلہ تملیک نہ کرتا ہو تو اس زکوٰۃ کی رقم کو کہاں کہاں خرچ کیا جائے؟

احمد علی صدیقی (کمرگون، ایم پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور دوسری واجب التملیک رقوم کو صرف نادار و غیر مستطیع طلبہ کے کھانے اور کپڑے پر خرچ کرنا لازم ہے، اگر تنخواہ مدرسین یا تعمیر وغیرہ یا کسی کام کی اجرت میں خرچ کرتا ہو، یا کسی بھی ایسے کام میں خرچ کرتا جس میں تملیکِ مستحق نہیں ہوتی، بغیر تملیک مستحق کے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لیے احتیاطی پہلو یہی ہے کہ ان رقوم واجب التملیک کے وصول ہونے کے ساتھ ہی مستحقین زکوٰۃ سے تملیک کرا کے پھر خرچ کے لیے استعمال کریں (۱)، اور تملیک کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جتنے روپے کی تملیک کرنا ہو اتنے روپے

۱- "والحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (الدر المختار علی هامش رد المحتار، ج ۲، ۲۳، کتاب الزکوٰۃ) (مرتب)۔

کے بارے میں کسی غریب مستحق زکوٰۃ سے کہیں کہ تم اتنے روپے کہیں سے قرض لاکر مدرسہ میں بطور چندہ وعطیہ دے دو تمہارا قرض ادا کردیا جائے گا، پھر جب وہ غریب اتنا روپے کہیں سے قرض لاکر بطور چندہ مدرسہ میں دے دے تو اس کے بعد زکوٰۃ وغیرہ واجب التملیک والی رقم اس غریب کو دیدیں اور غریب اس رقم سے اپنا قرض ادا کردے۔

اس کو قرض دینے میں ایسا بھی کرسکتے ہیں کہ خود اپنے پاس سے اس کو قرض دے دیں پھر جب وہ قرض لی ہوئی رقم چندہ میں دے تو اس کے بعد اپنی زکوٰۃ والی رقم اس کو دیدیں پھر جب وہ اس رقم پر مالک ہوجائے تو اس سے اپنا قرض وصول کرلیں، یہی طریقہ کسی دوسرے مالدار سے دلاکر اختیار کرسکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱/۲۵ھ

فراہمی مالیات کے لئے اجرت کی ایک جدید شکل اور اس کا حکم شرعی:

میں ایک مدرسہ میں پڑھاتا ہوں جس میں مستطیع وغیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ پڑھتے ہیں اور رہتے ہیں، میں وہاں سے چندہ کرنے کے لیے بمبئی، گجرات کے علاقہ میں جاتا ہوں، اس سال مدرسہ میں سفارتی اجرت اور انعام کی جدید شکل طے ہوئی ہے جس کو عرض کرتا ہوں۔

۱- تنخواہ یومیہ پچاس روپے ہوگی جس میں سفر خرچ بذمہ سفیر ہوگا۔

۲- پورے حلقہ کا ایک کوٹہ مقرر ہوا اس طرح پر کہ پچھلے سال کی آمدنی ۲/۳ حصہ اس سال کے لیے کوٹا ہے، اسی طرح ہر سال کی آمدنی کا ۲/۳ حصہ اپنے آئندہ کے لیے کوٹا ہوگا، مثلاً میرے حلقہ کی پچھلے سال کی آمدنی بارہ ہزار تھی اب آٹھ ہزار کوٹا ہوا۔

بہر کیف جو کوٹا متعین ہے جو کہ اوپر مذکور ہے کہ اتنی رقم وصول ہونے پر کوئی انعام نہیں ہے، صرف تنخواہ ہے اور اگر چندہ کی رقم کوٹا سے متجاوز ہوگئی تو تنخواہ تو جاری ہی رہے گی جب تک وصولی جاری رہے گی مزید مندرجہ ذیل شرح کے ساتھ محصل کو انعام بھی ملے گا۔ کوٹا سے متجاوز رقم سے ایک سے لے کر دو ہزار تک پندرہ فیصد، دو ہزار ایک سے لے کر چار ہزار تک بیس فیصد، چار ہزار ایک سے لے کر چھ ہزار تک پچیس فیصد، چھ ہزار ایک سے لے کر دس ہزار تک تیس فیصد اور دس ہزار ایک سے لے کر اوپر جتنا بھی ہو ساڑھے بتیس فیصد۔ اس میں ایک چیز یہ ہے کہ مندرجہ ذیل شرحوں کے ساتھ انعام جس منزل پر بھی ہوگا وہ کوٹوں کے بعد والی رقم کو محیط ہوگا مثلاً کوٹا کے بعد چھ ہزار ایک روپیہ ہم نے وصول کرلیا تو اب ہمیں انعام پورے

چھ ہزار میں ۳۰ فیصد کے حساب سے ملے گا اسی طرح دیگر شرحیں بھی۔

۳-وصولی کے ایام میں ہماری پرانی تنخواہ جو اور ایام میں ہوتی ہے جاری رہے گی، یہ تنخواہ پچاس روپیہ یومیہ وصولی والی الگ ہے، تو مندرجہ بالا شکل میں یہ تنخواہ اور اس طرح انعام مقرر شدہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناظم صاحب کی اجازت کے بغیر ہم سفراء اگر مفادِ مدرسہ کو سامنے رکھ کر مزید کسی حلقہ میں کام کریں جو نیا ہے تو جائز ہے کہ نہیں جبکہ نیا حلقہ بنانے میں وقت زیادہ لگے گا تو تنخواہ زیادہ ہوگی؟ مہربانی فرما کر شرعی حکم سے نوازیں۔

محمد غفران (اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مدارس میں کمیشن پر سفراء سے جو معاملہ رائج ہے وہ جائز نہیں ہوتا بعض صورتوں میں یہ اجارہ باطل ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں فاسد ہوتا ہے۔ اس کا جائز اور سفیر و مدرسہ دونوں کے لیے سودمند یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے سفیر کی ایک تنخواہ مقرر کردی جائے خواہ خشک یا خوراکی کے ساتھ اور جس علاقہ میں بھیجتا ہو اس علاقہ کے سابق وصولی کی مقدار کے مطابق یہ کہہ دیا جائے کہ اگر آپ کی وصولی اس مقدار سے نہیں بڑھے گی تو آپ کو انعام نہیں ملے گا، ہاں اگر مقررہ مقدار سے زیادہ وصولی ہو تو انعام اس طرح ملے گا کہ آپ اپنی کل وصولی مدرسہ پر بھیجتے جائیں اور مدرسہ اس کو اپنے خزانہ مدرسہ میں رکھتا جائے گا، پھر جب آپ کام ختم کر کے آجائیں گے اور حساب وصولی کریں گے تو اس وقت مقررہ مقدار سے زائد میں اتنا فیصد (جو مناسب وموزوں ہو) آپ کو انعام دیا جائے گا۔ اس طریقہ کار سے سفراء کی ہمت بھی بڑھتی رہے گی اور مدرسہ کو بھی فائدہ پہنچے گا اور کوئی شرعی قباحت بھی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۷/۲۷ھ

مدرسہ کے نام موقوفہ زمین پر عیدگاہ، مسجد اور مطبخ بنانا:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لیے چند اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، پھر اس موقوفہ زمین میں مدرسہ بنا پھر مطبخ اور دارالطلبہ بنا پھر اس زمین میں ایک مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عیدگاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائطِ وقف کے لیے نہیں تھی، صرف زبانی وقف ہوا اور

جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا گیا کمرے بنتے گئے اور اس کے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا، لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ کی متعلقہ عمارات، مطبخ، دارالطلبہ، مسجد اور عیدگاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا تو اب مسجد اور عیدگاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عیدگاہ کا احاطہ طلبہ کی تعلیم کے حسب موسم استعمال ہوتا ہے، اس طرح ایک مدرسہ کے لیے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عیدگاہ میں اینٹ، گارے وغیرہ میں امداد دی، حالانکہ عیدگاہ کی چہار دیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنائی تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں:

نوٹ (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگر چہ صرف مدرسہ ہوتا تھا، لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دارالطلبہ، مسجد، عیدگاہ کی عمارات ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور ان کے آبا واجداد کی طرح ان کے تصورات بھی ہوتے ہیں، زمانہ گذشتہ میں مدرسہ کے نام وکام سے جو زبانی وقف ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد جب کہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہو جاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عیدگاہ بنتی تھی، یعنی مسجد، عیدگاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کو لوازمات مدرسہ تصور کرتے تھے۔

نوٹ (۲) اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عیدگاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے؟

ماسٹر راغب علی (مقام و پوسٹ دودھارا ضلع بستی، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات جس طرح درسگاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ، دارالطلبہ، دارالاقامہ اور مسجد مدرسہ میں شمار ہو کر ان سب چیزوں کا بنانا اور تعمیر بھی واقف کے منشا کے خلاف نہ ہوگا، اسی طرح مدرسہ کی آمدنی بڑھانے کے لیے فاضل زمین پر زراعت یا باغ لگانے سے ہونے والے نفع کا طلبہ اور مدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کر لینا سب درست رہے گا، ان میں سے کوئی چیز واقف کے منشا کے خلاف ہو کر ناجائز نہ ہوگی۔

البتہ نمازعید اگر باغ یا مغازہ کی شکل میں ہوتے ہوئے ادا کریں تو ٹھیک ہے، باقی اس پر عیدگاہ کی عمارت تعمیر کر لینا صحیح نہ ہوگا، اس لیے کہ عیدگاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے، لیکن یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا ہے۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دے دی ہو، یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دو صورت کا ہے کہ یہ عیدگاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا جائز نہیں ہوگا، خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے، البتہ ایسی عیدگاہ میں جو نمازیں ادا کی جائیں گی وہ ادا ہو جائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگادی ہو تو "**شرط الواقف کنص الشارع فی المفهوم والدلالة فی وجوب العمل به**"(۱) کے مطابق اس کی اتباع اور رعایت ضروری ہوتی ہے اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے، نہ زبانی نہ تحریری لیکن اس کے زمانہ میں جو عمل ہوا ہے اس کے منشا اور رضا کا استنباط جہاں تک ہو سکے وہیں تک وسعت دی جائے گی، یا پھر اس کے منشأ وقف سے زیادہ مستحقین منشا وقف ہوا اور عند الشرع احسن منہ ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۲/۱۴۰۲ھ

سفر کے لئے مہتمم کی اجازت کے بغیر وصول شدہ رقم میں تصرف کرنے کا حکم؟

مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ ٹانڈہ وبادلی والوں نے اپنے مدرسہ کے ایک مدرس کو پاکستان چندہ وصولیابی کے لیے بھیجا، ان کے پاسپورٹ بنوانے، ویزہ حاصل کرنے اور اس سلسلے میں ہونے والے دیگر مصارف سفرخرچ کرایہ وغیرہ مدرسہ نے برداشت کیے، مدرسے سے روانگی تا واپسی مکمل تنخواہ مدرسہ نے دی اور ان کو یہ تاکید کی گئی کہ جو بھی رقم حاصل ہو اس کا آپ سامان بالکل نہ خریدیں بلکہ جملہ رقم پاکستان میں مقیم زید، عمرو، بکر وغیرہ کے حوالے کرتے آئیں وہ اپنے طور پر یہاں روانہ کردیں گے۔ لیکن مدرس موصوف نے اس کی خلاف ورزی کر کے اس رقم کا سامان خرید اور کسٹم آفس پر اس کو روک لیا گیا، تقریباً ایک تہائی سامان ساتھ میں لے آئے بقیہ دو تہائی پاکستان کسٹم پر روک لیا گیا اور پاکستان میں ان کے مقیم متعلقین کو واپس کردیا گیا جو رفتہ رفتہ آنے والے لوگوں کے ذریعہ بھیجا جارہا ہے، مدرس موصوف اس سامان کو تاجرانہ طریقے پر اچھے

۱- الدرالمختار علی هامش الشامی، ۴/۳/۴۱۶ کتاب الوقف (مرتب)۔

خاصے نفع سے اس کوفروخت کررہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح رقم جمع کرکے مدرسہ کی وصول شدہ رقم جمع کردوں گا۔ اس مدرس موصوف کے متعلق دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

۱-جب موصوف کا پاسپورٹ، ویزہ، تنخواہ، سفرخرچ ودیگر جملہ مصارف مدرسہ نے دے کر ان کو چندہ کی وصولیابی کے لیے بھیجا، کسٹم کے خطرات کو سامنے رکھ کر سامان کی خریداری سے منع کیا گیا، تو ان کو سامان خریدنا اور اس کی تجارت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

۲-اس سامان سے حاصل ہونے والے نفع کے مستحق مدرس موصوف ہوں گے یا مدرسہ، یعنی مدرسہ کی رقم مثلاً گیارہ ہزار ہی مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی جو کہ رسیدات کے مطابق ہے، یا اس پیسے سے جو رقم مع منافع مثلاً پندرہ ہزار حاصل ہوئی تھی وہ جملہ رقوم مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی۔

۳-مدرس موصوف چندہ کے لیے گیے تھے انہوں نے اس سے تجارت نامی اس رقم کا سامان خرید لیا تو اس صورت میں جن لوگوں نے ان کو زکوۃ کی رقم دی تھی ان کی زکوۃ ادا ہوگئی یا نہیں؟ ان کو دوبارہ دینی ہوگی یا نہیں؟

فرمائشی سامان لانے پر نفع لینا:

۴-مدرس موصوف کی پاکستان روانگی کے وقت بعض حضرات نے فرمائشی طور پر انہیں کچھ سامان لانے کے لیے کہا وہ سامان مثلاً سوروپے کا آیا وہ اس سامان کو ان لوگوں کو دوسوروپے کا دے رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس سامان پر ان کو نفع لینا جائز ہے یا نہیں، کیونکہ یہ تجارت نہیں ہے بلکہ فرمائش ہے، جیسے کوئی بازار جائے اور اس سے کہہ دیں کہ فلاں سامان لے آویں تو لانے والے کو اس طرح منگوائے ہوئے سامان پر نفع لینا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ محمود علی (نائب ہیڈ دلی ضلع رام پور یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-اگر تحریر کردہ واقعات اسی طرح ہیں جس طرح سوال میں تحریر ہیں تو مدرس مذکور گنہگار ہوا اور وصول شدہ مال ونفع سب کا مستحق مدرسہ ہے یہ مدرس نہیں ہے، بلکہ وصول شدہ رقم میں اگر کچھ نقصان ہوجائے گا تو اس کا ضمان بھی مدرس مذکور پر لاگو ہوگا۔ نیز اس مدرس پر لازم ہے کہ تمام مال مع نفع کے مدرسہ کے سپرد کردے۔

۳-اس صورت میں زکوۃ ادا نہیں ہوگی (۱)۔

۱-　''هي تمليك جزء مال عينه الشارع'' (تنویر الابصار علی رد المحتار ۲/۲ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

۴- اس مال پر بھی اس صورت میں نفع لینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر شروع معاملہ میں ہی اپنے اس عمل کی اجرت طے کر لی ہو تو صرف اس اجرت کو لے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۸ھ

مکاتب اسلامیہ میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کی رقم صرف کرنا، نیز حیلہ تملیک کی بہتر شکل؟

ایک بستی مسلمانوں کی ہے، تقریباً چھ سو کی مردم شماری ہے جو مسلم کاشتکاروں پر مشتمل ہے۔ تقریباً سات یا آٹھ افراد بڑی کاشت والے ہیں، باقی چھوٹے چھوٹے رقبہ والے، غریب کاشت کار کافی روز سے یہاں کے مکتب اسلامیہ میں کلام پاک اور اردو دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، ایک معلم بیس روپے ماہانہ اور خوراک پر تعلیم دیتے تھے، قلیل تنخواہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے مدرسہ چھوڑ دیا تو دوسرا معلم بہت ہی تلاش کے بعد اسی روپے ماہانہ اور خوراک پر رکھا گیا، بچوں اور بچیوں کی تعداد کافی ہے جس کی بنا پر ایک معلم کے لیے تمام کام کرنا مشکل ہو گیا ہے، ایک مدرس ناکافی ہے، کاشت کاروں میں جو چھوٹے درجہ کے ہیں وہ اپنے غلہ کی پیداوار سے چالیسواں حصہ نکالتے ہیں، بڑے کاشت کار اپنا چالیسواں حصہ دیگر مدارس میں دیتے تھے، اور مقامی مکتب کو بھی دیتے تھے، اب ایک معلم کے بجائے دو کی اشد حاجت ہے، مہنگائی و گرانی کو دیکھتے ہوئے اسی روپے اور ایک سو پچاس روپے بھی کم ہیں، اس آبادی میں گورنمنٹ کا پرائمری اسکول بھی قائم ہے چونکہ آبادی مسلمانوں کی ہے، اس لیے مکتب اسلامیہ کو جاری رکھنا اشد ضروری ہے، اس لیے کہ اس دور میں کلام پاک، اردو اور دینیات کی تعلیم دلانا بچوں کو بہت ضروری ہے، مندرجہ ذیل امور اس سلسلہ میں قابل غور ہیں:

۱- اس مکتب میں فطرہ کی امداد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اس مکتب میں چرم قربانی کی رقم یا کھال دینا کیسا ہے؟

۳- نیز اس میں زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟

۴- ان تینوں مدوں کی رقمیں تملیک کر کے دینا جائز ہے یا نہیں؟

۵- ناظم یا مہتمم مکتب تملیک کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس انداز سے جواب شرعیہ مع دلائل ہوں کہ عوام الناس بغیر تکلف کے سمجھ لیں۔

مولانا احمد علی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱ تا ۴: صدقۂ فطر، زکوۃ اور چرم قربانی کی قیمت تملیک مستحق کے بغیر تنخواہ وغیرہ کسی مد میں خرچ کرنا درست نہیں، ہاں قربانی کی کھال بجائے فروخت کرنے کے اگر بطور ہدیہ وتحفہ ناظم یا مہتمم مکتب کو دے دی جائیں، پھر ناظم اس کھال کو اپنی ملک میں لینے کے بعد جس مصرف میں چاہے خرچ کرسکتا ہے حتیٰ کہ پھر اس سے مدرسین وملازمین کی تنخواہ بھی دینا جائز ہو جائے گا(۱)۔

حیلۂ تملیک کا بہتر طریقہ:

یہ ہے کہ صدقات واجبہ کی جتنی رقم تنخواہ وغیرہ میں دینی ہو اتنی رقم کے لیے کسی غریب سے کہا جائے کہ تم اتنی رقم قرض لاکر بطور عطیہ و چندہ مدرسہ میں دے دو تمہارا قرض ادا کیا جائیگا، پھر جب وہ غریب اتنی رقم کہیں سے قرض لاکر مدرسہ میں داخل کر دے تو صدقات والی رقم میں سے اتنی رقم اس غریب کو دے کر اس کو مالک بنادیا جائے، پھر وہ غریب اس رقم سے اپنا قرضہ ادا کر دے، اگر کسی دوسری جگہ سے اس کو قرض نہ ملے تو اپنے پاس سے صدقاتِ واجبہ کے علاوہ جو روپے ہوں ان میں سے قرض دے دے تو ایسا بھی کرسکتا ہے، اسی طرح اگر غریب سے خطرہ ہو کہ وہ یہ رقم لے کر قرضہ ادا نہیں کرے گا تو جس سے قرض لایا ہو اور داخل مدرسہ کیا ہو اس کو بلا کر اس کے سامنے صدقاتِ واجبہ والی رقم قرض ادا کرنے کے لیے اس کو دی جائے اور پھر اسی غریب کے اس رقم کے قبضہ کرنے کے بعد اگر چاہے تو زبردستی بھی اپنا قرضہ وصول کرسکتا ہے۔

اور سب سے اہم اور پہلی بات یہ ہے کہ حیلہ تملیک سخت مجبوری کی صورت میں کرنا چاہیے، اس لیے پہلے جو لوگ متمول اور بڑے کاشت کار ہیں ان کو لازم ہے کہ صدقات نافلہ وعطیہ سے ایسی امداد کریں جس سے حیلہ کے بغیر ہی مدرسہ کا کام چلنے لگے، اس لیے کہ دینی تعلیم کا جاری کرنا اور رکھنا بہت ہی بڑا کار ثواب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۴/۱۴۰۲ھ

الاؤنس مدرسین کے بارے میں حکم شرعی:

ایک مدرسہ میں ناخوشگوار حالات کی بنا پر چند مدرسین نے یکجا درمیانی سال میں استعفیٰ دیا، مدتِ استعفیٰ سے قبل مدرسہ کی مجلس شوریٰ بیٹھی جس میں استعفیٰ کی واپسی پر پورا زور دیا گیا، لیکن مدرسین واپسی پر راضی نہ ہوئے۔

۱- ملاحظہ ہو: الدر المختار علی ہامش الشامی، ۲۳ ج ۲ کتاب الزکوۃ (مرتب)۔

بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ ۳۰؍رمضان تک استعفیٰ موخر کیا جائے، درمیانی سال کے سبب اس معاہدہ میں مدرسہ کی مصلحت تھی، چنانچہ شوریٰ کی کارروائی میں یہ معاہدہ طے ہوا اور اسی کو بنیاد قرار دے کر جملہ مدرسین کے الاؤنس ۳۰؍روپے ماہانہ جو مدرسہ دیتا تھا بجائے ۳۰؍روپے کے پندرہ روپے کم کر کے شامل تنخواہ ۳۰؍رمضان تک کیا گیا اور گورنمنٹ سے ملنے والے الاؤنس پر وعدہ کیا گیا کہ وصول ہونے کے بعد ادا کیا جائے گا، اس معاہدہ کے بعد مستعفی مدرسین بھی اخیر سال تک برابر کام کرتے رہے۔

۱۹؍شعبان ۹۰ھ کو مدرسہ میں تعطیل ہوگئی مدرسین کو شعبان کی تنخواہ نہیں دی گئی وہ اپنے اپنے مکان واپس ہوگئے، وسط رمضان میں صرف ۱۸؍دن کی تنخواہ شعبان بذریعہ منی آرڈر روانہ کی گئی جس کو مدرسین نے واپس کردیا، مدرسین کا کہنا ہے کہ چونکہ مدرسین کی حیثیت اجیر شہریکی ہے بغیر معاہدہ کے بھی پورے شعبان کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق تھے، اب چونکہ معاہدہ میں مدتِ اجارہ ۳۰؍رمضان تک بڑھا دی گئی ہے، اس لیے اس معاہدہ کی رو سے پورے شعبان ورمضان دونوں مہینوں کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق ہو چکے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مدرسین اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں یا نہیں؟ اگر حق بجانب ہیں تو شرعاً مہتمم کو ان دونوں ماہ کی تنخواہ روکنے کا حق نہیں ہونا چاہیے، ایسا کرنے پر مہتمم صاحب عنداللہ ماخوذ ہوں گے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے مدرسین کا مطالبہ صحیح ہے اور مطالبہ پورا نہ کرنے پر مہتمم کے سر مواخذہ ہوگا، قال الله تعالىٰ و أوفو ابالعهد إن العهد كان مسئولاً " (سورہ اسرائیل: ۳۴) مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے: "ان الوعد للحق بالدين كما ورد عنه صلى الله عليه وسلم: العدة دين" على ماروا ه الطبراني في الأوسط عن علي و ابن مسعود" ۴/۶۴۶ " الاشباہ" میں ہے الخلف في الوعد حرام، صفحه: ۴۵۲۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

محمد یسین المبارکپوری خادم التدریس والافتاء فی الجامعۃ العربیۃ احیاء العلوم المبارکفور ۱۱؍ذی الحجہ

الجواب وبالله التوفيق:

یہ صحیح ہے کہ رمضان کی تعطیل استراحت کے لیے ہوتی ہے کہ بعد استراحت پھر مستعدی سے کام ہو سکے، جیسا کہ

عام مدارس میں متعارف ہے اور اس بناپر آئندہ سال نہ آنے والے مدرسین وملازمین کو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوتا مگر صورتِ مسئولہ کا معاملہ اس عرف سے الگ اور ایک جدید معاہدہ کے تحت ہے، اس معاہدہ میں جب حسب تحریر سوال رمضان تک کی تصریح ہے تو یہ مستعفی مدرسین ۳۰؍رمضان تک کے اجیر قرار پاگئے اور تعطیل کلاں عرف عام کے تحت مدرسہ نے خود کی ہے، اس لیے اس تعطیل کا تعلق اس معاہدہ خصوصی سے نہ ہوگا، ہاں اگر ۳۰؍رمضان سے قبل ۱۹؍شعبان کو مدرسہ بند کرتے وقت ان مستعفی مدرسین کے ساتھ پھر کوئی معاہدہ جدید کرنے کے بعد ان کو وطن واپس کیا گیا ہوتا تو بے شک سابق معاہدہ ختم ہو کر اس جدید معاہدہ کے ماتحت حکم ہوتا، لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو حسب معاہدہ ۳۰؍رمضان تک کے اجورہ کے مستحق شرعاً یہ مستعفی مدرسین ہوں گے، لہٰذا ان مدرسین کا یہ مطالبہ صحیح ہے اور وہ اجورہ بذمہ مدرسہ واجب ادا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

احکام المدارس سے متعلق ایک فتویٰ:

کیا حکم ہے شریعتِ مطہرہ کا ان دونوں صورتوں میں:

۱- جن مدارس کا الحاق گورنمنٹ سے ہے، وہاں کے شیخ الحدیث حضرات بکثرت ایسے طلبہ کو جو دوسرے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، ان کا فارم امتحان سرکاری ان طلبہ کی منظوری پر خود بھر بھرا کر یا ان طلبہ کے والد یا سرپرست کے ذریعہ بھر بھرا کر اپنے یہاں سے واقعہ کے خلاف اس فارم کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں امتحانات کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ تو کیا ان حضرات کے لیے ایسے فارموں کی تصدیق درست ہے؟ جب کہ ایسا کرنے پر طلبہ کی عمر کے لحاظ سے کافی نقصان ہو جائے گا۔

۲- مدرسین کی تنخواہیں مدارس میں طے رہتی ہیں، اس کے باوجود گورنمنٹ سے بھی کچھ امدادی رقوم ان مدرسین کو مدرسہ کے ذریعہ ملا کرتی ہیں، تو کیا ایسے مدرسین کو زکوٰۃ کی رقم سے حیلہ شرعی کر کے تنخواہ لینا درست ہے، جبکہ وہ گورنمنٹ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہو جایا کرتی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱-امتحان تو پرائیوٹ بھی ہوتا ہے، پس اگر محض پرائیوٹ امتحان کے فارم کی تصدیق کرتا ہے تو یہ صحیح ہے، البتہ اگر یہ لکھتا ہو کہ یہ لڑکا ہمارے یہاں داخل ہو کر باقاعدہ پڑھتا ہے، حالانکہ داخل نہ ہو تو کذب صریح ہوگا اور ناجائز ہوگا۔

۲-تنخواہ کا معاملہ اجرت کا ہے جو اہل مدرسہ کے ذمہ واجب الادا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضروریات اس میں پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور حکومت یہ سمجھتے ہوئے امداد دیتی ہو کہ اس کو مستقل تنخواہ ملتی ہے اور دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

لہٰذا حکومت کے دینے سے اہل مدرسہ کے ذمہ جو وجوب ہے وہ ساقط نہ ہوگا، جب تک کہ اہل مدرسہ اس سے یہ معاملہ نہ کرلیں کہ جس کو حکومت کی یہ امداد ملے گی اس کو ہم یہ سابق تنخواہ نہ دیں گے بلکہ کم کر کے محض اتنی دیں گے اور مدرس اس کو قبول بھی کرلے، کیونکہ صحت اجارہ میں رضاء طرفین ضروری ہے اور علم دین کا باقی رکھنا اور اس کا انتظام واجب ہے اور اس وجوب کی بنیاد پر اجرت وتنخواہ کے معاملہ کا جواز اور اجرت کی ادائیگی وجوب متفرع ہے، پس اگر اہل مدرسہ کے پاس ایسی رقوم نہ ہوں جن سے اجرت وتنخواہ دی جاسکتی ہو اور بغیر اس کے تعلیم دین متعذر رہو، قطع نظر اس سے کہ حکومت کچھ امداد دیتی ہے یا نہیں، حیلہ تملیک کر کے بھی ادائیگی تنخواہ درست رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا کسی سودی ادارہ کو کرایہ پر دینا:

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا مسلم فنڈ والوں کو کرایہ پر دینا اور ان سے دکان یا مکان کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ بینک میں سودی کاروبار بھی ہوتا ہے، تو کیا اس سے حاصل شدہ کرایہ کی آمدنی مدرسہ یا مسجد میں لگانا درست ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق:

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک کو یا کسی ایسے ادارہ کو کرایہ پر دینا جس میں سودی کاروبار ہوتا ہو یا ایسے شخص کو دینا جو اس میں بت یا سنکھ رکھے یا بجائے، یا بت وغیرہ کو پوجے اس کا کرایہ پر دینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین نے بوجہ

اعانت علی المعصیۃ مکروہ فرمایا ہے اور منع فرمایا ہے، اس لیے گنجائش جواز نکلے گی مگر اچھا نہ ہوگا اور حتی الوسع اجتناب کرنا لازم رہے گا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب، ہذہ کلہانی کتاب لاجارۃ من الکتب الفقہ

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۳/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی

مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے خواص وعوام پر اوسط درجہ کا خرچ کرنا درست ہے؟

۱-ہم دارالعلوم میں کسی بزرگ یا عالم کو مدعو کریں ان کے ساتھ خدام اوران سے مستفیض ہونے کی غرض سے عوام بھی دارالعلوم میں آئیں تو ان مہمانان کرام پر دارالعلوم کے خزانے سے خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

۲-دارالعلوم میں عوام کی آمد پر دارالعلوم کے خزانے میں سے خرچ کرنے میں کوئی حرج آئے گا، نیز دارالعلوم کے معاون ومددگار لوگوں کو دارالعلوم ہی کے مفاد کے پیش نظر مدعو کیا جائے اوران پرخرچ کیا جائے تو کوئی حرج ہے؟

نوٹ: دارالعلوم کی اوقاف کی جائداد نہیں ہے، دارالعلوم کے اخراجات کامدار صرف چندہ پر ہے۔

محمد اسماعیل (کیرآف دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ ضلع گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-مدرسہ کے مفاد ومصلحت کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے اوسط درجہ کا خرچ ان جملہ مذکورین پر جائز ہے، اگر اوسط درجہ کی مقدار متعین کرنے میں اختلاف ہوجائے تو اراکین شوریٰ آپس کے مشورہ سے کوئی مناسب مقدار طے کرکے اس کا اختیار مہتمم کو دے دیں۔

یہ حکم چندہ ہی کی رقم ہونے کی صورت میں ہے، اگر وقف کی آمدنی ہو تو منشأ واقف کا لحاظ کرنا بھی ضروری

۱- (وجاز إجارة بيت إلى قوله ليتخذ بيت نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر، وقالا: لاينبغي ذالك، لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة) قال الشامي تحت قوله "وجاز إجارة بيت" هذا عنده أيضاً: لأن الإجارة على منفعة البيت ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه الخ" فتاویٰ شامی ۲۵۱/۵ فصل فی البیع (مرتب)۔

ہوجائے گا اور خلاف منشاء واقف کرنے کا ارکین یا مہتمم کو اختیار نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۰۱ھ

سنیما ہال وغیرہ کی کمائی مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حیلہ شرعی:

زید ایک سنیما ہال کا مالک ہے اور وہ فلم کی ریل منگوا کر فلم بھی چلاتا ہے، اس طرح کی کمائی ہوئی دولت، مکانات، کھیتیاں اور نقد روپیہ کی شکل میں رکھتا ہے، آٹھ دس سال سے با قاعدہ پنج گانہ نماز ادا کرتا رہتا ہے، حاجی ہے، مگر ذریعہ معاش سنیما ہال اور کھیتوں کی آمدنی ہے، کھیتیاں وغیرہ بھی سنیما ہال کی آمدنی سے ہی خریدی گئی ہیں، نیز وہ سنیما ہال کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور تجارت کرنے کی جدوجہد بھی کر رہا ہے، مگر لاکھوں روپیہ مذکورہ تجارت میں پھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے جلد علیحدہ نہیں ہوسکتا ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ ایک مدرسہ کھولے جہاں دینیات، حدیث وتفسیر اور ابتدائی علوم دینیہ پڑھائے جائیں، بچوں کے لیے ایک قیام گاہ اور ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے، اب سوال یہ ہے کہ آیا زید کی اس آمدنی سے زید کا مدرسہ کھولنا، مسجد تعمیر کرنا جائز ہے اور جائز نہ ہونے کی صورت میں اس کی لاکھوں روپیہ کی دولت کی تطہیر کی شریعتِ مطہرہ میں کونسی صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ان روپیوں سے براہِ راست مدرسہ وغیرہ کی تعمیر نہ کریں بلکہ کسی سے قرض لے کر تعمیر کرلیں اور وہ قرض ان روپیوں سے ادا کردیں۔

اگر کسی غریب سے جو مصرف صدقہ ہے کہیں کہ تم اتنے روپے کسی سے قرض لے کر مجھے بطور اعانت مدرسہ میں چندہ دے دو، میں تمہارا قرض ادا کردوں گا اور اس کو اطمینان دلادیں، وہ غریب شخص کسی سے قرض لے کر دیدے اور پھر یہ شخص اسی پہلے روپے سے اتنا روپیہ بطور صدقہ اس غریب کو دے دے جس سے وہ اپنا قرض ادا کردے تو اس طرح تطہیر بھی اتنے صدقہ کردہ روپیہ کی ہوجائے گی (۲)، اس روپیہ سے جو کھیت خریدا ہے، اگر اس کو اجارہ یا لگان پر دے گا تو اس کا نفع بھی صدقہ کرنا ہوگا، ہاں اگر اس کھیت میں خود کاشت کرے اور کھیتی کرے اور اپنی محنت سے جو غلہ کی پیداوار ہوگی وہ حلال ہوگی،

۱- "لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة" (ردالمحتار ۳/۴۲۳)۔

۲- "والحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (الدرالمختار ۲/۲۳ کتاب الزکوۃ)۔

اس کا کھانا درست رہے گا، پس اس سابق حاصل کردہ روپیہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ یا جتنا ہو سکے اراضی خرید کر اس میں اپنا فارم بنا کر کھیتی کرے اور پیداوار حاصل کرے اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنا لے اور تھوڑ تھوڑ حسب موقع بغیر نیت ثواب محض وبال سے بچنے کے لیے صدقہ بھی کرتا رہے، تو انشاء اللہ ذریعہ بھی پاک رہے گا اور تطہیر بھی ہوجائے گی، جب کہ اس طرح کمائے ہوئے روپے کی مقدار صدقہ ہوجائے گا، صدقہ کرنے میں جو مدرسہ کھولے گا اس کے اندر غریب و مسکین طلبہ کے کھانے، کپڑے پر بھی خرچ کرنا درست ہوگا (۱)۔

سینما ہال اگر حرام روپے سے نہیں بنویا ہے بلکہ پاک روپے سے بنا ہوا ہے تو اس میں صرف سینما خود چلانا بند کر کے اس کو کرایہ پر دے دینا کافی ہوگا جو کرایہ ملے گا وہ طیب ہوگا اور اگر سینما ہال بھی حرام ہی روپیہ سے خریدا ہے تو اس کی خرید کی قیمت کے برابر اسی طرح اور جو مکانات ہیں ان کی قیمت کے برابر بھی جب تصدق کردے گا تھوڑا تھوڑا کر کے تو وہ بھی طیب ہوگا اور اس کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی بھی حلال ہوجائے گی، البتہ ریل کو فروخت کردے اور اس ناجائز کاروبار کو ختم کردے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

موقوفہ مدرسہ کا کچھ حصہ یتیم خانہ کو دینے کا حکم:

مدرسہ قریشیہ مظفرنگر ایک عرصہ سے بنا پڑا تھا، حاجی عبدالغنی نے اس کو بنام مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ وقف کردیا، چنانچہ مدرسین مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفرنگر میں درس و تدریس کا کام کر رہے ہیں اور بیرونی طلباء بھی اس میں رہتے ہیں واقف نے وقف نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مکان مدرسہ کا کوئی جز کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا، سوائے تعلیم دین کے اس میں کوئی مشغلہ نہیں ہوسکتا، اب حال میں یتیم خانہ مظفرنگر کے مہتمم نے واقف سے یہ کوشش کی کہ مدرسہ موقوفہ کا اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیدیا جائے، اس یتیم خانہ میں زیادہ تر انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے، واقف مذکور اب کہتا ہے کہ اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیا جائے، اس صورت میں مدرسہ موقوفہ کا کوئی حصہ یتیم خانہ کو دیدینا جائز ہے یا نہیں؟ درآں حالیکہ وہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفرنگر

۱- "وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما ان ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن ان يدفعه الى الفقراء" (بذل المجہود ۱/ ۳۷ کتاب الطہارت)۔ "ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه (فتاوی شامی ۵/ ۵۷ ۲۴ فصل فی البیع)" "أي يتصدق بها بلا نية الثواب إنما ينوي به براءة الذمة" (مرتب)۔

کے نام کل کا کل وقف ہو چکا ہے۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

واقف نے جب مدرسہ مرادیہ مظفر نگر پر وقف کر دیا اور وقف مکمل ہو گیا تو اب واقف کو اختیار نہیں کہ اس وقف کو سوخت کرے یا اس کا کوئی حصہ مدرسہ مذکور کے علاوہ کسی اور مصرف میں استعمال کرے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مدرسہ کے لئے وقف زمین پر مسجد وعیدگاہ کی تعمیر:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لئے کچھ اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی پھر اس موقوفہ زمین پر مدرسہ بنا اور پھر مطبخ اور دار الطلباء بنا پھر اس زمین میں مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عیدگاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائط وقف کے لئے نہیں تھی صرف زبانی وقف ہوا اور جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا گیا کمرے بنتے گئے، اسکے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ تھی، لیکن اس میں بھی جوں جوں ترقی ہوئی مطبخ دار الطلباء مسجد اور عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ سے متعلقہ عمارات مطبخ، دار الطلباء، مسجد اور عیدگاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا۔

تو اب مسجد اور عیدگاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عیدگاہ کا احاطہ طلباء کی تعلیم کے لئے حسب موسم استعمال ہوتا رہا، اس طرح ایک مدرسہ کے لئے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عیدگاہ میں اینٹ گارے وغیرہ میں امداد دی حالانکہ عیدگاہ کی چہار دیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنایا تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگرچہ صرف مدرسہ ہوتا تھا لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دار الطلباء، مسجد، عیدگاہ وغیرہ عمارتیں ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں

۱- کما فی الدر مع الشامی ۳/ ۳۶۱، ''وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من احب ولو غنيا فيلزم فلا يجوز له ابطاله'' (الدر المختار علی الرد ۳/ ۳۹۵، مطبوعہ عثمانیہ)۔

اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور اپنے آباء واجداد کی طرح ان کے تصورات بھی رہتے ہیں، زمانہ گزشتہ میں مدرسہ کے نام وکام سے جو زبانی وقف ہونا تھا کچھ دنوں کے بعد بلکہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہوجاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عیدگاہ متعین تھی۔ یعنی مسجد عیدگاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کو لوازمات مدرسہ سے تصور کرتے تھے اور آج کل بھی وہی حالت ہے۔

نوٹ: اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو تو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عیدگاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے بنابر تصور بالا جواب دے کر ممنون فرمائیے۔

ماسٹر رجب علی (دودھارا، ضلع بستی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات میں جس طرح درسگاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ ودار الطلباء، دار الاقامہ اور مسجد مدرسہ سب ضروریات ومتعلقات مدرسہ میں شمار ہو کر ان سب چیزوں کا بنانا وتعمیر کرنا کوئی بھی واقف کی منشاء کے خلاف نہ ہوگا (۱)۔

اسی طرح مدرسہ کی آمدنی بڑھانے کے لئے فاضل زمین پر کھیتی کرلینا یا باغ لگا کر اس کا نفع طلباء ومدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کرلینا سب درست رہے گا۔ ان میں سے کوئی چیز منشاء واقف کے خلاف ہو کر ناجائز نہ ہوگی، البتہ نماز عید اگر باغ یا مغازہ کی شکل ہوتے ہوئے ادا کرلیا تو ٹھیک ہے باقی اس پر عیدگاہ کی عمارت تعمیر کردینا یہ صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ عیدگاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے اور یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے، اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا جب یہ زمین ایک دفعہ مدرسہ کے لئے وقف ہوچکی تو اب اس کو عیدگاہ کی عمارت کے لئے وقف کرنا صحیح نہ ہوگا (۲)۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دیدی ہو یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو

۱- ’’وإذا جعله تحته سردابا لمصالحه أي المسجد جاز‘‘ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۴۷)، ’’لو بنى فوقه بيتا للإمام لا يضر لأنه من المصالح‘‘ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۴۸)۔

۲- ’’فإذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن‘‘ (الدر المختار) ’’لا يملك أي لا يكون مملوكاً لصاحبه ولا يملك أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه‘‘ (رد المحتار على الدر المختار ۶/۵۳۹)۔

دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دوصورت کا ہے کہ یہ عیدگاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا جائز نہیں ہوگا خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے بنائے البتہ ایسی عیدگاہ میں جونمازیں ادا کی جائیں گی ادا ہوجائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگادی ہوتو "**شرط الواقف کنص الشارع فی المفهوم والدلالة ووجوب العمل به**" (۱) کے مطابق اس کی اتباع ورعایت ضروری ہوتی ہے، اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے نہ زبانی نہ تحریری، لیکن اس کے زمانہ میں جوعمل ہوا ہے اس سے اس کے منشاء مرضی کا استنباط جہاں تک ہوسکے وہیں تک وسعت کی جائے گی یا پھر اس کے منشاء وقف سے زیادہ مستحسن منشاء وقف ہواور عندالشرع احسن منہ ہوتو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۴۰۲ھ

سفرائے مدارس کا حکم:

ہمارے مدرسہ کے بعض علماء کو رمضان میں وصولی چندہ کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا ہے جن کی تنخواہ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اس مخصوص مبلغ تک اگر چندہ وصول کیا تو ماہواری جو تنخواہ رہتی ہے اس کا ڈبل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر مخصوص مبلغ میں مخصوص انعام دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر ہزار میں سو روپیہ انعام تو اس طریقہ سے تنخواہ متعین کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہ ہوتو صحیح جواز کی کیا صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مدارس میں موجود سفارت کا معاملہ جو فیصد پر طے ہوتا ہے، کئی وجہ سے ناجائز وناردرست ہے۔ شروع معاملہ میں جس وقت کوئی مقدار موجود ہی نہیں تو اس کا فیصد مقرر کرنا باطل اور یہ معاملہ شرعا باطل منعقد ہوگا۔

اور اگر معاملہ اس طرح کیا جائے کہ جب وصولی ہوجائے گی تو وصولی کا یہ فیصد لیا جائیگا تو اس صورت میں حدیث قفیز طحان کی مخالفت کی وجہ سے یہ معاملہ شرعا فاسد ہوگا۔

اور اہل مدارس کا یہ کہنا کہ اگر اس طرح معاملہ نہ کیا جائے تو مدرسہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ اکثر وصولی سفراء ہی

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۶۴۹۔

کی نظر ہوجاتی ہے، تاہم لحاظ ضرورت ہے اور اس کا تدارک اس طرح ہوسکتا ہے کہ معاملہ اس طرح کیا جائے کہ سفراء کی سابق کارکردگی کے اعتبار سے ان کی تنخواہ خشک بھتہ وسفر خرچ وغیرہ کے ساتھ مناسب ہو، مقرر کردی جائے اور ان سے کہا جائے کہ آپ جملہ وصولی مدرسہ میں بھیجتے جائیں اور مدرسہ کی تحویل میں ڈالتے جائیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ جب معاملہ ختم کرکے آپ مدرسہ میں آئیں گے تو آپ کی کل وصولی تحویل مدرسہ میں منتقل ہوجائے گی ومع الخلاط استہلاک وہ ضابطہ کے مطابق مدرسہ کی ہوچکی، اب آپ کے علاقۂ وصولی کے اعتبار سے جب تک اس مقدار کے اندر رہے گی آپ کو صرف تنخواہ ملے گی، ہاں جب اس مقدار سے زیادہ ہوگی تو آپ کو اتنا فیصد انعام بھی ملے گا۔ اس طرح سفراء کی ہمت افزائی ہوکر زیادہ سے زیادہ وصولی بھی ہوگی اور مدرسہ مذکورہ بالا خطرہ کے احتمال سے محفوظ رہے گا اور معاملہ بھی شرعاً بالکل درست وصحیح ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلا تعدی مدرسہ کی رقم سفراء سے گم ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

۱- ساجد نے مدرسہ کی طرف سے برائے فراہمی مالیہ سفر کیا اور مدرسہ سے تاکید کردی گئی تھی کہ جس شہر کا کام مکمل ہوجائے اس کی رقم دوسرے شہر کے سفر سے پہلے بھیج دیں اس کے باوجود ساجد نے دوسرے شہر کا رخ کرلیا اور دوسرے شہر کی مسجد میں کرتہ نکال کر سوگیا ابھی بیدار ہی تھا کہ کسی ہنگامہ کی صورت میں مسجد کے کسی دوسرے گوشہ کی طرف بھاگا۔ اور کرتہ سابق جگہ ہی بھول گیا۔ جب ہنگامہ فروہوا اور اپنی جگہ واپس آیا تو اس کی جیب خالی ہوچکی تھی روپیوں کی اور یہ نفس واقعہ کی صداقت کی تصدیق وہاں کے مقامی ذمہ داروں نے بھی کی ہے۔ اور ساجد کے حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب گمان یہی ہے کہ اس نے کذب بیانی سے کام نہیں لیا ہے اور واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

کیا صورت بالا میں ساجد کو وہ رقم مدرسہ کو ادا کرنا چاہئے یا نہیں، کیا مہتمم مدرسہ یا ذمہ داران مدرسہ کو معاف کرنے کا حق ہے؟

۲- راشد نے اسی طرح سفر کیا اور تمام رقوم اپنے ہمراہ لے کر واپس آرہا تھا۔ ریل میں کسی نے اس کو مٹھائی کھلادی اس کے بعد اس کو بیہوشی ہوگئی اور سارا روپیہ اس کی جیب سے نکال لیا گیا، کافی دیر کی بیہوشی اور بگڑی حالت میں جی۔ آر۔ پی۔ والوں نے ٹرین سے اتار کر علاج ومعالجہ کرایا۔ اور تصدیق نامہ بھی دیا۔ اور بعض ذرائع سے نفس واقعہ کے پیش نظر

ان کی تصدیق ہوتی ہے اور کبھی راشد مذکور سے خیانت کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے اور وہ مدرسہ کا ملازم بھی نہیں ہے اور کوئی صاحب جائیداد یا با ضابطہ ملازمت پیشہ بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ فی الوقت وہ رقم ادا نہیں کر سکے گا، آئندہ بھی مستقبل قریب میں ادائیگی کی توقع مشکل معلوم ہوتی ہے۔

اس صورت میں از روئے شرع وانتظام کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔

۳- ہر دو صورت بالا میں مزکی کی زکوۃ کا کیا حکم ہوگا، کیا اس کو دوبارہ زکوۃ ادا کرنا ہوگا؟

یہ بات پیش نظر رہے کہ سیکڑوں چندہ دہندگان کو مطلع کرنا ایک امر مشکل اور مزید مشقت کا باعث ہے، علاوہ اس کے علماء اور مدارس کے ساتھ عوام واہل خیر کو جو سوء ظن پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے اس پر اعتماد نہ کر سکیں گے، اگر کر بھی لیں تو اندیشہ ہے کہ آئندہ مدرسہ ہذا کو چندہ ہی دینا بند کر دیں اور بے اعتمادی ہو جاوے، ایسے میں ناظم مدرسہ کو کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

جب ذمہ داران مدرسہ نے طریق کار کی تاکیدی ہدایت کر دی تھی اور ان سفراء نے اس کے خلاف کیا تو ان سفراء پر شرعا ضمان واجب الاداء ہو گیا۔ اور ذمہ داران کا مدرسہ کی رقم سے ضمان ادا کرنا یا اس کو معاف کرنا کچھ بھی درست نہیں۔ جب ان سفراء کا دیانتدار ہونا اور ان کا خیانت نہ کرنا اور معذور ہونا عوام کے نزدیک بھی ثابت ہے تو عوام کو ان کی طرف سے چندہ کر کے وہ رقم مدرسہ میں دیدینا چاہئے۔

اب رہ گیا یہ اشکال کہ اس تدبیر سے بھی زکوۃ دہندگان کی زکوۃ کیسے ادا ہوگی تو ایسی صورت کا اصلی حکم تو یہی ہے کہ زکوۃ وصدقات واجبۃ التملیک رقم دینے والوں کو مطلع کر دیا جائے ، تاکہ وہ لوگ معاف کر دیں ضمان نہ لیں اور صحت ادا کے لئے دوبارہ رقم دے دیں، لیکن اس صورت میں وہ اشکال بھی ہے جو استفتاء میں درج ہے اور ان سب اشکالات اور بدنامیوں سے مدارس دینیہ کے بقاء وابقاء کے لئے تحفظ بھی واجب ہے اور خاص کر ہندوستان جیسے فساد والے ملک میں، اس لئے ضابطۂ شرعیہ (یختار أهون البليتين) کے مطابق عوام کے چندہ سے اس رقم کو پورا کر لینے کی شرعا گنجائش نکلے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نوٹ: اگر ارکین مدرسہ غیر مناسب نہ سمجھیں تو روئیداد میں بطور نوٹ یہ جملہ بھی درج کر دیا جائے کہ آج کل فسادات کی کثرت سے راستہ میں رقوم کی بلکہ بعض اوقات سفراء کے ضیاع کا بھی خطرہ زیادہ رہتا ہے، اس لئے ایسے ضیاع کے وقت میں مقامی مخیر حضرات سے اسی ضائع شدہ رقم کی ادائیگی صحیح ہو جانے کے لئے چندہ کر کے معطی حضرات کی جانب سے دے دیا جائے گا تاکہ ادائیگی سب کی صحیح ہو جائے۔

ہاں اگر کسی صاحب کو اس سے اتفاق نہ رہے تو مطلع کر دیا جائے، تاکہ وہ دوبارہ ادا کر کے اس کو صحیح کرلیں ایسا کرنے سے سب دشواریوں اور بدنامیوں سے حفاظت ہو جائے گی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سفیر سے مدرسہ کی رقم گم ہو جانے کا کیا حکم ہے؟

مجھے مدرسہ کے فراہمی چندہ کے لئے قصبہ گلاوٹھی اور شہر میرٹھ سے فراغت کے بعد قصبہ سکندرآباد (بلندشہر) جانا تھا، شام کا وقت اور کچھ بارش کا موسم تھا اور مزید برآں یہ کہ مذکورہ سکندرآباد قصبہ اپنے لئے بالکل نیا اور اجنبی تھا، وہاں رات میں کسی وقت پہنچا جاتا پہنچنے کے بعد نہ معلوم کہاں قیام ہوتا، اس لئے بہتر سمجھا کہ گلاوٹھی میں اپنے جانے پہچانے سابق امین جناب حافظ عبدالجبار صاحب امام مسجد مقبرہ والی کے پاس دو تین روز کے لئے موجودہ وصولیابی مبلغ چھ سو (600/=) امانت رکھدیئے جائیں، چنانچہ اس خیال سے شام قریب ۶ بجے متوکل علی اللہ ہو کر وہ رقم موصوف کو سپرد کر دی اور یہ رقم ایسی تنہائی میں سپرد کی تھی کہ انسان تو علیحدہ کوئی پرند بھی پر نہیں مار رہا تھا مراد ہے بالکل تنہائی تاکہ کوئی تاک نہ لے نیز یہ معاملہ کوئی پہلا نہیں تھا بلکہ اس سے قبل ان کے پاس کئی کئی ہزار کی رقم رکھتا رہا ہوں اور الحمدللہ محفوظ ملی آجتک کوئی کھٹکہ نہیں ہوا مگر تقدیر کہ محنت و مشقت کی وہ رقم مدرسہ کے نصیب سے اترنے والی تھی، افسوس کہ وہ رقم حافظ صاحب کے کچھ پیسوں کے ساتھ کمرہ کے اندر کسی خاص ڈبہ سے چوری ہوگئی، یہ خبر احقر کو سکندرآباد کے قریب واپس آتے ہوئے ملی، سنتے ہی اس خون پسینہ کی وصولیابی کے ضائع ہو جانے پر طبیعت اتنی متاثر ہوئی کہ ہاتھ پاؤں تک کی روح جاتی رہی، ہوش وحواس نے ساتھ چھوڑ دیا اللہ اللہ کر کے ان حافظ صاحب کے پاس پہنچا وہاں اس کا ایک شور تھا کہ مقبرہ والی مسجد میں اس طرح چوری ہوگئی اناللہ وانا الیہ راجعون اسی پریشانی میں وہاں کئی روز تحقیق وتجسس میں ناکامی کے بعد حافظ صاحب کو بڑی خوش آمد درآمد کر کے یہاں (دفتر مدرسہ میں) لایا، مہتمم صاحب اور بھائی محمد ہاشم صاحب اور بھائی عبدالمالک صاحب اور مولانا محمد سعید صاحب صدر مدرس وغیرہ

ذمہ داران مدرسہ سے بالمشافہ بات چیت کر اکرتحریراً ان کی تائید بھی پیش خدمت ہے۔

العبد محمد سہیل قاسمی

سلام مسنون! بندہ کی اسی سلسلہ میں حاضری ہوئی مذکورہ بالا تحریر واقعہ کے عین مطابق ہے۔

عبدالجبار (امام مسجد مقبرہ والی گلاؤٹھی)

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: نفس جواب سے قبل تسہیل فہم کے لئے چند فقہی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

۱-وعن محمد إن حفظها بمن يحفظ ماله كوكيله وما ذونه وشريكه مفاوضة وعنانا جاز وعليه الفتوى(۱)۔

۲- قوله لأن الظاهر أنه يلتزم حفظ مال غيره على الوجه الذي يحفظ مال نفسه وهو إنما يحفظ ماله بمن في عياله فيجوز أن يدفع إليهم الوديعة وعن هذا قيل: العيال ليس بشرط فإنه روى عن محمد أن المودع إذا دفع الوديعة إلى وكيله وهو ليس في عياله أو دفع إلى أمين من امنائه ممن يثق به في ماله وليس في عياله أنه لا يضمن(۲)۔

۳- فكان المالك ..الخ .. أقول فيه شئي (الى قوله) فالظاهر أن مدار ذلك هو الضرورة كما هو المفهوم من قوله ولأ نه لا يجد بداً من الدفع إلى عياله، فالأولىٰ أن يترك فكان المالك راضياً به (۳)۔

اب اس کے بعد اصل جواب معروض ہے:

سوال میں ہے کہ گلاؤٹھی میں شام کا وقت ہو چکا تھا، اگر وہاں بینک بھی ہوتو بھی شام کو بینک بند ہو چکے ہوتے ہیں، اس میں محفوظ کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے اور سکندر آباد قصبہ بالکل نیا اور اجنبی تھا اور حافظ عبدالجبار صاحب جانے پہچانے

۱- درمختار علی الشامی ۴/ ۶۸۷۔

۲- عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۷/ ۴۵۴۔

۳- فتح القدیر ۷/ ۹۰۔

معتمد شخص تھے اور معاملہ بھی پہلی بار کا نہیں تھا جیسا کہ اس خط کشیدہ الفاظ (یہ معاملہ کوئی پہلا معاملہ نہیں تھا بلکہ الخ) سے معلوم ہوتا ہے اس لئے عبارت ۱ و ۲ و ۳ سے بالخصوص عبارت نمبر ۲ کے خط کشیدہ حصہ سے ظاہر ہے کہ سفیر موصوف پر کوئی ضمان نہیں۔

علاوہ ازیں جب سفیر مذکور کا بار بار کا یہ طریقہ تھا تو یہ طریقہ قرینہ ہے کہ معطیان چندہ اور اہل مدرسہ دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو اس طریقہ کا علم تھا پھر کوئی اعتراض یا نکیر نہ کرنا ان کے اذن حال پر دل وسقوط ضمان کا موید ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۱۰/ ۱۴۰۰ھ

مدارس و مکاتب میں چرم قربانی خرچ کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں قریب قریب اکثر دیہات میں مکاتب قائم ہیں جن میں کچھ سرکار سے منظور شدہ ہیں کچھ غیر منظور شدہ ہیں، نصاب تعلیم ہندی، انگلش، حساب تو سرکاری نصاب کے مطابق ہے، البتہ اس کے ساتھ ناظرہ قرآن و تعلیم الاسلام وغیرہ بھی داخل نصاب ہے۔ ان مکاتب کے لئے عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک عام فضاء قائم ہوگئی ہے کہ ہر گاؤں والے اپنے یہاں کی چرم قربانی کو فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے اپنے مکتب کے مدرسین کی تنخواہ میں اور تعمیرات فرش وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں، انہیں مدرسین میں سے بعض نے عوام کو مسئلہ بتلا رکھا ہے کہ مدرسہ کو کھال بیچ کر پیسہ نہ دیں، بلکہ کھال ہی دیں، کھال اور قیمت دونوں میں فرق ہو جاتا ہے، کھال دینا درست ہے، قیمت درست نہیں، عوام مسئلہ کو سن کر مدرسہ کو کھال ہی دیدیتے ہیں، مہتمم مدرسہ کی ذاتی ملکیت میں دینے کو کوئی شخص بھی تیار نہیں، اگر مہتمم کو دیتے ہیں تو وہ بھی برائے مدرسہ ہی دیتے ہیں، کمیٹی مدرسہ ان کھالوں کو فروخت کر کے مدرسہ پر خرچ کر دیتی ہیں، نیز ان میں پڑھنے والے بچوں کے طعام کا انتظام اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک ایک بچہ کوئی گھر دے دیا جاتا ہے، چنانچہ ان بچوں پر وہ پیسہ صرف نہیں کیا جاتا۔

ازروئے شرع شریف فرمائیں کہ ہمارا ایسے مکاتب کو قربانی کی کھال دینا اور کمیٹی و ذمہ داران کو ان کو فروخت کر کے مدرسین کی تنخواہوں میں و تعمیرات میں خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مکاتب سرکار سے منظور شدہ ہوں یا غیر منظور شدہ ہوں اگر علوم دینیہ کی تعلیم اصل مقصود بالذات ہے اور حساب وکتاب اور علوم دنیوی کی تعلیم محض بقدر ضرورت اور تبعاً ہوتی ہے تو سب کو مکاتب دینیہ شمار کریں گے اور سب کو قائم کرنا اور ان کو ترقی دینا باشارہ آیت کریمہ: "یایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا"(۱)، واجبات اصلیہ میں سے ہے اور قوم پر ضروری ہے کہ اپنے عطیات وصدقات نافلہ سے اس کی بھرپور خدمت کریں، البتہ صدقات واجبۃ التملیک میں جیسے زکوٰۃ وغیرہ اور قیمت چرم قربانی اور ان کی رقوم کو ایسے مکتب میں دینا جن میں اس کا مصرف مسلمان غریب بچے جو مستحق صدقہ اور زکوٰۃ نہ ہوں دینا درست نہ ہوگا، ان رقوم کو صرف ان مکاتب میں دینا درست رہے گا جن میں ان مستحق طلبہ کو کھانا کپڑا یا اور رقوم تملیکا دیجاتی ہوں کہ اس کے ذمہ داران تملیک مستحق کرسکیں اور تملیک مستحق کے بعد پھر جس مصرف میں خرچ کرنا ہو خرچ کریں۔

پس اگر کوئی مہتمم مدرسہ اس درجہ معتمد نہ ہو کہ چرم قربانی کی قیمت اس کو تحفہ یا ہدیہ وغیرہ دیا جائے تو وہ مقاصد مکاتب دینیہ کے مطابق صحیح صحیح خرچ کرسکے تو دینا درست نہ ہوگا، بلکہ اراکین کے ذمہ لازم رہے گا کہ وہ ان کھالوں کو فروخت کرکے حیلۂ تملیک کے بعد جس کام میں چاہیں خرچ کریں، کیونکہ یہ رقم واجب التصدق ہے، بطور بدیہ مدارس میں دینا کافی نہ ہوگا اور نہ ذمہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی ہوگا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن مدارس ومکاتب میں غریب نادار طلباء ہوں، مگر ان کو کھانا کپڑا وغیرہ تملیکا نہ دیا جاتا ہو، بلکہ کھانے پینے وغیرہ کا انتظام اہل محلہ پر ہو۔ ان میں بھی ان طلباء کے بہانے سے یہ رقوم دینے سے دینے والوں کا ذمہ بری نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۴۱۱ھ

جس مدرسہ میں اسلامی کام نہ ہو اس میں چندہ دینا:

کسی گاؤں میں اسلامی طور پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہو اور وہ اسلامی کام نہ کررہا ہو اور ہندی کی ترقی کررہا ہے اور سرکار کیطرف سے ڈپٹی صاحب جانچ کے لئے آئے ہوں اور جے جے کے نعرہ لگاتے ہوں اور مدرسہ والا مہتمم صاحب یا صدر

۱- سورۂ تحریم: ۶۔

صاحب اسلامی نام لے لے کر چندہ کرتے ہوں، دریافت ہے کہ ایسی شکل میں جہاں گاؤں والوں سے اسلامی مدرسہ بتلا کر چندہ کرتے ہوں کیا ایسے مکتب میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

محض اسلامی مدرسہ نام رکھنے سے کوئی مدرسہ اسلامی نہیں ہوتا ہے جب تک اس میں اسلامی طور پر کام بھی نہ ہو غرض ایسے مدرسہ میں زکوۃ، صدقۂ فطر، چرم قربانی کی قیمت اور جتنے صدقات واجبہ جنکا مسلمان غرباء ومساکین کو مالک بنانا واجب ہے (۱)، اور بغیر ان غرباء ومساکین کے مالک بنائے ادا نہ ہوتے ہوں اور وہ اس مدرسہ میں نہ ہوتو نہ دے، اگر کوئی کچھ دینا ہی چاہے تو نفلی چندہ دے یہ سب نہ دے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

جماعت اسلامی کے مدرسہ میں چندہ دینا:

ایک قریہ میں ایک مدرسہ عربی جو عرصہ سے دین محمدی عربی کی تعلیم سے بچوں کو سیراب کر رہا تھا اور یہ ادارہ جماعت اہل سنت کے ماتحت تھا، اب کسی وجہ سے اس پر جماعت اسلامی کے کارکنان کا تسلط ہے اس میں انہی کا نصاب چل رہا ہے، قرآن شریف کے کچھ بچے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جو حضرات خیرات چندہ دیں وہ اس مدرسہ میں دیں یا اور کسی ادارہ میں اپنا روپیہ لگا کر ثواب دارین حاصل کریں آیا اس میں دینے سے ان کو ثواب ملتا ہے یا کہ نہیں ان کی نیت خدمت دین اور ثواب مدنظر ہے اگر اہل قریہ ایسے مدرسہ میں اپنا چندہ دیں تو ان پر کوئی تو حرج نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جماعت اسلامی کے تسلط سے بچانے کی تدبیر کرتے رہیں اور اس سے بے تعلق نہ ہوں اور جب تک دینی تعلیم

۱- ''تؤخذ من أغنیائهم فترد إلی فقرائهم'' (رواہ الجماعۃ نیل الاوطار ۴/ ۱۱۴)۔

۲- دیکھئے البدائع ۲/ ۱۶۱ مکتبہ زکریا دیوبند۔

ہوتی ہے اس میں چندہ دینے سے ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غنی عنہ

مدرسہ کی موقوفہ زمین پر اسکول بنانا:

مدرسہ دینیہ کے لئے زمین لی گئی اس میں لڑکیوں کا انگریزی تعلیم کے لئے اسکول بنانا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ دینیہ کے لئے تعلیم دینے کی تصریح کیساتھ جو چندہ لیا گیا کہ اس سے مدرسہ دینیہ کے لئے زمین خریدی جائے گی اور اس سے جو زمین خریدی گئی اس پر محض دینی تعلیم کے لئے اسکول بنانا خواہ اسکول انگریزی ہو یا غیر انگریزی ہو درست نہیں "**شرط الواقف کنص الشارع**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۴/ ۱۴۰۲ھ

۱- ردالمحتار علی الدر ۶/ ۹، ۶۴۹ مکتبہ زکریا۔

باب ما یتعلق بأحکام المقابر

متروکہ قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا:

ایک قدیم مسجد ہے اس کے اردگرد قبریں ہیں، مسجد کے سامنے بھی قبرستان ہے اور دونوں طرف چند قبریں ہیں، مسجد کی طرح قبرستان بھی بہت قدیم ہے، ساٹھ، ستر سال سے اس میں تدفین نہیں ہوتی، لیکن قبریں بالکل صاف معلوم ہوتی ہیں، اس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے اور یہی جامع مسجد بھی ہے، کبھی کبھی اتفاق سے مسجد میں تنگی محسوس ہوتی ہے، اس وجہ سے مسجد کی توسیع کی گئی، مسجد سے متصل ایک حوض ہے اور حوض قبر کے اوپر ہے، یعنی قبر کو بالکل منہدم کر کے اس کے اوپر عمارت بنائی گئی ہے، کیا یہ عمارت بنانا جائز ہے؟

بی، ایس موسیٰ (مقام و پوسٹ نالیسری وایا کالیکٹ ٹیلکو آ دیبنیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہو جائیں کہ میت کے جسم کا مٹی بن جانا غالب ہو گیا ہو تو فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے اوپر تعمیر کرنا جائز ہے (۱)، یہاں تو مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے جس کا ثواب تدفین سے کم نہیں۔

اس لیے ایسے قبرستان میں جس میں تدفین متروک ہو چکی ہو گرچہ موقوفہ ہو اس میں مسجد کی توسیع کرنا بلاشبہ جائز ہے اور یہ فعل حقیقتاً منشاء واقف کے بھی خلاف نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں حسبِ تحریر سوال یہ مسجد کی توسیع کر لینا یا قبرستان کو ضروریات مسجد میں لے لینا بلاشبہ جائز ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۷/۱۴۰۰ھ

۱- ”إذا بلی المیت وصار تراباً یجوز زرعه والبناء علیه“ (شامی ۱/۶۰۶ کتاب الجنائز)۔

۲- ”لأن غرضه إحیاء حقه وذلک یحصل بما قلنا“ (شامی ۳/۳، کتاب الوقف) (مرتب)۔

قدیم متروکہ قبر کے نشانات ختم کر کے مسجد بنانا؟

ایک جامع مسجد کی بابت مندرجہ ذیل سوالات پیش خدمت ہیں، مدلل جواب سے جلد نوازیں:

۱-ایک قدیم اور بڑی جامع مسجد جو ہمارے قصبہ گھوسی میں تھانہ سے متصل واقع ہے، اس کے جنوب میں افتادہ زمین ہے، اس زمین میں ایک قدیم مزار سید بابا کے نام سے مشہور ہے مزار کی چوحدی پختہ لمبائی چوڑائی 4*6 ہاتھ ہوگی، مسجد بھی ایک صدی سے زیادہ قدیم ہے، اور مزار بھی کافی قدیم ہے، بہت پہلے سے صاحب مزار کا حسب ونسب اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ معلوم نہ ہوسکا، اور نہ کوئی آدمی صاحب مزار کی تدفین ہی بتاتا ہے، البتہ اسی زمین سے متصل جنوب میں تحصیل ہے، تحصیل کے پرانے لوگوں سے اتنا معلوم ہوتا رہا ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال قبل فلاں تحصیلدار نے خواب میں سید بابا کو دیکھا تھا تحصیلدار کی قیام گاہ اس زمین سے متصل تھی، تحصیلدار نے مقامی طور پر بعض مسلمانوں کو شامل کر کے ایک کار مستحسن سمجھ کر مزار کی جگہ متعین کردی، اور معمولی طور پر اس کی کرسی بھی پختہ اینٹ سے تیار کرادی، آج بھی وہ مزار اسی صورت میں ہے، مسلمانوں سے زیادہ اہل ہنود پھول بتاشے چڑھاتے ہیں اور بتدریج اس عمل میں اضافہ ہی ہے، بعض مسلمان بھی اس سے اعتقاد رکھتے ہیں، اب اس وقت مسجد کی توسیع ناگزیر ہے، کیونکہ درمیان کے پانچ سالوں کا وقت اس زمین کے سلسلے میں تھانہ والوں سے مقدمہ بازی میں گذرا، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ عدالت دیوانی سے مع مسجد وزمین عام مسلمانوں کے حق میں ہوگیا۔

کثرت اژدہام کی وجہ سے مسجد کے علاوہ اس زمین پر بھی نمازی جمعہ کے دن بھرے رہتے ہیں بلکہ کچھ تاخیر سے آنے والوں کو جگہ نہیں ملتی، مزار مذکور مسجد کی مغربی دیوار میں پڑتا ہے، تقریباً آدھی مسجد کی تعمیر اگر صرف مزار تک رکھی جائے تو نمازی کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اور نہ توسیع کا مقصد ہی حاصل ہوگا، اور اگر مزار ختم کردیا جائے تو اس میں فتنہ کا امکان ہے، مذکورہ حالات میں کیا صورت اختیار کی جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

البحر الرائق میں ہے: "ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ" (۱)۔

۱- ۲/۲۱۰ کتاب الجنائز۔

وهکذا فی الرد (۱) والهندیة المعروفة بفتاویٰ عالمگیریة وغیرها۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسد میت کے مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس قبر میں دوسرے مردہ کا دفن کرنا اور اس پر کھیتی کرنا اور مکان بنالینا سب درست ہے اور جائز رہتا ہے، اور جب کھیتی کرنا اور مکان بنانا جائز ہے تو مسجد کی توسیع وتعمیر بلاشبہ جائز ودرست ہوگی، چنانچہ تاریخ الکعبۃ المعظمۃ ص۱۶۷ میں ہے: **مابین المقام والرکن وزمزم قبر تسعة وتسعین نبیاً** یعنی مقام ابراہیم اور رکن اور چاہ زمزم کے درمیان میں ننانویں نبیوں کی قبریں ہیں، اور اسی کتاب میں ہے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک کردی جاتی تھی تو وہ نبی بیت اللہ شریف کے پاس آ کر پناہ لیتے اور وہیں تا زندگی متعبد ہوجاتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی جس جگہ وفات واقع ہوتی ہے وہ اسی جگہ مدفون ہوتا ہے اور اب جب کہ ان قبروں کے نشانات صدیوں سے کسی کو معلوم نہیں تو کہنا پڑے گا کہ مسجد حرام کی توسیع میں زمانہ قدیم سے ہی وہ قبریں حدودِ حرم میں آگئیں، اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی قبریں دار حطیم میں ہیں، جو حدود مطاف میں ہے اور قبروں کا کوئی نشان نہیں ہے۔

یہ باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی قبروں کے نشانات مٹا کر بھی توسیع مسجد وتعمیر جائز ہے، اسی قسم کے مضامین طبری اور البدایہ والنہایہ، جلد۹ ص۱۲۰، ۸، ۱۴۳، ۱۹۱، ۱۹۲ میں بھی ہیں۔

اس لیے صورت مسئولہ میں بلاشبہ جائز ہے کہ نشان قبر مٹا کر توسیع مسجد کرلی جائے، بالخصوص جبکہ اس قبر کا واقعی قبر ہونا بھی مشتبہ ہے، لیکن اگر اس میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو یہ کرلیا جائے کہ قبر کو بغیر توڑے اور منہدم کیے ہوئے مٹی اتنی اونچی پاٹ دی جائے کہ قبر زمین میں چھپ جائے اور نشان قبر تک نمایاں نہ رہے اور اس پر توسیع مسجد کردی جائے، اگر اس صورت میں بھی کسی فتنہ وغیرہ کا اندیشہ ہو تو یہ بھی کرسکتے ہیں کہ قبر کی اونچائی کے برابر ہر طرف دیوار اٹھا کر اس پر ایک ڈاٹ لگائیں کہ پوری قبر ڈاٹ کے اندر آجائے پھر اس کے اوپر مٹی ڈال کر کرسی اونچی کرائیں اور مسجد کی توسیع کرائیں، اس صورت میں اگرچہ مسجد کی کرسی بھی کچھ اونچی کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر اس صورت میں بھی فتنہ کا خطرہ ہو تو عجلت نہ کی جائے بلکہ عوام کو مسئلہ کی نوعیت وحقیقت بتلا کر خوب مطمئن کرلینے کے بعد کوئی اقدام کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- ای فی رد المحتار ۱/۱۰۶ کتاب الجنائز۔

قبرستان کے پیڑ یا اس کی قیمت کو مسجد میں لگانا:

ہمیں اس امر کے لیے فتوی درکار ہے کہ قبرستان کے پیڑ یا ان کی قیمت مسجد کے احاطہ کے اندر یا مسجد کے احاطہ سے باہر واقع مسجد کے کمروں کی تعمیر میں استعمال ہو سکتی ہے یا نہیں، دیگر یہ کہ پیڑ کی لکڑی یا ان کی قیمت کس طور پر استعمال کرنا جائز ہے؟

نسیم اقبال (صدر منتظمہ کمیٹی دوگڈہ ضلع پوڑی گڑھوال)

الجواب وبالله التوفيق:

قبرستان کے پیڑوں کی قیمت یا ان کی لکڑی مسجد کے کسی کام میں اس وقت لگانا جائز ہے جب کہ وہ قبرستان کے کام وضرورت سے بالکل فاضل ہو اور یوں ہی پڑے ضائع یا خراب ہو جانے کا غالب گمان ہو جائے، بغیر اس کے ان چیزوں کا قبرستان کے علاوہ کہیں اور استعمال درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۹/۹/۱۶ھ

قبرستان کی زمین پر دوکان کی تعمیر اور اس کی آمدنی کا حکم:

ایک قبرستان جو کہ اب سڑک ہے اس کے پاس والے خالی قبرستان کی زمین میں اگر دوکانیں بنالی جائیں اور ان کی آمدنی مدرسہ عربیہ گلزار محمدی یتیموں، بیواؤں، غربا پیشتری اسکول جس کا بنانے کا ارادہ ہے اس میں خرچ کی جائے تو کیسا ہے؟

محمد علی (مقام شاہ پور ضلع مظفر نگر یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

وہ خالی زمین اگر اس درجہ میں ہو کہ نہ تو اس وقت مدفین کی ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت متوقع ہے، تو اس صورت میں حواشی پر دوکانیں بنا کر چوحدی قبرستان بھی محفوظ کر سکتے ہیں اور اس کی آمدنی جو قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اس کو مذکورہ دینی کاموں میں بھی بہ سبیل مناسب اور باقاعدہ دیانت خرچ کر سکتے ہیں ورنہ کوئی صورت جواز کی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قبرستان یا مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا؟

قبرستان یا مسجد کے مثلاً پانچ سو روپے ہیں، اس رقم سے قبرستان یا مسجد کے مفاد کی خاطر کوئی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

عبدالقیوم القاسمی (خادم جامعہ عربیہ قاسم العلوم قصبہ نہٹور بجنور)

الجواب وباللہ التوفیق:

قبرستان یا مسجد کے روپیہ سے تجارت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ حرکت منشاء واقف کے صریح خلاف ہوگی، چاہے مفاد قبرستان و مسجد ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

اس لیے کہ دینے والے اور وقف کرنے والے نے ثواب حاصل کرنے کے لیے دیا ہے، تجارت کے لیے نہیں دیا ہے اور تجارت کرنے میں وہ رقم واقف کے مصرف میں خرچ ہونے کے بجائے تجارت میں مستہلک ہو جائے گی، "**لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۶/۳/۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظہیر الدین مفتاحی

قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کرنا:

مرکزی انجمن تحفظ مساجد و قبور آندھرا پردیش آپ کو واقف کراتی ہے کہ صوبہ آندھرا پردیش بالخصوص حیدرآباد میں آئے دن قبرستانوں پر ناجائز قبضوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، بعض قبرستانوں کو آندھرا پردیش وقف بورڈ نے جس پر صیانت کی براہ راست ذمہ داری قانونِ اوقاف دفعہ ۱۵ / ۱۹۵۴ء کے تحت عائد ہوتی ہے۔ خود آندھرا پردیش وقف بورڈ کی قبرستانوں کے بعض حصوں کو کرایہ وغیرہ سے آمدنی وقف بورڈ کے عنوان سے دیا ہے اور بعض قبرستانوں کو بلڈنگیں وغیرہ بنانے کے لیے کئی سال اجارہ پر دے چکا ہے۔

مرکزی انجمن نے جب بھی ارباب وقف بورڈ سے کہا کہ اراضی قبرستان کو آمدنی وقف بورڈ کے لیے استعمال نہیں کیا

۱- ردالمحتار ۴/۴۴۳۔

جاسکتا تو ارباب بورڈ نے کہا کہ ہمارے پاس فتویٰ موجود ہے کہ فارغ اراضی قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، مرکزی انجمن عالی جناب سے یہ سوال کرتی ہے کہ واقف جس غرض وغایت کے لیے اراضی کو وقف کرتا ہے واقف کے منشاء کے خلاف جانے کا کسی فرد یا حکومت کو بھی حق نہیں پہونچتا۔ جب کہ شہر وصوبوں میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی صیانت ایک مسئلہ بن چکی ہے۔

۲-میت کی تدفین کے لئے قدیم قبروں کو منہدم کرنا:

شریعت میں پکی قبر بنانا جائز ہے یا نہیں؟ قبرستان محدود ہونے کی بنیاد پر کیا قدیم قبروں کو منہدم کر کے مزید میتوں کو دفن کیا جاسکتا ہے؟ یہاں بعض افراد یہ کہہ رہے ہیں کہ ساٹھ سال کے بعد قبر کو مسمار کرنے کا حکم حدیث شریف میں موجود ہے، اس تاویل کی بنا پر کئی قبرستانوں میں علانیہ عمارتیں وغیرہ تعمیر ہورہی ہیں اور مرکزی انجمن آخر میں مسلمانوں کی آخری آرام گاہ کی صیانت وحفاظت کے لیے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرنا چاہتی ہے، تاکہ بعض غرض مند افراد کے غلط پروپیگنڈے ختم ہوجائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جو قبرستان موقوفہ نہیں ہیں مملوکہ ہیں، ان میں اصل مالکوں کو تصرف کا حق حاصل ہے، لیکن جو قبرستان موقوفہ ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک ان میں مردے ہی دفن کرنا متعین ہے، اس کے علاوہ کسی اور کام میں اس طرح لانا جس سے منشاء واقف فوت ہو درست وجائز نہیں!

ہاں جو موقوفہ قبرستان اس حالت میں پہونچ گیا ہو کہ اس میں تدفین موقوف ہوگئی اور آئندہ اس کی توقع بھی نہ ہو کہ تدفین ہوگی، بلکہ اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہوگیا ہو تو اس کے اور اس کے واقف کے منشاء کے تحفظ وبقاء کے لیے جو مناسب صورت ہو اختیار کرنا ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہ اس کو چہار دیواری سے محفوظ کر کے اس میں کل کے اندر باغ لگا کر یا مثلاً اس کے حواشی پر بیرونی رخی دکانیں اور اندر باغ لگا کر اس کی آمدنی دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کی جائے۔

اور اگر دوسرا قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے، یا اس میں مسجد تعمیر کردی جائے یا دینی مدرسہ قائم کردیا جائے۔

اور جب بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی زیادہ ضرورت ہوتو اس صورت میں اس کی آمدنی سے دوسرے محتاج اعانت قبرستان پرخرچ کرنا یا مستقل دوسرا قبرستان قائم کرنا زیادہ قابلِ ترجیح ہوگا، ذاتی وشخصی رہائش گاہ وغیرہ بنالینا یا کوئی عمل ایسا کرنا جس سے وقف ہی بالکلیہ فوت ہوجاتا ہوہرگز جائز نہ ہوگا۔

معلوم نہیں کہ وقف بورڈ والوں کے پاس کیا فتویٰ ہے اورکہاں سے گیا ہے، جب تک وہ فتاویٰ سامنے نہ ہوں ہم ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔

۲-قانونِ شرع میں پکی قبریں بنانا جائز نہیں ہے(۱)۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسدِ میت مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس میں دوسرا مردہ دفن کرسکتے ہیں۔

جسدِ میت کا مٹی ہوجانا یہ ملک وموسم کے اختلاف سے اور خود میت کے احوال کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح اس کے پرانا ہونے کی تحدید وتعیین ساٹھ سال کے ساتھ کسی حدیث میں نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/ ۲/ ۹۴ ۱۳ھ

پرانی قبروں کے نشان مٹ جانے پر کیا حکم ہے؟

یہاں ایک مسجد کے صحن کے جنوبی حصے کے ایک کونے میں تقریباً ۱۵ رفٹ کے احاطہ میں چند پرانی قبریں ہیں اور بالکل ویران جگہ ہے جہاں بچھووغیرہ نکلتے رہتے ہیں، ایک مرتبہ مدرسہ کی ایک بچی کو مسجد میں بچھو نے کاٹ لیا، ان وجوہات کے مدنظر منتظم مدرسہ نے ارادہ کیا ہے کہ قبروں کو ہٹا کر اس ویران جگہ سیمنٹ لگا کر صحن بنالیا جائے اور اونچا بنالیا جائے، کیا شریعت کی رو سے مسجد کے احاطہ والی قبروں کی جگہ سیمنٹ سے پکا کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قبر اتنی پرانی ہوچکی ہو کہ مردہ مٹی بن چکا ہوگا تو قبروں کا نشان باقی رکھنا ضروری نہیں ہے، نشان مٹا کر زمین

۱- "عن جابر نهى رسول الله ﷺ أن يجصص القبور وأن يكتب عليها وأن توطأ رواه الترمذي"(مشکوۃ المصابیح/ص ۱۴۸-۱۴۹)۔

ہموار کر کے پختہ صحن بھی بنا سکتے ہیں، بلکہ مذکورہ خطرہ کی صورت میں ایسا کرلینا بہتر ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

متولی کی اجازت کے بغیر موقوفہ قبرستان میں تدفین:

بغیر متولی کی اجازت کے کسی کو قبرستان میں دفنا دیا جائے اس سلسلہ میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کے خط کشیدہ جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ موقوفہ قبرستان کا ہے اور موقوفہ قبرستان کا حکم شرعی یہ ہے کہ جو متولی غیر واقف ہو اس کا واقف کے درجہ میں ہونا ضروری نہیں، بلکہ وہ واقف کی شرائط کے تابع ہوتا ہے۔ ”**لأن شرط الواقف کنص الشارع**“ (۲)۔

نیز شامی (۳/۴۲۴) میں ہے: ”**مراعاة غرض الواقفین واجبة**“ ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ متولی جو غیر واقف ہو وہ اوقاف کا محض نگراں و منتظم و قیم ہوتا ہے اور اس کو واقف کی منشاء وغرض کے خلاف کے دفن کردینے سے حاصل ہوتا ہے، پس ”**المعروف عرفا کالمشروط شرطا**“ (۳) ضابطہ شرعیہ کے تحت کسی مسلمان کو اس قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

ہاں اگر واقف نے اصل وقف نامہ میں صراحت کردی ہو کہ اس موقوفہ میں فلاں کو دفن نہ کیا جائے تو صرف اس صورت میں متولی کی بغیر اجازت دفن کرنا جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۳/۱۴۱۱ھ

قبرستان کے اردگرد کی زمین مدرسہ میں دینا:

کسی آبادی کے قریب ایک جنگل میں کسی بزرگ کا پرانا مزار ہے جس سے قدیم لوگوں کو عقیدت تھی جس کی بناء پر

۱- ”ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه“ (ردالمحتار ۱/۹۹)۔

۲- الدرالمختار علی ہامش الشامی نعمانی ۱/۳۱۶۔

۳- قواعد الفقہ قاعدہ ۳۳۴ ص۔

مزار کے گرد کچھ اراضی چھوڑ دی گئی تھی بعض خودرو درخت اور اکثر کانٹے دار جھاڑیاں پیدا ہوگئی ہیں اور اس کے قریب کی آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اس مزار کے قریب ہوتی تھی ایک فقیر کو مزار کی حفاظت کے لئے مقرر رکھا دیدی تھی جو عرصہ دراز تک اس اراضی کے خودرو درختوں کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور آخرکار اس کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا، اس کے بعد اس کی اولاد میں کوئی دوسرا شخص اس پر قابض ہوگیا اور درخت کی لکڑیاں کاٹ کر اپنے کام میں لاتا رہا ہے اور غیر مزروعہ زمین کے کچھ حصہ قابل کاشت کر کے کاشت میں نام لکھالیا ہے اس کو فروخت کردیا باقی غیر مزروع حصہ میں اس کی کاشت نہیں ہے اور نہ مالک کی حیثیت سے اسکا نام ہے، اب آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اسکے قریب ہے فیصلہ کیا ہے کہ مزار کی حفاظت کے لئے ایک چہار دیواری بنا کر دروازہ لگا دیا جائے اور مزار کے گرد و نواح کی غیر مزروعہ زمین ایک اسلامی مدرسہ میں دیدی جائے، مدرسہ خود اس جنگل کو صاف کرا کر لکڑی مدرسہ کے صرف میں لے آوے اور زمین کو قابل کاشت بنا کر مدرسہ ہی کاشت کرائے اور اپنے مصرف میں لاتا رہے۔خصوصا ایسی صورت میں جبکہ چک بندی میں اس حصہ کا نکل جانا یقینی ہے آیا مدرسہ کے حق میں یہ فیصلہ از روئے شرع درست ہے یا کہ نہیں؟

۲۔قبرستان کے درخت کی آمدنی مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا:

کسی آبادی کے جنگل میں قبرستان ہے جہاں مسلمانوں کے مردے دفن ہوتے ہیں، اس زمین میں بعض درخت ہیں جن لوگوں کے مردے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں انہوں نے قبرستان کے درخت کٹوا کر مسجد یا مدرسہ میں صرف کرنیکی اجازت دیدی ہے آیا ان درختوں کو کٹوا کر مسجد یا مدرسہ کے صرف میں لانا درست ہے یا کہ نہیں؟ نیز قبرستان کے حلقہ کی بقیہ زمین جس میں قبریں نہیں ہیں یا پرانی قبروں کے آثار بھی باقی نہیں رہے ہیں مدرسہ کو دیدی جائے تو اس میں مدرسہ کاشت کرا سکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔عبارت سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین جو مزار کے اردگرد ابتک باقی ہے موقوفہ ہے یا کسی کی ملک ہے، اگر موقوفہ ہے تو وقف واقف کے شرائط کے مطابق اسکی حفاظت وترقی ودیکھ بھال کرنی واجب ہے اس کے خلاف مدرسہ کو دینا جائز نہ ہوگا (۱)، اور اگر وقف نہیں ہے تو جس کی ملکیت ہو اس کی اجازت سے جس جائز مصرف میں چاہے صرف کرسکتے

۱- "وسئل هو (القاضي الامام شمس الائمه محمود الاوزجندي) ايضا عن المقبرة في القرى اذا اندرست ولم يبق فيها

ہیں اور مدرسہ اسلامی اسکا بہترین مصرف ہے اور مالکوں کا پتہ عرف عام سے بھی چل سکتا ہے، ورنہ قدیم سرکاری کاغذات بندوبست سے ضرور چل سکتا ہے، بہر حال جب کسی طرح کوئی پتہ نہ چلے اور چک بندی میں نکل جانے کا ظن غالب ہوتو ایسی صورت میں آبادی کے لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے۔

۲۔ یہاں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قبرستان وقف ہے تو اس وقف میں واقف کے شرائط ومنشاء کے مطابق عمل کرنا واجب ہے اور اگر وقف نہیں ہے تو مالکوں کی اجازت لے کر درخت کٹوانے درست ہیں اور یہی حکم حلقہ کی بقیہ زمین میں کاشت کرنے کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

مزار وغیرہ کے نام وقف شدہ زمین اور اس کی آمدنی کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

کسی شخص نے کچھ زمین پہلے مزار پیر کے نام پر اور کچھ زمین محرم وغیرہ کرنے کے لئے وقف کی تھی، یعنی پیر کے عرس تعزیہ لاٹھی وغیرہ کے لئے یہ سارے کام خلاف شرع ہونے کی وجہ سے متولی مسجد زمینوں کی دیکھ بھال کرتے رہے پھر انکو مسجد کی زمین میں شامل کرلی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ وقف صحیح ہے، فی الحال اس کی آمدنی مسجد کے کام میں لگایا جارہا ہے، یا یہ لگانا درست ہے اگر عدم صحت کا فتوی ہوتو پھر جو روپیہ لگایا جاچکا ہے انکا کیا حکم ہوگا، نیز ان زمینوں کی آمدنی کو ہائی اسکول یا مدرسہ میں یا کسی اسکول کی تیاری میں لگایا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ واقفوں نے نہ تو مسجد کے نام وقف کیا ہے نہ مسجد کے نام پر رجسٹری کی ہے۔ موقوفہ زمین کی تبدیلی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص نے مزار پیر یا محرم تعزیہ کے لئے یہ زمین وقف کی تھی اگر وہ یا اس کے ورثہ مذکورہ موجود معلوم ہوں تو ان سے اجازت لے لی جائے ورنہ اس زمین کا مسجد میں شامل کرنا یا اس کی آمدنی مسجد پر صرف کرنا صحیح نہ ہوگا (۱)۔ اسی طرح اسی

اثر الموتی لا العظم ولا غیرہ هل یجوز زرعها واستغلالها قال: لا" (ہندیہ ۲/ ۴۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۱- "فی الواقعات بنی مسجدا علی سور المدینة لاینبغی أن یصلی فیه لانه حق العامة فلم یخلص للّٰه تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبة" (شامی ۱/ ۳۵۴، عثمانیہ)۔

زمین کایا اس کی آمدنی کا پائی اسکول کی یا کسی اسکول کی تیاری وتعمیر میں خرچ کرنا بھی جائز نہ ہوگا اور صحت وقف میں یہ تفصیل ہے کہ محرم وتعزیہ والا تو شرعاً صحیح نہیں(۱)، اور مزاربیر کے وقفنامہ میں اگر تصریح نہ ہوتو اس کا بھی وہی حکم ہے جو محرم کے وقف کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو آمدنی متولی نے بلا اس شخص کی یا اس کے وارثوں کی اجازت کے مسجد میں لگائی ہوگی اگر وہ شخص یا اس کے ورثہ چاہیں تو متولی کی ذاتی جائداد سے بطور ضمان کے وصول کرسکتے ہیں اور چاہیں تو معاف بھی کردیں اور یہی ان کے لئے بہتر ہے تو انکو ثواب ملے گا لیکن خوب یاد رہے کہ یہ تاوان وضمان وغیرہ مسجد کے وقف یا مال سے وصول نہیں کرسکتے ہیں۔

اور اگر مزاربیر یا محرم وتعزیہ کے لئے دینے کی بابت بہت قدیم اور پرانی ہو اب اس دینے والے یا اس کے ورثہ کا بھی پتہ نہ ہوتو متولی پر کچھ ضمان نہیں، مسلمانوں کے مشورہ سے مسجد پر یا جس کار خیر میں ہو خرچ کرے اور ان سب کے مشورہ سے ایک ضابطہ وقاعدہ مطابق شرع شریف بنا کر اس کے مطابق عمل کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

متروکہ قبرستان کی زمین میں غرباء کے لئے مکان بنانا:

تقریباً دوسو سال پہلے بھنورشاہ تکیا می ایک جگہ میں کچھ قبریں تھیں مگر اسکا نام ونشان نہیں ہے، البتہ چند قبروں کے نشانات موجود ہیں، دیگر اراضی میں نام ونشان کسی قبر کا نہیں ہے، نہ ایک سو سال سے آج تک وہاں کسی قبر کا وجود ہے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس وقت اس تکیہ میں جو خالی جگہ پڑی ہوئی ہے وہاں غرباء کے مکانات تعمیر ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قرائن تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ قدیم قبرستان اور موقوفہ ہے اگر ایسا ہے تو اس سے کسی قسم کا انتفاع جائز نہیں جیسا کہ عالمگیری جلد ۲ کتاب الوقف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "**وسئل هو أيضاً عن المقبرة في القرىٰ إذا اندرست ولم يبق فيها أثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها قال: لا ولها حكم المقبرة كذا في المحيط وهكذا في قاضي خان من كتاب الوقف**(۲)"۔

۱- "ومنها (اي من شرائط) ان يكون قربة في ذاته وعند التصرف فلايصح وقف المسلم او الذمي على البيعة والكنيسة أو على فقراء اهل الحرب كذا في النهر الفائق" (ہندیہ ۲/ ۳۵۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۲- فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ صرف منشا وقف وواقف کے مطابق اس کا استعمال وحفاظت وآبادی کی جائے، لہذا وہ قبرستان متروک ہوگیا ہو یا اس میں دفن ممکن نہ ہوگیا ہو تو مجبوراً اس کو محفوظ کرکے اس میں باغات لگادیئے جائیں یا جہاں خالی جگہیں ہوں وہاں پر کرایہ کی دوکانات تعمیر کرا کر کرایہ پر دیدیا جائے اور اس کا نفع جو اس کی حرمت وحفاظت سے بچے اہل محلّہ کے دوسرے قبرستان پر صرف کیا جائے اور اگر دوسرا قبرستان بھی اس آمدنی کا محتاج نہ ہو تو غرباء ومساکین پر وہ نفع تقسیم کردیا جائے ہاں اگر وہ جگہ کسی کی ملک ہو تو مالک کی اجازت سے اس پر مکان بھی تعمیر کرسکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ یا امداد یتامیٰ کے لئے مکان کی تعمیر:

قلب آبادی بھواڑے میں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں تقریباً ایک سو سال سے تدفین بند ہے، کچھ حصے پر بعض قبور کے کے نشان پائے جاتے ہیں۔

حالات حاضرہ کے تحت اراضی قبرستان کا تحفظ مشکل نظر آتا ہے اس کا امکان ہے کہ اراضی دستبرد زمانہ کی نظر ہو جائے، کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو لب سڑک حصہ پر مدرسہ حفاظ وامداد یتامیٰ کیلئے عمارت بنا کر وقف کیا جاوے تا کہ جس طرح مسلمان اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کرتے ہیں بعد الموت اس کی خاک بھی تملیک الی اللہ کی حیثیت بنکر اس سے خدمت دین میں صرف ہوتی رہے۔ مسلم عوام یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عند الشرع اس میں کوئی ممانعت تو نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قدیم مسلم قبرستان عموماً وقف ہی ہوتی تھیں لہذا اگر یہ قبرستان وقف ہے جیسا کہ ظاہر اور متبادر بھی ہے تو اس کو غیر قبرستان کے لئے استعمال کرنا شرعاً کسی طرح بھی ہونا جائز ہے، تحفظ دینا ضروری ہے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس قبرستان کی احاطہ بندی کرادیا جائے اور سب سڑک جہاں قبریں نہ ہوں جگہ خالی ہو برائے نفع ومرمت وحفاظت قبرستان دوکانیں بنادی جائیں اور رخ سڑک پر کردیا جائے اور اندرون قبرستان جہاں جگہیں خالی ہوں کچھ درخت از قسم باغ لگادیے جاویں اور اس کی آمدنی قبرستان پر اور اس کے علاوہ جو دوسرا قبرستان مسلمان کا ہو اس پر خرچ کیا جاوے اور اگر صحیح

ثبوت ودلیل سے یہ معلوم ہوکہ یہ قبرستان وقف کی نہیں ہے بلکہ کسی خاص شخص کی مملوک ہے تو اس مالک کی مرضی سے جہاں جگہیں خالی ہیں قبروں کے نشانات نہیں ہیں مکانات بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم:

۱۔عورتوں کو مطلقاً قبرستان میں جانا کیسا ہے؟

۲۔عورتوں کو کسی مزار پر زیارت کی غرض سے جانا کیسا ہے؟

۳۔فرض نماز کے بعد سر یا پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جو دعا پڑھتے ہیں وہ کیا ہے۔مسنون ہے یا نہیں؟

۴۔مسجد کے ممبر کے سامنے مطلقاً روپیہ گننا کیسا ہے؟

۵۔مسجد کے ممبر کے سامنے اسی مسجد کے چندہ کا پیسہ کسی ذمہ دار کو دیا جائے تو جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱، ۲)عورتوں کا مطلقاً قبرستان میں جانا یا مزار پر جانا فی نفسہ جائز ہے، لیکن چونکہ کمزوردل کی ہوتی ہیں، اس لیے متاثر ہوکر بعض ناجائز فعل (شرک وبدعت وغیرہ) کردیتی ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، پس اگر پردہ کے ساتھ جائیں اور سنت کے مطابق کچھ پڑھ کر ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کر کے واپس آجائیں تو اس میں کوئی ممانعت نہ ہوگی۔

۳۔یہ عمل نہ تو سنت ہے نہ تو واجب صرف بطور مباح ایک فعل ضعف دماغ سے حفاظت کی نیت سے یہ علاج کے درجہ کی چیز ہے۔

۴۔جائز ہے۔

۵۔جائز ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۵/۱۴۱۱ھ

چرم قربانی کی رقم سے قبرستان کی چہاردیواری بنانا کیسا ہے؟

چرم قربانی کے مستحق کون ہیں اور کیا چرم قربانی کی آمدنی سے قبرستان کی دیوار بنائی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قربانی کرنے والا جب تک چرم کو فروخت نہ کردے اس کو سب اختیار ہے۔ چاہے تو خود اس کا مصلیٰ، ڈول وغیرہ کچھ بنا کر استعمال کرے یا غریب یا امیر یا اور جس کو چاہے بطور تحفہ ہدیہ کے دے دے پھر وہ پانے والا اس چمڑے کو جس طرح چاہے استعمال کرے حتیٰ کہ فروخت کرکے قبرستان کی چہاردیواری بنوادے یا اس کے بنوانے کے لئے بطور عطیہ دیدے سب جائز رہتا ہے، "**ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو**"(۱)۔

البتہ جب قربانی کرنے والا خود چمڑا فروخت کردے یا کسی کے ذریعہ فروخت کرادے تو اس قیمت کا غرباء یا مساکین پر صدقہ کردینا واجب ہوجاتا ہے اور کسی بھی دوسرے کام میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا ہے، "**فإن بيع اللحم أو الجلد به...... أو بدراهم تصدق بثمنه**" (۲)، ہاں وہ غریب ومسکین اپنا قبضہ قیمت پر کرکے اور مالک ہوکر پھر جہاں چاہے خرچ کرسکتا ہے قبرستان کے لئے بھی دے سکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱۲/۱۴۱۰ھ

قبرستان میں آبادی بسانا:

قبرستان میں آبادی کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

موقوفہ قبرستان میں رہائش کے لئے مکان بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/۱۳۸۵ھ

۱- الدرالمختار ۹/۴۷۵۔

۲- تنویر الابصار علی ہامش ردالمحتار ۹/۴۷۵۔

۱-پرانی قبروں پر دوکان لگانا:

عیدگاہ کے متصل قبرستان کے نشانات جہاں پر ختم ہیں وہاں عید وبقرعید کے موقع پر مٹھائی وغیرہ کی دوکانوں کی بھیڑ ہوجاتی ہے اس کا کیا حکم ہے اور گاؤں کے ذمہ دار لوگوں پر کیا حکم ہے؟

۲-قبرستان میں فقیروں کو چاول دال دینا:

مردہ کو دفنانے کے لئے جب قبرستان لے جاتے ہیں تو فقیر وہاں جمع ہوتے ہیں اور قبرستان ہی میں مردہ کو دفن کے بعد دال چاول اور نمک فقیروں کو بانٹا جاتا ہے اور وہیں سے کچھ مدرسہ کو بھی دیا جاتا ہے یہ رقم کیسی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-یہ سب غلط طریقہ ہے اور منشاء شرع کے خلاف ہے، گاؤں کے تمام ذمہ دار لوگوں پر لازم ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

۲-یہ طریقہ خلاف شرع ہے، صدقہ کے آداب میں سے ہے کہ جہاں تک ہو مخفی اور خفیہ طور پر دیں اور اس کے صحیح مصرف میں دیں، ان فقیروں میں اکثر صدقہ کے مصرف نہیں ہوتے جن کو دینے سے صدقہ ادا بھی نہیں ہوتا اس طریقہ کی اصلاح ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

امیر جماعت کے لئے درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا:

۱-تبلیغی جماعت کے امیر کو ایسی درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے یا کہ نہیں جس درگاہ کا عرس ہوتا ہے قوالی زوروشور سے ہوتی ہے جہاں پر پھول چادر غلاف سے نذرانہ صندل وغیرہ چڑھایا جاتا ہے یہ کہنا کہ ان معاملات میں کچھ دخل نہیں دوں گا، یعنی میں قوالی کرنے، صندل پھول چادر غلاف وغیرہ چڑھانا سے نہیں روکوں گا یہ کہہ کر ممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں۔ جبکہ یہ تمام چیزیں شرک وبدعت ہیں ایسی جگہ خصوصاً امیر جماعت تبلیغ کو ممبر بننا چاہئے یا کہ نہیں۔

۲۔اگرصرف عوام سے کہنے کے لئے کہ مقصد یہ ہے کہ ممبر بنتے ہی رفتہ رفتہ یہ تمام کام بند کردوں گا تو ایسا کرنا عوام کو دھوکہ دینا ہوگا یانہیں اور منافقت ہوگی یا کہ نہیں اگر ممبر بننا ہی ہے تو عوام سے صاف صاف یہ کہہ کر ممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں جبکہ یہ تمام چیزیں شرک وبدعت ہیں ایسی جگہ خصوصا امیر جماعت تبلیغ کو ممبر بننا چاہئے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

یہ طریقہ تبلیغ طریق سنت کے خلاف ہے، اپنی حفاظت مقدم ہے، ایسے مزاروں پر جہاں عرس قوالی پھول چادریں وغیرہ تمام بدعتیں ہوتی ہیں اس کے ممبر بننے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور میں اور اکے نظم ونسق میں برضا ورغبت شریک ہوں اور ان عہود وقواعد وضوابط کی پابندی پہلے کرلیں جو شرعا ناجائز ہیں اور نفع کا بھی پتہ تک نہیں ہے اور شرعی قاعدہ مسلم ہے: جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، اس لئے شرعا اس امر کی اجازت نہ ہوگی، نیز یہی کام اصلاح والا وہ ممبر صاحب باہر سے بلاممبر بنے بھی کرسکتے ہیں، اگر باطن وقلب میں کچھ رکھتے ہوں تو بلاممبر بنے اس کے متولی پر اثر انداز ہوں جب بھی کام بن سکتا ہے، لہذا ان کو حسب تحریر سوال یہ شرکت وغیرہ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

قبرستان کی زمین فروخت کرنا:

ایک قطعہ آراضی کے دو حقیقی بھائی مالک تھے، جن کا نام محمد حسن اور خدا بخش تھا۔ محمد حسن کی اولاد میں شریفا، نذیرا، فہم النساء، غفوری، امین الدین تھے، ان سب کا انتقال ہوگیا، ان کی اولاد میں سے بھی کوئی زندہ نہیں رہا، دوسرے بھائی خدا بخش تھے خدا بخش کی اولاد میں صرف کلوا تھے ان کا بھی انتقال ہوگیا کلوا کی اولاد میں ننھے اور تین لڑکیاں ننھی چھوٹی منکو ہوئیں ننھے چھوٹی منکو کا بھی انتقال ہوگیا اس وقت صرف کلوا کی لڑکی ننھی زندہ ہے۔

کلوا کے لڑکے جو ننھے تھے ان کی اولاد میں عبد العزیز، عبد الصمد، شاہد حسین اور حامد حسین اور ننھے کی بیوی بسم اللہ اس وقت موجود ہیں ان کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے، ان سب کے نام پٹواری کے کاغذوں میں موجود ہیں، یہ قطعہ آراضی ان کی ذاتی ملکیت ہے، یہ قطعہ آراضی پٹواری کاغذوں میں قبرستان درج ہے، اس قطعہ آراضی کو ان وارثوں نے فروخت کیا، اسوقت اس آراضی میں کوئی قبر نہیں ہے وقف بورڈ سے بھی اس قبرستان کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ وقف بورڈ سے یہ

رجسٹرڈ ہے۔

نوٹ: ان مالکوں نے قبرستان کا وہ حصہ جمیں جس میں اسوقت قبریں نہیں رہیں فروخت کیا ہے قبرستان کا وہ حصہ جس میں قبریں ہیں اسے فروخت نہیں کیا ہے تو آیا ان مالکوں کو اس قبرستان کے فروخت کرنے کا کوئی حق ہے یا نہیں ہے جبکہ بیان کی ملکیت ہے، **مدلل** ومفصل تحریر فرمائیں۔

خلیل احمد (محلہ پہاڑی سرائے نگینہ ضلع بجنور (یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

پٹواری کے کاغذ میں قبرستان درج ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ آراضی قدیم سے قبرستان نہ ہوگا، اگر ایسا ہے تو قدیم قبرستان موقوفہ ہوتی ہے اور موقوفہ قبرستان کا بغیر وجہ شرعی کے فروخت کرنا درست نہیں (۱)، پوری تحقیق کرلی جائے، اگر موقوفہ ہو تو فروخت کرنے کی وجہ شرعی واضح کر کے سوال کیا جائے۔

اور اگر واقعۃً مملوک ہو موقوفہ نہ ہو تو مالکوں کو فروخت کرنے کا حق ہوگا حقیقت حال جو ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

نوٹ: یہ بقیہ سوال واضح نہیں ہے مرنے والوں کی ترتیب، انہوں نے مرتے وقت زندہ کس کس کو چھوڑا واضح کریں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مزار کی آمدنی:

قصبہ اٹر کی ضلع سہارنپور میں حدود ملٹری چھاؤنی کے اندر انگریز کے دور حکومت سے ایک شاندار مسجد ہے، انگریز کے دور میں یہاں ملٹری مسلم رہا کرتی تھی اور باقاعدہ سرکاری تنخواہ پر امام بھی رہا کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں وہ ملٹری یہاں سے ٹرانسفر ہوگئی، ملٹری کا اصول ہے کہ ایک جگہ چھاؤنی میں ایک مذہب کے اگر ۱۲۰ ماننے والے ہوتے تو ان کو ان کے مذہب کا رہبر سرکاری تنخواہ پر امام انکو مل جاتا ہے، ۱۹۴۷ء سے لیکر آج تک مسلمان یہاں پر رہتے نہیں جس سے سرکاری طور پر امام رکھ

۱- "وإذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه" (ہدایہ ۲/۶۴۰)۔

کر مسجد کو آباد کیا جا سکے، چھاونی کے اندر ہی مسجد سے تقریباً ۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بزرگ کا مزار ہے جس پر جمعرات کو عقیدت مند لوگوں کا ایک خاص ہجوم ہو جاتا ہے جس میں ۹۵ پرسینٹ غیر مذہب کے لوگ اور ۵ فیصد مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اس مزار کی آمد کو افسران لوگ کھا جاتے ہیں، اس وقت ایک افسر اچھے خیال کا ہے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اس مزار کو مسجد سے منسلک کرلو تاکہ اس کی آمدنی سے مسجد بھی آباد ہو جاوے اور یہ پیسے ادھر ادھر بھی نہ جائے، اگر اس پیسے سے امام کی تنخواہ مقرر کر کے امام رکھ دیا جائے اور مسجد آباد ہو جاوے تو شرعی رو سے جائز ہے، اخراجات مسجد تو حکومت کی طرف سے پورے ہوتے ہیں جیسا کہ چھاونی کے اندر مندر ہے اور گوردوارہ ہے انکا خرچ حکومت کے ذمہ ہے اور پنڈت کو اور گیتانی جو گردوارہ کے اندر رہے حکومت تنخواہ دیتی ہے کیونکہ جوانوں کی تعداد پوری رہتی ہے اس مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مزار کی آمدنی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً:

۱-حیوان، بکرا، مرغا، بھینس وغیرہ کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں اور وہ وہیں ذبح کر دیئے جاتے ہیں، انکے حلال وجائز استعمال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی وہ مردار اور میتہ کے حکم میں ہو جاتے ہیں، ان کا اصلی مالک یا کوئی بھی مفت دے یا بیچ کردے ان کا خریدنا کھانا جائز نہیں (۱)۔

۲-حیوان کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں مگر مجاور و خادمین ذبح نہیں کرتے بلکہ کسی حیلہ بہانے سے نظر بچا کر فروخت کر دیتے ہیں، انکا حکم یہ ہے کہ ان کے اول واجبی مالک اگر تائب ہو کر اپنے عقیدہ کی اصلاح کرلیں اور اس جانور کو واپس لے لیں تو ان کا کھانا وغیرہ سب جائز ہو جاتا ہے اور اگر تائب نہ ہوں تو ان سے یا مجاورین وغیرہ کسی سے اس کو خریدنا اور کھانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

۳-وہ حیوان جن کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے نہیں لاتے بلکہ بہ نیت تقرب لصاحب المزار لا کر مجاور وغیرہ کو بطریق ھبہ وتملیک دیدیتے ہیں اور اس سے ان لانے والوں کا مقصود صاحب مزار کے لئے ذبح کرنا کرانا نہیں ہوتا بلکہ صرف وہاں کے مجاورین میں غریبوں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ ایسا فعل کرنا ناجائز کہا جائے مگر جس کو ہبہ وتملیک کر کے دیدیا جاتا ہے اس سے خرید نا لینا اور استعمال کرنا سب جائز رہے گا۔

۱- "إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله" (سورۃ البقرۃ:۱۷۳)۔

۴- وہ مٹھائیاں و چادر و زیورات وغیرہ جس کو مزار پر چڑھا دیتے ہیں اس کا حکم یہ ہے جب تک لانے والا تائب ہو کر اپنے عقیدہ کی اصلاح کر لے اور اس نذر کو باطل کر کے ان چیزوں کو واپس نہ لے لیں ان کا خریدنا لینا کھانا وغیرہ سب حرام و ناجائز رہے گا، ہاں اگر تائب وغیرہ ہو کر واپس لے لیں تو ان کو لینا کھانا وغیرہ سب درست ہو جاوے گا غرض اس نمبر کا حکم بالکل ۲- کا ہوگا۔

۵- وہ مٹھائیاں چادریں و زیور و نقد وغیرہ لا کر مزار پر چڑھاتے ہیں بلکہ بہ نیت تقرب لصاحب مزار وہاں کے غریبوں یا مجاوروں وغیرہ کو بطور ھبہ و تملیک دیدیتے ہیں اس کا حکم ۲- کا ہے جن کو بطریق ھبہ تملیک دے دیا ہے، ان سے لیکر یا خرید کر استعمال کر سکتے ہیں اور اگر چہ ان کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ ہو یہ الگ بات ہوگی، ان تمام مذکورہ صورتوں میں کسی شرط کے ساتھ انتفاع ممکن بھی ہے، ان میں مذکورہ بالا طریق پر صاحب حق کی اجازت و مرضی سے یا ان کی بلا اجازت و مرضی لینا اور استعمال کرنا ہرگز درست نہیں اور صورت مسئولہ میں صاحب حق کی اجازت مرضی کے بغیر محض دکانمان کے دباؤ و جبر سے لے کر استعمال کرنا ہے اس کا جواز شرع میں نہیں ہے خاص کر مساجد کے لئے مساجد پر تو نہایت صحیح پاکیزہ پیسہ لگانا ضروری ہے۔ اس لئے مذکورہ مسئولہ صورت کا جواز شرعاً بالکل نہیں نکلتا ہے، ہاں اگر اس مزار سے متعلق کچھ دکانیں ہوں جنکا کرایہ آتا ہو یا کچھ کمرے ہوں اور ان سے کرایہ آتا ہو یا کرایہ آنے کی کوئی صورت نہ نکل سکے اور نکال لیجائے تو ان رقوم کو لیکر مسجد کے امام کی تنخواہ میں بھی لا سکتے ہیں اگر مزار سے متعلق کچھ دکانیں یا کمرے وغیرہ ایسے نہ ہوں جن سے کرایہ آ سکتا ہو تو چونکہ سوال میں مذکور ہے کہ مسجد کے اخراجات حکومت پورے کرتی ہے اس لئے لے دے کر صرف امام کی تنخواہ کا معاملہ رہ جاتا ہے اس کو چندہ وغیرہ دوسری جائز صورتوں سے پورا کر کے مسلمان خود امام و موذن مقرر کر کے نماز جماعت کا انتظام کر لیں اور یہ امر مسلمانوں پر بیشک حسب استطاعت لازم و ضروری رہے گا، اس معاملہ کے بعض مسائل و بعض نمبروں سے متعلق پوری تحقیق و تفصیل فتاوی دارالعلوم دیوبند جلد ہفتم و ہشتم کے جز امداد المفتیین میں بھی مذکور ہے، اس میں حضرت مولانا تھانوی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے مستقل فتاوے درج ہیں اور سب مضامین بھی نہایت مکمل و مدلل ہیں جناب بھی عالم ہیں مراجعت کر لیں بڑی بصیرت پیدا ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۳/ ۱۴۰۴ھ

الجواب صحیح عبدالحق قاسمی دارالعلوم دیوبند
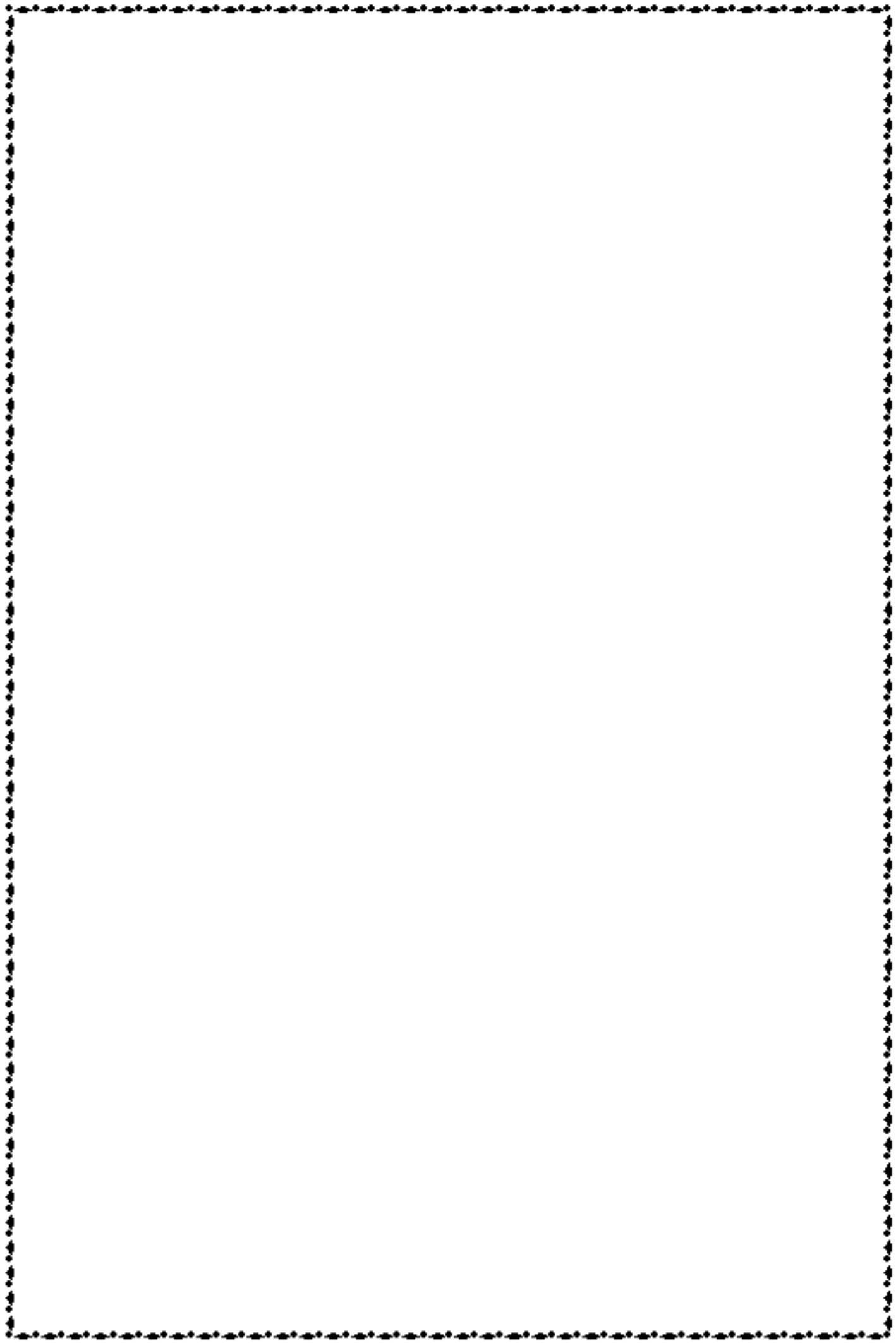
كتاب الأيمان والنذور

کتاب الأیمان والنذور

شراب نہ پینے کی قسم کھانے کے بعد شراب پی لینے کا حکم:

ایک شخص شراب پیتا تھا، اس نے بعد میں قرآن شریف کی قسم کھائی کہ میں قرآن شریف کی قسم کھاتا ہوں کہ میں شراب نہیں پیوں گا۔ قسم کے بعد وہ شخص پھر شراب پینے لگا اب وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو کفارہ ادا ہوسکتا ہے یا نہیں اور ہوسکتا ہے تو کس طرح؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب شراب نہ پینے کے لئے قسم کھائی تھی اور پھر شراب پی لیا تو قسم ٹوٹ گئی اور قسم توڑنے کا کفارہ دینا واجب ہوگیا اور قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکین کو بھر پیٹ دونوں وقت کھانا کھلائے، یا دس مسکین کو ایسا کپڑا پہنا دے جس میں نماز پڑھی جا سکے اور اگر غربت ونا داری کی وجہ سے ان دونوں باتوں پر قدرت نہ رہے تو مسلسل تین دن روزہ رکھے یہ حکم تو قسم توڑنے پر کفارہ کا (۱) ہے اور جب پھر شراب پینے لگا ہے تو اس پر شراب پینا چھوڑ دینا واجب ہے اور جو پی چکا ہے اس پر توبہ واستغفار کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۲/ ۱۴۰۳ھ

منت کے روزوں کا حکم شرعی؟

میری صاحبزادی مسماۃ صبیحہ خاتون جب ہائی اسکول کا امتحان دے رہی تھی تو اس نے منت مانی تھی کہ امتحان میں

۱- "فكفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ما تطعمون أهليكم أو كسوتهم أو تحرير رقبة فمن لم يجد فصيام ثلثة ايام، ذالک کفارة ایمانکم إذا حلفتم واحفظوا أيمانكم كذالک يبين الله لكم آياته لعلكم تشكرون" (سورۂ مائدہ ۸۹)۔

کامیاب ہونے پر (۵۵) روزے رکھوں گی، چنانچہ وہ پاس ہوگئی مگر اس نے اب تک صرف آٹھ روزے رکھے ہیں، باقی روزے ابھی پورے نہیں کر پائی تھی کہ وہ اتنے میں اونچے درجہ ۱۱ رمیں پہونچ گئی اور دو سال انٹر میں پڑھتی رہی، اس مدت میں بھی وہ منت کے روزے پورے نہ کرسکی، انٹر کا آخری امتحان دیا مگر اس میں فیل ہوگئی، اب تکمیل کے روزے ہائی اسکول کے باقی ہیں، اس میں اس نے منت روزوں کی تکمیل شروع کی ہے مگر شاید پورے نہ کر سکے، کیونکہ پوزے مین کا امتحان ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء سے شروع ہورہا ہے۔

اس صورت میں ان باقی ماندہ روزوں کی تلافی صدقہ اور خیرات سے ہوسکتی ہے؟ خیرات دینے کے بعد بھی اس کی پکی نیت روزے رکھنے کی ہے، اگر تلافی ہوجائے تو کس قدر اور کس طرح ہو؟ نیز تحریر فرمائیں کہ فی روزے کتنی خیرات کرنے سے تلافی ہوجائے گی، آیا نقد صدقہ وخیرات سے مساکین کو کھلانا بہتر ہے اور فی مسکین کس قدر صدقہ وخیرات دے، نیز ہر مسکین کو دونوں وقت کھلانا ضروری ہے یا صرف ایک وقت؟

الجواب وباللہ التوفیق:

منت کے روزوں کا بدل فدیہ نہیں ہوتا وہ تو رکھنے ہی ہوں گے، چونکہ کسی زمانہ یا مدت کے ساتھ محدود نہیں، اس لیے موت سے پہلے جب بھی روزے رکھ لیں گی ادا قرار دیئے جائیں گے، بے وجہ شرعی تاخیر سے برائی اور اساءت طاری ہوگی، فدیہ تو صرف فرض رمضان کے روزوں کے بدلے میں شیخ فانی کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو حکم میں شیخ فانی کے ہوں، اس پر دوسرے روزوں کو قیاس نہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا منت کے ان روزوں کے بدل میں قیمت وغیرہ کوئی چیز کافی نہ ہوگی، خیرات وغیرہ کرنے کے بعد بھی اس منت کو پورا کرنا اور روزے ہی رکھ کر پورا کرنا واجب ہے، ہاں اب سے ہی حسب موقع واستطاعت روزے رکھنا شروع کردیں اور آئندہ حسب موقع واستطاعت روزے رکھنے کا عزم وتہیہ کرلیں، کبھی بیماری وغیرہ عوارض کی وجہ سے جو تاخیر ہوگی وہ قابل معافی اب بھی ہوسکے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

نذر کے روزہ کو پورا کرنے کی صورت:

ایک شخص نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہوجائے تو میں ایک سال تک روزے رکھوں گا جب کام ہوگیا تو وہ صرف

دوماہ کے روزے رکھ سکا اب کاروبار کی وجہ سے ہمت نہیں تو اس منت کا پورا کرنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو ۱۰ ماہ کے روزے کا فدیہ کس حساب سے رہے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

منت کرنے والے کا یہ قول کہ (میرا فلاں کام ہوجائے گا تو میں ایک سال روزے رکھوں گا) اس قول کے مطابق جب اس کا وہ کام ہوگیا تو فوراً روزے شروع کردینا واجب تھا، اگر اس نے منت ماننے میں یہ نیت کی کہ مسلسل رکھوں گا تو ایک سال تک کا مسلسل روزہ واجب بالنذر ہوگیا اور ظاہر ومتبادر بھی اس قول کا یہی ہے، اس صورت میں اگر اس نے دوماہ روزہ رکھ کر ہمت چھوڑ دیا اور روزہ ختم کردیا تو حانث ہوگیا۔ اب اس کی قضاء ایک سال روزے کی مسلسل رکھنا واجب ہے زندگی میں جب بھی قضاء کرے لیکن جہاں تک جلدی ہوسکے رکھ ڈالے اگر نہ رکھے گا اور فوت ہوجائے گا تو گنہگار رہوگا محض کاروبار کی وجہ سے ہمت نہ ہونا یہ کوئی عذر نہیں ہے اس میں کچھ شرطیں ہیں جو آگے آتی ہیں، ہاں اگر بیمار ہوجاوے اور قوت روزہ رکھنے کی نہ رہ جائے اور موت کا ظن غالب اس حالت میں ہوجائے یا اتنا بوڑھا ہوجائے کہ بتقاضہ عمر طبعی قوت سلب ہوجائے تو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہوگا، ابھی فدیہ کا کوئی محل نہیں اور نہ گنجائش ہے اور اگر منت مانتے وقت ایک سال تک مسلسل روزے کی نیت نہیں کی تھی بلکہ یہ نیت کی تھی کہ ایک سال تک جتنا ہوسکے گا رکھوں گا تو ایک سال کے اندر جتنے روزے کی طاقت ہو رکھ لے ایک سال کے بعد قسم پوری ہوجائیگی اور کفارہ وغیرہ کچھ لازم نہ آئے گا، لیکن معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے خوب سوچ لے کہ اس کی کیا نیت تھی، کیونکہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، کاروبار میں یہ شرط وتفصیل ہے کہ اگر کاروبار کرنے پر مضطر ہو مزدوروں نوکروں سے بھی کام نہ چلے اور نہ سرمایہ ہی ہو کہ بیٹھ کر اتنے دن گذارے غرض ہر طرح کوئی صورت نہ ہو تو روزے موخر کرے اور جب قدرت ہو قضاء کرے اور فدیہ کا وہی حکم ہے جو اوپر گذرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

عہد توڑنے کا کفارہ:

محلہ کی مسجد کے متولیین سابقین کے احوال کو دیکھ کر محلے والوں نے ایک ایسے آدمی کو متولی بنادیا جو نیک طبیعت دیانتدار ہے جس نے مسجد کی آمدنی بڑھائی اور دکانیں بنوائی بڑی دلچسپی سے کام کیا مگر کچھ لوگوں نے اعتراض اٹھایا جس سے

موصوف کی طبیعت اس کام کرنے سے کٹ گئی ہے اور انہوں نے بالکل ارادہ کرلیا ہے کہ وہ اس کام سے سبکدوش ہوجائے گا، چنانچہ انہوں نے اعلان بھی کردیا ہے کہ میں اس کام سے علیحدہ ہورہا ہوں، اس اعلان سے لوگوں کو ازحد رنج ہوا اور بضد رہے کہ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے پختہ عہد کرلیا ہے میں اپنا عہد کیسے توڑ سکتا ہوں، ایسی صورت میں جب لوگوں کی نظر ان کی طرف ہے اور اعتراض کرنے والا سامنے نہیں آتا ہے اور دوسرے کے متولی بنجانے میں مستقبل اچھا نظر نہیں آتا ہے، ان تمام حالات کے پیش نظر موصوف کے اپنے عہد کے توڑ دینے میں کوئی جرم کی بات تو نہیں ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

موجودہ صورت میں متولی کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اگر قسم کھا چکے ہوں تو قسم توڑ کر قسم کا کفارہ ادا کریں(۱) اور کام سنبھالیں ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا بلکہ ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۹/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”والقسم ايضا بقوله: أقسم أو أحلف أو أعزم“ (ردالمحتار ۵/ ۴۸۹، مکتبہ زکریا)۔

باب الحدود

محصن کی کیا سزا ہے؟

شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک شخص کی بیوی سے صحبت کر بیٹھا، اب اس کی سزا یا توبہ کا طریقہ بتلائیں اور اس مرد کی بھی اور اس عورت کی بھی دونوں کی کیا سزا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسے جرم کی سزا بھی آپ خوب جانتے ہوں گے کہ رجم اور توبہ ہے، لیکن رجم کا حق محض حکومت اسلامیہ کو ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ہے(۱)، اب آپ آئندہ نہ کرنے کا عزم بالجزم کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکے اللہ تبارک وتعالیٰ شانہ کے روبرو انتہائی ندامت وعجز ونیاز کے ساتھ توبہ واستغفار کریں اور دونوں آپس میں قوی پردہ کریں کہ کسی وقت بھی ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور نہ کسی قسم کا اختلاط رکھیں، یہی حکم دونوں کے لئے ہے اور احتیاط تو اس میں ہے کہ اگر دونوں ایک مکان میں رہتے ہوں یا ایسے دو کمرے یا مکان میں رہتے ہوں کہ اختلاط یا تنہائی کا موقع آجاتا ہو تو بھی دونوں جدا جدا دور دور مکان میں رہائش اختیار کرلیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "(والزنا) الموجب للحد(وطئ) مکلف ناطق طائع فی قبل مشتهاة......فی دارالاسلام"(تنویر الابصار علی ہامش ردالمحتار ۶/ ۵،۶)۔

زنا کی سزا محض مزنیہ کے والد سے معافی مانگنے سے معاف نہیں ہوگی:

زید نے زنا کیا عمر کی لڑکی سے، جب لوگوں نے بلا کر اس سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے یعنی زید نے عمر کی لڑکی سے زنا کیا، اور پھر اس نے خفیہ طریقہ سے لڑکی کے باپ سے معافی مانگا۔ اگر لڑکی کا باپ اسے معاف کر دے تو کیا معاف ہو جائے گا؟

الجواب وبالله التوفيق:

زنا کا گناہ محض مزنیہ کے باپ سے معافی مانگ لینے سے یا محض اس کے معاف کر دینے سے معاف نہ ہوگا، بارگاہ رب العزت میں انتہائی عجز و نیاز و ندامت کے ساتھ اقرار جرم کرتے ہوئے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرتے ہوئے توبہ و استغفار کرنے اور اللہ رب العزت سے معافی مانگنے سے ہوگا "**الحد شرعا عقوبة مقدرة وجبت حقا لله تعالى زجرا فلا تجوز الشفاعة فيه**"(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

غیر شرعی طریقہ پر اپنی خواہش کی تکمیل:

زید کی عمر ۲۰ سال کی ہے، پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے، رمضان کے پورے روزے بھی کئی سال سے رکھ رہا ہے، بچوں کو مدرسہ میں قرآن کریم کی تعلیم بھی دیتا ہے، کسی حد تک بدعت سے بھی بچتا ہے، حلال و حرام کی بھی تمیز ہے، غلط رسموں کی وجہ سے اس کے ماں باپ اس کی شادی نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بڑے بھائی اور بہن کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے، زید اپنی شہوت اپنے شاگردوں سے پوری کرتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں اور فوراً ہی شہوت کو پورا کرنے کے لئے کبھی کبھی مشت زنی بھی کرتا ہے، کبھی کبھی جانوروں سے بھی اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے، ان تمام باتوں کا علم یا تو وہ خود جانتا ہے یا اس کا خدا، زید اسلامی سزا لینے کے لئے تیار ہے، اب اس نے سچے دل سے ان تمام باتوں سے توبہ کر لی ہے، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرتا ہے لیکن موقع آنے پر وہ اپنے اقرار پر قائم نہیں رہتا ہے، لوگ نماز پڑھانے کے لئے اکثر کھڑا کر دیتے ہیں، کیونکہ کسی حد تک وہ صحیح کلام پاک پڑھتا ہے، آپ فرمائیے کہ اس کو نماز

۱- 　الدر مع الرد ۶/ ۳

پڑھانا چاہئے یا کہ نہیں،نفسانی خواہش ابھرے تو زید کو کیا کرنا چاہئے،نفلی روزے رکھنے کے لئے اس کے والدین اس کو منع کرتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے بھی ہیں اور آخرت کی سزاؤں کا تصور بھی رکھتے ہیں پھر گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں،زنا کی شرعی سزا سو کوڑے ہیں،"**الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة**"(۱)ان کے علاوہ ذرا سوچئے کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں جب بڑی ہو جائیں گی اور آپ سے ملاقات بھی ہوگی اور آپ بوڑھے ہو چکے ہوں گے، اس وقت آپ پر کیا گذرے گی،کس قدر ندامت ہوگی جن سے آپ یہ باتیں کرتے ہیں سب اس فعل کے بعد مر تو نہ جاتے ہوں گے اور نہ مرنا ضروری ہی ہے،علاوہ ازیں جہنم کی آگ منتظر کھڑی ہے،نیز قیامت کے میدان میں یہ سارے جرم کرتے ہوئے دیکھائے جائیں گے اور سارا عالم برملا دیکھے گا اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا؟ جناب رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام اور تمام مومنین مومنات اور خود آپ کی ماں بہن باپ بھائی سب اس طرح کرتے ہوئے اس فعل کو وہاں دیکھیں گے جس طرح یہاں دیکھ سکتے ہیں پھر اس چھپانے سے کیا فائدہ اور ایسی حالت میں آپ پر واجب بلکہ فرض ہے کہ اپنی شادی آپ خود کہیں کرلیں،ماں باپ کی اطاعت اس معاملہ میں اور اس حال میں آپ پر لازم نہیں ہے، بلکہ اس جرم کے ساتھ اطاعت میں آپ گنہگار ہو رہے ہیں،"**لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق**"رواہ شرح السنن(۲)۔

آپ قطعاً ماں باپ کی نافرمانی کا لحاظ اس حالت میں نہ کیجئے اور نکاح فوراً کرلیجئے اور تمام جرموں سے باری تعالیٰ عز اسمہ کی دربار میں صدق دل سے توبہ کرلیجئے اور ماں باپ کو اولاً نکاح کے لئے راضی کرلینے کی کوشش کریں تو بہتر ہے ورنہ خود کرلیجئے، البتہ ماں باپ کا احترام برابر قائم رکھئے اور جب تک آپ نکاح نہ کریں نماز پڑھانے سے پرہیز کریں،سکون شہوت کے لئے نکاح جلد سے جلد کرلینا آپ پر فرض ہے(۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سورۂ نور: ۲۔

۲- مشکوٰۃ/ ۳۲۱۔

۳- "ويكون واجبا عند التوقان فإن تيقن الزنا إلا به فرض"(الدرالمختار على ردالمحتار ۴/ ۶۳)۔
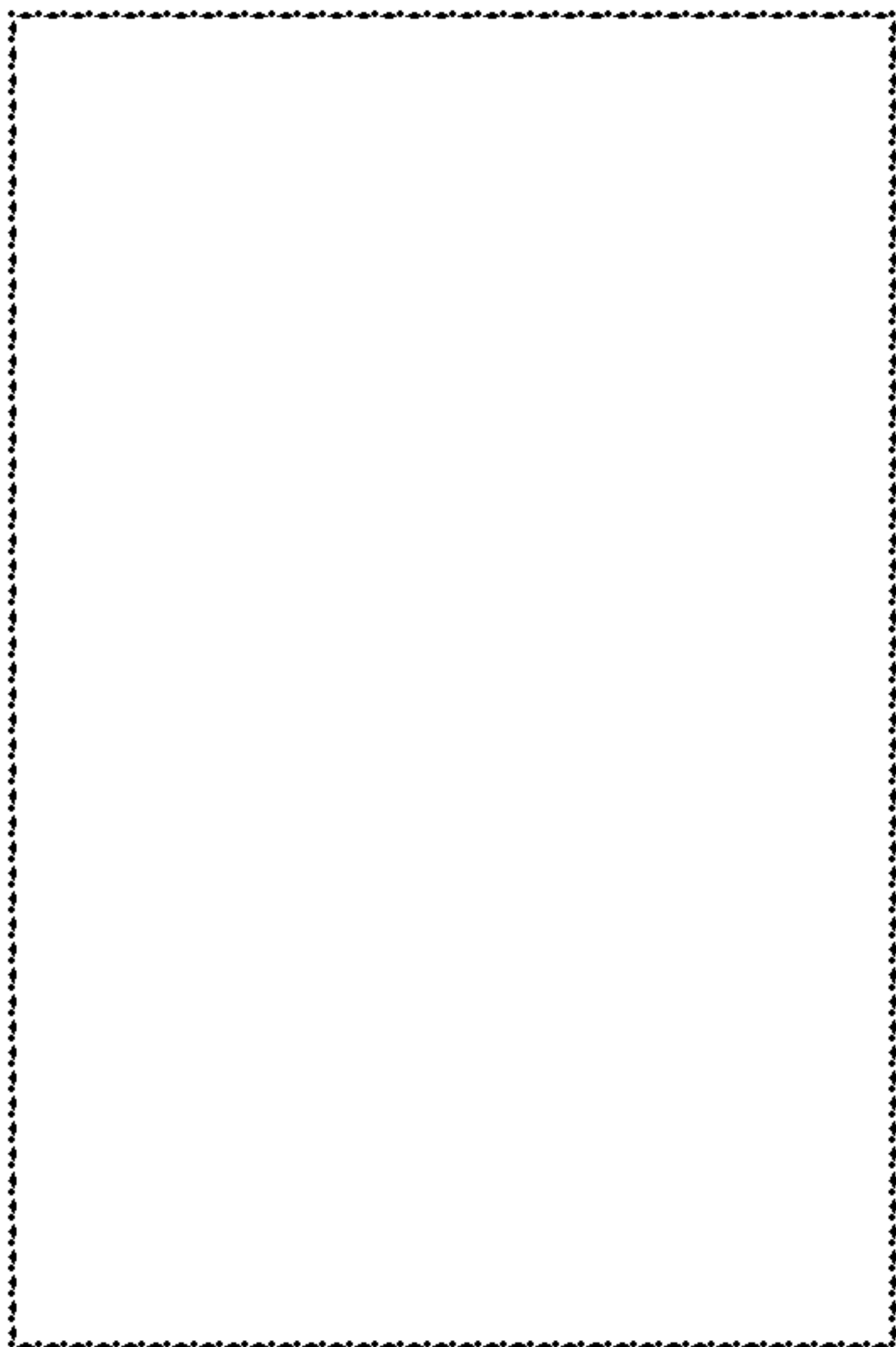
كتاب المعاملات

کتاب المعاملات

پرچوں کے معمے حل کرکے انعام لینا کیسا ہے؟

آج کل بعض پرچوں میں معمے آتے ہیں، جن کو بھر کر بھیجنے کے بعد صحیح نکلنے پر انعامات دیئے جاتے ہیں، اور ان کو بھرنے کے لئے صرف فیس بھیجنا ہوتی ہے، اس طرح معمہ کا حل کرنا اور اس کا انعام لینا شرعا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ معمہ بلاشبہ قمار پر مشتمل ہوتا ہے، جتنے لوگ فیس بھرتے ہیں ان سب کو انعام نہیں ملتا، بلکہ صرف بعض کو ملتا ہے اور بقیہ پیسہ بھرنے والوں کا پیسہ ڈوب جاتا ہے واپس نہیں ملتا، یہی قمار ہے قرآن پاک میں قمار کی ممانعت موجود ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: **"إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان"** (۱) قمار شیطانی ناپاکی ہے اس سے ہر مسلمان کو بچنا واجب ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۶/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ

۱- سورۂ مائدہ: ۹۰۔

۲- قمار کے علاوہ کئی مفاسد اور پائے جاتے ہیں: (۱) انعام کا ملنا یقینی امر نہیں ہے لہٰذا یہ ناجائز ہے "تعليق الأملاك بالأخطار باطل" (قواعد الفقہ ص ۷۱)، (۲) انعام ملنے کی صورت میں ایک روپیہ کے بدلے بہت سے روپے ملتے ہیں اس لئے ربا ہے (۳) درحقیقت یہ انعام معمہ حل کرنے کی اجرت ہے مگر مطلقاً نہیں بلکہ حسب منشا مستاجر ہو جس کا اجیر کو علم نہیں اور ایسا اجارہ جس میں اجیر کو عمل معلوم نہ ہو، نہ ہی اس کے قابو میں ہو شرعاً فاسد ہے: "قال في المبسوط لا بد من أعلام مايرد عليه عقد الإجارة على وجه ينقطع به المنازعة بيان المدة والمسافة والعمل ولابد من أعلام البدل" (فتاویٰ شامی ۵/۴) (۴) ظاہر ہے کہ انعام دینے والوں کا مقصود محض خانہ پری نہیں، نہ ہی اس سے کوئی خاص غرض وابستہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایک ایک روپیہ کر کے بہت سے روپے جمع ہو جاتے ہیں اس لئے یہ بھی اجارۂ فاسدہ ہے: "هي تمليك نفع مقصود من العين بعوض حتى لو استاجر ثيابا أو اواني يستعمل بها (إلى قوله) فالإجارة فاسدة في الكل ولا أجر له لأنهامنفعة غير مقصودة من العين" (الدر المختار مع الشامی ۵/۳) (مرتب)۔

شیئرز سے متعلق چند اشکالات:

نظام الفتاوی میں کمپنی کے شیرز کے متعلق آں جناب کا تحریر فرمودہ فتوی نظر سے گذرا، اس جواب میں آنجناب نے جو حوالہ قرطاس فرمایا تھا اس سے مندرجہ ذیل امور ناظرین کو بادی النظر میں متصور ہوتے ہیں:

اول یہ کہ شیئرز دراصل حصوں کا نام ہے اور جب حصے بولے جاتے ہیں تو تبادر فہمی سے شرعی شرکت کے حصے سمجھ میں آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مالک شیئرز اپنے شیئرز کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے اور کمپنی کے راس المال و سامان، اثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حسب شیئرز مالک ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ شیئرز کا خریدنا بیچنا ان حصوں اور ان میں داخل شدہ چیزوں کا خریدنا و بیچنا شمار ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ شیئرز کی قیمت میں کمی بیشی تو کمپنی کے سرمایہ و سامان وغیرہ کی قیمت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

اگر واقعتاً کمپنی کے شیئرز کے سلسلہ میں امور بالا محقق تھے تو پھر اشکال کی گنجائش نہ تھی، لیکن مقننین اور ان کی کتابوں سے تحقیق کرنے پر، نیز تعامل ناس اور عرف عام کو ملاحظہ کرنے سے شیئرز کی حقیقت کچھ اور نکل آئی جو حضرت مفتی صاحب کی پیش کردہ تفصیل سے کافی متغایر ہے، لہذا آں حضرت کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ آنے والی تفصیل پر پھر معاملہ شیئرز کو ملاحظہ فرمائیں، یہ تفصیل ہماری معلومات کا خلاصہ ہے جو ہم نے شیئرز کے متعلق کی ہے۔

جن جن فقہاء کرام نے جواز کا فتوی دیا ہے ان میں مستند صرف یہی تھا کہ شیئرز کمپنی کے حصص کا نام ہے اور یہ شرعی شرکت کی طرح ہے، پس شیئرز کا معاملہ جائز ہوگا'' **لکن التالی باطل فالمقدم مثلہ، و أیضا بناء الفاسد علی الفاسد**" چنانچہ کتب اقتصادیات وقوانین کمپنی کے مطابق شیئرز ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ لغۃ (انگریزی زبان میں) اس کے معنی حصص کے ہیں، لیکن اصطلاحاً کمپنی و قانون کنار میں شیئرز نام ہے حقوق مجردہ کے مجموعہ کا۔ ان حقوق میں سے دو سب سے اہم ہیں، ایک کمپنی کے جلسوں و شوری کی میٹنگ میں ووٹ کرنے کا حق، دوم منافع ——— مستقبل میں حصہ کا حق، یہ دراصل ایک بیع ہے جس میں یہ حقوق مبیع کے طور پر بیچے جاتے ہیں، خریدنے والے کو شیرز ہولڈر (انگریزی میں) یعنی شیر دار یا حصہ دار کہتے ہیں۔ سمجھانے کے لیے آں حضور کی خدمت میں یہ احقر اس معاملہ کے آغاز و ابتداء کی تفصیل پیش کرتا ہے، یہ بھی کمپنی کی اقتصادی کتب سے مستخرج ہے:

شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چندلوگ جمع ہوئے اور اس کمپنی کے ذریعہ سے مثال کےطور پر کپڑے کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس پیسہ ایک بھی نہیں، اور کمپنی قائم کرنے کے لیے پھر اس کمپنی کے واسطے سے کاروبار جاری کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے کما ہوظاہر، پس تحصیل فلوس کے لیے یہ چندلوگ اعلان کرتے ہیں کہ ہم کپڑے کا کارخانہ کھولنا چاہتے ہیں کمپنی کی شکل میں، اور اس کمپنی کے مثلاً ایک لاکھ شیئرز بیچتے ہیں، دس روپیہ فی شیئر، اعلان کے بعدلوگ شیئرز خریدنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لاکھ شیئرز بک گئے جس نے بھی رقم دے کر ایک یا زیادہ شیئرز خریدا ہے اس کی ملک سے رقم نکل کر کمپنی کی ملکیت بن جاتی ہے، اب واپسی کا سوال ہی نہیں، لیکن رقم دے کرعوض میں حقوق مل گئے، وہی حقوق جن کو اصطلاح میں شیئرز کہا جاتا ہے اورمن جملہ ان حقوق کے ایک مستقل نفع بھی ہے، اس عقد میں مبیع وہی نفع تھا جو فقط زمانہ مستقبل میں وصول ہوگا، کیونکہ یہ لوگ شیئرز کے بیچنے میں ملی ہوئی رقم سے اب کارخانہ کھول کر تجارت کریں گے، تجارت کر کے جونفع حاصل ہوگا وہ شیئرز دار کو ملے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ مستقبل میں ہی ہوگا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ روپیہ دے کرعوض میں بصورت بیع روپیہ لیتے ہیں، لیکن علی طریق النسئیہ، بہرحال ہر مشتری شیئرز کو ایک رسید ملتی ہے جن کو ان کی اصطلاح میں سند کہتے ہیں، اس رسید پر شیئرز دار کا نام وعدد شیئرز مرقوم ہوتی ہے اور یہ شہادت ہے اس بات پر کہ مالک شیئرز مستقل منافع کا مستحق ہے، اب وہ کمپنی جدید قائم شدہ قانون حکومت کی نظر میں ایک قانونی شخص کی حیثیت رکھتی ہے، اب وہ مستقل ذات ہے، مالک اس کا کوئی نہیں بلکہ وہ خود اپنا مالک ہے اور جن لوگوں نے اس کمپنی کو قائم کیا ہے وہ تو محض متولین اور منتظمین ہیں، انہیں کو ارکین کمپنی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کمپنی کے مالک نہیں ہیں، نہ کمپنی کے کوئی جزء ان کی ملک میں داخل ہیں، تنخواہ کمپنی کے سرمایہ سے لے کر یہ لوگ کمپنی کے انتظام وکاروبار جاری کرتے ہیں، ان ارکین میں سے بعض خود شیئرز دار بھی ہوتے ہیں، ان لاکھ شیئرز کو بیچ کر جو دس لاکھ (مثلاً) روپیہ جمع ہوئے وہ سب کمپنی کے ذاتی سرمایہ بن گئے شیئرز داران اور ارکین کو (بجز اپنی تنخواہ کے) کوئی حق اس میں نہیں ہے، لہٰذا کمپنی کے مختار خود ہونے پر یہ ثمرے ظاہر ہوتے ہیں کہ کاروبار کے سلسلے میں جو دین لازم ہوتے ہیں، ان کے لیے ذمہ دار خود کمپنی ہے نہ کہ شیرز داران یا منتظمین، ان سے کمپنی کے دین کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، پس اگر کمپنی ٹوٹ جائے (اور یہ کثیر الوقوع ہے) تو قرض خواہوں کو اپنے دین کے نقصان اٹھانے پڑیں گے، اگر کمپنی کے سرمایہ میں ادائیگی دین کی استطاعت ہو تو اسی سے ادا کیا جائے گا ورنہ نہیں، منتظمین، ارکین شیئرز دار وغیرہ سے طلب نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ کمپنی ایک مستقل انسان کے مانند ہے جو بذات خود اپنے حقوق کی ذمہ دار ہے، کسی قسم کا خسارہ یا ٹوٹ کمپنی کے مال پر عائد ہوگا نہ کہ اہل شیئرز یا ارکین کے مال پر، بعض صورتوں میں عدم استطاعت

دین کے وقت وہ قرض و دین بالکل ساقط ہو جاتے ہیں، نیز شیئرز دار و ارکین کو اپنے ذاتی معاملات میں جو دین یا قرض دینے پڑ لاحق ہو جاتے ہیں، کمپنی اس کی ذمہ دار نہیں، کمپنی کے سرمایہ سے نہیں لیا جائے گا، اہل شیئرز یا ارکین خود ذمہ دار ہیں، اسی طرح اگر ارکین میں سے کسی ایک نے کمپنی کے سرمایہ میں سے کچھ رقم نکال لی بلا اجازت کے تو عند الحکومت وہ سرقہ (چوری) کا مرتکب قرار دیا جائے گا، اور سزا کا مستحق۔ یہ سب اسی لیے ہیں کہ کمپنی ذاتی استقلال کی حیثیت رکھتی ہے، مالک اس کا کوئی نہیں۔

غرض جو رقم شیئرز یعنی مجموعہ حقوق کے بیچنے میں حاصل ہوئی اس کو منتظمین کمپنی کے کاروبار میں لگا دیتے ہیں، اب وہ رقم کمپنی کی ذاتی ملک بن گئی، وہ کمپنی کے پاس شیئرز داروں کی امانت نہیں ہے کہ جب چاہے واپس لے سکتے ہیں جیسا کہ شرکت میں ہوتا ہے، نہیں بلکہ کمپنی نے حقوق بیچ کر بذریعہ اپنے وکلاء یعنی منتظمین اس رقم کو حاصل کیا جیسا کہ مطلق بیع میں ثمن ملک بائع بن جاتا ہے۔

وقتاً فوقتاً کمپنی کے جلسے منعقد ہوتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں اس کو میٹنگ کہتے ہیں تو اپنے شیئرز کی بدولت شیئرز دار بھی شریک ہو سکتے ہیں اور وہاں ووٹ کے ذریعہ کمپنی کے انتظام میں کسی قدر دخل دے سکتے ہیں، یہ تو ایک حق تھا جس کو میں نے شروع میں ذکر کیا، ان جلسوں میں تو بڑے بڑے شیئرز دار شریک ہوتے ہیں، عموماً اکثر شیئرز داران جو کم درجہ کے ہیں شریک نہیں ہوتے اور نہ ان کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ تو فقط نفع کے درپے ہیں، تجارت کرتے کرتے ایک سال کے بعد (مثلاً) جب نفع کا جائزہ لیا جائے تو منتظمین نے دیکھا کہ پچاس ہزار کا نفع ہوا بمطابق قانون اس وقت ان کو اس نفع کا اعلان کرنے کا حکم ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ اگر کمپنی کے سامان سرمایہ وغیرہ میں اضافہ کی ضرورت ہو تو ان منافع میں سے یا کل منافع کے ساتھ اضافہ کر سکتے ہیں، اگر کل منافع کا اعلان کریں تو کل میں شیئرز داران کا حق ہے، اگر بعض کا اعلان کریں تو اسی بعض معلن میں ان کا حق ہے، اور اگر کچھ بھی اعلان نہ کریں تو کسی چیز میں بھی ان کا حق نہیں، ایسی صورت میں آئندہ وقت کے منافع کے وہ مستحق ہوں گے، مثال کے طور پر پچاس ہزار میں سے دس ہزار اضافہ کمپنی کے لیے روک رکھا اور باقی چالیس ہزار کا اعلان کریں تو اس باقی کو منافع معلن کہتے ہیں، اس میں اب شیئرز صاحبان کا حق ہے، اور اگر یوں اعلان کریں کہ پورے پچاس ہزار کو ہم نے کمپنی کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لیے رکھا اور یہ برائے تقسیم نہیں ہے تو یہ منافع معلن شمار نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ جن منافع کا تقسیم کے لیے اعلان کریں وہ معلن شمار کیا جاتا ہے اور اس میں شیئرز دار مستحق ہیں، غیر معلن میں نہیں، یہ بھی یاد رہے کہ ایسی صورتوں میں ارکین غداری بھی کرتے ہیں، چونکہ سب کے سب غیر مسلمان

ہیں جن منافع کا برائے تقسیم اعلان نہیں کیا گیا وہ بھی کمپنی کے ملک میں داخل ہوتے ہیں اور کسی کا حق ان پر نہیں نہ وہ کسی کی ملک رہتے ہیں (علاوہ کمپنی کے) جب بھی منافع ہوتے ہیں یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے، قانون کے تحت بعض دفعہ کمپنی کے قائم ہونے کے بعد منتظمین مزید شیئرز بیچنا چاہتے ہیں تو بذریعہ دلال اسٹاک ایکس چینج یعنی شیرز کے بازاروں میں ایسا ہی کر دیتے ہیں، اب جو دلال سے شیئرز خریدنے والے ہیں ان کا کمپنی سے واسطہ ہی نہیں اور کمپنی کو دیکھتے تک نہیں، یہاں بھی حقوق بیچے جاتے ہیں اور ہر ایک کو رسید (سند) دی جاتی ہے۔

پھر جس نے ابتداءً براہِ راست یا بالواسطہ دلال کمپنی سے شیئرز خرید لیا ہے اگر وہ چاہے تو کسی غیر سے اپنے شیئرز کو بیچ سکتا ہے، یہ بھی دلال کے واسطے سے ہوگا، اور اب مشتری ثانی کے نام رسید کٹے گی اور اسی کا نام کمپنی کے رجسٹر میں درج ہوگا، اور اب سے مشتری ثانی ہی مستقبل میں منافع معلنہ کا حق دار ہوگا، تو یہاں بھی حقوق کی بیع ہوئی، مشتری اول کے نام کو خارج کرنے کے بعد یہ طریقہ شیئرز کی بیع و شراء عام شائع و ذائع ہے اور اقتصادیات کے میدان میں یہ مسلم و معروف ہے، ماہرین اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں جو ان معاملات میں روزمرہ مستغرق و ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں (عرصہ دراز سے یہ معاملہ بایں طور چالو ہے جہاں میں)، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شیئرز دار کمپنی کے سرمایہ و اثاثہ میں حصہ رکھتے ہیں یا نہیں، سو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کمپنی کی حیثیت ایک قانونی شخص کی ہے جس کا کوئی مالک نہیں بلکہ وہ خود کا مالک ہے، یہ تمام اقتصادی اور قانونی کتابوں میں مذکور ہے صراحۃً، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ سمجھنا کہ شیر دار کمپنی کے راس المال و سامان میں حصہ دار ہے، محض لوگوں کی غلط فہمی ہے، ان چیزوں میں شیئرز دار بالکل شریک نہیں، شریک تو منافع مستقبل معلنہ میں ہے (اس اعتبار سے کہ اس کو حصہ دار کہا جاتا ہے نہ اس واسطے کہ کمپنی کے راس المال یا اثاثہ میں اس کا حصہ ہے) مذکورہ بالا عبارت اقتصادیات کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں جس کو انگریزی میں مرکنٹائل لاء کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیئرز والے حقیقۃً کمپنی کے حصہ دار نہیں ہیں، کمپنی کے سرمایہ و اثاثہ میں کسی قسم کی ملکیت اس کو حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ کمپنی کا قرض و دین شیئرز داران یا اراکین سے طلب نہیں کیا جائے گا یہ دونوں قسم کے لوگ کروڑپتی ہی کیوں نہ ہوں، پس معلوم ہوا کہ شیئرز کا خریدنا اور بیچنا دراصل و فی الحقیقۃ کمپنی کے کسی حصہ (سرمایہ ہو یا سامان) کے خرید و بیچنے میں شمار نہیں ہے، چونکہ یہ اہل شیرز کی ملک ہی نہیں ہے۔

رہی شیئرز کی قیمت میں کمی بیشی کی وجہ سو اس میں کمپنی کے سرمایہ و سامان کو کوئی دخل نہیں، حسب ذیل متعدد وجوہ ہیں قلت و کثرت قیمت شیئرز کی۔

(۱) کمپنی کی ایسی اقتصادی حیثیت کی قوت وضعف۔

(۲) ملک یا دیگر ممالک کی سیاسی حالت۔

(۳) ملک یا دیگر ممالک کی اقتصادی ومالی حالت۔

(۴) مشتریان شیئرز کا تجربہ وعلم۔

(۵) دوملکوں کے درمیان وقوع جنگ۔

(۶) سونے کی قیمت میں تقلیل وتکثیر۔

(۷) ملک کے بڑے بڑے بازاروں میں گرانی ومہنگائی کا ظہور۔

(۸) شیرز کی بکری میں کمی زیادتی (یا مشتری کی چاہت سے زیادہ بکری یا اس سے کم)۔

یہ وجوہات خود احقر کی رائے نہیں ہیں، بلکہ معاملہ شیئرز کی قانونی کتابوں سے مستفاد ہیں، خلاصہ یہ نکلا کہ ابتداءً بائع شیئرز تو کمپنی تھی اور اراکین کمپنی کے وکلاء شیئرز داران مشتری تھے اور مبیع تھا حقوق مجردہ کا مجموعہ، پھر جب اول مشتری شیئرز اپنے شیئرز کو فروخت کرتا ہے تو وہ بائع اور غیر جو بواسطہ دلال خریدتا ہے وہ مشتری ثانی ہوا اور مبیع وہی حقوق مجردہ بناء، اور بدلیل "وبیع الحقوق بالانفراد لایجوز" (اشباہ تحت القاعدۃ "التابع تابع") فکذابیع المعلوم (شامی) یہ حقوق کی بیع باطل ہوتی ہے، پس اسی بناپر معاملہ شیئرز سرے سے باطل وناجائز ہونا چاہیے۔

جواز کے لیے تاویل شرکت کی گنجائش نہیں ہے کہ اس میں شرائط عقد شرکت (ملک ہو یا عقد) سب مفقود ہیں، **کما لایخفیٰ علی مثلکم العلام**

مجھے پوری امید ہے کہ بندہ کی اس تفصیل کی تصدیق وتوثیق ہندوستان میں کسی بھی قانون داں سے حاصل ہوسکتی ہے، اس لیے کہ پورے عالم میں عقود شیئرز اسی منہج پر رائج ہیں۔ جواب میں اس عریضہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں نقل ہمارے پاس ہے۔

سراج احمد غفرلہ (افریقی) بروز چہارشنبہ ۲۱/۲/۱۴۰۳ھ جنوبی افریقہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلے چند چیزیں بطور مقدمہ پیش کی جاتی ہیں، اس کے بعد اصل مسئلہ کے متعلق عرض کیا جائے گا:

(۱)”وجاز آخذ دين علي كافر من ثمن خمر بخلاف دين علي المسلم لبطلانه، إلا إذا وكل ذميا ببيعه فيجوز عنده خلافا لهما“(۱)۔

(۲)”صح توكيل مسلم ذمياً ببيع خمر وخنزير وشرائهما“(۲)۔

(۳)”يكره للمسلم أن يدفع إلى النصراني مالا مضاربة وهو جائز في القضاء“ (۳)۔

(۴)شرکت مفاوضہ کے علاوہ اور عقود شرکت کا معاملہ، نیز کفالت وحوالہ وغیرہ کا معاملہ یہ سب غیر مسلم کے ساتھ صحیح ومباح ہیں، ان سب کے ماخذ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۵)”وإذا خلط الوكيل دراهم الربوا بعضها ببعض الدراهم التي أخذها من حلال يجوز آخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكاً عند الإمام لاسيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مطهر عندنا، كما إذا بال البقر في الحنطة وقت الدياسة فاقتسمها الملاک حل لكل واحد آكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أحدثت احتمالا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا، إذا آربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركا يحكم بحل نصيب كل واحد منهم“(۴)۔

(۶)”غاصب اخذ ثوبان من دار رجل فذهب وعجز صاحب الثوب عن الاسترداد فقال له رجل يفي حتى استرده منه فباعه بثمن معلوم فجاء المشترى الى الغاصب واراد ان ياخذ الثوب وقال هو لي وكذبه الغاصب فحلف المشترى بطلاق امرأ ته ثلاثا انه قالوا لايكون حانثا لان شراء المغصوب صحيح“(۵)۔

(۷)”أى عن سمرة عن النبى صلى الله عليه وسلم، قال: من وجد عين ماله عند رجل فهو أحق به ويتبع البيع من باعه “(۶)۔

۱- درمختار علی ہامش الشامی ۵/ ۳۷۹۔

۲- درمختار کتاب الوکالۃ۔

۳- المبسوط ۱۲۵/۲۵۔

۴- ناقلاً عن امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۹۸۔

۵- قاضی خاں علی الہندیہ ۳/ ۲۹۰۔

۶- رواہ احمد وابوداؤد والنسائی، مشکوۃ ۲۵۵۔

(۸) یہ سب احکام دار الاسلام کے اندر ہوتے ہیں، دار غیر اسلام میں تو بہت سے عقود فاسدہ میں فقہاء متاخرین نے توسع کیا ہے اور گنجائش دی ہے اور اس کے نظائر اکابر کے فتاویٰ میں بے شمار ہیں، اس کا اندازہ امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی وفتاویٰ رشیدیہ وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے۔

(۹) دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کو حربیوں سے ایسا مال لینا (خواہ نقد ہو یا غیر نقد) حضرت امام ابوحنیفہؒ وحضرت امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے، جس کو حربی اپنی رضامندی واجازت سے دیں اور چاہے وہ مال ان کو شرعی طریقہ وحکم کے مطابق حاصل ہوا ہو، یا غیر شرعی طریقہ وحکم سے حاصل ہوا ہو ہر حال میں اس کو وہ مسلمان لے سکتا ہے اور وہ لینا اس کے لیے مباح ہوتا ہے، جیسا کہ مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ''**وإذا دخل المسلم دار الحرب فلابأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب انفسهم بأى وجه كان، لأنه إنما أخذ المباح على وجه عري عن الغدر فيكون ذالک طيبا له**'' (۱)۔

(۱۰) ''**ولا ربوا بين حربي ومسلم مستامن ثمه، لأن ماله ثمه مباح فيحل برضاه مطلقاً بلاعذر خلافا للثاني والثلاثة**'' (۲)۔

ان مقدمات عشرہ کے بعد اب اصل مسئلہ کی حقیقت شرعیہ بیان کی جاتی ہے، پورا سوال بار بار اور بغور پڑھا، سوال کی اس عبارت (شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چند لوگ جمع ہوتے ہیں اور کمپنی کے ذریعہ سے کپڑے یا کسی اور چیز کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس کمپنی قائم کرنے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، تو شیئر یعنی حصے بیچتے ہیں اور لوگ اعلان کے بعد خریدنے لگتے ہیں الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ حصے (شیئر) خریدنے والے کمپنی ہی کا حصہ خریدتے ہیں اور بیچنے والے کمپنی ہی کا حصہ بیچتے ہیں اور اسی حصہ کے خریدنے سے خریدنے والے شرعاً اس کمپنی میں حصہ دار ہوجاتے ہیں اور اسی کا نام شرکت ہے، لہٰذا شرعاً بلاشبہ ابتداءً شرکت متحقق ہوجاتی ہے، پھر بعد میں جب ان حصوں کو بیچنے والوں کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوجاتا ہے تو تغلب کرکے خود مالک بن بیٹھتے ہیں اور کمپنی کو بمنزل انسان قرار دے کر مالک قرار دے لیتے ہیں، یہ سب فعل شرعاً ظلم وغصب ہے، اس سے حصہ خریدنے والوں کی ملکیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ ان کو شرعاً حق رہتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کے بقدر جس طرح ہو حدود شرع میں رہ کر وصول کرسکتے ہیں۔

باقی یہ الگ بات ہے کہ چونکہ سب کے سب غیر مسلم ہوتے ہیں جیسا کہ خود سوال میں اس کی تصریح موجود ہے اور

۱- سرخسی ۶۰/۴، ۳ قبیل کتاب الحوق۔

۲- درمختار باب الربوا۔

ملک و دار کا غیر اسلام ہونا ظاہر ہی ہے، اس لیے ملکی اور غیر شرعی قانون کی مجبوری سے کچھ چارہ جوئی وغیرہ بھی نہیں کر سکتے ہیں، مگر ان کے حقوق حصہ داری شرعاً اس سے سوخت نہ ہوں گے، بلکہ جس حصہ دار کو جس طرح بلا غدر و فریب وخداع کے اپنے حصہ کے بقدر ملے وصول کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ مقدمات عشرہ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ یہ محض فتویٰ ہوگا گو از روئے تقویٰ احتیاط اعلیٰ بات ہوگی اور اس سے اس فتویٰ میں کوئی فرق نہ پڑے گا اور حقوق مجردہ کے منتقلی وبیع وشراء کی جتنی بحث جناب نے کی ہے اس کا یہ موقع نہیں ہے، یہ چیز عمل غصب کے بعد مرتب ہوئی ہے جو ظلم ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں، بلکہ مقدمہ ۶ و ۷ کے مطابق جہاں اور جس طرح ہو سکے اپنے حصہ کے بقدر لے سکتے ہیں، صرف یہ خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اس کے لینے میں فریب وخداع وظلم نہ ہو جیسا کہ مقدمہ ۸ تا ۱۰ سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۴/۱۴۰۳ھ

ہندوستان میں عقود فاسدہ کا حکم، نیز ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالامن؟

کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟ اگر نہیں ہے تو شرعی طور پر کس قسم کے دار میں آتا ہے؟ سنا ہے بعض علماء آزاد ہندوستان کو دارالامن کہتے ہیں، کیا دارالامن کے نام سے موسوم دار کا ثبوت کتب حدیث وفقہ میں ہے؟ اگر آزاد ہندوستان کو دارالامن ہی کہا جائے تو کیا دارالامن میں دارالحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق☆:

مندرجہ ذیل نمبر ملاحظہ فرمائیے:

(۱) دار الحرب لفظی معنی کے لحاظ سے تو ایسے ملک کو کہنا چاہیے جو برسر جنگ ہو، جس سے کوئی معاہدہ نہ ہو، جہاں مسلمان کے لیے امن اور تحفظ نہ ہو۔

لیکن حضرات فقہاء جن کے پیش نظر احکام اسلام کا اجراء اور نفاذ ہوتا ہے، وہ اسی نقطہ نظر سے دار (ملک) کی تقسیم

☆ نوٹ: یہ فتویٰ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ، صدر مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی کا مطبوعہ فتویٰ تھا، جس کو حضرت موصوف نے استصواب رائے کے لئے حضرت مفتی صاحب کو بھیجا تھا، اس فتویٰ کے بعد حضرت مفتی صاحب کا مستقل جواب مذکور ہے۔

کرتے ہیں اورصرف دودار (دوقسم کے ممالک) تسلیم کرتے ہیں، دار الاسلام، دارالحرب۔

(۲) دار الاسلام: وہ ملک جہاں حکومت کا مذہب اسلام ہواور مسلمانوں کوکلی طور پر اقتدار اعلی حاصل ہو۔ وہ اپنی آزادانہ رائے سے جوقانون چاہیں بنائیں اورجس قانون کو چاہیں منسوخ کردیں وہ دارالاسلام ہے۔

الف: اس دار کے مسلمانوں پرفرض ہوتا ہے کہ وہ احکام اسلام جاری کریں اورشریعت غراء کے مطابق قانون بنائیں، اس کے خلاف قانون بنائیں گے تو گنہگار ہوں گے: "**ومن لم یحکم بما أنزل الله فاؤلئک هم الظالمون، ومن لم یحکم بما أنزل الله فاولئک هم الفاسقون**" (۱)۔

ب: وہ ایسی طاقت فراہم کریں جوحریف طاقتوں کواسی طرح متاثر اورمرعوب رکھے جیسے سرد جنگ میں ایک حریف دوسرے کوخوف زدہ رکھتا ہے: "**وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوالله وعدوکم وآخرين من دونهم لاتعلمونهم الله يعلمهم**" (۲)۔

ج: وہ دفاعی حیثیت میں نہ آئیں، بلکہ ان کی اقدامی صلاحیت ایسی ہوکہ ہمسایہ ممالک اس کومحسوس کرتے رہیں اوراس کالوہا مانتے رہیں: "**يا أيها الذين آمنوا قاتلوا الذين يلونكم من الكفار وليجدوا فيكم غلظة**" (۳)۔

د: وہ ان کمزور مسلمانوں کی بھی امداد کریں، جوکسی دوسرے ملک میں محض مسلمان ہونے کی بنا پرظلم وستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہوں اورضرورت ہوتو ان کونجات دلانے کے لیےفوجی طاقت بھی استعمال کرسکیں۔ "**وما لکم لاتقاتلون في سبيل الله ۔تا ۔نصيرا**" (۴)۔

(۳) ایسا ملک جہاں مسلمانوں کوکلی اقتدار حاصل نہ ہو،مثلاً امورخارجہ اوربین الاقوامی تعلقات میں وہ خودمختار نہ ہوں،فوجی اختیارات ان کوحاصل نہ ہوں، جرم وسزا کے قانون بنانے میں بھی وہ آزاد نہ ہوں، البتہ مذہبی اور عائلی معاملات میں وہ خودمختار ہوں، ان کا پرسنل لاء محفوظ اورکارفرما ہو۔فقہائے اسلام اس کوبھی دارالاسلام کہتے ہیں،وہاں اقتدار اوراختیار کی حدتک احکام اسلام جاری کرنے لازم ہوں گے۔

"**کل مصرفيه وال مسلم من جهة الكفار يجوز منه إقامة الجمع والأعياد وأخذ الخراج**

۱- سورۂ مائدہ: ۴۵، ۴۶، ۴۷۔

۲- سورۂ انفال: ۶۰۔

۳- سورۂ توبہ: ۱۲۳۔

۴- سورۂ نساء: ۷۵۔

وتقليد القضاة وتزويج الأيامى"(۱)۔

یعنی جمعہ اور عیدین کا نظام قائم کرنے، خراج وصول کرنے، قاضیوں کے مقرر کرنے اور لاوارث غیر منکوحہ عورتوں کے نکاح کرنے کا اصل حق تو امام عامہ کو ہے، لیکن اگر کوئی شہر (علاقہ) امام عامہ کے بجائے غیر مسلم اقتدار اعلیٰ کے تحت ہے اور اس اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس کا مسلمان سربراہ (والی) مقرر ہے، اس کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ ان فرائض کو انجام دے، ایسا ملک بھی علماء دارالاسلام ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریزی دور حکومت میں حیدرآباد، بھوپال جیسی ریاستیں جو اپنے داخلی معاملات میں خودمختار تھیں؛ یہی حیثیت رکھتی تھیں۔

(۴) وہ مملکت جہاں مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو، خواہ مسلمان وہاں ہر طرح امن واطمینان سے رہتے ہوں، وہاں کے سیاسی اور غیر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہوں، اس کو اپنا وطن سمجھتے ہوں اور باشندۂ ملک کی حیثیت سے اس کی حفاظت اور ترقی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں، اس کے لیے ایثار اور قربانی بھی کردیتے ہوں۔ مسلمان کی حیثیت سے یا مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کی بناپر نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ اقتدار اعلیٰ میں حصہ لے سکتے ہوں، مثلاً وہ رئیس جمہوریہ اور وزیر اعظم بن سکتے ہوں، مگر احکام اسلام جاری نہ کرسکتے ہوں، جرم وسزا اور اقتصادی مسائل، کرنسی اور شرح تبادلہ وغیرہ کے سلسلہ میں احکام اسلام کو قانون نہ بنا سکتے ہوں، بلکہ ان میں اس ملک کے قوانین کے پابند ہوں تو وہ دارالاسلام نہیں ہے۔

حضرات فقہائے کرام کی تقسیم کے مطابق (کہ یہاں احکام اسلام جاری نہیں ہیں، یعنی قانون اسلامی قانون نہیں ہے) یہ ملک دارالحرب ہوگا، لیکن ایک پرامن اور باحفاظت ملک کے لیے اس لفظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہے تو اس کو دارالامن کہہ دیا جاتا ہے۔

(۵) دارالامن ہوگا تو یہاں مسلمانوں کی حیثیت مستامن کی ہوگی، یعنی ان کو خود اپنی اجتماعی قوت کی بناء پر امن حاصل نہیں ہے، بلکہ حکومت کے قانون کی بناپر وہ حقوق حاصل ہیں جو باشندہ ملک کو حاصل ہوسکتے ہیں، ایسے ملک میں اگرچہ قانونی طور پر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کوئی اقتدار یا قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا مگر مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک نظام بنائیں اور اس کے تحت جمعہ اور عیدین کا انتظام کریں۔

"**وأما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضياً**

۱- ردالمحتار ۵/ ۲۷۶/ ۳۔

بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب وال مسلم"(۱)۔

ایسے شہروں میں جہاں غیر مسلم حکام ہوں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا جائز ہے اور جس کو وہ اپنی مرضی سے قاضی بنا دیں وہ قاضی ہو جائے گا اور مسلمان والی کے لیے جد وجہد کرنا ان پر لازم ہوگا۔

(۶) اگر مسلمانوں کا ایسا نظام بھی نہ ہو تو نماز جمعہ وقتِ انتشار نہیں ہوگی بلکہ یہ فریضہ تمام مسلمانوں پر عائد ہوگا کہ وہ جمعہ کا امام بنائیں اور جمعہ وعیدین کی نمازیں شہروں میں حسب شرائط ادا کریں: "**يقيمها أمير البلد ثم الشرطي ثم من ولاة قاضي القضاة ونصب العامة الخطيب غير معتبر مع وجود من ذكر، أمامع عدمهم فيجوز للضرورة**"(۲)۔

نماز جمعہ امیر البلد (والی یا گورنر) قائم کرائے گا، وہ نہ ہو تو شرطی یعنی وہ افسر جس کو سلطان نے اسی قسم کے تقررات کے لیے مقرر کیا ہے، مثلاً صدر الصدور یا امیر الامراء وغیرہ عام مسلمان اگر خطیب اور امام جمعہ مقرر کرلیں تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے، جب کہ ان عہدہ داران میں سے کوئی عہدہ دار موجود ہو اور اگر کوئی عہدہ دار بھی نہ ہو تو ضرورتاً تمام مسلمانوں کے انتخاب کو منظور کرلیا جائے گا اور اس کو امام قرار دیا جائے گا جس کو مسلمان امام قرار دے لیں۔

(۷) جہاں تک میری واقفیت ہے دار الامن جدید اصطلاح ہے۔ قرآن اور حدیث تو کیا فقہائے متقدمین کی تصانیف میں بھی یہ اصطلاح رائج نہیں ہے، لیکن اس کا تصور ضرور موجود ہے، کیونکہ غیر اسلامی مملکت میں جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہ ہو، مسلمانوں کے لیے بود و باش اور کاروبار کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ وہ مسلمان جو دشمنوں میں رہتا تھا اور کسی مسلمان کے ہاتھ سے خطاءً قتل ہوگیا، اس کے متعلق قرآن پاک (۳) میں احکام مذکور ہیں۔

اسی طرح سورہ انفال کے آخری رکوع میں ان نومسلموں کے متعلق احکام ہیں جو اپنے وطن میں مسلمان ہوگئے اور

۱- ردالمحتار قبیل باب العشر والخراج ۳/ ۲۵۳۔

۲- ردالمحتار ۱/ ۷۵۴۔

۳- "ستجدون آخرين يريدون أن يأمنوكم ويأمنوا قومهم كلما ردوا إلى الفتنة أركسوا فيها فإن لم يعتزلوكم ويلقوا إليكم السلم ويكفوا أيديهم فخذوهم واقتلوهم حيث ثقفتموهم وأولائكم جعلنا لكم عليهم سلطانا مبينا، وما كان لمؤمن أن يقتل مؤمنا إلا خطئا ومن قتل مؤمنا خطئا فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة إلى أهله إلا أن يصدقوا فإن كان من قوم عدو لكم وهو مؤمن فتحرير رقبة مؤمنة وإن كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق فدية مسلمة إلى أهله وتحرير رقبة مؤمنة فمن لم يجد فصيام شهرين متتابعين توبة من الله وكان الله عليما حكيما" (سورۂ نساء ۹۱-۹۲)۔

ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آئے (۱)، اسی طرح کے اور احکام جو دوسری آیتوں سے مترشح ہوتے ہیں ان سے ان کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی جواز تھا جس کی بناپر حضرات صحابہؓ اپنے دور میں اور ان کے بعد حضرات تابعین اور ان کے اتباع غیر اسلامی ممالک میں پہنچے، وہاں قیام کیا، ان کی زندگیاں اسلامی تھیں، ان کے قول و اعمال میں صداقت تھی، وہ کاروبار میں نہایت دیانتدار، خلق خدا کے بہی خواہ، اور جو ان سے خرید وفروخت کرتا، اس کے بھی خیرخواہ اور صحیح معنی میں الصدوق اور الامین ہوتے تھے، ان کی اس شان نے ان ممالک کے عوام کے دلوں کو اسلام کا گرویدہ بنایا۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک جن میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں، ان میں اسلام ان ہی حضرات کے قیام کی بدولت پھیلا۔ علاوہ ازیں جس طرح ان غیر مسلم مستامنین کے احکام موجود ہیں جو دارالحرب سے دارالاسلام میں آئیں، ایسے ہی ان مسلمانوں کے متعلق بھی احکام موجود ہیں جو دارالاسلام سے دارالحرب میں مستامن کی حیثیت سے جائیں۔

البتہ زمانۂ جنگ میں جائز نہیں ہے کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان دارالحرب میں قیام کرے جس سے دشمنانِ اسلام کو قوت پہنچے اور خود اس کے لیے بھی خطرہ رہے، **کما قال رسول اللہ ﷺ: "لاترا ایٔ نارا ھما"** (۲)۔

(۸) رہا یہ کہ دارالامن میں دارالحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر فقہاء کا یہ مسلمہ اصول یاد رکھنا ضروری ہے: **"المسلم ملتزم بحکم الإسلام حیث مایکون"** (۳) (مسلمان احکام اسلام کا پابند ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو)۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، احتکار، (ذخیرہ اندوزی) استحصال بالجبر، ٹیکس کی چوری وغیرہ جس طرح دارالاسلام میں حرام ہیں دارالحرب میں بھی حرام ہیں، ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان سب برائیوں سے بالا رہے اور خصوصاً ایسے موقعہ پر کہ یہ امراض وباء کی طرح پھیل رہے ہوں، مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت ہونے کا مظاہرہ کرے، یہی موقعہ ہے کہ عملاً اسلام کی برتری ثابت کی جاتی ہے اور دوسرے کو متاثر کیا جاتا ہے۔

باقی بہت سے معاملات ایسے ہیں جو دارالاسلام میں اسلامی قانون کے مطابق ناجائز ہوتے ہیں، اگر ان کے

۱- "والذین آمنوا ولم یهاجروا مالکم من ولایتهم من شیء حتی یهاجروا وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق واللہ بما تعملون بصیر" (سورۂ انفال: ۷۲)۔

۲- ترمذی شریف ۱/۱۹۳۔

۳- شرح کبیر جلد ۴۔

سلسلہ میں کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوتو عدالت اس کے نا جائز ہونے کا فیصلہ کرے گی۔اور اس خرید وفروخت کو نا جائز قرار دے گی، لیکن یہی معاملات اگر دار الحرب میں کیے جائیں تو وہاں کے قانون کے مطابق وہ غلط نہیں ہوتے بلکہ ان کو جائز قرار دیا جاتا ہے، مثلاً ایک من گیہوں کے معاوضہ میں ڈیڑھ من یا دو من گیہوں خریدنا ''ربوا'' کہلاتا ہے جو اسلامی قانون کے مطابق جائز نہیں ہے۔اس طرح کی بیع اگر دار الاسلام میں ہواور مقدمہ عدالت میں پہنچے تو اس بیع کو نا جائز قرار دیا جائے گا، لیکن اگر یہ دار الحرب میں ہواور وہاں کا قانون اجازت دے دے تو اسے مسلمان کی ملک تصور کیا جائے گا۔

اب اگر کوئی فریق دار الاسلام میں اس مقدمہ کو چلانا چاہے تو قاضی اسلام اس کو خارج کردے گا، کیونکہ یہ معاملہ دار الاسلام کا نہیں ہے۔

اسی طرح کے احکام ہیں جن کے متعلق مشہور ہوگیا ہے کہ دار الحرب میں بیوع فاسدہ جائز ہوتی ہیں، بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور معاملہ خوش دلی سے ہو۔

سیر کبیر میں ہے: **''إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا باس بأن یاخذ منهم أموالهم بطیب أنفسهم بأی وجه کان، لأنه إنما أخذ المباح علی وجه عری عن الغدر فیکون ذالک طیباً له، والأسیر والمستامن سواء حتیٰ لو باعهم درهماً بدرهمین أو باعهم میتة بدراهم أو أخذ مالاً منهم بطریق القمار ذالک کله طیب لهم''**(۱)۔

(کوئی مسلمان دار الحرب میں پروانہ امن (ویزا) لے کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں دار الحرب والوں کے مال کسی بھی صورت سے حاصل کرے جو طیب خاطر اور خوش دلی سے ہو، کیونکہ یہ ایسا مال لے رہا ہے جو مباح ہے، ایسی صورت سے لے رہا ہے جو دھوکہ فریب سے پاک ہے، پس یہ مال اس کے لیے حلال وطیب ہوگا، کوئی مسلمان دار الحرب میں اسیر کی حیثیت سے ہو یا پروانہ امن حاصل کر کے (ویزا لے کر) گیا ہو۔دونوں کے لیے یہی حکم ہے، چنانچہ اگر وہاں ایک درہم دو درہم میں فروخت کردے یا مردار جانور کو درہموں کے بدلے فروخت کردے (بقیمت فروخت کردے) یا قمار کی صورت میں مال حاصل کرے تو یہ سب صورتیں اس کے لیے جائز ہوں گی)(۲)۔

(۹) سیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں جو معاملہ اہل حرب سے ہو اس کے حلال

۱- سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار۔

۲- سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار۔

وطیب ہونے کے لیے طیب نفس یعنی خوش دلی اور رضامندی کافی ہے، وہ رضامندی شرعاً معتبر ہو یا نہ ہو چنانچہ سود اور قمار میں جو رضامندی ہوتی ہے، اگر چہ وہ شرعاً معتبر نہیں ہے، لیکن دار الحرب میں یہ غیر معتبر بھی معتبر ہوگی۔ اور اس رضامندی سے حاصل شدہ مال طیب قرار دیا جائے گا۔

تو سوال یہ ہے کہ شریعت نے جس کو خبیث فرمایا ہے، کیا اس کی خباثت صرف دار الاسلام تک ہے یا وہ خباثت اس معاملہ کی فطرت ہے جہاں بھی اس معاملہ کا وجود ہوگا۔ خباثت موجود رہے گی۔

مثلاً قمار بقول حضرت شاہ ولی اللہ اس لیے حرام ہے کہ کسب واستحصال کے جو ضابطے شریعت نے مقرر کیے ہیں یہ ان کے برعکس اور ان کے مناقض ومخالف ہے۔ مثلاً یہ کہ ان میں ایسی محنت نہیں ہوتی جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہنچے۔

حضرت شاہ صاحب محنت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چور، ڈاکو، گرہ کٹ اور بھیک مانگنے والے سب ہی محنت کرتے ہیں، مگر ان کی محنت سے نہ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ اس کی صنعت وحرفت میں، نہ تمدن ترقی کرتا ہے، نہ تعمیر ملک میں فروغ ہے، بلکہ یہ جرائم ان مقاصد کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں، اسی طرح قمار باز اور سود خوار محنت ضرور کرتے ہیں مگر ان کی محنت سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی محنت ایک طرح کا ہیر پھیر ہوتی ہے جس سے دوسرے کی رقم جھپٹ لی جاتی ہے اور اس کی تہہ میں طمع وحرص کارفرما ہوتی ہے جو قانون کی حد سے آگے بڑھ کر اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک مرض ہیں، سود کی بھی اصل علت حرص وطمع ہوتی ہے جس میں جارحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ سود خوار کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی کمزوری میں اور اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ ضرورت مند ہی قرض لینے پر مجبور ہے، ظاہر ہے اس میں ادائے قرض کی وسعت مشکل ہی سے پیدا ہوگی، لیکن سود خوار اس مشکل کی بناء پر رحم کرنے کے بجائے اس کی مشکل میں اضافہ کر دیتا ہے کہ سود کے مطالبہ کو دو چند اور سہ چند کر دیتا ہے(۱)۔

ان افعال کی یہ قباحتیں جس طرح دار الاسلام میں ہوتی ہیں، دار الحرب میں بھی قائم رہتی ہیں۔ تو جن معاملات کی تہ میں یہ قباحتیں موجود ہوں ان کی آمدنی کو حلال وطیب کیسے کہا جا سکتا ہے۔ قانونی نقطۂ نظر سے اگر جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کو اسی حد تک محدود رہنا چاہیے، اس کو حلال وطیب نہیں کہنا چاہیے۔ قمار سے حاصل کردہ رقم دار الحرب میں جائز ہوگی، کیونکہ اس کو اسلامی قانون کا تحفظ حاصل نہیں اور ملکی قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا، لیکن اس جائز کو طیب نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اخلاق

۱- حجۃ اللہ البالغۃ، باب البیوع المنہی عنہا۔

قباحتیں اس کی شکلوں میں بدستور پیوست ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ حسن وقبح کا مدار شریعت کے فیصلہ پر ہے، شریعت جس کو جائز قرار دے وہ حسن ہے اور جس کو ناجائز قرار دے وہ قبیح ہے۔

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غلبہ روم کی قرآنی پیشین گوئی کے سلسلہ میں بازی لگا دینے پر جو مال حاصل کیا تھا حضور ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا، اس جائز کو حسن اور اس ملک کو طیب ہی کہا جائے، لیکن بحر العلوم حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ نے اس جواز کے متعلق بیان کی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے آپ فرماتے ہیں:

جو مال ایسے ملک سے لیا جائے جہاں صلح وعہد ہے اگر قہر وجبر لیا ہے تو غیر مملوک وحرام ہے اور اگر ایسی رضا سے لیا جائے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے حر کی بیع یا سود یا قمار وغیرہ تو ملک آجائے گی برعایت صورت رضا اور حلت نہ آئے گی بوجہ مخالفت شرعی اور اگر وہ رضا شرعاً معتبر یا مسکوت ہو تو ملک بھی آجائے گی اور حلت بھی (۱)۔

(۱۰) دار الامن کے غیر مسلم کو حربی کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، مثلاً ہندوستان کا کوئی مسلمان باشندہ لندن یا پیرس چلا جائے تو وہاں کے باشندوں سے اس کا کوئی رابطہ یا معاہدہ نہیں ہوگا، لیکن ہم وطن غیر مسلموں سے اس کے بہت سے رابطے ہیں وہ برابر کے شہری ہیں، ملکی قانون کے پابند اور اقتصادی کاروباری معاملات اور قومی اداروں میں شریک اور ایک دوسرے کے مددگار وغیرہ وغیرہ۔

(۱۱) تنویر الابصار میں ایک جزئیہ ہے:

"**دار الحرب تصير دار الاسلام بإجراء أحكام أهل الإسلام فيها**"(۲)۔صاحب الدر المختار نے اس کی مثال دی ہے کہ **کجمعة وعيد**۔

درمختار کی اس مثال کی بناء پر کچھ علماء کی رائے ہے کہ ہندوستان دار الاسلام ہے کہ یہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہر ایک صاحب بصیرت فیصلہ کرسکتا ہے کہ جمعہ وعیدین کی مثال صحیح نہیں ہے، کیونکہ جمعہ اور عیدین کی نماز کے پڑھ لینے کو" اجراء احکام الاسلام" نہیں کہا جا سکتا، ایک معمولی مجسٹریٹ بھی کسی مقام پر جمعہ یا عید کی نماز سے روک دے تو مسلمانوں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کے حکم کو منسوخ کر کے اپنے فیصلہ کے بموجب وہاں عید کی نماز یا جمعہ کی نماز پڑھ سکیں۔

۱- عطر ہدایہ ۱۸۰۔

۲- تنویر الابصار ۳؍۳۵۲ قبل باب العشر والخراج۔

حکم اسلام کا اجراء یہ ہے کہ اہل اسلام اپنا فیصلہ نافذ کرسکیں، ادائے فرض کی اجازت ہونا اور چیز ہے اور حکم اسلام کے اجراء کا اختیار و اقتدار اور چیز ہے۔ یہ مثال اس لیے بھی بے محل ہے کہ خود ردالمحتار کی تحریر سابق کے مخالف ہے، جو فقرہ ''ب'' میں پیش کی گئی جس میں دارالاسلام اس علاقہ کو کہا گیا ہے، جہاں با اختیار والی مسلم ہو اگر محض نماز جمعہ پڑھ لینے سے کوئی علاقہ دارالاسلام ہو جاتا ہے تو والی مسلم کا تذکرہ غیر ضروری اور بے کار ہے۔

(۱۲) بہر حال ہندوستان کو آپ دار الحرب قرار دیں یا دار الاسلام، مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں عقود اور معاملات کے متعلق وہی احکام ہیں جو دار الاسلام میں ہوتے ہیں۔ پھلوں اور باغات کی بیع کی مختلف صورتوں میں وہی فتاویٰ صادر کیے جاتے ہیں جو دارالاسلام میں صادر کیے جاتے ہیں۔ گویا عقود اور معاملات کے سلسلہ میں عملاً دار الاسلام ہی مانا جاتا ہے۔

حضرت مولانا فتح محمد میاں صاحب رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک ضابطہ تحریر فرماتے ہیں:

نقرہ (۹) میں جو عطر ہدایہ کی عبارت گزری ہے، اس کو ملاحظہ فرمائیے، اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ دارالکفر میں بامان رہتے ہیں یا داخل ہوں یا باہم صلح و عہد رکھتے ہوں، انہیں کوئی ایسا معاملہ کرنا جو شرعاً ناجائز ہو، جیسے بیع یا اجارہ فاسد و باطل، یا شرعی ربو یا رشوت وغیرہ ہرگز جائز نہیں۔

اور حدیث: ''لاربو ابین المسلم والحربی'' کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دارالکفر میں کافر سے سود لے تو وہ سود خوار اور موجب وعید ربو انہ ہوگا، اگر چہ ملک حرام کا مواخذہ باقی ہے مگر سود دینا کسی طور پر جائز نہ ہوگا، مگر جب کہ اس سود کے لینے سے وہاں کے لوگوں کا عہد و صلح ہو، یا یہ وہیں کی رعیت ہو تو لینا بھی جائز نہیں (۱)۔

(۱۳) دار کے سلسلہ میں ملک العلماء علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ نے مسلک امام ابوحنیفہؒ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"إن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الإطلاق فهي دارالإسلام، وإن كان الأمان فيها للكفر ة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفرة" (۲)۔

سوال یہ ہے کہ اگر امن اور خوف کا مدار کسی مذہب پر نہ ہو، حکومت کا دستور اساسی یہ ہو کہ حکومت کا تعلق کسی مذہب

۱- عطر ہدایہ ص ۱۸۱۔

۲- بدائع الصنائع ۱۳۱/۷۔

سے نہیں ہے، نہ کسی مذہب کی بنا پر کسی کو ترجیح دی جائے گی، بلکہ امن اور خوف کا مدار وطنیت اور شہریت پر ہو، مثلاً دہلی کا رہنے والا مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ یا کسی شہر میں بھی جائے وہ ہندوستانی ہونے کی بنا پر محفوظ اور مامون ہے اور اس کو تمام شہری حقوق حاصل ہیں، لیکن نیپال کا رہنے والا برہمن ویزا کے بغیر حدود ہندوستان میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا، تو اس صورت میں اس دار کو کیا کہا جائے گا؟ کیا کسی مذہب کی طرف منسوب کرنا الزام مالایلزم نہیں ہوگا(۱)؟

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دارالاسلام ودارالکفر کی تحقیق:

الجواب وبالله التوفيق:

(۱، و، ۲) حضرت مجیب نے بالکل صحیح فرمایا، (۲) دار حقیقت میں دو ہی ہوتے ہیں: ایک دار الاسلام جس کی توضیح وتشریح حضرت مجیب نے بہت مفصل ومدلل فرمادی ہے کہ اقتدار اعلیٰ (۳) جس ملک میں مسلمانوں کو مکمل طور پر حاصل ہو اور اس کو اسلامی احکام کے مطابق ہر قانون بنانے اور اس کو جاری کرنے کی پوری قدرت حاصل ہو۔ دوسرا دار، دار الاسلام کا مقابل ہوگا۔ اور اسلام کا مقابل کفر ہے، لہٰذا دوسرا دار حقیقت میں دار الکفر ہوگا اور یہی دو دار حقیقۃً و واقعۃً ہیں۔

پھر دار الکفر کی بنیادی واصولی طور پر چار قسمیں ہیں: (۱) دار المحاربہ (۴) (۲) دار المعاہدہ والمسالمہ (۵)

۱- حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کا جواب مکمل ہوگیا، اس کے بعد اس کی مزید توضیح بعنوان دارالکفر ودارالاسلام کی تحقیق حضرت مفتی صاحب کی تحریر فرمودہ ہے۔

۲- ’’قيل: الدار عندنا دار الإسلام ودار الحرب‘‘ (عینی شرح الہدایہ کتاب السیر ۲/ ۸۶۲)۔

۳- "وهذا لأن دار الحرب تصير دار الإسلام باجراء الأحكام وثبوت الأمن للمقيم من المسلمين فيها" (فتح القدیر ۴/ ۳۱۱) ف: دارالکفر کی یہ اقسام اربعہ باہم قسیم ومتضاد نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے آگے اس کی وضاحت فرمائی ہے بلکہ اول الذکر دو قسمیں باہم قسیم ومتضاد ہیں اور ثانی الذکر دو قسمیں باہم قسیم ہیں، فرق صرف مقسم کے اعتبار کا ہے اگر دار الاسلام کے تقابل کا اعتبار کیا جائے تو دارالکفر کی دو اول الذکر قسمیں ہوں گی اور اگر دار الکفر کے اندرونی معاملات کا اعتبار کیا جائے تو اس کی متاخر الذکر دو قسمیں ہوں گی۔

۴- ’’إن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الاطلاق فهي دار الكفر‘‘ (بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۵- ’’إذا رأى الإمام أن يصالح أهل الحرب أو فريقا منهم، وكان في ذالك مصلحة المسلمين فلا بأس به‘‘ (ہدایہ علی ہامش الفتح ۹۹/ ۲) ’’إذا كانت دار من ديار الحرب لا دع وادع المسلمون أهلها على أن يؤدوا إلى المسلمين شيئاً معلوماً في

(۳) دار الأمن (۱) (۴) دار الشر والفساد (۲)، اس لیے کہ دار الاسلام کا محاربہ دار الکفر سے ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو اس کا نام دار المحاربہ ہوگا اور اگر محاربہ نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں ان دونوں داروں (دار الاسلام اور دار الکفر) اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ومسالمہ ہوگا یا نہیں، اگر معاہدہ یا مسالمہ ہوگا تو اس کو دار المعاہدہ یا دار المسالمہ کہیں گے اور اگر معاہدہ ومسالمہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو اس ملک کے مسلم باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ رہتے ہوں گے یا مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں گے، اگر مامون ومحفوظ رہتے ہوں، جیسے سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبشہ تو اس ملک کو دار الأمن کہا جائے گا اور اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دار الشر والفساد کہا جائے گا۔ جیسے فتح مکہ سے قبل مکہ مکرمہ ان چاروں قسموں میں سے پہلی دو قسموں میں دار الاسلام کے تقابل کے اعتبار سے مطلق دار الکفر مقسم ہے، اور بعد کی دو قسموں میں دار الکفر کے اندرونی معاملات کے اعتبار سے مطلق دار الکفر مقسم ہے، اس لیے پہلی دونوں قسمیں دار المحاربہ ودار المعاہدہ تو آپس میں قسیم ومتضاد ہوں گی اور بعد کی دونوں قسمیں محض آپس میں قسیم ومتضاد ہوں گی اور بیک وقت جمع نہ ہوسکیں گی، لیکن پہلی دونوں قسموں میں سے ہر ایک کے ساتھ جمع ہوسکیں گی۔ یعنی ایک دار، دار الاسلام کے تقابل کے اعتبار سے دار الحرب یا دار المعاہدہ ہو اور اپنے اندرونی قوانین ومعاملات کے اعتبار سے دار الأمن یا دار الشر والفساد ہو، تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔ پس ایک ملک ودار بیک

كل مدة على أن لايجرى عليهم المسلمون احكامهم فهذه دار الحرب، لأن الدار إنما تصير دار الإسلام باجراء حكم المسلمين فيها وحكم المسلمين غير جار فكانت هذه دار حرب" (شرح السیر الکبیر ۳/۳۰۲) "الموادعة وهي المعاهدة والصلح على ترك القتال" (بدائع الصنائع ۷/۱۰۸)۔

"ان النبي ﷺ صالح أهل مكة عام الحديبية على ان وضع الحرب بينه وبينهم عشر سنين" (مبسوط ۲/۳۷) "ولما انتهى رسول الله ﷺ إلى تبوك أتاه يحنه بن رؤبة صاحب ايلة فصالح رسول الله ﷺ وأعطاه الجزية وكتب لهم رسول الله ﷺ كتابا فهو عندهم" (البدایۃ والنہایۃ ۵/۱۶)۔

۱- دار الأمن کا لفظ اگرچہ بعد میں وضع کیا گیا ہے لیکن عہد نبوی میں اس کی مثال موجود تھی۔ حبشہ کا ملک اسی قسم میں داخل تھا۔ "فلما رأى رسول الله ﷺ ما يصيب أصحابه من البلاء الخ قال لهم: لو خرجتم إلى الحبشة فإن بها ملكا لايظلم عنده أحد، وهي "أرض صدق" حتىٰ يجعل الله لكم فرجا مما أنتم فيه، فخرج عند ذالك المسلمون من أصحاب رسول الله ﷺ إلى أرض الحبشة" البدایۃ والنہایۃ (۳/۶۶) "قال النجاشي للمسلمين: اذهبوا فأنتم سيوم في الأرض، السيوم الآمنون في الأرض ما أحب أن لي دبراً وإلى رجل منكم والدبر بلسانهم الذهب" (البدایۃ والنہایۃ ۳/۷۴)۔

۲- فتح مکہ سے پہلے دار الشر والفساد تھا۔ "انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فساداً أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع ايديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض" (سورۂ مائدہ ۶ رکوع ۹)۔

وقت دونوں قسموں کے اعتبار سے دار المعاہدہ والمسالمہ اور دار الشر والفساد بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح پر مطلق دار کی پانچ قسمیں نکل آئیں گی: (۱) دار الاسلام (۲) دار المحاربہ (۳) دار المعاہدہ والمسالمہ (۴) دار الامن (۵) دار الشر والفساد۔ لیکن دار الکفر کی ان چاروں قسموں میں سے پہلی قسم نہایت اہم اور شدید ہے، نیز کفر اپنی حقیقت ومفہوم واثر کے اعتبار سے "**ودوا لو تکفرون الخ**" کی خاصیت رکھتا ہے اور اسلام اپنی حقیقت ومفہوم واثر کے اعتبار سے "**بلغوا عني ولو آية**" (الحدیث) اور آیت کریمہ: "**وجادلهم بالتي هي أحسن**" (۱) اور آیت کریمہ: "**وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين**" (۲) اور آیت کریمہ: "**وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله فإن انتهوا فلا عدوان إلا على الظالمين**" (۳) کی خاصیت رکھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کا مخاطب ہے، اس لیے ہر وقت تصادم وٹکراؤ کا مظنہ وخطرہ موجود رہتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے فقہاء کرام کے یہاں "**تسمية الكل باسم الجزء يا تسمية كل أفراد المقسم باسم بعض أفراد المقسم**" کے مطابق دار الکفر کے سب سے اہم وشدید فرد کا ترغیباً وتحریضاً علی الجہاد دار الحرب کا نام اس کے سارے وتمام افراد پر جاری ہوگیا پھر وہی شائع وذائع بھی ہوگیا ہو، ورنہ تمام اقسام کے احکام الگ الگ فقہاء متقدمین کی کتابوں میں بھی ملیں گے۔ پھر اسلام (۴) کے ابتدائی دور میں اگرچہ دار الکفر متعدد ومختلف تھے، مگر تمام عالم اسلام کی حکومت ایک ہی تھی اور دار الاسلام بھی ایک ہی تھا، اس لیے ان تمام اقسام پنجگانہ سے بات آگے نظر نہیں آتی، البتہ جب (۵) بنو امیہ وبنو عباسیہ کی دو الگ الگ اور مستقل حکومتیں بن گئیں اور ہر ایک اپنی حکومت کو مستقل

۱- سورۂ نحل: ۱۲۵۔		۲- سورۂ بقرہ: ۱۹۰۔		۳- سورۂ بقرہ: ۱۹۳۔

۴- "عن أنس بن مالك أن رسول الله ﷺ كتب قبل موته إلى كسرى وقيصر وإلى النجاشي وإلى كل جبار يدعوهم إلى الله عزوجل" (البدایہ والنہایہ ۴/ ۲۶۴) "عن عبد الله بن عبد القاري ان رسول الله ﷺ بعث حاطب بن أبي بلتعة إلى المقوقس صاحب الإسكندرية فمضى بكتاب رسول الله ﷺ" (البدایہ ۴/ ۲۷۲)۔

۵- اندلس کا پہلا فرماں روا عبد الرحمن الداخل ۱۳۸ھ سے ۱۷۲ھ تک اندلس کی حکومت کا مالک رہا، اس کے بعد بالترتیب ہشام اول از ۱۷۲ھ تا ۱۸۰ھ، حاکم اول از ۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ، عبد الرحمن ثانی از ۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ، محمد اول از ۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ، منذر از ۲۷۳ھ تا ۲۷۵ھ، عبد اللہ از ۲۷۵ھ تا ۳۰۰ھ حکومت کے مالک ہوتے رہے لیکن ان میں سے کسی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ۳۰۰ھ میں عبد الرحمن ثالث بادشاہ ہوا، سب سے پہلے اسی نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا اور اندلس میں اس سے خلافت کا آغاز ہوگیا۔ "في هذه السنة (سنة خمسين وثلاث مائة) توفي عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله صاحب الأندلس الملقب بالناصر لدين الله فكانت إمارته خمسين سنة وستة أشهر وكان عمره ثلاثا وسبعين سنة ...... وهو أول من تلقب من الأمويين بألقاب الخلفاء وتسمى بأمير المؤمنين" (تاریخ الکامل ۸/ ۱۷۶) دوسری طرف بغداد کے اندر عباسی خلفاء یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوتے رہے۔ عبد الرحمن ثالث کے پچاس سالہ دور خلافت کے اندر مندرجہ ذیل عباسی خلفاء تخت خلافت پر آئے۔ المقتدر باللہ از ۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ، القاہر باللہ از ۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ، الراضی باللہ از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ، المتقی للہ از ۳۲۹ھ تا ۳۳۳ھ

دار الاسلام قرار دینے لگا تو اگر دار الکفر کا ایک ہی ملک ایک حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دار الحرب اور دوسری حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دار الامن یا دار المعاہد یا دار الشر والفساد قرار پانے لگے پایا جائے تو یہ کسی تعجب یا کسی اختلاف کی بات نہ ہوگی بلکہ دار الاسلام کے ان حصوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ اختلاف ہوگا، پھر جب مسلم حکومتیں ٹولیوں (۱) میں منقسم ہوکر اور زائد ومتعدد ہوگئیں تو دار الکفر کی ایک قسم مختلف مسلم حکومتوں کے اعتبار سے الگ الگ ناموں سے بھی موسوم ہوسکتی ہیں، مثلاً اگر مسلم حکومت کے اعتبار سے دار الکفر کا ایک ملک دار المعاہد دو المسالمہ ہوتو دوسری حکومت کے اعتبار سے وہی ملک دار الحرب اور تیسری کے اعتبار سے دار الشر والفساد ہو اور چوتھی کے اعتبار سے دار الامن ہو اور ہر ایک مسلم حکومت اپنے اپنے

المستکفی باللہ از ۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ، المطیع للہ از ۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ۔

عبدالرحمٰن ثالث کے بعد دوسرے اموی خلفاء اندلس میں خلیفہ ہوتے رہے اور عباسی خلفاء بغداد میں اندلس کے علاوہ باقی اسلامی ممالک کے خلیفہ ہوتے رہے اس طرح بیک وقت اسلامی ممالک میں دو خلیفہ کا وجود مدتوں تک رہا۔ ۹۳ھ تک اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ ہوگیا اور عباسی حکومت بھی روبہ زوال ہونے لگی یہاں تک کہ فتنہ تاتار اٹھا اور آخری عباسی خلیفہ المستعصم بن المستنصر کو ۶۵۶ھ میں قتل کردیا گیا۔ کانت مدة خلافة المستعصم ۱۶ سنة تقریباً وعمره ۵۰ سنة الخ وانقضت الدولة العباسية من بغداد بعد ان دامت ۵۲۴ سنة ای من سنة ۱۳۲ وهي السنة التي استولیٰ فیها الثور علي بغداد وعدد خلفائهم ۳۷ خليفة الخ (دروس التاریخ ۴/ ۲۴۳)۔

اس زمانہ میں پوری اسلامی خلافت ٹکڑیوں میں بٹ گئی تھی۔ کچھ مدت کے بعد پھر دوسری خلافت کا آغاز ہوجاتا ہے کیونکہ عباسیوں کے بعض فرد فتنہ تاتار سے بچ کر مصر چلے گئے تھے وہاں جاکر انہوں نے خلافت کی بیعت لی۔ سب سے پہلا خلیفہ المستنصر باللہ ابو القاسم از ۶۵۹ھ تا ۶۶۰ھ ہوا۔ اس کے بعد الحاکم بامر اللہ ابو العباس از ۶۶۰ھ تا ۷۰۱ھ خلیفہ رہا، ادھر عالم اسلام کے اکثر حصوں پر عثمانیوں کی حکومت وخلافت قائم ہوچکی تھی، آل عثمان کی خلافت کا آغاز عثمان اول سے ہوتا ہے جو ۶۹۹ھ سے ۷۲۶ھ تک خلیفہ رہا۔ یہیں سے دوسری خلافت کی ابتداء دوبارہ ہوجاتی ہے اور اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا، جب تک کہ ۹۲۶ھ میں مصر سے بھی عباسی خلافت کا خاتمہ ہوکر عثمانیوں کا قبضہ نہ ہوگیا۔ اوپر کی مختصر تاریخی تفصیلات سے یہ معلوم ہوگیا کہ بیک وقت متعدد خلفاء کا وجود رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی مثال حضرت معاذؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت کے وقت ملتی ہے ایک طرف معاویہؓ خلیفہ تھے اور دوسری طرف حضرت حسنؓ خلیفہ تھے، یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے لیکن چھ ماہ کے بعد حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبردار ہوکر حضرت معاویہؓ کو مستقل خلیفہ مان لیا۔ "ثم دخلت سنة اربعين وفي هذه السنة بويع لمعاوية بالخلافة بايلياء الخ فلما قتل عليؓ دعي لمعاوية أمير المؤمنين" (تاریخ طبری ۶/ ۹۰ سو ۴۰)۔

۱- مثلاً پانچویں صدی کے اوائل میں کئی دار الاسلام بن گئے تھے۔ بغداد میں قادر باللہ ۳۸۱ھ سے ۴۲۲ھ تک خلیفہ رہا۔ اسی زمانہ میں قاسم ابن حمود اشبیلیہ پر قبضہ کرکے وہاں حکومت کرنے لگا اور اسی وقت اس کا بھتیجا یحییٰ ابن علی مالقہ سے قرطبہ پہونچا اور لوگوں سے بیعت لی۔ یہ واقعہ شروع جمادی الاولیٰ ۴۱۲ھ کا ہے "لما سار القاسم ابن حمود من قرطبة إلى إشبيلية سار ابن أخيه يحيى ابن علي من مالقه إلىٰ قرطبه فدخلها بغير مانع فلما تمكن بقرطبه دعا الناس إلى بيعته فاجابوه فكانت البيعة مستهل جمادى الاولىٰ من سنة إثني عشرة وأربع مأة ولقب بالمعتلیٰ وبقي بقرطبه يدعیٰ له بالخلافة وعمه القاسم باشبيليه ويدعیٰ له بالخلافة إلى ذي القعدة سنة ثلاث عشرة وأربع مائة" (تاریخ الکامل، ۹/ ۹۴)۔

اعتبار سے وہاں کے بارے میں احکام مرتب و جاری کرے، یہ سب ہوسکتا ہے اور بظاہر اگرچہ ایک ہی ملک کے بارے میں متضاد قسم کے احکام و نام نظر آئیں، مگر یہ سب اصل میں احکام کا تضاد نہ ہوگا بلکہ ان مسلم حکومتوں کے اختلاف کی وجہ سے نظر آئے گا۔

پھر دار کی یہ سب قسمیں اس وقت کے اعتبار سے ہیں جب شخصی حکومتیں عام طور سے رائج تھیں اور ایک ہی قسم کے احکام قوانین پورے ملک میں یکساں طور پر جاری و رائج ہوتے تھے۔ اب جب کہ جمہوری حکومتوں کا عام رواج ہوگیا ہے اور جمہوری حکومتوں میں خاص کر بڑے ملکوں میں ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے اور اس کے تحت متعدد صوبائی حکومتیں ہوتی ہیں اور صوبائی حکومتیں اپنے اندرونی معاملات قوانین میں خودمختار و آزاد بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے احکام قوانین میں کچھ تغایر بھی ہوسکتا ہے، پس اگر مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے دونوں احکام قوانین بالکل متحد و یکساں ہوں گے۔ جب تو یہی اقسام پنج گانہ قائم رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ دونوں کے احکام قوانین میں کچھ تغایر ہوتو دونوں کے اعتبار سے نام و اقسام بھی الگ الگ ہوسکیں گے اور ان اقسام کے اعتبار سے احکام بھی الگ الگ ہوسکیں گے۔ یہ سب تقسیمیں اور قسمیں قوانین کے حدود میں اور حکومتی سطح پر ہیں، اور اس تقدیر پر ہیں کہ وہ احکام قوانین سارے ملک میں یکساں رائج و نافذ بھی ہوں اور اندرون ملک کے حالات و معاملات بھی انہیں احکام قوانین کے مطابق ہوں اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ حکومتی سطح کے اور قوانینی حدود کے احکام کچھ اور ہو اور عوامی سطح کے معاملات و حالات کچھ اور ہوں اور حکومت اس پر قابو نہ پائے یا بے اعتنائی برتے یا نظر انداز کرے تو حکومتی سطح اور قوانینی حدود کے احکام کچھ ہی ہوں مگر چونکہ شرعی احکام ظاہر معاملات و حالات پر دائر ہوتے ہیں اور عوامی معاملات و حالات ہی ایسی صورت میں ظاہر و باہر ہوں گے۔ اس لیے شرعی احکام انہیں عوامی حالات و معاملات پر جو ظاہر و باہر ہوں گے، دائر ہوں گے، اور انہیں کا اعتبار عندالشرع ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر حاصل ہو اور مسلمانوں کے قبضہ و اقتدار میں مکمل طور پر ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس ملک پر دارالاسلام کی تعریف صادق آئے، لیکن وہاں اسلامی احکام کے خلاف احکام قوانین نافذ و جاری ہوں، یا اس ملک کے رہنے والے مامون و محفوظ نہ ہوں تو اس ملک میں باوجود ملک مسلم اور فی نفسہ دارالاسلام ہونے کے وہاں کے مروجہ احکام قوانین اور ظاہر معاملات و حالات کے اعتبار سے جو احکام ان پر عندالشرع عائد ہوں گے وہ لاگو ہوں گے اور فی نفسہ دار الاسلام ہوتے ہوئے غیر شرعی قوانین جو نافذ کریں گے اس پر وہ عنداللہ ماخوذ ہوں گے اور ان کے عمل کی غلطی یا کوتاہی پر عنداللہ ان سے باز پرس ہوگی۔ پس اس حیثیت سے سارے عالم کا دارالاسلام ایک ہوتے ہوئے بھی ان کی صورت کے اعتبار سے احکام بالیقین

الگ الگ اور جدا جدا ہوسکیں گے۔ لہٰذا اس مطبوعہ استفتاء میں درج شدہ مسائل کے احکام مستنبط کرنے میں بھی ان تمام امور پر نظر رکھنا اور سب کو ملحوظ رکھنا لازمی و ضروری رہے گا، چنانچہ حضرت مجیب نے ان امور کو حتی المقدور ملحوظ رکھا ہے لیکن اگر ایسے علماء کا اجتماع ہوجائے جن کو اس قسم کے مسائل پر بصیرت کی نگاہ حاصل ہو تو نفع سے خالی نہ ہوگا، البتہ طریقہ کار پر پہلے غور کر لینا ضروری رہے گا۔

(۳) اس نمبر میں اس لفظ (اور بین الاقوامی تعلقات میں خودمختار نہ ہوں) کے بعد یہ جملہ (لیکن اپنے داخلی معاملات میں خودمختار ہوں) کا اضافہ ضروری ہے ورنہ پھر اس جملہ (فقہائے اسلام اس کو بھی دار الاسلام کہتے ہیں) کے لیے سند کی ضرورت ہوگی، اور اس پر تفریع کردہ مثال حیدرآباد، بھوپال، چسپاں ہونے کے بجائے دیگر چھوٹی چھوٹی غیر خودمختار ریاستوں کی مثال بھی چسپاں ہوجائے گی، جیسے ریاست مالیر کوٹلہ اور ریاست باغپت وغیرہ۔

(۴) یہ تشریح بھی احقر کے نزدیک بالکل صحیح اور درست ہے، لیکن اخیر کی یہ چند سطریں (یہ ملک دار الحرب الخ) اس طرح کردینا انسب معلوم ہوتا ہے (ایسا ملک دار الحرب کہا جاسکتا ہے)(۱) لیکن اصل میں ایک پرامن اور باحفاظت ملک ہونے کی وجہ سے دار الکفر کی تیسری قسم دار الامن اس کا نام ہوگا۔

(۵) مستامن (۲) تو اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے ملک میں عارضی قیام کی نیت سے کچھ دنوں کے لیے امن حاصل کرکے قیام پذیر ہو جیسے کوئی مسلمان لندن و امریکہ وغیرہ ملکوں میں بذریعہ ملازمت یا تجارت وغیرہ کے لئے عارضی طور پر قیام پذیر ہوجائے اور وہاں کا شہری نہ بنے اور جو شخص (۳) اس ملک کا مستقل باشندہ ہو اس کو مستامن نہیں کہتے، بلکہ اس کے لیے مستقل دوسرا نام ہوگا، مثلاً امریکی مسلمان، افریقی مسلمان، روسی مسلمان وغیرہ، البتہ بعض اعتبار سے اس کو مستامن کی حیثیت میں کہا جاسکتا ہے اور غالباً حضرت مجیب کی بھی یہی مراد ہوگی۔

۱- ”قال النجاشي :اذهبوا فأنتم سيوم في الأرض، السيوم الأمنون في الأرض ما أحب ان لي دبرا وإني اذيت رجلاً منكم والدبر بلسانهم الذهب“(ہدایہ ۴/۷۲۴)۔

۲- ”وهو المسلم الذي يدخل دار الحرب بالأمان وكذالك يطلق على الحربي الذي يطلب الأمان من المسلمين“ (عینی شرح ہدایہ ۴/ ۸۵۳) ”هو يشمل مسلما دخل دار هم بأمان وكافرا دخل دارنا بأمان“ (شرح الوقایہ ۱/ ۳۶۱)۔

۳- ”إذا دخل الحربي دار الإسلام بأمان لايمكن أن يقيم فيها سنة الخ فإن مكث سنة فهو ذمي الخ وللإمام أن يقدر له أقل من ذالك إذا رأى كالشهر والشهرين“(عالمگیری ۴/ ۲۳۴)”الذي ملتزم أحكام الإسلام فيما يرجع إلى المعاملات والمستامن غير ملتزم لذالك “(المبسوط ۱۰/ ۸۹) ”لأنه بقبول عقد الذمة يصير من اهل دارنا حتیٰ لايمكن من الرجوع إلى دار الحرب بحال “(المبسوط ۱۰/ ۸۷ و ۹۷)۔

(۶) یہ تشریح بھی درست ہے۔

(۷) یہ تشریح بھی بہت اچھی ہے، البتہ دار الأمن جدید اصطلاح نہیں ہے، بلکہ قدیم چیز ہے(۱)، لیکن اس کا ظہور وشیوع بعد میں ہوا جیسا کہ خود حضرت مجیب کے اس جملہ (اس کا تصور ضرور موجود ہے) سے معلوم ہوتا ہے۔

(۸) یہ تشریح بھی درست ہے۔ البتہ بعض جملوں کی تعبیری عبارت میں کچھ تغیر کی ضرورت ہے جس کو اس موقع پر ظاہر کردیا گیا ہے۔

(۹) یہ تشریح بھی بہت عمدہ ہے، صرف ایک قید کی ضرورت تھی جس کو بڑھادیا گیا ہے۔

(۱۰) جی ہاں صحیح ہے، دار الأمن کے غیر مسلم کو ہر حیثیت سے حربی (بمعنی حربی محارب) کی حیثیت نہیں دی جاسکتی بلکہ عموماً معاہدہ ومسالم کی حیثیت یا مامون کی حیثیت رہتی ہے۔

(۱۱) یہ تفریع بہت مناسب ہے۔

(۱۲) ان احکام کے دار الأمن (دار الحرب) میں نافذ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان احکام میں اس دار کو عملاً دار الاسلام ہی مانا جاتا ہے، بلکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ چونکہ یہ احکام دار الاسلام ودار الأمن (دار الحرب) دونوں کے لیے یکساں وعام ہیں، اس لیے نافذ کیے جاتے ہیں، جیسا کہ خود یہی بات صاحب عطر ہدایہ کی محولہ عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

(۱۳) ملک العلماء کی دار کے بارے میں جو عبارت نقل فرمائی گئی ہے وہ امان وخوف کی ہر صورت کو حاوی نہیں ہے، اس لیے کہ امن وخوف کے اعتبار سے چھ صورتیں اور بھی ہیں اور کل آٹھ صورتیں ہوجاتی ہیں:
۱-"أمان للمسلمین علی الإطلاق وخوف للکفرة علی الإطلاق"، ۲-"أمان للکفرة علی الإطلاق" (۲)"وخوف للمسلمین علی الإطلاق"، ۳-"أمان للمسلمین علی الإطلاق وخوف للکفرة مقیدبقیود" (۳)،

۱- "فلما رأی رسول الله ﷺ مایصیب أصحابه من البلاء الخ قال لهم: لو خرجتم إلی الحبشة فإن بها ملکا لایظلم عنده أحد،وهي أرض صدق حتی یجعل الله لکم فرجاً مما انتم فیه فخرج عند ذالک المسلمون من أصحاب رسول الله ﷺ" (البدایة والنهایة ۶۶/۳)" قال النجاشي للمسلمین: اذهبوا فأنتم سیوم في الأرض الیوم الأمنون في الأرض "(البدایة ۷۲/۳)۔

۲- "وإن کان الإمام للکفر والخوف للمسلمین علی الإطلاق فهي دار الحرب" (بدائع الصنائع ۱۳۱/۷)۔

۳- مثلاً دار الاسلام مسلمانوں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور کافر ذمیوں کو خوف لاحق ہے نقض عہد ذمہ کی قید کے ساتھ، یا مثلاً کافر مستامن کو خوف لاحق ہے دار الاسلام میں اسلام لاکر مرتد ہوجانے کی قید کے ساتھ۔ "إذا نقض الذمي العهد فهو بمنزلة المرتد معناه في الحکم بموته باللحاق لأنه التحق بالأموات" (ہدایہ ۵۷۸/۱)، "من ارتد والعیاذ بالله عرض علیه الإسلام وکشفت شبهه فان استمهل حبس ثلاثة أیام فإن تاب فیها وإلا قتل" (شرح الوقایہ ۳۷۵/۲)۔

(۴)"أمان للكفرة" (۱)"علی الإطلاق وخوف للمسلمين مقيد بقيود"(۵)"أمان للمسلمين"(۲) "مقيد بقيود والخوف للكفرة مقيد بقيود"(۶)"أمان للمسلمين مقيد" (۳)"بقيود والخوف للكفرة علی الاطلاق" (۷)"أمان للكفرة" (۴)"مقيد بقيود وخوف للمسلمين علی الاطلاق" (۸)"أمان للكفرة"(۵)"مقيد بقيود وخوف للمسلمين مقيد بقيود"۔

اس لیے معلوم ہوا کہ ملک العلماء نے یہ کوئی جامع ومانع تعریف نہیں فرمائی ہے کہ اس پر ہی مدار رکھ دیا جائے، بلکہ یہ بطور تمثیل کے بیان فرما دیا ہے، اسی طرح اس عبارت سے امن وخوف کا مدار بھی کسی مذہب پر نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اختلاف دار کا مدار مذہب پر ضرور معلوم ہوتا ہے، اس لیے علامہ کاسانی کی اس عبارت کے تحت امن وخوف پر اختلاف دار کا مدار رکھ کر سوال میں درج شدہ تفریع مشکل ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتی، نیز التزام مالا یلزم کا لزوم بھی نظر نہیں آتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم:

ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کے مستقل باشندے ہیں، سیکڑوں سال تک یہاں حکمراں رہے۔ اب اگرچہ حکمراں نہیں ہیں، مگر قانون اور دستور ہند

۱- (مثلاً دار الکفر کافروں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور مسلم مستامن کے لیے نقض عہد امان اور غدر وخیانت کی قید کے ساتھ خوف کی جگہ ہے۔"إذا دخل دار الحرب بامان مسلم تاجر يحرم عليه أن يتعرض بشئي من أموالهم ودمائهم إلا إذا غدر به ملكهم الخ"(فتاوی عالمگیری ۲/ ۲۳۲)۔

۲- (مثلاً دار الاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ذمیوں کو نقض عہد ذمہ کی قید کے ساتھ خوف لاحق ہے) "من ارتد والعياذ بالله عرض عليه الاسلام الخ فان تاب فيها وإلا قتل"(شرح الوقایہ ۲/ ۳۷۵)۔

۳- مثلاً دار الاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ایسے کافر کو جو نہ معاہد ہو نہ ذمی نہ مستامن مطلقاً خوف لاحق ہے)"من ارتد والعياذ بالله عرض عليه الإسلام الخ فان تاب فيها وإلا قتل"(شرح الوقایہ ۳/ ۳۷۵) "إن كان الأمان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الإطلاق فهي دار الاسلام"(بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۴- (مثلاً دار الحرب میں ذمی کافر بقید امان داخل ہو اور مسلمان بغیر امان کے تو ذمی کافروں کو ایک قید کے ساتھ امان حاصل ہے اور مسلمان کو علی الاطلاق خوف لاحق ہے) "دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان الخ"(فتح القدیر ۴/ ۳۱۶)"وإن كان فيها الخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفر"(بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۵- (مثلاً دار الحرب میں ذمی کافر اور مسلمان بقید امان داخل ہو)"دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان)۔

نیز حقیقت واقعہ کے لحاظ سے وہ ملک کے حصہ دار ہیں اوران کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو دوسرے فرقوں کو حاصل ہیں، یہاں ان کے اوقاف ہیں، ان کے مدر سے ہیں، عبادت گاہیں ہیں وغیرہ وغیرہ!

لیکن اس بارے میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں مشترک ہیں کہ ایسا اقتدار جس کے ذریعے مسلمان کوئی قانون تنہا اپنی رائے اور صوابدید اور اپنے مذہبی رجحانات کے بموجب بناسکیں اور اس کو نافذ کرسکیں نہ افریقہ کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو، مالی اور اقتصادی لحاظ سے وہ ایسے نظام میں جکڑ بند ہیں جس کی بنیاد اگر چہ سود پر نہیں ہے مگر اس کا پھیلاؤ اور اس کی تمام ترقی سود پر موقوف ہے، ممکن ہے مسلمان سود لینے سے احتیاط کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ سود ادا کرنے سے محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ جو مختلف ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس لئے مقرر کیے گئے ہیں کہ ان قرضوں کا سود ادا کیا جاسکے جو ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کے سلسلے میں لیے گئے ہیں۔

جن مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لازم نہیں ہوتا ان کو بھی سود کی ادائیگی میں شرکت کرنی پڑتی ہے، کیونکہ وہ گرانی ان کو لامحالہ برداشت کرنی پڑتی ہے جو ٹیکسوں کے اضافہ کے باعث کردی جاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے ایک ضرر اس کو لامحالہ برداشت کرنا پڑتا ہے، انفرادی کاروبار کی اگر چہ ممانعت نہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ ترقی کے امکانات انفرادی کاروبار میں ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ترقیات کے منصوبے جو ہر طرح کے کاروبار حتیٰ کہ زراعت پر بھی حاوی کیے جارہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ تمام کاروبار اجتماعی نوعیت اختیار کریں، یعنی سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور ان کے ذریعے کام کیا جائے جن کا نمونہ افریقہ اور یورپ کے ممالک میں اس وقت پایا جارہا ہے، حکومت اس طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، چنانچہ ان سوسائٹیوں کو قرض دیا جاتا ہے جس کا سود ان کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اضافہ آبادی، بودوباش کے سلسلے میں بھی مشکلات پیدا کررہا ہے، اپنے ذاتی مکانات تنگ ہوتے جارہے ہیں، دوسری جانب نہ صرف یہ کہ کرایہ بڑھ رہا ہے بلکہ ''پگڑی'' کی وبا نے غیر معمولی مشکلات پیدا کردی ہیں، اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہوگیا ہے، حکومت اس پیچیدگی کو اس طرح ختم کررہی ہے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں قرض دیتی ہے مگر سود اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں اگر مسلمان سوسائٹی قائم کریں یا کسی قائم شدہ سوسائٹی میں شرکت کریں، تو کیا ان کے لیے جائز ہوگا کہ برادران وطن کی طرح وہ بھی حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ترقیاتی منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور اپنی سوسائٹیاں اس طرح پر قائم کرنی چاہیے کہ ان میں سود اور سودی لین دین سے حفاظت رہے۔ مثلاً شرکت اور مضاربت کے اصول پر قائم کریں اور قوانین اس طرح وضع کریں جو حدود شرع میں رہیں۔ قانون کے جس موڑ پر شرعی حیثیت سے شبہ ہو معاملہ فہم مفتیوں اور علماء سے رجوع کر کے اصلاح کرلیا کریں۔

اسی طرح قائم شدہ سوسائٹیوں میں بھی شرکت کر سکتے ہیں، بڑی بڑی کمپنیوں اور فیکٹریوں میں جس طرح شیئرز (حصہ) خرید کر شرکت درست ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی درست ہو سکتی ہے۔ ہر عقد شرکت کی صحت کے لیے تمام شرکاء کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ بعض عقد شرکت میں صرف معاملہ صاف و جائز ہونا شرط ہے، جیسے شرکت عنان اور شرکتیں عموماً اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا شرعی حکم:

حکومت ہذا نے عوام کی بے روزگاری دور کرنے، ان کی بحالی اور ترقی کے لیے ایک محکمہ قائم کیا ہے، جس کے ذریعہ سے صنعتی کارخانہ قائم کرنے والوں کو، صنعت وحرفت اختیار کرنے والوں کو یا جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صنعت وحرفت کو فروغ دینے اور چلانے سے عاجز رہتے ہیں اور ان لوگوں کو جن کے پاس مکان نہیں، مکان بنانے کے لیے، اور کھیتی کرنے والوں کو کھیتی میں ترقی کے لیے نقد روپیہ دیتی ہے اور بہت کم شرح کے ساتھ کچھ زیادہ کر کے واپس لیتی ہے اور واپسی کی مدت بھی بہت لمبی دیتی ہے اور زائد رقم سے اس محکمہ کا نظم درست رکھتی ہے اور جو رقم اس محکمہ کے خرچے سے بچ جاتی ہے اس کو پھر اس قسم کے کاموں میں خرچ کرتی ہے، حکومت کا مقصد اس سے اپنی تجارت یا سرمایہ داری نہیں ہوتا ہے، محض قوم کی بھلائی اور ترقی مقصود ہوتی ہے، کبھی نقد روپیہ کے ساتھ یا بغیر نقد روپیہ کے محض سامان تجارت وحرفت اور آلات زراعت بھی سرکاری نرخ پر بازاری نرخ سے بہت ارزاں ادھار دیتی ہے، جیسے فیکٹریوں کے لئے مشین یا دیگر سامان یا انجن یا ٹریکٹر، کھاد، بیج اور آب پاشی کے لیے ٹیوب ویل اور دیگر سامان تجارت وصنعت اور اس کی قیمت مختلف قسطوں پر وصول کرتی ہے، بلکہ بعض بعض لوگوں کو کچھ روپیہ یا سامان مشینری وغیرہ مفت دیتی ہے اور کچھ مذکورہ رعایت وتفصیل کے ساتھ دیتی ہے، اس

مفت لینے اور دینے کے لیے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، اسی قاعدہ میں جو لوگ مستحق ہوتے ہیں صرف ان کو دیتی ہے۔ اور اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کچھ انسپکٹران (اور ماہرین فن) ماہرین صنعت وحرفت بھی مقرر ہوتے ہیں، جو لوگوں کو طریقۂ استعمال بتاتے ہیں، مفید مشوروں کے ذریعہ ہدایت ورہبری بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں اور بسا اوقات اپنی نگرانی میں ان سامانوں کا استعمال بھی کراتے ہیں تا کہ سامان ضائع نہ ہو اور لوگوں کو اس کا ہنر بھی اچھی طرح آجائے۔ اور مقررہ قسطوں کی وصولی میں آسانی بھی ہو۔ اور قسطوں کی وصولی کے لیے بھی ضابطے مقرر کیے ہیں مثلاً روپیہ یا سامان دیتے وقت کچھ ضمانت لیتی ہے اور وقت پر قسط ادا نہ ہو تو مہلت بھی دیتی ہے، لیکن کچھ زائد رقم بڑھا کر وصول کرتی ہے، اس کی ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس حد کے گذرنے پر حکومت سختی بھی کرتی ہے، بسا اوقات عدم ادائیگی کی صورت میں ضمانتیں ضبط ہوجاتی ہیں، سب کارخانے وغیرہ بلکہ اس کے ذاتی مکان وغیرہ ساری ملکیت بھی ضبط ونیلام ہوجاتی ہے، اور بعض مرتبہ جیل خانہ بھی جانا ہوتا ہے۔

(۱) اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی امداد لینا اور ایسا سامان ادھار خریدنا جس میں یہ سب خطرات بھی ہیں اور جس میں اپنے لیے ہوئے روپیہ سے زائد روپیہ واپس کرنا ہوتا ہے یا مقررہ قسط سے زیادہ دینے کا بھی ہر وقت احتمال رہتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

زائد دینا سود تو نہیں ہوگا؟ بعض علماء اس کو سود اور ناجائز کہتے ہیں اور بعض علما ٹیکس میں داخل کر کے جائز کہتے ہیں، بعض اس کو امداد باہمی کا ایک طریقہ کہہ کر جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو تجارت کا ایک طریقہ کہتے ہیں اور اس کو تجارت کا نفع قرار دے کر جائز کہتے ہیں۔ امید کہ مفصل جواب دے کر مطمئن کریں گے۔

واضح رہے کہ اگر مسلمان اس قسم کی امداد نہ لے تو بسا اوقات اپنی کھیتی باڑی اور صنعت وحرفت وتجارت کو باقی نہیں رکھ سکتا، اور بہت سے غریب جو بے گھر اور بے روزگار ہیں اپنا روزگار قائم نہیں کر سکتے، اپنا گھر نہیں بنا سکتے، بے روزگار، بے گھر ہی رہ جائیں گے، اپنے معاش بھی نہ چلا سکیں گے تو کیا ناجائز ہونے کی شکل میں ان کے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہ طریقہ ناجائز ہو اور یہ دینا سود ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں اس میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو کیا ہوگا؟

(۳) اگر یہی معاملات کسی ایسے ملک میں ہوں جن میں مسلم اکثریت ہو اور اقتدار اہلِ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس وقت سود یا سودی کاروبار سے متعلق کوئی اور تفصیلی کلام کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ سود اور سودی کاروبار کی حرمت میں آیات قرآنیہ، احادیث صحیحہ وصریحہ اس قدر کثرت سے اور اس طرح ترہیبی انداز میں موجود ہیں کہ سود کا شرعی مفہوم صادق آجانے کے بعد اس کے جواز واباحت کی طرف جانے کی جرأت ذرا بھی نہیں ہوسکتی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت ربوا پورے قرآن میں زیادہ خوفناک آیت ہے: **"كان أبوحنيفة رضي الله عنه يقول: هي (يآيها الذين امنوا لاتآكلوا الربا أضعافا مضاعفة) الخ الأية، أخوف آية القرآن، أو عد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين إن لم يتقوه في اجتناب محارمه الخ"** (۱)۔

نیز جس وقت سود (ربوا) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ سقیم وخطرناک وقابل رحم تھے، پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ اباحت وجواز کی طرف نہیں دیا گیا، اس لئے جتنی صورتیں لوگ سود کی وجہ جواز کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ان میں سے کوئی ایک بھی کافی نہیں، اور نہ مبیح ربوا ہوسکتی ہے،لہٰذا اس رخ کی طرف کلام کی کوئی حاجت نہیں اور اضطرار ومجبوری میں فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے جو کچھ تغیر احکام کا شبہ ہوتا ہے، اس کا حاصل ومقصود سود و ربوا کو مباح وحلال قرار دینا نہیں ہے، بیش از بیش مواخذہ آخرت سے برأت وسبکدوشی وحفاظت ہے، جیسا کہ عنقریب احقر کے کلام سے بھی معلوم ہوگا۔

البتہ چونکہ ربوا (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین ومنضبط ہے، کسی فرد یا جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دید ینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگا دینا ضروری نہیں ہے، جیسے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کہ رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دید ینے سے وہ سود کے حکم سے خارج نہیں ہوجائے گا، اس لیے یہ شق کلام کی باقی رہ گئی کہ آیا یہ نو پید امعاملات جس میں حکومت وقت قرض کے طور پر عوام کو ان کی ترقی وبہبود کے لیے کچھ سامان یا آلات واسباب کھیتی کرنے کے یا آبپاشی کرنے کے، یا کسی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے یا بڑھانے کے لیے (جیسے مشین، انجن، ٹریکٹر یا اس کے اور آلات واسباب بیج، کھاد وغیرہ) ادھار سستے سے سستے داموں پر دیکر کے اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے مختلف قسطیں مقرر کردیتی ہے اور قسطوں کے معینہ مدت پر وصول نہ ہونے سے اس قسط کو کچھ بڑھا کر وصول کرتی ہے اور کبھی ان سامانوں کے ساتھ ان سے کام لینے

۱- مدارک ۱/۱۴۱ب

کے لیے کچھ نقد روپیہ بھی دیتی ہے اور کبھی ان ہی عوام کی ترقی و بہبود کے لیے محض نقد روپیہ دے کر پھر اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے تو آیا اس پر سود کی شرعی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں، اور سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معاملہ شرعاً ربوا ہے یا اس کی حقیقت شرعیہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے یا ہے۔ اس وقت یہی پیش نظر ہے اور اس کے متعلق حکم شرعی مختصر لفظوں میں واضح کرنا مقصود ہے۔

سوالنامہ میں تصریح ہے کہ اس قسم کے اعانت کے طریقوں سے افراد اور ملک کی ترقی اور انہیں زوال سے محفوظ رکھنا اور ان کی بعض پریشانی دور کرنا حکومت کا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض مرتبہ بعض حصہ قرض یا بعض حصہ سامان کے مفت چھوڑ دینے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے، جس کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ان طریقوں سے نفع خیزی یا زر اندوزی یا کوئی سودی کاروبار کرنا حکومتوں کا مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر سود کے نام سے لی ہوئی جزوی رقم اول تو عام رقم سود سے بہت تھوڑی ہوتی ہے، پھر اس سلسلہ کے اخراجات کے پورے کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے تو اس کو اسی قسم کے اعانتی کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے، **كما هو مصرح في السوال**، تو مطابق قاعدہ مسلمہ فقہیہ: **"الأمور بمقاصدها وفيها بيان ان الشئي الواحد يتصف بالحل والحرمة باعتبار ما قصد له"**(۱)۔

سوالنامہ کی تصریحات کے بموجب اس زائد رقم کو جو قرضہ کے سلسلے میں وصول کی جاتی ہے، ٹیکس قرار دینا جیسا کہ بعض لوگوں کی تحریر سے اخذ کیا گیا ہے صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ٹیکس محض قرضہ دینے پر نہیں لیا جاتا بلکہ انسان کی آمدنی اور کاروبار میں اس وقت لاگو اور عائد ہوتا ہے جب کہ اس کی معتد بہ مقدار جو حکومت کے قانون میں مصرح ہوتی ہے، موجود ہو کر ایک سال بھی گذر چکا ہوتا ہے، یہاں پر ایسا نہیں ہے اور یہ فرق بدیہی ہے، البتہ اس قسم کے معاملات کی احتیاج اور اس کی ضرورتیں چونکہ عام ہوتی جا رہی ہیں، بلکہ عموم کا ایک درجہ اختیار کر چکی ہیں جیسا کہ سوالنامہ میں پیش کردہ حالات نیز روزمرہ پیش آمدہ واقعات جو بشکل استفتا تحریری و زبانی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، اس لیے ضرورت داعی ہے کہ اگر کوئی توجیہ و تاویل معاملہ کے حدود شرع میں لانے کی ہو سکتی ہو تو حفظاً للعوام تلاش کرنی چاہیے۔ **كما سيجي، استحسانه**۔

پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے، حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں، ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ

۱- قاعدہ ثانیہ فی الاشباہ والنظائر۔

صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی ومشترک نظام کی صورت ونوعیت ہے، کوئی سودی کاروبار نہیں ہے بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے اس کے منتظمین وکارکنان قوم کے اجیر ووکیل ہوسکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پس ماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لیے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا انتظام کہا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار وحکمہ میں نفع وسہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سود تو نام ہے اس نفع اور زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو، اور عوض سے خالی ہو۔ **كما صرح به الفقهاء: "الربوا هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقدين في المعاوضة" هذا التعريف يستفاد من الشامي من باب الربوا (۴۰۰/۷)۔**

غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کہا جا سکتا ہے، اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگرچہ سود کے نام پر دیتی ہے، مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں(۱)۔

نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے، فیس کو اجرت کتابت اور اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ تھانوی امداد الفتاوی میں ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں: البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت اور روانگی فارم کہا جاوے، اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہوجائے گی مگر کراہت سفتجہ باقی رہے گی۔

أيضاً ثم قال في مقام آخر: اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تفاضل کا ختم ہوگیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی وهو المراد، پھر اسی امداد الفتاوی، (۱۰۸/۳) میں فرماتے ہیں: البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت وروانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو رفع کیا جا سکتا ہے، لیکن کراہت سفتجہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی، گو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الی قولہ) حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں، تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا (ثم قال فیہ ۱۰۸/۳): منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے: ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دیجاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ دینا مناسب ہے (انتہی بلفظہ) امداد الفتاوی کی ان مجموعی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے

۱- کمافی امداد الفتاوی ۱۲۳ تا ۱۲۵/ ۳ جدید ایڈیشن مطبوعہ پاکستان۔

معاملات میں جب ابتلاء عام ہوجائے یا ضرورت صحیح داعی ہوجائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے مھما امکن توجیہ جواز تلاش کرنا امر مستحسن ہے، نیز عالمگیری کتاب الحیل کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے:

"وکل حیلة یحتال بها الرجل لیتخلص بها عن حرام أو لیتوصل بها إلی حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحیل قول الله عزوجل:" وخذ بیدک ضغثا فاضرب به ولا تحنث" وهذا تعلیم المخرج لأیوب النبي علیه وعلی نبینا الصلاة و السلام (الی قوله) وعامة المشائخ علی أن حکمها لیس بمنسوخ وهو الصحیح من المذهب کذا في الذخیرة" (۱)۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل وتوجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوالنامہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود مترشح ضرور ہوتا ہے، اس لیے یہ توضیح مستحسن بھی ہوسکتی ہے، خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو، وہاں یہ توجیہ اور بھی آسان ہوگی۔ **علی ما فصل المحققون من الفقهاء بالتفصیل التام۔**

چند شبہات اور ان کا ازالہ:

اول یہ کہ ان تاویلات کا معاملات متعاقدہ سے کیا تعلق ہے؟ اگر یہ تاویلیں کی گئیں تو منی آرڈر وغیرہ معاملات میں کی گئی ہیں اس معاملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جواب: یہ بات محض درجۂ نظیر میں یہاں پیش ہے کہ بحوائے آیات: **"یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" الآیة "لا یکلف الله نفسا إلا وسعها"** اور **"الدین یسر"** کے ہمارے فقہاء کرام ومشائخ عظام نے اس قسم کے نوپید مسائل میں جن میں عام ابتلاء ہوا ہے، حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع سے کام لیا ہے اور قوم کو تنگی میں پڑنے سے بچایا ہے، اس ذوق کے ماتحت مسئلہ مجوث عنہا میں بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع تلاش کرنا منشاء شرع وشارع کے خلاف نہ ہوگا، فقط اسی استدلال کے پیش نظر بطور نظیر یہ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ورنہ یہ تمثیل نہیں کہ باعث اشکال یا اعتراض ہو۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تاویلات وتوجیہات ارباب حکومت یا اس شعبہ کے اصحاب حل وعقد کے پیش نظر نہیں اور نہ وہ اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں تو پھر یہ توجیہات وتاویلات کس طرح مؤثر اور مفید ہوسکتی ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی اشکالات پراویڈنٹ فنڈ اور منی آرڈر کی تاویلات میں بھی وارد ہوتے ہیں اور باوجود اس کے علماء ان کو صحیح اور معتبر تسلیم کرتے ہیں، کما أشرت الیه سابقا پس اسی طرح یہاں بھی معتبر ومفید کہا جاسکتا ہے، چونکہ

۱- الفتاویٰ العالمگیریہ کتاب الحیل ۶/ ۳۹۰۔

معاملہ اصول ربو یہ کا اور حرمت و اباحت کے مقابل کا ہے، اس لئے اکابر امت وعلماء فحول بطور خود بھی غور فرمالیں۔

اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ معتبرہ واقع میں متحقق ہے جب تو اس توجیہ میں کوئی کلام ہی نہیں وھوالمراد۔

اور اگر ایسا نہ ہو جب بھی اگر چہ اس قسم کے نفس معاملہ کو نا جائز کہا جائے اور نفس معاملہ کرنا گو گناہ ہو مگر مجبوری اور حاجت شدیدہ کے وقت جب کوئی دوسرا ذریعہ معاش معیشت سنبھالنے کا اور ضرورت رفع کرنے کا نہ رہے، یا متعذر ہو جائے تو اس وقت اس قسم کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ الاشباہ والنظائر اور حموی کی اس تشریح کے مطابق رہے گی: **كما قال: القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، وفي القاعدة السادسة من الحاشية ١١٥: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح انتهى وأيضاً يعلم مما تحته في الحموي وكذلك نحوه أن يقرض عشرة دنانير مثلاً ويجعل يربيها شيئا معلوما في كل يوم ربحاً** اھ۔

اس صورت میں اقتدار اہل مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ ہی ہو، کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس تمہید کے بعد اب تحریر کردہ ہر سہ سوالات کے جوابات نمبر وار درج ہیں:

(۱-۲) اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی وہ یہ کہ اگر محض نقد روپیہ بطور قرض لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی لیا جائے، مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے زائد ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم یافتنی سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف: **هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقدين في عقود المعاوضة** (۱) صادق آجائے گی، مقدار نفع کم ہو یا زیادہ اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض کا ہوگا، اس لئے وہ نفع سود ہی ہوگا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہے جو اس جزئیہ: "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔

البتہ جو رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لیے امانت میں داخل کر کے اس پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی

۱- الدر المختار ۷/ ۴۰۰۔

۲- الاشباہ ۱۱۵۔

فیس میں داخل کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

اسی طرح مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپے کنویں بنوانے کے لئے نقد لئے، محکمہ پروجیکٹ نے اپنے قاعدہ کے ماتحت ایک ہزار نقد بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا، کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ، **فضل خال عن العوض** الخ یا "**کل قرض جر نفعا**" وغیرہ ربوٰ کی تعریف صادق آسکے۔

اسی طرح محکمہ اعانت وترقی میں مشین لگانے کے لیے، فیکٹری قائم کرنے کے لئے یا کوئی صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست کی، محکمہ نے اپنے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے مناسب حال نقد روپے دیئے اور سامان خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس شعبہ سے جو سامان درکار ہو خریدلو، اس دوسرے محکمہ نے ارزاں قیمتوں پر بااقساط وصولی کے ساتھ سامان دیدیا یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا محکمہ ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپے قرض کے نام پر دیتا رہا اور اس لینے دینے میں دیئے ہوئے روپیے سے کچھ زائد وصول کیا تو یہ زیادتی بھی سود نہ کہلائے گی، بلکہ انتظام کے درست وصحیح رکھنے کی فیس کہی جا سکے گی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا۔

اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح تاویل ملتی رہے گی، ربوا، سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان وآلات ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ قسطوں کے مطابق وصول ہو جائے تو اس میں کوئی شبہ کسی کو نہیں۔

اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط کے یا تمام قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جا سکتا ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں۔

فقہاء محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلاء کے کوئی توجیہ وتاویل کر کے حد جواز میں داخل کرنے کا توسع کیا جائے، جیسا کہ اوپر کی پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ کی اس پر شاہد ہیں، لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائے گی پر قدرت نہیں ہوتی، بڑی خطرناک اور

مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات مذکور بھی ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ میں بھی ہیں، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات سے پرہیز رکھنا ہی ضروری ہے، بغیر کسی شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب اور پرہیز کا حتی المقدور ضروری ہونا ظاہر ہی ہے۔

(۳) اگر یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے جب تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور یہ تحقیق وتفصیل صحیح ومعتبر نہ ہوئی تو بھی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، اصل جواب میں جو (۱، و ۲) میں مذکور ہے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا کہ جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے ربوا کا نام بھی نہ آئے اور اگر وہ اعلیٰ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتیٰ کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں، ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اسکے رواج دینے میں کوشش کرتے رہنا ضروری ہوگا۔ **هذا ماظهر لي الآن في هذا المقام مرتجلاً بتوفيق الله تعالىٰ وعليه التكلان** ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۴/ ۱۱/ ۸۸ ۱۳ھ

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینا (۱):

کیا حکومت سے ایسے بڑے اخراجات کو جو معاشی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں، حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جاسکتا ہے:

(۱) قرض، اس میں چھوٹی بچتوں کی اسکیم، بینکوں سے قرض، لمبی مدت کے داخلی قرض، ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

(۲) غیر ممالک سے قرض۔

(۳) خسارے کی مالیات۔

۱- گذشتہ سوال کا ضمیمہ۔

عنوانات سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

قرض لینے میں نفع اندوزی کا عنصر۔

خسارے کی مالیات۔

افراد کو حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے قرض۔

افراد کو دیئے جانے والے قرضوں کی قسمیں۔

حکومت کے ملازمین کو قرض۔

امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض۔

مالیاتی ادارے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوالنامہ مع ضمیمہ بغور پڑھا، سوالنامہ کا حاصل یہ ہے کہ حکومت وقت ترقیاتی اسکیم کے تحت جو رقم قرض کے نام پر اپنی رعایا کو دیتی ہے، اس پر زائد رقم یا نفع اتنا کم لیتی ہے جو لاگت کے برابر ہوتا ہے، بسا اوقات حکومت کو اس میں خسارہ ہی برداشت کرنا ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی زرکشی یا زراندوزی یا ذخیرہ خیزی وغیرہ جو عام طور سے مہاجنوں کے یا سودی کاروبار کرنے والوں کے پیش نظر ہوتی ہے نہیں ہوتی، اس لیے یہ قرض سودی نہ ہوگا، اور مسلمانوں کو بھی اس کا لینا درست ہونا چاہیے۔

اور اگر سود کا احتمال ہو تو ٹیکس شمار کر کے یا حکومت کے حقوق عام جو رعیت پر ہوتے ہیں، ان کے تحت لا کر یا کسی اور فقہی تاویل سے یہ قرض لینا اور ان اسکیموں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز و درست ہوسکتا ہے؟ تاکہ مسلمان بھی ان سے مستفید ہوکر اقتصادیات میں پیچھے نہ رہیں۔

سوالنامہ سے ان ہی امور کی شرعی تحقیق مقصود ہے کہ آیا واقعی ان امور کی گنجائش شرعاً ہے یا نہیں؟

اصل سوالنامہ کے اندر جواب طلب امور کا جہاں تک خاص تعلق ہے ان سب کا تقریباً مفصل جواب احقر کے ایک فتویٰ مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ میں آچکا ہے، جس کا حاصل بحذف تمہید و دلائل فقہیہ یہ ہے کہ سود (ربوا) کا ایک مفہوم شرعی ہے، جس کو حقیقت شرعیہ کہہ سکتے ہیں، اور اس کی حرمت متعدد آیات واحادیث میں نہایت شدومد سے مصرح ومنصوص ہے، اور

اس کے ارتکاب کرنے والوں پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں، اور یہ حرمت ایک ضابطہ وقانون کی شکل میں نازل ہوچکی ہے، اور یہ قانون (حرمت ربوا) اس بادشاہ کا قانون ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تمام قانون بنانے والے دماغوں کا بنانے والا ہے، تمام کائنات عالم کا تخلیق کرنے والا اور مالک ہے۔ اور تمام گذشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بھی تمام منافع ومضار ہر پہلو وہر حیثیت سے اس کے سامنے ہمہ وقت مستحضر ہیں۔

دنیا کی کوئی حکومت یا قانون بنانے والی کوئی جماعت بڑے سے بڑا دماغ خواہ کتنا ہی مکمل ومنضبط اور اپنے خیال میں کتنا ہی جامع اور مانع قانون بنائے وہ اس احکم الحاکمین اور وحدہٗ لاشریک لہ کے بنائے ہوئے قانون جیسا مکمل ومدلل وجامع ومانع ونافع نہیں ہوسکتا۔

جب اس نے یہ مکمل قانون (ربوا کی حرمت مطلقہ کا) بنا کر دنیا کو اس کے خلاف نہ کرنے کا حکم قطعی دیدیا، اور ایسے وقت میں اس کو نافذ بھی کردیا کہ وہ وقت آج کے وقت سے کہیں زیادہ سخت اور قابل لحاظ ورعایت تھا، اور اس کی حرمت بھی ساتھ ساتھ اور کھلے لفظوں میں بیان کردی، بلکہ جاہلیت (زمانہ پیشین) کے جتنے ربوا تھے سب کو یک لخت ختم بلسیا منسیا کردیا، اور دنیا نے اس قانون کا امتثال کرکے اور بار بار اس کا تجربہ کرکے منافع بھی دیکھ لیا تو اب اس قانون کے مطابق سود (ربوا) کا مفہوم جب کسی معاملہ پر صادق آجائے گا تو اس کو کسی طرح بھی جائز یا مباح نہیں کہا جائے گا اور بالکل اسی طرح جب تک کسی معاملہ پر ربوا (سود) کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے گی محض لوگوں کے ربوا کا نام اس پر رکھ دینے سے کبھی اس کو حرام وناجائز یا ربوا نہ کہا جائے گا۔

بس اس قاعدہ کے مطابق اس زائد رقم یا نفع کی تقریباً ہر شق کا جواب تفصیل کے ساتھ احقر کے سابق جواب (مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ھ) میں آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمہید ودلائل فقہیہ کو حذف کرکے صرف اس زائد رقم کا تفصیلی حکم یہاں لاحق کردیا جائے۔ پھر ضمیمہ کا جواب لکھا جائے۔ البتہ اصل سوالنامہ میں جو بعض زائد باتیں ہیں، ان کے جواب کا یہاں اضافہ بھی کردیا جائے، تاکہ بات ہر پہلو سے مکمل ہوکر سامنے آجائے اور جن صاحب کو مزید دلائل وغیرہ دیکھنا ہوں وہ اس اصل جواب کو بھی دیکھ لیں۔ اس تمہید کے بعد اس زائد رقم کا تفصیلی حکم پیش ہے:

اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی۔ لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی اور وہ یہ ہے:

الف: اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ نقد

بھی لیا جائے مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا اور واپسی کی کل رقم یا فنتی رقم سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف "**هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين**" صادق آجائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اورعوض معاوضہ کا ہے، اس کے لیے وہ نفع کم ہو یا زیادہ وہ سود ہی ہوگا "**كل قرض جر نفعاً فهو ربوا**" بھی صادق آجائے گا، اس لیے حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا جو اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے: "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**"(۱) اسی قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لے لینے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

ب: جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی، اور اس کو کام چلانے کے لیے امانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا، اور اس پہ معاملہ جائز رہے گا۔

ج: مثلاً کسی نے محکمہ ترقیات کے شعبہ سے چار ہزار روپے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے کے لیے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لیے نقد لیے اور محکمہ ترقیات نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کر دیئے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا۔ پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل قرضہ) سے زائد نہ ہوئی تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ جائز رہے گا، چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ سود کی تعریف "**هو فضل خال عن العوض الخ** نیز **كل قرض جر نفعاً الخ**" صادق آسکے۔

د: مثلاً محکمہ امانت وترقی میں مشین (ٹیوب ویل) لگانے کے لیے یا فیکٹری قائم کرنے کے لیے یا کوئی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لیے سامان لینے کی درخواست دی، محکمہ نے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے لیے اس کے مناسب حال نقد روپے اور سامان لینے یا خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس فلاں (دفتر یا شعبہ) سے جو سامان درکار ہو خریدلو، یا لیتے رہو، اور اس دوسرے شعبہ یا دفتر نے ارزاں قیمت پر باقساط وصول کیے اور شرط کے ساتھ ساتھ سامان دیدیا، یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا شعبہ (محکمہ کا) ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپے

۱- الاشباہ والنظائر/ص ۱۱۵۔

قرض کے نام پر دیتا رہا، اور اس لینے دینے میں محکمہ نے اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرتے ہوئے اپنے دیئے ہوئے روپے سے کچھ زائد وصول کرلیا ہے تو اس زیادتی کا سود ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ انتظام درست رکھنے کی فیس بھی کہا جا سکے گا، اور یہ معاملہ بھی جائز رہ سکے گا۔

ھ: اسی طرح حکومت کے کسی اعانتی محکمہ سے کھاد یا بیج وغیرہ ادھار لیا، محکمہ نے ۶/ماہ میں ہر ماہ دس روپیہ کے حساب سے کل ۶۰/روپیہ وصول کیے اور اپنے رجسٹر میں ازخود اصل قیمت کے خانہ میں بچاس روپئے درج کیے اور دس روپے خانہ سود یا نفع میں درج کیے تو اس دس روپے کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ جزو ثمن قرار پا سکتا ہے، اس لیے کہ سود نام ہے فضل خال عن العوض کا جو اموال ربویہ کے اندر عقد معاوضہ کا معاملہ کرنے میں مشروط طریقہ پر طرفین متعین کریں، اور یہاں ایسا نہیں ہوا ہے، خواہ مشتری کو اس اندراج کا علم ہوجائے یا نہ ہو، بالخصوص ایسے ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلمین کے ہاتھ میں ہو، مسلمانوں کو قانوناً ایسا معاملہ کرنے سے روکنے کا یا اس کے اصلاح کرنے کا اختیار نہ ہو، اور خاص کر جب مجموعہ وصولی کی مقدار عام بازار کے نرخ کے اعتبار سے غبن فاحش کی مقدار سے زائد نہ ہو۔

و: اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے ان اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود کو سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کہ کوئی صحیح فقہی تاویل ملتی رہے گی، اس کو سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان یا آلات وغیرہ ادھار دیکر اس کی قیمت مقرر متعدد قسطوں کے ذریعہ وصول ہو تو اس میں امید ہے کہ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

ز: اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد یا تمام اقساط کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کرکے جائز کہا جا سکے گا۔

بالخصوص جب ہندوستان جیسے ملکوں میں فقہائے محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلائے عام کے کوئی صورت توجیہ وتاویل کرکے حد جواز میں داخل کرلینے کی ہو تو داخل کرلینے کا توسع کیا جائے جیسا کہ تمہید میں پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاوی وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں۔ جیسے گائے بھینس وغیرہ کو چرائی پر دینے کا جزئیہ۔

لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی ثمن قسط پر قدرت نہیں ہوتی تو بڑی خطرناک مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جن سے عزت وآبرو وجان ومال سب خطرے میں پڑجاتے ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات خود

سوال میں بھی مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ ومشاہدہ میں بھی ہیں جس کا علم عام ہے، اور بعض مرتبہ محررین وکارکنان محکمہ کی بے اعتنائیوں وشرارتوں کی وجہ سے برآمدگی رقوم میں بے حد تعویقیں ودشواریاں پیش آجاتی ہیں، یا رشوت خوروں کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی نذر ہوجاتا ہے، اس لیے جہاں تک ہوسکے اس قسم کے معاملات میں پڑنے سے پرہیز ہی رکھنا ضروری ہے، بغیر شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔

اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے تب تو اس سے اجتناب وپرہیز کا حتی المقدور ہونا ظاہر ہی ہے، یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے یا غیر صحیح اس کا فیصلہ تو علمائے محققین اور مفتیانِ مدققین کریں گے، ان سب حضرات سے درخواست ہے کہ بہر نگ اصلاح یا بصورت تائید وتصویب مطلع فرمائیں، باقی اگر اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو، اس سے اس مسئلہ میں کچھ فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف اور واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا، جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے اس میں ربوا کا نام بھی نہ آنے پائے اور "**دعوا الربا والريبة**" کا پورا پورا مصداق ہو، اور اگر وہ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں گے ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرنا واجب رہے گا۔

نوٹ: سابق جواب یہاں تک ختم ہوگیا، اس کے بعد کا اس وقت کا اضافہ ہے جو سوالنامہ کے پیش نظر لکھا گیا۔

(۲) جس جس چیز پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے گا، اس کو والی یا حاکم کے حقوق خصوصی کی بنیاد پر مباح وجائز نہیں کہا جاسکتا، خاص کر جن جن چیزوں کا حکم نص میں جس طرح آجائے، اسی طرح اس کو رکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہی اصل دین ہے اور دین کے خلاف کسی کا بھی حکم ہو معتبر نہیں، **لقوله تعالىٰ:** "**ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه**" (۱)۔

اور اسی وجہ سے ایسی تمام چیزیں حکام وشاہان دنیا کی دسترس سے بلند وبالاتر ہوتی ہیں حتی کہ اگر کوئی امیر یا والی یا امام ان نصوص کے خلاف کوئی حکم کر بھی دے تو وہ مداخلت بے جا اور مداخلت فی الدین ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو اس کی موافقت یا اتباع درست ومباح نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی موافقت واتباع میں خالق کائنات ورب الارباب کی نافرمانی اور اس کی معصیت کا ارتکاب ہوگا اور یہ جائز نہیں، **لقوله عليه السلام:** "**لاطاعة لمخلوق في معصية**

۱- سورۂ آل عمران: ۸۵۔

المخالق" (۱) اور "**الضرورات تبیح المحظورات**(۲) میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے صرف وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی ہوں، کیفیت واضطرار اور مخمصہ کی جانب جیسا کہ اس جملہ سے بالکل متصل اگلی عبارت: "**ومن ثم جاز اکل المیتة عند المخمصة**" (۳) اس پر قرینہ ہے جس کو اسی قاعدہ کی وضاحت کے لیے مثال کے موقع پر خود مصنف (صاحب اشباہ ۱۱۵) نے ذکر فرمایا ہے اور "**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" **الخ**(۴) جو فرمایا گیا ہے اس کا مقصود سود کا جائز کہنا نہیں ہے بلکہ صرف گنجائش دینا ہے بایں معنیٰ کہ اس معذوری میں اس طرح قرض لے لینا جائز ہو جائے گا اور مواخذہ آخرت سے بری رہ سکے گا اور بس۔

(۳و۴) ان دونوں نمبروں کا جواب ابھی ا؎ میں تفصیل گذر چکا ہے، اس کے بعد ضمیمہ کا اصل جواب عرض ہے، ضمیمہ میں دو قسم کے قرضوں کا ذکر ہے:

پہلی قسم، حکومت کا خود دوسروں سے قرض لینا:

اندرون ملک کے باشندوں سے خواہ بیرون ملک سے پھر خواہ دوسری حکومتوں سے یا وہاں کے سرمایہ داروں سے اور پھر خواہ نفس حکومت کے استحکام وترقی پر خرچ کرنے کے لیے لیا جائے، خواہ اپنی رعیت کی فلاح وبہبود پر براہِ راست خرچ کرنے کے لیے لیا جائے۔

دوسری قسم، حکومت کا اپنی رعایا کو قرض دینا:

قسم اول پر کلام کرنے سے زیادہ مقدم واہم قسم ثانی پر کلام کرنا ہے، اس لیے کہ اسی کا تعلق مسلم عوام سے براہِ راست ہے اور انہی کے لیے شرعی راہ تلاش کرنا مقصودِ سوال ہے، علاوہ ازیں قسم ثانی پر کلام کرنے سے قسم اول کی بہت سی صورتوں کا حکم شرعی خود بخود بھی نکل آئے گا، قسم ثانی کی موٹی موٹی اور اصولی چھ صورتیں ضمیمہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ہر ایک پر بقدرِ ضرورت کلام کرکے اس کا حکمِ شرعی منقح کرنا مقصود ہے۔

۱-بچوں، بوڑھوں، معذوروں کو وظیفہ دینا، یہ صورت اگرچہ اب تک ہمارے ملک میں ظاہر نہیں ہے، لیکن اگر عام ہو جائے تو اس کے جواز میں کوئی خفا یا شبہ نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ خالص وظیفہ یا اعانت یا انعام ہوگا بخلاف اور صورتوں کے،

۱- مشکوۃ المصابیح کتاب الامارۃ والقضاء/ ۳۲۱۔

۲- الاشباہ والنظائر/ ۱۴۰۔

۳- الاشباہ والنظائر/ ۱۴۰۔

۴- الاشباہ والنظائر/ ۱۳۹۔

ان میں بسا اوقات تفتیش وتحقیق کا اور حکم شرع مستنبط کرنے کا احتیاج ہوگا، پس یہ صورتیں نیز (۲و۳و۵) کے اندر قرض کی قریب قریب تمام صورتوں کا حکم احقر کے سابق جواب میں آچکا ہے، اور بعض صورتیں جو رہ گئی ہیں ان کا حکم اس وقت ہر نمبر کے تحت بیان کردیا جائے گا۔

۲-اس تحریر کا مقصد اگر یہ ہے کہ فنڈ سے لیا ہوا قرض دراصل اسی ملازم کا روپیہ ہے اور اس کی واپسی میں جو رقم زائد سود کے نام پر دی جاتی ہے وہ بھی اصل اسی ملازم کو ختم ملازمت پر واپس دے دی جاتی ہے، اس لیے یہ قرض درحقیقت قرض اور یہ سود درحقیقت سود نہ ہوا، کیونکہ قرض تو وہ چیز ہوتی ہے جو دوسروں سے لی جائے۔ اور سود اس زیادتی کا نام ہے جو دوسروں کو دی جائے۔ تو یہ توجیہ وتاویل اور یہ مقصد صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ فنڈ کی اس رقم پر ابھی ملازم کی ملکیت ہی متحقق وثابت نہیں ہوئی ہے۔

اس لیے کہ ملازم کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے، اور فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا بلکہ محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے، اس وصول کے ہونے سے قبل ملک ملازم نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے اور فنڈ کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع ہوتا ہے وہ بھی جزء اجرت ہوتا ہے، اور اجرت پر جب تک اجیر کا قبضہ وتصرف نہ ہوجائے اس وقت تک اجیر کی اس پر ملکیت ثابت ومتحقق نہیں ہوتی بصرف استحقاق ملکیت فی الجملہ ہوتا ہے، اور یہ ثبوت ملک کے لیے کافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک فنڈ کی رقم وصول نہیں ہوجاتی اس پر زکوۃ وغیرہ واجب نہیں ہوتی، اور اسی وجہ سے محکمہ جو جزو اضافہ کرکے اور زائد کرکے دیتا ہے، اگرچہ سود کے نام پر دیتا ہے، اور اپنے فہم وخیال میں اس پر سود کا اطلاق کرتا ہے اس کو سود نہیں کہا جاتا بلکہ سب کو انعام شمار کیا جاتا ہے اور جائز کہا جاتا ہے۔ غرض وہ رقم ابھی دراصل محکمہ ہی کی ملکیت ہوتی ہے اور محکمہ کی ملک میں واپس جاتی ہے، اور جب قرض کے نام پر دی جاتی ہے تو قرض ہی شمار ہوگا اور جو نفع اس پر لیا دیا جائیگا وہ قرض پر ہی نفع لینا دینا شمار ہوگا جس کا سود ہونا ظاہر ہے، اور یہ نسبت کہ یہ فنڈ ملازم کا ہے یہ نسبت مجازی ہے، مآل کے اعتبار سے ہے، اور اگر تسلیم بھی کرلیں کہ وہ زائد رقم (نفع) پھر اسی ملازم کو واپس مل جاتی ہے جب بھی کچھ مفید نہیں، اولاً تو اس لیے کہ وہ رقم بہ شکل نقد ہوتی ہے، اور نقود میں قاعدہ شرعیہ مسلمہ عند الکل ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہوجاتا ہے، اور تبدل میں واپسی کہاں:۔ واپسی تو بعینہ اسی سابق شئے کی واپسی کا نام ہے اور پھر اگر اس واپسی کو بھی تسلیم کرلیں جب بھی مفید مدعا (عدم ربوا) نہیں ہوسکتی، اس لیے جب محکمہ اس کو سود قرار دے کر لیتا ہے اور سود ہی کے درجہ میں رکھ کر ملازم کو ختم ملازمت پر دیتا ہے، جیسا کہ سوال سے واضح ہے تو اس واپسی کو استرداد نہیں کہہ سکتے، کیونکہ استرداد میں سابق معاملہ کو فسخ کرنا اور اس کی حیثیت کو

مٹانا اور ختم کرنا منوی اور ملحوظ ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اور جب یہ واپسی استرداد نہیں ہوئی تو سود کی حقیقت وشناعت بھی ختم نہ ہوئی بلکہ قائم و متحقق رہی، لہٰذا یہ زائد رقم قرض کا نفع اور سود ہی کے حکم میں ہوگی اور بغیر حاجت واقعی ایسا قرض بھی لینا درست نہ ہوگا، ہاں اگر بغیر سودی قرض کے چارہ نہ ہو، اور محکمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے قرض لینے میں سود زیادہ دینا پڑے گا تو اس صورت میں اشد المفسدین سے بچنے کی نیت سے اس اخف المفسدین کو ہی گوارہ کیا جائے گا اور اس قرض کو دوسرے قرضوں پر ترجیح ہوگی، اور بقدر ضرورت وحاجت لے لینے کی گنجائش ہوگی۔

(۳) امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض:

ان سوسائٹیوں کو بھی حکومت ہی قائم کرتی ہے اور اپنی ہی دی ہوئی یا دلائی ہوئی رقم اشیاء سے امداد دلاتی ہے، اس لیے ان سوسائٹیوں سے ملی ہوئی امداد (نقد یا بشکل سامان یا دونوں جو بھی ہو) سب کا حکم اور اس پر وصول کردہ رقم بنام سود کا سود ہونا یا سود نہ ہونا ان سب کی تفصیل ہوگی جو اصل استفتاء مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ھ کے جواب میں گذر چکی ہے، بلکہ اگر ان سوسائٹیوں میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار کیا جائے تو اس کے نفع کا سود نہ ہونا اور زیادہ آسان اور نمایاں ہو جائے گا بلکہ اس میں شرکت کرنا اور حصہ لینا بھی درست ہوسکے گا۔

(۴) بالاقساط ادائیگی ثمن کے وعدہ پر خرید وفروخت کا طریقہ:

اس بیع کا حکم عام طور سے فقہاء متاخرین کے فتاویٰ میں بہ تفصیل موجود ہے، جیسے امداد الفتاویٰ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وصول اقساط کے سلسلہ میں کوئی قید عقد بیع کے منافی نہ ہو تو بے تکلف یہ بیع جائز رہے گی، اور اگر کوئی قید عقد بیع کے منافی بھی لگ جائے، لیکن ارکان بیع متحقق ہیں تو نفس معاملہ کرنے میں اگر چہ فساد آ جائے اور بیع فاسد کہی جائے، لیکن یہ بیع بالکل کالعدم اور باطل نہ کہی جائے گی بلکہ مشتری کے حق میں مفید ملک رہے گی اور اس خرید کردہ شیٔ سے جو انتفاع ہو جائے گا وہ حرام نہ رہے گا اور جو تصرف اس میں کیا جائے گا وہ نافذ وصحیح رہے گا اور ہندوستان جیسے ممالک میں ایسے توسعات کی گنجائش ملتی ہے، جیسا کہ ہم اپنے سابق اصل جواب میں مدلل طور پر بیان کر آئے ہیں۔

(۵) مالیاتی ادارے:

پہلے عموماً بینکوں میں محض نقد کا لین دین ہوتا تھا، اس لیے اس کے منافع کو علی الاطلاق ناجائز اور سود کہا جاتا تھا، لیکن اب بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر قائم ہوتے اور چلائے جاتے ہیں، اس لیے ان بینکوں میں شرکت کرنا یا ان سے لین دین کرنا جو شرکت یا مضاربت کے اصول کے مطابق ہونا جائز نہ ہوگا، اسی طرح ان کے منافع کا ہر حال میں سود

ہوا ضروری نہ ہوگا، بلکہ ان بینکوں کے اصول وضوابط اور ان کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ حکم ہوگا اور جائز بھی ہو سکے گا۔

اسی طرح ''انشورنس'' کی حقیقت ابتداءً سود وقمار میں منحصر تھی، لیکن اگر اس کے اصول وضوابط میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے (جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں) تو اس کی تفصیل سامنے آنے کے بعد اس کے مطابق بھی حکم شرعی منقح ہو سکے گا، بہر حال یہ مالیاتی ادارے بینک کی امداد سے قائم ہوئے ہوں یا ''انشورنس'' کی مدد سے یا کسی اور طرح سے قائم ہوئے ہوں ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسانوں کی زمینیں رہن رکھ کر ان کو جو امداد دی جاتی ہے، خواہ نقد سے بصورت قرض یا بصورت سامان یا آلات زراعت بیج، کھاد واشیاء سے ادھار فروخت کر کے، غرض ان سب صورتوں میں کون کون سی صورتیں اور کون کون سے معاملے شرعی اصول پر جائز ودرست ہیں، اور کون کون سے ناجائز اور نادرست ہیں۔ ان سب کی تفصیل بھی اصل سوال کے جواب میں گذر چکی ہے، وہاں مکمل دیکھ لیا جائے۔

(۱) بواسطہ بینک خرید وفروخت وکاروبار:

۱- اس طریقہ سے کاروبار کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

مالک از خود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ مالک بینک کے واسطہ سے مال خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم سے کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہوجاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب ودھوکہ کھانے یا ادھار معاملہ میں پڑ کر قیمت کے ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہوجاتے ہیں۔

۲- کبھی مالک مال از خود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گذر چکا ہے، اور خریدار اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

۳- کبھی خود حکومت دخیل ہو کر بائع ومشتری کے درمیان میں بینک کو قانوناً واسطہ بنادیتی ہے اور بینک کے ذریعے سے خرید وفروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

۴- کبھی بینک خود پیش کش کر کے یہ طریقہ کار جو نمبر ایک میں گذرا مالک مال سے اختیار کرالیتا ہے، کیونکہ اس طریقہ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵- کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے مگر کم، صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کر سکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ

سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶-انہیں مواقع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کر کے خریدار سے براہ راست یہ طریقہ کار اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے بھی بہت کم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں خریدار کو اگر چہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، مگر اس پر خرچ کا بار زائد ہو جاتا ہے نیز کچھ ذمہ داریاں وپریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں۔

ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بینک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں، یا بینک خود دخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے، اور ان کی ہدایات کے مطابق جو معاملہ چاہتا ہے اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرض دیدو بلکہ یہ صورت قریب ویسی ہی ہو جاتی ہے، جیسی صورت اصل پراویڈنٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیہ کے مثل خود اضافہ کرتا ہے، یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے، لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے، اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔ اور پانچویں وچھٹی صورت میں بھی جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے چھ مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

یہاں الف، ب، ج، د، و کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں:

الف: خریدار کا نقد سرمایہ بینک میں داخل وموجود ہے اور از خود مالک مال کی قیمت جمع کرا دیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، بلکہ اس جمع شدہ سرمایہ کو ادا کرنا محسوب کریں گے اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے، اور جو پیسے بینک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

ب: خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے، لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کر دے، تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا، اور یہ ظاہر ہے۔

ج: ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد بھی اگر بینک از خود قیمت جمع کر دے، لیکن خریدار سے کوئی

معاملہ نہ کرے، جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا، اور پھر اس پر بینک اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د- اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو، لیکن بینک مال کو اپنی قید اور نگرانی میں لے کر قیمت مالک مال کو جمع کردے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ ہونے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا اور جو پیسے بینک سے لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ھ- ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں (یا، الف، ب، ج، د، وغیرہ کی پانچ صورتیں ہوں) سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا جائے بااقساط یا بقسط واحد بینک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا وہ سود نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کی اجرت اور حق المؤنت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

و- البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے، مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کر دیا کروں گا تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے۔ پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دیئے ہوئے روپے سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا، وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لیے ہوئے کام نہ چلتا ہو، اور بینک کے علاوہ کہیں سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، الغرض اس جواب ضمیمہ میں جن جن صورتوں میں نفع کو سود کہا گیا ہے وہ شرعی مفہوم ومصداق کے اعتبار سے کہا گیا ہے، اس کی حرمت ہر ملک اور ہر زمانہ کے اعتبار سے علی الاطلاق ہے، اخیر ضمیمہ میں ان سرکاری قرضوں کو جن جن صورتوں میں بانٹا گیا ہے، ان میں سے کوئی صورت بھی ہو، جب اس پر سود کا شرعی مفہوم صادق آجائے گا اس کو ربوائے محرم سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے، اسی طرح حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس ربو کو جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، یوزری کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اگرچہ سوالنامہ پورا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نیز آکسفورڈ ڈکشنری بھی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حضرت موصوف کی مراد متعین نہیں ہوئی، لیکن دوسری اس فن کی معتبر کتاب (آؤٹ لائن آف اکنامکس) مصنفہ من موہن سنگھ ودیا ساگر کالج کلکتہ، مطبوعہ ۱۹۶۲ء میں یوزری USURY کے یہ تین معنی لکھے ہیں۔

(۱) سودخوری (۲) مروجہ قانونی شرح سے زیادہ سود لینا (۳) بہت بھاری سود لینا (عموماً)۔

یوزری کے انہی تین معنی میں سے کوئی معنی مراد لینا یا اس کے علاوہ کوئی بھی معنی لینا آیات حرمت ربوا میں ربوا کو اس کے ساتھ مخصوص کر لینا اس وجہ سے صحیح نہ ہوگا کہ جب شارع علیہ السلام نے خود ربوا کے معنی کی تشریح یا نشاندہی اس انداز سے فرمادی جس میں ہر طرح کا اطلاق ہے تو اب کسی دوسرے شخص کو اس کے تقیید یا تخصیص کا حق نہیں پہنچتا، چنانچہ مشہور حدیث کے جس کو مسلم شریف وابوداؤد ونسائی وترمذی وابن ماجہ بھی نے نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں:**عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: "الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد أربى"** (۱)۔

علت حکم جو چیز بھی ہو، اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے جب کوئی چیز اپنی جنس کے عوض میں بیچی جائے یا بطور قرض لی جائے یا دی جائے تو کسی قسم کی زیادتی بھی ہو وہ مطلقاً ربوائے محرم ہوگی، خواہ وہ مبادلہ (قرض) پیداوار کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے ہو، کسی انسانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہو، خواہ قرضدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو بلکہ نفع پہنچانا مقصود ہو، خواہ بھاری سود یا سودخوری وغیرہ سے بالکل خالی وصاف ہو، غرض ہر حال میں وہ زیادتی ربوا ہی شمار ہوگی اور دائرہ حرمت سے باہر نہ ہوگی۔ ہاں اگر دربار رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی اتنی صاف تصریح اور وضاحت نہ ہوتی، اور پھر کوئی مناسب تاویل قائم ہو جاتی تو گنجائش بھی ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا حکم شارع علیہ السلام اطلاق وعموم کے ساتھ صاف وواضح لفظوں میں بیان فرمادیں تو کسی بشر کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس میں بغیر کسی نص کی مدد کے کوئی تقیید یا تخصیص یا کسی قسم کا تغیر وغیرہ کر سکے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

اشکال یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربوا کا مفہوم اس طرح اطلاق اور عموم کے ساتھ صاف اور واضح بیان فرمادیا تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کا کیا مقصد ہے؟

"إن آخر ما نزلت آية الربو وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربوا والريبة" (۲)۔

۱- مسلم باب الربا ۲/ ۲۵۔

۲- ابن ماجہ والدارمی، مشکوٰۃ/ص ۲۴۶۔

اس کا جواب یہ ہے:

حضرت عمرؓ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت ربوا مجمل ہے یا اپنے مفہوم ومصداق میں مخلک ہے، جس کی وجہ سے تقاضائے آیت پر عمل کرنے میں دشواری ہے، یہ مفہوم تو ایک معمولی انسان بھی نہیں لے سکتا چہ جائیکہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اورقوی الایمان صحابی، اس لیے کہ اس میں کھلا اعتراض اسلام وتعلیمات اسلام پر ہوتا ہے اور اس کی زد ذات باری عز اسمہ پر پہنچتی ہے۔

بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ آیت ربوا آیت محکم ہے، اس میں نسخ وتغیر وغیرہ کسی چیز کا احتمال نہیں ہے اور نہایت واضح اور مفسر ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر نہیں فرمائی، اور اتنی اہم ہے اور خوفناک ہے کہ جو چیزیں صریح ربوا ہیں ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، جن چیزوں میں شبہ ربوا ہو ان کو بھی چھوڑ دینا ہے۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں: **" ان هذه الأية ثابتة غير منسوخة غير مشتبهة ولذالک لم يفسرها النبي ﷺ فاجروها على ما هي عليه ولا تر تابوا فيها واتركوا الحيلة في حل الربوا"۔**

اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس جملہ **"فدعوا الربوا والريبة"** سے بھی اسی مفہوم کا پتہ لگتا ہے۔

اسی طرح **"الأمور بمقاصدها"** میں امور سے وہ امور مراد ہیں جن کا حسن وقبح یا جن کا حکم حلت وحرمت منصوص نہ ہو تو اس کا حسن وقبح یا حکم ان کے مقاصد سے نکل سکتا ہے نہ یہ کہ سارے ہی امور واحکام کا مدار ان ہی مقاصد پر ہو، اگر ایسا ہو تو دین کی اور حدود اللہ کی ساری ہی عمارت منہدم ہو کر رہ جائے گی۔

اسی طرح **"الضرورات تبيح المحظورات"**(۱) میں بھی الف ولام عہد کا ہے اور وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی اور منجر ہو جاتی ہیں، اضطرار اور مخمصہ تک، نہ کہ تمام ہی ضرورتوں کا یہی حکم ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے چنانچہ اس سے اگلا جملہ **"ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة"**(۲) جو بالکل اس قاعدہ سے متصل اور اسی کی تمثیل ہے، اس کی وضاحت کر رہا ہے، جیسا کہ سابق جواب میں بھی ہم اس کی وضاحت کر آئے ہیں۔

الغرض جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے جس طرح اس کو غیر سود یا مباح وجائز کہنا درست وجائز نہیں ہوگا، اسی طرح جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق نہ آوے اس کو سود یا حرام کہنا درست ومباح نہ ہوگا، بلکہ ان فرق کا واضح

۱- الاشباہ والنظائر/۱۴۰۔
۲- الاشباہ والنظائر/۱۴۰۔

کرنا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے علماء و مشائخ پر ضروری رہے گا تا کہ دین متین کی جامعیت اور جاذبیت و ہمہ گیری وہر دلعزیزی نیز "الحلال بین و الحرام بین" اور "الدین یسر" نمایاں و غالب رہے، اس تمام تر گفتگو سے قرض کی قسم اول (حکومتوں کا خود قرض لینا) کا حکم بھی خود بخود نکل آیا، اور اسی تفصیل پر جو گذری اس کو منطبق کر لینا کافی ہو سکتا ہے، اس لیے فقط ایک بات اس کے متعلق عرض کر کے جواب ختم کرتا ہوں۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کو اندرون ملک کے باشندوں سے قرض لینا ہو تو سود پر نہ لینا چاہئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کے سامنے مکمل ضروریات رکھ کر ہمدردی کی ترغیب و تحریض دلا کر بطور قرض حسنہ (غیر سودی قرض) لینا چاہیے۔ افراد ملک پر بھی اخلاقاً ضروری ہے خاص کر صاحب سرمایہ و صاحب حیثیت اصحاب پر کہ وہ ملک کی مضبوطی و ترقی کے لیے حکومت کو قرض حسنہ (قرضہ غیر سودی) دیں کہ ملک کی اور اہل ملک کی ہمدردی و بہی خواہی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۷/ ۷/ ۹۱ ۱۳ ھ

ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت:

عرض یہ ہے کہ چند امور قابل استفسار ہیں، اس کا جواب جس قدر بہ سہولت تمام ممکن ہو عنایت فرما دیں!

۱-سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لیے اسکیمیں کھولی ہیں، اور ان کے واسطے روپیہ کی فراہمی کے لیے سرٹیفکٹ جاری کرتے ہیں، جو لوگ سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، ان کو سود ہر سال مل سکتا ہے، ان کا راس المال تین یا سات سال پر واپس مل سکتا ہے، یہ روپیہ سرکار اسکیم میں لگاتی ہے، لوگ روپیہ کی حفاظت کی نیت سے اور اس نیت سے بھی کہ کچھ اضافہ بطور سود ہو جاوے گا، روپیہ دے کر سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، روپیہ فوراً نہیں مل سکتا، البتہ تین سال کے پہلے مل سکتا ہے، آیا ایسے روپیہ پر زکوۃ فوراً ہر سال ادا کرنے کا حکم ہے یا کس طرح اس کی زکوۃ کی ادائے گی کا حکم ہے؟

۲-آیا غیر مسلم حکومت سے سود لیا جا سکتا ہے اور وہ سود ہر کام میں لگا سکتے ہیں، سرکار ججوں سے، وکیلوں سے اور زمینداروں سے آدمی پر اور زمینداری و مکان پر ٹیکس لیتی ہے۔

۳و۴-کئی کمپنی چٹھی ڈالنے کی کھلی ہیں، جو غیر مسلم کی نہیں، آیا چٹھی ڈالنا ایسی کمپنی میں شرعاً جائز ہے؟ چونکہ کچھ لوگ اس ملک کو دارالحرب کہتے ہیں، آیا چٹھی ڈالنا یا عشر بند کرنا شرعاً جائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا-سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لیے جو اسکیمیں کھولی ہیں، ان میں مختلف کاروبار اور بزنس کیا اور کرایا جاتا ہے اور عوام سے بذریعہ سرٹیفکٹ جو رقمیں لی جاتی ہیں، ان ہی کاروباروں میں اور بزنسوں میں خرچ کیا جاتا ہے، اس طرح یہ روپے بمنزلہ شیئر (حصوں) کے ہوسکتے ہیں اور دینے والے شیئر ہولڈر کہلائے جاسکتے ہیں، جس طرح دیگر کمپنیوں میں شیئر اور شیئر ہولڈر (حصہ دار) ہوتے ہیں، پھر ان کاروباروں اور بزنسوں سے جو نفع ہوتا ہے، نفع ان شیئر داروں کو دیتی ہے، یہ تاویل کی جاسکتی ہے، لہذا سود کا نام رکھنے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں، جس طرح پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ میں سود کا نام رکھنے سے سود نہیں ہوتا۔

امداد الفتاویٰ میں حضرت تھانویؒ بھی اس حق میں ہیں کہ سود کا نام رکھنے سے سود ہونا ضروری نہیں اور یہ صحیح بھی ہے، اس لیے کہ سود (ربوا) شرعی لفظ اور شرعی اصطلاح ہے، شرعی مفہوم رکھتا ہے، جب تک وہ مفہوم شرعاً صادق نہ آئے گا کسی کے سود کہنے سے سود نہ ہوگا، پس جن علماء کے نزدیک یہ تاویلات وتوجیہات صحیح ہیں، وہ ان اسکیموں میں حصہ لینے اور اس کے نفع کو جائز کہتے ہیں، اور جن علماء کے نزدیک تاویلیں صحیح نہیں وہ ناجائز فرماتے ہیں، اور احقر کا رجحان بھی بحالت موجودہ جواز کی طرف ہے، اور جب وہ شخص وہ روپیہ حقیقت میں کاروبار و بزنس میں لگاتا ہے یا لگانے کے لیے دے سکتے ہیں، اس لیے اس کو زکوٰۃ بھی اپنے اور سرمایہ کے اندر لگے ہوئے روپیوں کی طرح دینی ہوگی۔

۲-جو نفع شرعی مفہوم کے اعتبار سے سود (ربوا) ہے، اس کا لینا دار الحرب میں اور غیر مسلم سے ہر ایک سے لینا ناجائز ہے اور حرام ہے، سود لینے پر بڑی سخت وعیدیں احادیث پاک قرآن پاک میں وارد ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ پورے قرآن پاک میں مجھے اس سے زیادہ اور کوئی آیت معاصی کے سلسلے میں خوفناک نظر نہیں آتی۔

اور اسی وجہ سے ان محکموں میں جو علماء شرکت جائز فرماتے ہیں، غایت احتیاط کا حکم دیتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے بچا جائے، ایسے کاموں میں بدرجہ مجبوری ہی شرکت کی جائے۔

۳-چٹھی ڈالنے کی کمپنیوں کی ذرا وضاحت فرمایئے، بہر حال اگر ان کمپنیوں میں بزنس اور کاروبار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت اور حکم دوسرا ہوسکتا ہے، اور بالکل لاٹری والا معاملہ ہو تو دوسرا ہوسکتا ہے۔

۴-رہ گیا عشر کا مسئلہ تو ختم زمینداری کے بعد سے جہاں کا زمیندارہ حکومت نے ختم کردیا، وہاں حکومت ارضیات کاشت کی مالک ہوگئی، مسئلہ استیلاء کے ماتحت وہ زمین مثل اراضی محرزہ سلطانی ملک سرکار ہوگئیں اور عشر ختم ہوگیا، باقی جس

قدر بھی کوئی شخص بطور خیرات نکالدے گا باعث خیر وبرکت ہی ہوگا اور نکالنا بھی چاہیے، مگر وجوب عشر نہ ہونے کی وجہ سے عدم ادائیگی میں گناہ نہ ہوگا اور ادائیگی میں ثواب ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند، سہارنپور ۱۳/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

انعام کا غلط طریقہ:

چندلڑکوں نے مل کر ایک کمپنی شروع کی ہے اس کا نام ''سونا ٹریڈرز'' ہے، کمپنی کا اصول یہ ہے کہ دس ہزار ممبر بنائے جائیں اور ہر ممبر سے دس روپے فیس لی جائے۔کل رقم ایک لاکھ روپے ہوئے، اس رقم کو لے کر تجارت کرنے کا ارادہ ہے، اور ممبران کو ان کی اصلی رقم واپس کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر ماہ پانچ سو روپے کے انعامات کھولے جائیں، ۸۰/ انعامات ۲۵،۲۵ روپے کے اور ایک انعام تین سو روپے کا، ان انعامات کی ترتیب قرعہ اندازی جیسی ہوگی کہ دس ہزار نا موں کو ایک ڈبہ میں ڈال کر ۹۰ پرچے ہر ماہ نکالے جائیں، اسی طرح ۵ سال تک ہر ماہ کیا جائے اور ۵ سال بعد بقیہ ممبران کو کمپنی جو بونس (نفع) مقرر کرے وہ مع اصل رقم کے واپس کردیا جائے گا، آیا اس کمپنی میں ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی تقسیم شرع کے خلاف تو نہیں ہے مفصل تحریر فرماویں۔

(نوٹ) جن ممبران کا نام انعامات میں آجائے گا ان کو پھر کمپنی سے کوئی جوڑیا تعلق باعتبار پیسے کے نہیں ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کمپنی کا یہ طریقہ انعام ونفع تقسیم کرنے کا غلط ہے۔قمار اور سود کو شامل ہے جائز نہیں۔اس لیے اس میں شریک ہونا اس کا ممبر بننا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہ، سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیو بند ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ ھ

حق تصنیف سے متعلق سوال وجواب:

زید بہت بڑا عالم ہے اس نے ایک ابتدائی مذہبی کتاب لکھی جس میں بچوں کو سوال وجواب کے طور پر عقائد واعمال کے ضروری مسائل سکھائے ہیں۔ پھر وہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے دینی مدارس میں داخل نصاب کرلی گئی۔ اور بہت سے لوگوں (اہل علم وتجارت) نے اسکو چھپوا کر شائع کیا۔ مگر زید نے کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ زید کے انتقال کے بعد کچھ مدت گزرنے پر عمر نے اس کتاب کو بغرض اشاعت علم وتجارت چھپوایا۔ اس پر زید کے ورثاء مطالبہ کرتے ہیں کہ تمہارے اس کتاب کو چھپوانے سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچا تم نے بلا اجازت اس کو چھپوایا ہے، لہذا ہمارے نقصان کا ہرجانہ اتنے ہزار روپیہ ادا کرو۔ ورنہ ہم عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ تم نے ہماری کتاب کو بلا اجازت چھپوایا ہے۔

اب سوال یہ ہے (۱) کیا زید کے لیے خود یہ بات جائز تھی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی دینی ضروری کتاب کی طباعت کے حقوق قانوناً محفوظ کرائے کہ کوئی دوسرا شخص نہ چھاپ سکے۔

(۲) کیا زید کے ورثا کے لیے خود یہ بات جائز ہے کہ انتقال زید کے بعد دوسرے لوگوں کو اس کے چھاپنے سے منع کریں۔

(۳) کیا زید یا زید کے ورثا کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ حقوق طبع کسی پریس یا تاجر کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اور کیا شرعاً ایسی بیع درست ہوگی؟ اور اس بیع سے حاصل شدہ روپیہ جائز ہوگا؟ حق طبع مال متقوم ہے یا غیر متقوم؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ اجتہادی اور قیاسی مسئلہ ہے قرون اولی میں فن طباعت کا نہ وجود تھا، اور نہ طباعت کیساتھ مالی منفعت کے متعلق ہونے کا تصور تھا، لہذا اس کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم مذکور نہیں ہے، لیکن اگر طباعت کو غیر متقوم اور مباح الاصل مان لیا جائے، تب بھی ایسی کتاب جس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت یا تجارتی مفاد وابستہ ہو تو اس کو ہر کس وناکس کا بلا اجازت مصنف طبع کرنا جائز نہیں، کیونکہ بعض افعال ایسے ہیں کہ اصل کے لحاظ سے مباح ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کے کرنے میں دوسرے شخص کی حق تلفی اور ضرر کا امکان ہو تو ان کی اباحت ساقط ہوجاتی ہے اور ممنوع شرعی بن جاتے ہیں، مثلاً ایک مسلمان عورت کو نکاح کا پیغام دینے کی ہر مسلمان مرد ہم کفو کو اجازت ہے، لیکن پیغام پر پیغام دینا ممنوع ہے، یعنی اگر ایک مسلمان مرد نے ایک ہم کفو مسلمان عورت کو اپنے نکاح کا پیغام دے دیا ہو، اور اولیاء کا نکاح کا کچھ رجحان بھی پایا جائے، تو جب تک

وہ عورت انکار نہ کر دے، دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ مباح فعل جائز نہ ہوگا(۱)۔

ایک شخص کسی سے بھاؤ طے کرے تو تیسرے شخص کو دام لگانے کا حق نہیں رہا، اپنے مکان کی چھت پر چڑھنے اور ہوا کھانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، مگر جب دوسرے لوگوں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو تو اس مباح کی اباحت نہیں رہے گی (کفایت المفتی کتاب المضاربہ والشرکت)۔

مسجد میں ہر جگہ بیٹھنا ہر نمازی کے لیے مباح ہے۔کوئی مقام کسی شخص واحد کے لیے مخصوص نہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی جگہ پر آ کر بیٹھ جائے اور اپنا کپڑا وغیرہ رکھ کر کسی ضرورت کے لیے اٹھے تو اس جگہ بیٹھنا دوسروں کے لیے ممنوع ہے، یعنی اس جگہ کو جب شخص واحد نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تو دوسروں کے لیے اس کی اباحت نہ رہی، علامہ شامی نے "**باب ما یفسد**" میں "**مطلب فیمن سبقت یدہ إلی مباح**" کے تحت مفصل طور پر بیان کیا ہے کہ کسی مباح کے ساتھ جب کسی شخص کا حق متعلق ہو جائے تو وہ دوسروں کے لیے مباح نہیں رہتا۔

کسی مصنف کی کتاب جو شب و روز کی شدید محنت کے بعد معرض وجود میں آتی ہے۔اس کو طبع کرنے کا سب سے پہلا حق خود مصنف کو حاصل ہے اور اس کا مقصد علم کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ہی مصنف کے لیے مالی منفعت کا حصول بھی ہے۔تو جب تک مصنف کا حق اس کے ساتھ وابستہ ہے دوسروں کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہوگا۔ایسے تاجران کتب جو مصنف کی طرف سے کتاب کی معتد بہ تعداد کی اشاعت کے باوجود اس کی کتاب کو بلا اجازت چھاپ لیتے ہیں، وہ اس کتاب کی مقبولیت سے مالی اور تجارتی فائدے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور ان کا یہ عذر غیر مسموع ہے کہ انہوں نے علم کی اشاعت کے لیے ایسا کیا ہے، کیونکہ اگر ان کے دل میں علم کی وقعت اور اشاعت علم کا جذبہ ہوتا تو وہ بڑی تعداد میں مصنف سے کتاب خرید کر غریبوں میں مفت تقسیم کرتے اور ثواب حاصل کرتے۔

اب رہا یہ سوال کہ حق طباعت کا معاوضہ لینا مصنف کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

حقوق مجردہ میں سے وہ حق جن میں مالی منفعت نہیں پائی جاتی یا وہ تحصیل مال کا ذریعہ نہیں بن سکتے، بلکہ محض دفع ضرر کے لیے اثبات حق ہوتا ہے، مثلاً حق شفعہ، سوء جوار سے مامون رہنے کے لیے یہ حق دیا گیا ہے، بیشک ایسے حقوق کا مالی معاوضہ لینا جائز نہیں، لیکن بعض حقوق ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ صاحب حق کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق

۱- "إن رسول الله ﷺ قال: المؤمن أخو المؤمن فلا يحل للمؤمن أن يبتاع على بيع أخيه ولا يخطب على خطبة أخيه حتى يذر" (مسلم کتاب النکاح ۱/ ۴۵۴ باب تحریم الخطبة علی خطبة أخیہ)۔

ہوتی ہے، مثلاً حق وظائف، یعنی شاہی مناصب تو ان کا معاوضہ مال کی صورت میں لینا یا مال کے معاوضہ میں حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔ حضرت حسنؓ نے اپنے حق خلافت سے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری دے کر معاوضہ قبول فرمایا تھا (۱)۔

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ جس کو آج کل کی اصطلاح میں گڈول (Goodwill) کہتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام "عطرستان یا گلشن ادب" رکھ لیا، اور اس سے اسکا تجارتی مفاد وابستہ ہوگیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا۔ اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز ہے (۲)۔

اسی طرح کتاب کا حق طباعت، جبکہ اس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق ہے۔ وہ حق بالاصالۃ ہے اور مصنف اس حق کو معاوضہ لیکر منتقل بھی کر سکتا ہے، اور عہد حاضر میں ذرائع نقل و حمل اور وسائل نشر و اشاعت کی بے پناہ وسعت کے ہوتے ہوئے اور مصنفین کے لیے اسباب قدر دانی و ہمت افزائی، نیز وجہ کفاف کے فقدان کی وجہ سے حق طباعت کا مصنف کے لیے محفوظ رہنا علمی بخل نہیں ہے، بلکہ اسی میں صالح لٹریچر کی بقاء و ترقی مضمر ہے، مگر صورت مسئلہ میں نقصان چونکہ نقصان منفعت ہے اور وہ بھی غیر متعین اور مجہول ہے، اس لیے موجب ضمان نہیں (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرکت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام:

۱- "**ولا یجوز الشرکة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح**" (۴) مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکت میں شریک کو متعین نفع یعنی تنخواہ لینا نا جائز ہے، مگر کیا دوسرے شرکاء کے لئے یہ تنخواہ دینے اور شریک کو تنخواہ لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟

۱- الاشباہ والنظائر حموی وشامی فی غایۃ الاوطار۔

۲- حوادث الفتاوی حصہ چہارم۔

۳- شامی کتاب الغصب۔

۴- ہدایہ اولین، ۲/ ۶۳۲ کتاب الشرکۃ زکریا بک ڈپو۔

۲- اگر کاروبار چلانے والے شریک کے لئے شرکت صحیح کرنے کے لئے غیر متعین حصہ طے کیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا کاروبار میں حصہ زیادہ ہوجانے کی وجہ سے پورے کاروبار پر خود قابض ہوکر بیٹھ جاتا ہے، اور دیگر شرکاء کے حصے کو جبرا وقہرا نکال دیتا ہے، اس لئے متعین نفع دینا ضروری ہے یہ رواج ہوٹل وغیرہ کے کاروبار میں عام ہوگیا ہے اور ابتلاء عام ہے، تو کیا اس صورت میں شرعاً متعین نفع کے لئے جواز کی کوئی سبیل نکل سکتی ہے تا کہ کسب حرام سے احتراز ہو سکے۔

۳- کچھ لوگوں نے ملکر ایک شخص کی دوکان چلانے کے لئے لی اور بات یہ طے ہوئی کہ ماہوار ہم لوگ دس ہزار روپئے (کنٹراکٹ) یعنی دکان کی اجرت دیتے رہیں گے اور پانچ سال کی مدت طے ہوئی، لیکن دکان پرانی ہوجانے کی وجہ سے اس میں کچھ مرمت واصلاح کی ضرورت ہے، اس لئے مالک دوکان نے چلانے والے لوگوں سے کہا کہ اگر تم کو دکان چلانی ہے تو جو کچھ بھی مرمت کی ضرورت ہے اپنی ذاتی رقم سے کرلو اور مرمت کا جتنا خرچ ہو وہ میرے ذمہ قرض رہے گا اور تمہارے ذمہ مجھے کنٹراکٹ دینے کی جو رقم طے ہوئی ہے اس میں سے ہر ماہ نصف نصف یعنی پانچ پانچ ہزار وصول کرتے رہیں، ما بقیہ کنٹراکٹ کی نصف رقم مجھے دیتے رہیں اور مرمت کے قرض میں سے جب مبلغ دس ہزار روپئے باقی رہ جائے تو کنٹراکٹ میں سے وصول کرنا ترک کردیں وہ دس ہزار روپئے اجرت کی مدت مکمل ہوجانے کے بعد میں اس کو ادا کرونگا اور تم لوگ مجھے پوری اجرت دس ہزار روپئے دیتے رہو، دکان چلانے والوں نے اس بات کو منظور کرلیا اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے تاکہ دکان چلانے والوں پر مالک دکان کی طرف سے ایک قسم کا دباؤ رہتا ہے جس کی بنا پر وہ لوگ دکان میں کسی قسم کا نقصان نہیں کرتے، کیونکہ ان لوگوں کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر دکان میں کسی قسم کا نقصان کیا گیا تو مالک دکان ہمیں اپنے دس ہزار کا قرض واپس نہیں دے گا تو کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اگر اس میں کوئی مضائقہ ہو تو شرعی حیثیت سے اگر کوئی جواز کی صورت نکلتی ہو تو تحریر فرمائیں۔

۴- اگر زید نے بکر سے یوں کہا کہ خالد جو کاروبار کر رہا ہے اس میں میری جانب سے بطور قرض دو ہزار روپئے دے دینا اور بکر نے زید کے حکم کے مطابق خالد کو دو ہزار روپئے دے بھی دیئے تو ظاہر ہے کہ ان دو ہزار روپئے پر زید کا قبضہ نہیں ہوا تو اب خالد کے کاروبار میں جو منافع ہوا وہ زید کی ملک ہوگا یا بکر کی اور یہ ملحوظ رہے کہ زید نے اپنا قرضہ بکر کو کچھ ادا کردیا ہے اور کچھ بعد میں ادا کردے گا۔

۵- ایک دوکان میں دو آدمی حصہ دار ہیں جملہ منقولی وغیر منقولی اشیاء میں، اس میں سے ایک آدمی کو دکان چلانے کے لئے متعین کیا اور دوسرا حصہ داران سے الگ رہا اور یہ دوکان چلانے میں شرکت نہ کرنے والا چلانے والے حصہ دار سے

یوں کہے کہ تم دکان چلاتے رہو اور مثلاً دو ہزار روپے مجھے میری نصف دکان کی اجرت کے طور پر دیتے رہنا، بقیہ بچا ہوا سب تمہارا ہے اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ متعین نفع کسی شریک کے لئے نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے حصہ کی اجرت لے رہا ہے تو کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے تحریر فرمائیں۔

۶- بعض مالک دکان، دکان چلانے والوں سے بطور ڈپوزٹ (قرض) لے لیتے ہیں اور یہ رقم اجارہ کی مدت ختم ہوجانے کے بعد واپس دے دی جاتی ہے اور یہ صورت اختیار کئے بغیر دکان ملنا مشکل ہے تو اس طرح ڈپوزٹ دے کر دکان چلانے کے لئے لینا جائز ہوگا اگر یہ صورت جائز نہیں ہے تو اگر یوں کیا جائے کہ مالک دکان سے کہا جائے کہ یہ ڈپوزٹ نہیں ہے بلکہ یہ وہ پیشگی اجرت ہے جو مدت اجارہ کے آخری دو مہینے ہیں اس کی اجرت ہے ان دو ماہ کے قبل کی اجرت نہیں ہے تو یہ صورت جواز کی ہے یا نہیں؟

محمد سلیمان (مہتمم مدرسہ جامعہ نذیریہ کاکوسی ضلع مہسانہ شمالی گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- "**ولا یجوز الشرکة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح**"(۱)۔

عبارت بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین روپیوں کی شرط کردی جاتی ہے تو شرکت درست نہیں ہوتی ہے اور یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے، قال ابن المنذر: **لاخلاف فی هذا لأحد من أهل العلم**(۲)۔

اور اس صورت میں نفع کی تقسیم مال کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اگرچہ نفع میں تفاضل کی شرط کی گئی ہو **ویکون الربح علی قدر المال**، (الدر المختار)(۳)۔

رہ گیا یہ حکم کہ کسی شریک کو مشترک شئی میں کام کرنے کی تنخواہ اور اجرت لینا جائز نہیں سو یہ اس عبارت مذکورہ فی السوال سے معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ حکم مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے: "**ولو استأجره لحمل طعام**

۱- (ہدایہ اولین رص ۶۳۲ کتاب الشرکۃ زکریا کتب خانہ)، اس کے آگے کی عبارت یہ ہے:" لأنه شرط یوجب انقطاع الشرکة فعساه لایخرج إلا قدر المسمی لأحدهما ونظیره فی المزارعة"(ہدایہ رص ۶۳۲ کتاب الشرکۃ زکریا کتب خانہ)(مرتب)۔

۲- فتح القدیر ۵/ ۲۵۔

۳- "قوله ویکون الربح علی قدر المال أی وإن اشترط فیه التفاضل لأن الشرکة لما فسدت صار المال مشترکا شرکة ملک والربح فی شرکة الملک علی قدر المال" (رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۴۹۰)۔

مشترک بینهما فلا أجر له لأنه لا یعمل شیئاً لشریکه إلا و یقع بعضه لنفسه فلا یستحق الأجر"(الدر المختار)، (قوله فلا أجر له) أی لا المسمی و لا أجر المثل زیلعی(۱) والأصل أن کل ما لا یستحق الأجر إلا بإیقاع عمل فی العین المشترکة لا یجوز و کل ما یستحق بدونه یجوز(۲)۔

اب رہ گئی یہ بات کہ نفع میں سے تنخواہ دینے اور شریک کے تنخواہ لینے سے یا متعین ومعدود روپے دینے اور شریک کے لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟ سو اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں اس لئے وہ مال حلال ہوگا لان الأصل فی الأشیاء إلا باحة(الاشباہ ص ۱۳۲)(۳)۔

۲-سوال اول سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر متعین نفع سے آپ کی مراد تنخواہ اور اجرت ہے سو اس کا حکم سوال اول کے جواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ مشترک چیز میں کام کرنے کی اجرت وتنخواہ لینا درست نہیں لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک درست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: "وإذا کان الطعام بین رجلین فاستاجر أحدهما صاحبه أوحمار صاحبه علی أن یحمل نصیبه فحمل الطعام کله فلا أجرله وقال الشافعی رحمه الله: له المسمی لأن المنفعة عین عنده و بیع العین شائعا جائز"(ہدایہ ۳/ ۳۰۷)۔

اور ضرورت شدیدہ اور ابتلاء شدید کی صورت میں دیگر ائمہ کے مذہب کو اختیار کر لینے کی گنجائش ہے، لہٰذا اگر ضرورت شدیدہ یا ابتلاء شدید ثابت ہو جائے تو توسع کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ مفقود کے بارے میں ضرورت شدیدہ کی بناء پر امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کر لیا گیا ہے اور قاعدہ ہے کہ ما عمت بلیته خفت قضیته(۴) اور درمختار میں ہے کہ وأطلق الشافعیؒ أخذ خلاف الجنس للمجانسة فی المالیة قال فی المجتبی: وهو أوسع فیعمل به عند الضرورة(الدر المختار ۲۷۷)۔

جہاں تک ضرورت شدیدہ کا تعلق ہے تو ہمارے خیال میں اس کا تحقق نہیں، کیونکہ جو وجہ تنخواہ اجرت دینے کی ذکر

۱- رد المحتار علی الدر المختار طبع مکتبہ زکریا ۹/ ۸۲۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار طبع مکتبہ زکریا ۹/ ۸۳۔

۳- الاشباہ والنظائر طبع دیوبند ۱۴۰۶ ص ۱۱۵ وطبع ادارۃ القرآن کراچی ص ۹۷، عبارت اس طرح ہے "وفی شرح المنار للمصنف الأصل فی الأشیاء الإباحة عند بعض الحنفیة و منهم الکرخی"، اس کے تحت شرح حموی میں مذکور ہے "ذکر العلامة قاسم بن قطلوبغا فی بعض تعالیقه إن المختار أن الأصل الإباحة عند جمهور أصحابنا" (الاشباہ والنظائر مطبوعہ دیوبند ص ۱۱۵)۔

۴- الاشباہ والنظائر طبع دیوبند ص ۱۳۸ وطبع کراچی ص ۱۰۷۔

کی گئی ہے، اس سے استیجار شریک و اعطاء اجرت کی ضرورت شدیدہ کا ثبوت نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت نہ کیا جائے اور متعین ومعدود روپے کسی شریک کے لئے مشروط نہ کئے جائیں بلکہ نفع کا جزو شائع متعین (مثلاً نصف نفع، ثلث، یا ربع نفع) ہی طے کیا جائے اور مثلاً ہر پانچ سال پر حساب کر کے کاروبار چلانے والے شریک کا ز ائد حصہ شرکت کے مال سے علیحدہ کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے (جیسا کہ تنخواہ دینے کی صورت میں تھوڑا تھوڑا اس کے حوالہ ہوتا رہتا ہے) تو اس شریک کا کاروبار میں حصہ زیادہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی پورے کاروبار پر خود قابض ہوکر بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی دیگر شرکاء کے حصوں کو جبر اقہرا نکال سکتا ہے۔

نیز اس خرابی سے بچنے کے لئے وہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے جسکو ۵ کے جواب میں بعض تاویلات اور تفصیلات کے ساتھ ذکر کیا جائے گا کما ستعرف انشاء اللہ تعالی۔

رہ گیا ابتلاء شدید سو اگر واقعی اس علاقہ میں متحقق ہے تو وہاں توسع کیا جاسکتا ہے، حضرت مولینا تھانویؒ نے امام احمدؒ کی ایک روایت کی بناء پر ''دفع بقرہ بر نصف نماء'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جاسکتا ہے'' (امداد الفتاوی ۳/۲۸۵)(۱)۔

اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت کو مطابق مذہب امام شافعیؒ اختیار کیا جائے تو مناسب ہے کہ شرکت میں بھی حتی الوسع ان کے مذہب کی رعایت کی جائے، شرکت میں ان کے نزدیک ضروری ہے کہ نفع ونقصان مال کی مقدار کے اعتبار سے ہو اس کے خلاف کی شرط موجب فساد عقد ہے'' **والربح والخسران علی قدر المالین تساویا فی العمل أو تفاوتا فإن شرطا خلافه فسد العقد فیرجع کل أحد علی الآخر بأجرة عمله فی ماله** "(۲)۔

۳- اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: ''**وإذا استأجر الرجل من آخر عرصة دار ببدلٍ معلومٍ مدةً معلومة وأذن له رب الدار أن یبنی فیها کذا وکذا و یحسب له ما أنفق فی البناء من الأجر فهذا جائز، ألاتری إلی ما ذکر محمد رحمه الله تعالیٰ فیمن استاجر حماماً و وکله رب الحمام أن یرم ما استرم من الحمام ویحسب له ذلک من الأجر یجوز وإذا جاز ذلک وأنفق فی البناء إستوجب علی الآجر قدر ما أنفق لأنه فعل بأمره والأجر علی**

۱- امداد الفتاوی طبع زکریا بکڈپو دیوبند ۳/ ۳۴۳، امام احمدؒ کی روایت جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے: ''لو دفع دابة أو نخلة إلی من یقوم له وله جزء من نمائه صح''۔

۲- منہاج الطالبین للنووی ص ۵۶۔

المستاجر دين فيلتقيان قصاصا إن لم يكن بينهما فضل و يترادان الفضل إن كان بينهما فضل ويكون البناء لصاحب العرصة " (۱) ۔

اس صورت کے اختیار کرنے کی جو وجہ سوال میں مذکور ہے وہ موجب بطلان یا فساد عقد نہیں ہے۔

۴- **"أما دين الحيّ الفقير فيجوز لو بأمره" (الدر المختار) (قوله فيجوز لو بأمره) أي يجوز عن الزكاة على أنه تمليک منه و الدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضاً لنفسه فتح** (۲)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اس کاروبار میں جو منافع ہوا ہے وہ زید کی ملک ہوگا، کیونکہ وہ قرض کے دوہزار روپئے اگر چہ زید کے قبضہ میں نہیں آئے ہیں لیکن زید کے نائب خالد کے قبضہ میں بحکم النیابت آ چکے ہیں وہ پھر ان دوہزار روپیوں پر شرکت کے واسطے قابض ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خالد کے ساتھ شرکت کا معاملہ تو زید کا ہوا ہے نہ کہ بکر کا جیسا کہ سوال سے ظاہر ہوتا ہے، پس شریک کاروبار زید ہی ہے، لہذا وہی منافع کا مالک ہوگا ورنہ غیر شریک کو منافع کا مالک قرار دینا لازم آئے گا "**وهو باطل كما لا يخفى من له أدنى مناسبة بالفقه**"

پھر زید کا کچھ قرض ادا کر دینا اور کچھ بعد میں ادا کرنے کا ارادہ رکھنا اور بکر کا زید سے کچھ قرض وصول کر لینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ شریک کاروبار زید ہی ہے لہذا منافع اس کی ملک ہوگا۔

۵- اگر وہ دکان مع عمارت وفرنیچر وسامان عمارت دونوں کی ملکیت میں ہو تو یہ صورت اس تاویل سے جائز ہو سکے گی کہ ایک شریک اپنے حصہ عمارت وفرنیچر وسامان عمارت کا کرایہ لے رہا ہے، باقی کل کاروبار ونفع سب کا متبرع کر رہا ہے (ورنہ جواز کی کوئی شکل نہیں)" **و أجمعوا أن لو آجر من شريكه يجوز سواء كان مشاعا يحتمل القسمة أو لا يحتمل و سواء آجر كل نصيبه أو بعضه كذا في الخلاصة** " (۳)۔

لیکن یہ اجرت اس کے حصہ کی واقعی آمدنی سے زائد نہ ہو اور متعین ومعدود روپئے ہی ہوں نہ کہ جزء وشائع (۴)۔

اور اپنے حصہ کا منافع کلی طور پر مستاجر کے سپرد کردے اور اس کے نفع سے بالکل دست بردار ہو جائے۔

۱- الفتاوی الہندیہ ۶/ ۴۱۴۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۹۱، ۲۹۲۔

۳- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۴۸۔

۴- مستفاد من امداد الفتاوی ۳/ ۴۳۱۔

۶-ڈپوزٹ دیکر دکان کرایہ پر لینے کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن دوسری صورت (یعنی جو رقم مالک دوکان شروع میں لیتا ہے اس کو آخری دو مہینوں کی پیشگی اجرت قرار دیکر اس کے سپرد کیا جائے) چونکہ بے غبار ہے، اس لئے اسی صورت کو اختیار کرنا بہتر ہے، اس صورت کو چھوڑ کر سوال کی پہلی صورت کو اختیار نہ کرنا چاہئے اور اگر ڈپوزٹ کی رقم کو ضمانت قرار دیا جائے تو دونوں صورتیں بلا تکلف درست رہیں گی، رہ گیا تعجیل اجرت کا جواز سو وہ واضح ہے اور محتاج دلیل نہیں نیز مندرجہ ذیل عبارات سے اس کا جواز مستفاد بھی ہوتا ہے۔" **إذا استأجر الرجل من آخر دارا بدين كان للمستاجر على الآجر يجوز"** (۱) **"ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل أو بإستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فانه يملكها كذا في شرح الطحاوى"** (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۳/ ۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

شرکت عنان کے فساد کے وجوہات:

۱-شرکت عنان کن وجوہات کی وجہ سے فاسد ہوسکتی ہے یا کرسکتے ہیں اس کو مفصل تحریر فرمائیں۔

بعض شرکاء کا ایک شریک کو نکال دینا:

۲-بعض شرکاء دوسرے کم حصہ والے شرکاء کو بلا وجہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر شرکت سے خارج کر دیتے ہیں تو کیا یہ حرکت شرعاً جائز ہے؟

۳-شرکت عنان میں جملہ شرکاء کو مساوی درجہ کا حق ہوتا ہے یا حصہ کے تفاوت کی وجہ سے حقوق میں بھی تفاوت ہوسکتا ہے، مثلاً عام طور پر ہوٹلوں وغیرہ کے کاروبار میں جو شرکاء زیادہ حصہ والے ہوتے ہیں وہ کم حصہ والوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے، یعنی ہوٹل میں کسی قسم کا کام کرنا ہو نوکر وغیرہ رکھنا ہو یا کسی بھی قسم کا ردوبدل کرنا ہو تو اپنے اختیار سے کر لیتے ہیں، کم حصہ والوں سے مشورہ لینے اور پوچھنے تک کے بھی روادار نہیں ہوتے اور ان کے اس برتاؤ پر کم حصہ والے رضامند بھی نہیں ہوتے مگر حصہ کم ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچھ دم نہیں مار سکتے کہ کہیں ہمارا حصہ ہی نہ نکال دیں تو اس طرح زیادہ حصہ والوں کا کم حصہ والوں کے ساتھ اس طرح رویہ اختیار کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

۱- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۱۵۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۱۲۔

مال شرکت میں شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف:

۴-شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعاً کیسا ہے اگر نفع تقسیم کرنے کی مدت کے قبل اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھالے تو کیا اس طرح کرنے میں گنجائش نکل سکتی ہے؟

مولوی عبدالرحیم گجراتی (مدرس مدرسہ جامعہ عزیزیہ کاکوسی ضلع مہسانہ گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱و۲-شرکت عنان مندرجہ ذیل وجوہ سے فاسد و باطل ہوتی ہے:

(۱) احدالشریکین کی موت اگر چہ حکماً ہی ہو خواہ دوسرے شریک کو اس کا علم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، (۲) شرکت کا انکار، (۳) احدالشریکین کا دوسرے سے یہ کہہ دینا کہ اب میں تیرے ساتھ شرکت میں کام نہیں کروں گا، (۴) احدالشریکین کا فسخ کر دینا بشرطیکہ دوسرے شریک کو فسخ کا علم ہو جائے خواہ مال نقود اور روپیوں کی شکل میں ہو یا سامان کی شکل میں ہو، (۵) احدالشریکین کا جنون مطبق، (۶) خریدنے سے قبل دونوں مالوں کا یا ایک مال کا ہلاک ہو جانا، (۷) کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین و معدود روپیوں کی شرط کرنا یہ آخری صورت فساد کی ہے اور بقیہ صورتیں بطلان کی ہیں" **وتبطل الشركة اى شركة العقد بموت أحدهما علم الآخر أولا، لأنه عزل حكمي ولو حكما بأن قضى بلحاقه مرتدا و تبطل أيضاً بإنكارها وبقوله: لا أعمل معك فتح و بفسخ أحدهما ولو المال عروضا بخلاف المضاربة هو المختار بزازيه خلافاً للزيلعي ويتوقف على علم الآخر، لأنه عزل قصدى وبجنونه مطبقا**"(۱)۔

"**وظاهر أنه لا يحكم بالفسخ إلا بإطباق الجنون وهو مقدر بشهر أو بنصف حول على الخلاف**"(۲)۔

"**وتبطل الشركة بهلاک المالين أو أحدهما قبل الشراء**"(۳)۔

۱- الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۳/ ۸۵،۳۸۴۔
۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۶/ ۵۰۵۔
۳- الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ۳/ ۳۷۔

"وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة كما مر" (۱)۔

اگر شرکاء دو سے زیادہ ہوں اور ایک کے حق میں شرکت فسخ یا باطل ہوجائے تو باقی شرکاء کے حق میں اس کا فسخ یا بطلان لازم نہیں آئے گا، بلکہ ان کے حق میں شرکت قائم رہے گی، **"ولو كان الشركاء ثلاثة فمات واحد منهم حتى انفسخت الشركة في حقه لا تنفسخ في حق الباقين كذا في المحيط"** (۲)۔

"فلو كانو ثلاثة فمات أحدهم حتى انفسخت في حقه لا تنفسخ في حق الباقين بحر عن الظهيريه" (۳)۔

شرکت عنان کو جو شریک جب چاہے فسخ کرسکتا ہے جائز ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی شریک کی حق تلفی اور اضرار کا قصد نہ ہو کیونکہ یہ معصیت ہے، اپنے مفاد کی خاطر دوسرے شریک کے نفع ونقصان کا خیال نہ کرتے ہوئے فسخ کرنا بہت ہی غلط ہے، کسی شریک کو شرکت سے خارج کر کے اس کو اپنے حصہ کی قیمت ہی لینے پر مجبور کرنا درست نہیں اور بڑی بے مروتی ہے۔

"وأحدهما يملك الفسخ وإن كان المال عروضا بخلاف المضاربة وهو المختار" (۴)۔

"القاعدة الخامسة، الضرر يزال، أصلها قوله عليه الصلاة والسلام: "لا ضرر ولا ضرار" (۵)، **"وفسره في المغرب بأنه لا يضر الرجل أخاه ابتداءً ولا جزاءً أنتهى"** (۶)۔

۳- شرکت عنان میں حصص کے تفاوت کی وجہ سے حق تصرف میں تفاوت نہیں ہوتا، بلکہ ہر شریک کو مساوی درجہ کا حق تصرف حاصل ہوتا ہے، ہوٹل میں جو بھی کام کرتا ہے، اس کا ہر شریک مجاز ہے، زیادہ حصہ والے شرکاء کا تمام تصرفات کا خود مالک بننا، اور کم حصہ والے شرکاء کو تصرف کا حق نہ دینا، اور مشورہ تک نہ لینا (جبکہ وہ اس پر راضی بھی نہیں ہوتے) ناجائز ہے،

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۶/۴۸۹۔

۲- الفتاویٰ الہندیہ ۲/۳۳۵-۳۳۶۔

۳- رد المحتار ۳/۳۸۴۔

۴- البحر الرائق ۵/۱۹۹۔

۵- "عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قضى أن لا ضرر ولا ضرار" (سنن ابن ماجہ ۲/۷۸۴ حدیث نمبر ۲۳۴۰، وفی سندہ انقطاع اور حدیث نمبر ۲۳۴۱، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: "لا ضرر ولا ضرار" وفي إسناده جابر الجعفي)۔

۶- الاشباہ والنظائر طبع کراچی ص/۱۱۸، وطبع دیوبند/۱۳۹۔

”ولکل من شریکی العنان والمفاوضة أن یبضع ویستأجر ویودع ویضارب ویوکل ویده فی المال أمانة“(۱)، ”ودلیل عدم الجواز ما مر عن الأشباه من القاعدة والحدیث الشریف“۔

۴- شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعاً درست نہیں۔ جب تک خرید وفروخت جاری ہے اس وقت تک نفع میں سے اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھالینا درست نہیں، لیکن جب خرید وفروخت دونوں موقوف ہوچکی ہوں یا صرف خریدنا موقوف ہوا ہو اور اب صرف تقسیم کا مسئلہ رہ گیا ہو یا بقیہ مال بیچ کر تقسیم ہی کرنا ہو اور نفع کا مال نقود کی شکل میں ہو یا ایسی چیز ہو کہ تقسیم نہ کرنے سے خراب ہوجائے گی جیسے کھانا یا بعض کیلی اور موزون چیزیں اور ضرورت بھی متحقق ہو تو گنجائش ہے، لما مر عن الکنز من قوله :”ویده فی المال أمانة“ ولما مر عن الأشباه من القاعدة والحدیث الشریف ولما فی الهندیة من قوله فی الفتاوی :طعام أو دراهم بین اثنین غاب أحدهما واحتاج الآخر الحاضر وأخذ منه نصیبه قال محمد رحمه الله تعالیٰ :أرجو أن لا بأس به قال الفقیه ابو اللیث وبه نأخذ کذا فی الغیاثیة“ (۲)۔

”وفی المکیل والموزون له أن یعزل حصته بغیبة شریکه ولا شئ علیه إن سلم الباقی وإن هلک کان علیهما کذا فی النهر الفائق“(۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

ایک شریک کو اس کی محنت کے صلہ میں طے شدہ حصہ سے زیادہ دینا:

سوال نمبر(۱) سلیمان نے ایک ہوٹل کا ۷لاکھ میں سودا کیا، ۵۰ہزار بیعانے کے طور پر اپنے پاس سے دیئے اور بقیہ رقم ۲ماہ کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا، سلیمان سے کچھ احباب نے کہہ رکھا تھا کہ کہیں دکان ہوٹل وغیرہ خریدو تو ہمارا حصہ رکھنا، ہمارے پاس کچھ رقم موجود ہے، سلیمان نے ان لوگوں سے ایک پیسہ حصہ پر ۱۲ہزار وصول کئے، ۶۰ پیسوں کا حصہ ۷لاکھ ۲۰ ہزار میں فروخت کیا، اس میں لینے دینے والوں کی یہ نیت تھی کہ دوکان میں جو نفع ہوگا وہ پہلے ۶۰ پیسے والوں میں تقسیم ہوگا اور

۱- کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ۵/ ۲۹۶-۲۹۷۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۲/ ۳۴۲۔

۳- حوالہ بالا ۲/ ۳۴۲۔

جب ۶۰ پیسے والے کو ان کی رقم جو ایک پیسے پر ۱۲ ہزار دیئے تھے وصول ہو جائیں گے تو سلیمان نفع کو ۱۰۰ پیسوں پر تقسیم کرے گا، اس میں سے ۴۰ پیسے سلیمان کو اور بقیہ دوسرے ۶۰ پیسے والوں کے ہوں گے، سلیمان کے دکان کا قبضہ لینے سے پہلے ایک ساتھی ابراہیم کو اپنے چالیس پیسے حصہ میں ۲۵ پیسے حصہ دکان ذمہ داری پر چلانے کے بدلے دینا طے کیا اور یہ طے کیا کہ اصل رقم جو ۶۰ پیسے والوں کے پاس سے وصول کی ہے وہ نفع میں سے وصول ہو جانے کے بعد تمہیں ۲۵ پیسہ نفع ملنا شروع ہو جائے گا تو اب شریعت مطہرہ کے اعتبار سے یہ معاملہ صحیح ہوا یا نہیں اگر صحیح نہیں ہے تو جواز کی کیا شکل ہے؟۔

(۲) ایک ہوٹل میں ۳۔۴ حصہ دار ہیں جس میں ایک آدمی دکان میں محنت کرتا ہے، دوسرے محنت نہیں کرتے، جو شخص محنت کرتا ہے وہ چونکہ حصہ دار ہے اس لئے تنخواہ نہیں لے سکتا، اگر دوسرے حصہ داروں نے ملکر یہ کہا ہے کہ آپ محنت کرتے رہئے ہم سب ملکر آپکو ہر سال ۱۲ ہزار ہمارے حساب میں سے بطور بخشش دیں گے تو کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر محنت کرنے والے کا دکان میں کچھ حصہ بڑھا دیا تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ شخص محنت کرنا چھوڑ دے یا بیمار ہو گیا یا غیر حاضر رہنے لگا تو جو حصہ بڑھا دیا وہ کیسے کم کر سکتے ہیں، آیا وقتی طور پر جب تک وہ شخص محنت کرتا رہے گا اس کو اتنا حصہ نفع میں زیادہ ملے گا اور محنت چھوڑ دے گا یا انتقال ہو گیا تو وہ حصہ نہیں ملے گا، اس طرح شرط رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟۔

شریک کا مال مشترک سے چندہ دینا و دیگر تصرفات کا حکم:

(۳) بمبئی میں ہوٹل کے کاروبار میں ۵-۶ اور زیادہ شریک ہوتے ہیں، ایک ایک پیسے کا حصہ دار ہوتا ہے اور ۲-۴ آنوں کا حصہ دار بھی اس میں ہوتا ہے، لیکن ایک آدمی ذمہ دار ہوتا ہے جس کے پاس حساب رہتا ہے اور وہ تمام حصہ داروں کو انکا نفع وقت پر تقسیم کرتا ہے، دکان میں کوئی مرمت کا کام آتا ہے یا سرکاری دفتروں کی لائن کے کام بھی وہی کرتا ہے، ماہ رمضان میں مسجد مدرسوں کے چندہ کرنے والے ہندوستان کی مختلف جگہوں سے آتے ہیں ان کو بھی دکان میں سے دیتا ہے، یہ چیزیں پہلے سے چلی آ رہی ہیں، اس میں کسی حصہ دار کا کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ذمہ دار شخص کبھی بھی ایک ایک پیسے اور کم زیادہ کے حصہ داروں کو جمع کر کے نہیں پوچھتا کہ اس طرح کے کام مجھے کرنے ہوتے ہیں، آپ سب ملکر مجھے اجازت دے دیں اس لئے کہ عام طور پر سب حصہ داروں کو یہ ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ اس طرح ذمہ دار شخص تصرف کرتا رہے گا جس پر کوئی مخالفت نہیں کرتا، آیا اس قسم کا کام صریح اجازت کے بغیر اور چندہ وغیرہ دکان میں سے دینا جائز ہے یا نہیں اور اس کے جواز کی کیا صورت ہے؟۔

شریک کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟

(۴) اگر ایک ہوٹل کے ۵، ۷ حصہ دار میں سے ایک کی وفات ہوگئی، مرحوم کے وارث موجود بھی ہیں، اب یہ وارث اس دکان میں مرحوم کے حصے کے پورے پورے نفع اور ملک میں حصہ دار ہوں گے یا نہیں؟ مرحوم کے انتقال کے بعد حصہ داروں نے اور ورثہ نے کوئی خلاصہ نہیں کیا اور ایک سال گذر گیا، تو جو نفع مرحوم کے حصہ کا ہوگا اس کے حق دار کون ہوں گے، وارث اس حصہ کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو شرعاً کیا حکم ہے اور دوسرے شرکاء اس کو باقی نہیں رکھنا چاہتے تو اس کا کیا حکم ہے واضح فرمادیں۔

غیر شریک کا شرکاء کے لئے تنخواہ پر کام کرنا:

(۵) ایک ہوٹل کو اس کے مالکان یا کرائے دار کئی سال سے چلاتے ہیں، اب وہ ضعیف اور کمزور ہوگئے، یا کسی وجہ سے چلانے کو تیار نہیں ہے، تو یہ سب ملکر کسی ایک باہر کے شخص کو جو حصہ دار نہیں ہے، ۱۵ پیسے نفع میں حصہ دیکر رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ آدمی اپنی ذمہ داری سے دکان سنبھالے گا اور جو نفع ہوگا اس میں ۱۵ فی صد وصول کرلے گا باقی مالکوں کو دے دے گا تو اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نفع کیساتھ روزانہ ۱۵ روپیہ تنخواہ بھی لیتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں؟

ہوٹل کی ذمہ داری ایسے شریک کو دینا جو نفع زیادہ دے:

(۶) ایک ہوٹل کے پانچ سات حصے دار ہیں ہر ایک حصہ دار یہ چاہتا ہے کہ دوکان کو میں سنبھالوں اور چلاؤں سب ملکر نہیں چلاتے، ایک شخص جو ذمہ دار ہوتا ہے وہی چلاتا ہے، جب آپس میں معاملہ طے نہیں ہوتا تو یہ شرکاء یہ شرط رکھتے ہیں کہ جو نفع زیادہ دینے کو تیار ہو اس کو دینا چاہئے، اب آپس میں بیٹھ کر طے کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے کو تیار ہوتا ہے، اس کو دوکان ایک متعین وقت کے لئے سپرد کرتے ہیں، آیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں ہے تو اس ہوٹل میں جو چیزیں موجود ہیں، مثلاً کرسی، میز، پنکھے جو چھت میں لٹک رہے ہیں اور الماری جو دیوار میں لگی ہے وغیرہ چیزوں کا جو زیادہ کرایہ دے اس کو ہوٹل چلانے کے لئے دیدیتے ہیں تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

مال اور عمل کے بغیر نفع میں شرکت:

(۷) زید کے پاس دوکان خریدنے کے لئے اتنی رقم تو نہیں ہے مگر اپنی وجاہت سے ادھار خریدتا ہے، پھر خریدنے کے بعد شرکاء تلاش کرتا ہے، اس میں سے دس فی صد پیسے اپنے لئے رکھتا ہے کہ تم لوگوں کو دوکان خرید کر تو میں نے دی ہے، لہذا بغیر راس المال کے دس پیسہ حصہ تم لوگ مجھے دیتے رہو اور تمام شرکاء اس کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں، تو اس طرح

سے معاملہ کرنا شرعاً کیسا ہے، اسی طرح اگر شرط اجارہ کی دکان میں کی جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

کھیت کو پیداوار کے ایک تہائی حصہ کی شرط پر سیراب کرنا:

(۸) میرا ایک ذاتی کنواں ہے اس میں کافی پانی ہے، دوسرے لوگ مجھ سے اپنے کھیت کو سیراب کرنے کے لئے پانی طلب کرتے ہیں تو میں پانی اس شرط پر دیتا ہوں کہ تمہارے کھیت میں جو اس پانی سے پیداوار ہوگی اس میں سے تیسرا حصہ مجھے پانی کے عوض میں دینا اور کھیت والا اسے خوشی سے منظور کرلیتا ہے تو شرعاً یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟

اور اگر ایک گھنٹہ کے دس روپئے کے حساب سے پانی دیا جاتا ہے تو اس سے کنویں والے کا نقصان ہوتا ہے بلکہ کھیت والے بھی اس پر خوش نہیں ہوتے اور اگر پانی نہ دیوے تو دوسرے لوگوں کے پاس چونکہ کنواں نہیں ہے یا اس میں پانی نہیں ہے، اس لئے پریشان ہوتے ہیں اور ان کے کھیت بے کار پڑے رہتے ہیں تو کیا ایسی مجبوری کی صورت میں شرعاً اوپر والا معاملہ کرنا درست ہے؟

مضاربت کے بعد ارباب مال، مضاربین اور راس المال میں اضافہ کا حکم:

(۹) عقد مضاربت تام ہوجانے کے بعد ارباب مال میں نیز مضاربین میں اضافہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

(۱۰) نیز عقد مضاربت تام ہوجانے کے بعد رأس المال میں اضافہ کرنا کیسا ہے بحوالہ کتاب جواب عنایت فرمائیں۔

محمد سلیمان بھاگلپوری

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اس سوال کے جواب سے پہلے چند باتوں کا معلوم ہونا ضروری ہے:

(۱) سلیمان نے ہوٹل پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ پیسے حصہ کو فروخت کیا ہے یا قبضہ سے پہلے؟

(۲) ابراہیم سے دکان چلانے کا معاملہ کب ہوا ہے اور یہ معاملہ سب شرکاء کے مشورہ اور رضامندی سے ہوا ہے یا صرف سلیمان کے ساتھ ہوا ہے۔

(۳) ابراہیم بھی ہوٹل کے شرکاء مالکین میں سے ہے یا نہیں؟

۲- یہ بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) روپئے سالانہ دینے کے لئے کہنا اگر شرط کے درجہ میں ہو، یعنی اگر نہ پاوے تو مطالبہ

کر سکے تو جائز نہیں، خواہ تنخواہ کے نام سے دیئے جائیں یا ہدیہ یا بخشش کے نام سے (۱) اور اگر محض وعدہ کے درجہ میں ہے اور محض تبرع ہے تو ہدیہ اور بخشش کے نام سے دینا جائز ہے اور اگر بغیر شرط اور وعدہ کے دیا جاتا رہے تو اور اچھا ہے، سوال کے آخر میں جو شرط ذکر کی گئی ہے وہ درست نہیں۔

اچھی صورت یہ ہے کہ محنت کرنے والے کا کچھ حصہ بڑھا دیا جائے اور ہر سال جدید معاملہ کیا جائے اور کام کرنے والے شریک کا کام دیکھ کر حصہ میں کمی وبیشی کردی جایا کرے (۲)۔

۳- ذمہ دار شریک جس کے پاس حساب رہتا ہے اور شرکاء کے درمیان نفع تقسیم کرتا ہے، اس کے لئے دکان کی مرمت کرنا اور کروانا اور سرکاری دفاتر سے متعلق کام کرنا اور کروانا درست ہے، ان چیزوں کے لئے صریح اجازت کی ضرورت نہیں، رہ گیا چندہ وغیرہ سو قیاس تو یہ ہے کہ اس مشترک ہوٹل میں سے دینا بغیر اذن صریح کے درست نہ ہو، مگر چونکہ تعارف ہے اور تعارف اذن صریح کے قائم مقام ہوا کرتا ہے، اس لئے استحسانا درست ہے، ”**ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يستأجر ويبضع**“ الخ (۳)۔

”**وكل ما كان لأحد أن يعمله إذا نهاه شريكه عنه لم يكن له عمله**“ (۴)۔

”**ولا يجوز لهما في عنان ومفاوضة تزويج العبد......... ولا الأمة اى لثوب ونحوه ولا القرض إلا باذن شريكه إذنا صريحاً (سراج) وفيه إذا قال له: إعمل برأيك فله كل التجارة إلا القرض والهبة وكذا كل ما كان إتلافاً للمال أو تمليكاً للمال بغير عوض، لأن الشركة وُضعت للإسترباح وتوابعه وما ليس كذلك لا ينتظمه عقدها**“ (۵)۔

”**قال في البحر: ولو قال كل منهما للآخر: إعمل برايك فلكل منهما أن يعمل ما يقع في التجارة كالرهن والإرتهان والسفر والخلط بما له والشركة بالغير لا الهبة والقرض وما كان إتلافا**

۱- ”وشرطها (الشركة) ..... وعدم مايقطعها كشرط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لأنه قد لا يربح غير المسمى، وحكمها الشركة في الربح“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۴۷۵)۔

۱- ”ومع التفاضل في المال دون الربح وعكسه“ (الدر المختار)، ”لكن هذا مقيد بأن يشترط الأكثر للعامل منهما أو لأكثرهما عملا“ (رد المحتار على الدر المختار ۶/ ۴۸۴ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۳- تنویر الابصار مع الدر المختار ۳/ ۳۴۴۔

۴- فتاویٰ عالمگیریہ ۲/ ۳۲۳، وتمام العبارة: فإن عمله ضمن لصيب شريكه۔

۵- الدر المختار علی ہامش الطحطاوی ۲/ ۵۲۰۔

للمال أو تمليكا من غير عوض فإنه لا يجوز مالم يصرح به نصا"(۱)۔

"قوله: وكذا كل ما كان إتلافا للمال ولو في وجوه الخير كوقف وبناء مسجد "(۲)۔

"ومنها لو باع التاجر في السوق شيئاً بثمن ولم يصرحا بحلول ولا تأجيل وكان المتعارف فيما بينهم أن البائع يأخذ كل جمعة قدراً معلوماً إنصرف إليه بلا بيان، قالوا لأن المعروف كالمشروط" (۳)۔

۴- شرکاءمیں سے کسی شریک کے انتقال کرجانے سے اس کے حق میں شرکت فسخ ہوجاتی ہےاوردوسروں کے حق میں فسخ وباطل نہیں ہوتی ہے وہ اگر اس کو باقی رکھنا چاہیں تو بلا تکلف باقی رکھ سکتے ہیں، پس اس شریک کے وفات پاجانے کی وجہ سے شرکت فسخ ہوگئی،مرحوم کی وفات کے وقت جس قدر ان کا حصہ تھا صرف اسی مقدار کے ورثہ حقدار ہیں، جب ورثہ نے دوسرے شرکاء کیساتھ ازسرنو مستقل عقد شرکت نہیں کیا ہے،تو مرحوم کے انتقال کے وقت سے ابتک جو ان کے چھوڑے ہوئے حصہ پر نفع ہوا ہے، اس کے حقدار ورثہ نہ ہوں گے،لیکن اس کو لیکر صدقہ کردینا ضروری ہوگا ان کے لئے (یعنی شرکاء کے لئے) مرحوم کے حصہ کا نفع حلال نہیں رہے گا، **"وتبطل الشركة بموت أحدهما وبجنونه مطبقا فالربح بعد ذلك للعامل لكنه يتصدق بربح مال المجنون(۴)(قوله لكنه يتصدق الخ) "والظاهر أنه يقال مثل ذلك فيما إذا تصرف أحدهما بالمال في صور بطلان الشركة المارة فإن الربح يكون للعامل ويتصدق بما ربح من مال الآخر"(۵)۔**

"(قوله وبجنونه) قال في البحر: سئل أبو بكر عن شريكين جن أحدهما وعمل الآخر بالمال حتى ربح أو وضع قال: الشركة بينهما قائمة إلى أن يتم إطباق الجنون فإذا مضى ذلك الوقت عليه قال: تنفسخ الشركة بينهما فإذا عمل بالمال بعد ذلك فالربح كله للعامل والوضيعة عليه وهو كالغصب لمال المجنون فيطيب له ربح ماله ولا يطيب ما ربح من مال المجنون فيتصدق(۶)۔

۱- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر مطبوعہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، البحر الرائق ۲۹۹/۵۔

۲- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر مطبوعہ المکتبۃ العربیہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، نیز الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۳۹۳" وفيه: وكذا كل ما كان إتلافاً للمال أو كان تمليكاً للمال بغير عوض لأن الشركة وضعت للاسترباح وتوابعه وما ليس كذلك لا ينتظمه عقدها"۔

۳- الاشباہ والنظائر طبع ادارۃ القرآن کراچی/ ۱۲۸، وطبع دیوبند/ ۱۵۲۔

۴- الدر المختار ۳/ ۳۸۴-۸۵۔

۵- رد المحتار ۳/ ۳۸۵۔

۶- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۲/ ۵۲۳۔

رہ گئی یہ بات کہ ورثہ شرکت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے شرکاء ورثہ کے ساتھ شرکت کو باقی رکھنا نہیں چاہتے، سو اس کا حکم یہ ہے کہ شرکت تو مرحوم کے وفات کے وقت فسخ و باطل اور معدوم ہو چکی ہے، اس باطل اور معدوم کو کس طرح باقی رکھیں گے، ہاں اگر ورثہ از سر نو دوسرے شرکاء کی رضامندی سے شرکت کا معاملہ کریں اور صحت شرکت کی جملہ شرائط پائی جائیں تو وہ اور بات ہے ورثہ کو اس بات کا حق نہیں کہ شرکاء کے ساتھ بغیر انکی رضامندی کے شریک ہو جائیں اور نہ ہی دوسرے شرکاء پر انکو شریک کرنا لازم ہے: ”**لأن كل واحدمختار في المعاملات مع الآخرين**“، البتہ مرحوم کا حصہ جو انکے انتقال کے وقت تھا، ورثہ ان کے حقدار ہیں وہ ان کو مل جائے گا، البتہ شرکاء کے لئے بہتر ہے کہ مرحوم کے ورثہ کو اگر کوئی مانع نہ ہو تو شریک کر لیں۔

۵- وہ شرکاء اس غیر شریک سے جو معاملہ کرنا چاہتے ہیں وہ مضاربت ہے، پس اگر صحت مضاربت کی ساری شرطیں پائی جائیں تو درست ہے ورنہ نہیں، مضاربت کی ایک شرط یہ ہے کہ راس المال اثمان میں سے ہو، اگر عروض میں سے ہے تو حیلہ کر لیا جائے، یعنی ارباب مال مضارب سے یوں کہیں کہ یہ سامان بیچ کر اس کے ثمن سے مضاربت کرو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نفع میں سے مضارب اور رب المال کے لئے جزء شائع ہی ہو، متعین مقدار نفع کی کسی کے لئے طے نہ کی جائے، پس اگر راس المال اثمان میں سے ہے، یا عروض میں سے ہے، لیکن حیلہ کر لیا گیا ہے اور نفع میں سے ارباب مال کی طرح مضارب کا بھی جزء شائع ہی ہو، ۱۰، ۱۵ پیسے یا ۲۰ پیسے وغیرہ تو درست ہے۔

اس مضاربت کی بنیاد پر نفع میں ۱۵ روپئے روزانہ مضارب کے لئے طے کرنا درست نہیں، اس سے مضاربت فاسد ہو جائے گی، البتہ مضارب کو ۱۵ پیسے حصے کے بجائے تیس پیسے حصے یا چالیس پیسے حصے وغیرہ متعین کر سکتے ہیں، اگر اس کو نفع کی تقسیم سے پہلے ہی پیسوں کی ضرورت ہو تو ارباب مال کی اجازت سے اپنے حصے میں سے کچھ لیتا رہے، پھر نفع کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے اتنا کم کر دیا جائے گا اور اس صورت میں نقصان مضارب پر نہیں ہوگا بلکہ ارباب مال پر بعد وضع نفع ہوگا ”**وشرطها أمور سبعة: كون رأس المال من الأثمان..... و كون الربح شائعاً فلو عين قدراً فسدت**“ (۱)۔

”**(قوله اشترلي عبداً) هذا يفهم أنه لو دفع عرضا وقال له: بعه واعمل بثمنه مضاربة أنه يجوز بالأولى، وقد أوضحه الشارح وهذه حيلة لجواز المضاربة في العروض**“(۲)، **وهكذا في البدائع عن**

۱- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۴/ ۴۸۵-۴۸۴۔
۲- رد المحتار ۴/ ۴۸۴ نقلاً عن الطحاوی۔

کتاب المضاربة مفصلاً و مدللاً(۱)۔

اس معاملہ کواجارہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس صورت میں نفع میں سے پندرہ پیسے حصہ اجرت کے لئے طے کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اجرت کا متعین اور معلوم کرنا ضروری ہے، اسی طرح مدت عمل کا بیان کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً یہ کہ پچیس روپے اور یا مثلاً ۵۰۰ سوروپے مہینے میں اس کو اجرت پر رکھا جائے اور اس سے بیع وشراء کا کام لیا جائے ، "**من دفع إلى حائک غزلا لينسجه بالنصف فله أجر مثله وكذا إذا استاجر حمارا يحمل عليه طعاما بقفيز منه فالإجارة فاسدة، لأنه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان، وقد نهى عليه السلام عنه .... والمعنى فيه أن المستاجر عاجز عن تسليم الأجر وهو بعض المنسوج أو المحمول وحصوله بفعل الأجير فلا يعد هو قادراً بقدرة غيره**"(۲) ۔

"**ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة .... والمنافع تارة تكون معلومة بالمدة**" **الخ** (۳)۔

"**(فرع) استوجر على أن يبيع ويشترى لم يجز لعدم قدرته عليه، والحيلة أن يستاجره مدة للخدمة ويستعمله في البيع زيلعي**" (۴)۔

مذکورہ صورت میں مضاربت بھی ہے اور اجارہ بھی ہے جو مدّ اخل صفقتین ہے، یہ وجہ بھی اس معاملہ کے نا درست ہونے کی ہے، پس یا تو اجارہ ہی رکھا جائے یا مضاربت ہی۔

۶- سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شریک کو دوسرے شرکاء جو ہوٹل چلانے کے لئے دے رہے ہیں، وہ اپنے حصوں کو کرایہ پر دے رہے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ ہوٹل مع اپنے الماریوں فرنیچر وغیرہ کے ان شرکاء کی ملکیت میں ہے تو دونوں صورتیں اپنی شرط (جس کا ذکر آگے آئے گا) کے ساتھ درست ہیں اور اگر وہ ہوٹل کرایہ کا ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر انہوں نے ہوٹل میں کچھ اصلاح کی ہے یا الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں اور اب شریک کے ساتھ زیادتی اجرت کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں تو درست ہے اور اجرت زائدہ حلال وطیب ہے اجرت زائدہ کا الماریوں وغیرہ

۱- دیکھئے بدائع الصنائع ۵/ ۱۱۳۔
۲- ہدایہ مع الفتح کتاب الاجارۃ ۸/ ۱۸۸۔
۳- ہدایہ ۳/ ۲۷۰۔
۴- الدر المختار ۴/ ۳۶۰۔

کے مقابلہ میں مقرر کرنا ضروری نہیں البتہ ایسا کرلینا بہتر ضرور ہے اور اگر نہ کچھ اصلاح کی ہے اور نہ ہی الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں تو اجرت زائدہ دوسرے شرکاء کے لئے حلال نہیں ہوگی، اس کا صدقہ کردینا واجب ہوگا، اس معاملہ کی جو صورتیں درست ہیں، ان میں بھی شرط یہ ہے کہ اجرت نفع میں سے متعین نہ کی جائے بلکہ مطلقاً روپے متعین کرلئے جائیں، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو اجارہ فاسد ہوجائے گا کمافي الهنديه قوله: " وأجمعوا أنه لو آجر من شريكه يجوز سواء كان مشاعاً يحتمل القسمة أو لا يحتمل وسواء آجر كل نصيبه أو بعضه كذا في الخلاصة" (۱) ولما مرفي الجواب:عن السوال الرابع من الدر المختار ورد المحتار وأصول الكرخي، ولما في الدر المختار من قوله :"ولو دفع غزلاً لآخر لينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أو إستأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثوراً ليطحنَ بُرّه ببعض دقيقه فسدت في الكل، لأنه إستأجر بجزء من عمله والأصل في ذلک نهيه ﷺ عن قفيز الطحان وقدمناه في بيع الوفاء والحيلة ان يفرز الأجر أولا أويسّمي قفيزاً بلا تعيين ثم يعطيه قفيزاً منه فيجوز" (۲)۔

اوراگر سوال کا مقصد کچھ اور ہو تو واضح کیا جائے تاکہ حکم معلوم کیا جاسکے۔

۷- نفع میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ تین چیزوں میں سے ایک چیز پائی جائے: مال ہو یا عمل ہو، تقبل وضمان ہو اور زید کا ان تینوں چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لہذا یہ شرکت فی النفع درست نہ ہوگی اور زید کسی مقدار نفع کا مستحق نہ ہوگا اور نہ زبردستی ان سے لے سکتا ہے، "وفي الدر: لا يستحق الربح إلا بإحدى ثلاث: بمال أو عمل أو تقبل" (۳)۔

"وقال في الدر: ولذا لو قال لغيره: تصرف في مالک على أن لي بعض ربحه لا يستحق شيئاً لعدم هذه المعاني" (۴)۔

البتہ زید نے شرکاء پر شراء یا اجارۂ دکان کا انتظام کرکے تبرع اور احسان کیا ہے، اگر اس کے عوض میں بطیب خاطر اتنا حصہ یا جس قدر چاہیں اور جب تک چاہیں دیا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ حکم مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

۱- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۴۸۔
۲- الدر المختار ۵/ ۳۶ نعمانیہ۔
۳- الدر المختار ۳/ ۳۴۹۔
۴- رد المحتار ۳/ ۳۴۹۔

”ولو عمل من غير شرط وأعطاه شيئاً لا بأس به لأنه عمل معه حسنة فجازاه خيراً“(۱)، دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے۔

۸-کنویں کا مالک اس کے پانی کا مالک نہیں ہوتا کہ اس کی بیع صحیح ہو، ہاں اگر اس کو کسی آلے سے نکال لے تو مالک ہو جائے گا، پس اگر اپنی مشین یا رہٹ وغیرہ سے نکال دیتا ہے اور اجرت بھی مطلقاً متعین کرتا ہے نہ کہ پیداوار کا جزو شائع مثلاً دس روپیہ گھنٹہ یا پچاس روپیہ بیگھا متعین کرتا ہے تو درست ہے ورنہ درست نہیں، پس یہ معاملہ مذکورہ درست نہیں، ہے سوال میں جو مجبوری ذکر کی گئی ہے وہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس سے جواز کا حکم نکال لیا جائے، **”وقال الرملي: صاحب البئر لا يملك الماء“**(۲)۔

”ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة“ (۳) **”فيصير بمعنى قفيز الطحان وقد نهى عليه السلام عنه، والمعنى فيه أن المستاجر عاجز عن تسليم الأجر“**(۴)۔

جواب نمبر ۱۰ و ۱۱- الدر المختار ورد المحتار کے کتاب المضاربۃ والفتاوی الہندیۃ ۴/ ۵۲۲ اور قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب مال اور مضاربین کے مشورہ سے بیاضا۔نے ہو سکتے ہیں (۵)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۲ھ

شرکاء میں سے کسی شریک کا مال شرکت میں سے کچھ اپنے مصرف میں لانا:

۱-ایک کمپنی جو کہ بہت سے افراد کے حصص سے بنی ہے کی رقم میں سے جانے انجانے کچھ رقم ذمہ داران کے ذاتی مصرف میں بھی آجاتی ہے جس کا حساب میں آنا ممکن نہیں ہوتا (ذمہ داران کچھ رقم بنا حساب بھی خرچ کرتے ہیں) کیا یہ کوئی

۱- رد المحتار ۴/ ۳۸۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۲۵۸ نیز علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: ”وهذا ما دام في البئر، أما إذا أخرجه منها بالإحتيال كما في السواني فلا شك في ملكه له لحيازته له في الكيزان ثم صبه في البرك بعد حيازته“(۷/ ۲۵۸ مکتبہ زکریا)۔

۳- ہدایہ ۳/ ۲۹۳ کتاب الاجارات یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند۔

۴- ہدایہ ۳/ ۲۷۷۔

۵- تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۸/ ۴۳۵،........ ”ولا يملك المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن أو إعمل برأيك“۔

گناہ تو نہیں؟

۲- مزید جو حصص حصہ داران لیتے ہیں ان پر کچھ فائدہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کہ حسابات سے پرے ہوتا ہے اور ان کے اندراجات نہیں ہوتے ان کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ (یہ بات ظاہر ہے کہ جو بھی حصص حصہ داران خریدتے ہیں وہ ان کے بدلے صرف اندراجی حسابات کے فائدہ میں حصہ دار ہوتے ہیں اور حصص خریدتے وقت یہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ وہ صرف اندراجی فائدہ میں حصہ دار ہوں گے)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جو رقم انجانے میں اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہوجاتی ہو اس پر تو عنداللہ مواخذہ نہیں، البتہ اس کے بارے میں کوشش یہ دہنا چاہئے کہ اس طرح بھی کوئی رقم اپنے اوپر خرچ نہ ہو، نیز اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ اس کے وبال سے ہمیں بچائیے اور اس طرح بھی کوئی رقم خرچ نہ ہو تو پھر معاملہ آخرت کا بالکل صاف رہے گا (۱) اور جو رقم جانتے بوجھتے اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہوجاتی ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک اندازکر کے جتنی رقم جس کے حصے کی خرچ ہوجاتی ہو اور وہ اندراج میں نہ آسکتی ہو اندراج میں لانے میں کوئی قانونی گرفت یا اور کوئی پریشانی آسکتی ہو تو اندراج میں لائے بغیر اتنی رقم خواہ ہدیہ و تحفہ ہی کے نام پر ہو اصل مالک کی ملک میں پہنچا دینا آخرت کے حساب سے برأت کے لئے کافی ہوگی۔ اور ایسا کر لینے سے حقوق العباد کے تلف کا انشاء اللہ کوئی گزند نہ ہوگا (۲)۔

۲- جو فائدہ حسابات سے پرے ہو کسی مصلحت یا مجبوری سے اندراج میں نہ آتا ہو تو اسکا حکم شرعی یہ ہے کہ اندازہ کر کے جس حصہ دار کی جتنی رقم اس فائدہ کی رقم میں آتی ہو اتنی رقم تحفہ ہدیہ کے نام پر ان کی ملک میں پہنچا دے، پھر اگر ذمہ داران کو یہ معلوم ہو کہ ہم کو صرف اندراجی حساب کا فائدہ ملے گا زائد نہیں ملے گا اور اس علم کے باوجود حصہ خریدتے ہوں تو یہ سکوت اذن حالی کے درجہ کی چیز ہوگی اور اس صورت میں حسابات سے پرے والی رقم حسب طریق بالا ان تک پہنچانا

۱- حدثنا عبد الله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: "لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباً أو جاداً فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه" (سنن الترمذی ۴/ ۶۲ ۴ کتاب الفتن باب ماجاء لا یحل لمسلم أن یروع مسلما حدیث: ۲۱۶۰)۔

۲- ويجب رد عين المغصوب ما لم يتغير تغيراً فاحشاً، مجتبى، في مكان غصبه لتفاوت القيم باختلاف الأماكن، ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/ ۲۶۶)۔

تفقو ئی ہوگا ورنہ ازروئے فتوی کسی حیلہ سے اس کی ملک میں پہنچانا واجب رہے گا۔ ورنہ عند اللہ مواخذہ ہوگا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیشن کی شرط پر کمپنی میں شرکت:

ایک کمپنی جو کہ مثال کے طور پر ۵۰۰ افراد کے اشتراک سے مختص ہے اور ہر فرد کچھ مخصوص رقم لگاتا ہے، اس مخصوص رقم پر یہ طے پایا جاتا ہے کہ اگر:

۱۔ تجارت ۱۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۰% کمیشن ملے گا۔

۲۔ ۱۱ سے ۲۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۱% 〃 〃

۳۔ ۲۰ سے ۳۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۲% 〃 〃

۴۔ ۳۰ سے ۴۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۳% 〃 〃

اور حد سے حد کمیشن ۱۵% تک ہوگا۔ کیا یہ کمیشن کی ادائیگی Interest تو نہیں مانی جائے گی (یہ بات مسلمہ ہے کہ کمپنی کی تجارت اس حد سے کم نہ ہوگی

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ دس فیصد یا گیارہ فیصد یا جتنا فیصد بھی ہو اگر یہ فیصد محض نفع کا فیصد ہوتا ہے تو یہ نفع ہرگز سود میں نہیں آتا ہاں اگر بجائے نفع کے فیصد کے کل رقم کا فیصد مانا جائے تو ربو اشرعی کا شبہ ہو جاتا ہے جس سے بھی بچنا ضروری ہے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۶/۳۰ھ

۱- حوالہ بالا، نیز "وکذا لو سلمه إليه بجهة أخرى كهبة أو إيداع أو شراء وكذا لو أطعمه فأكله خلافاً للشافعي" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۶۷)۔

۲- کیونکہ یہ مخصوص رقم پر مشروط نفع ہو کر "كل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً" (رد المحتار على الدر المختار ۷/۳۹۵) کے دائرہ میں آجاتا ہے۔

شرکت کی ایک خاص اسکیم:

دوسو افراد نے بیس ماہ کی ایک اسکیم بنا رکھی ہے اس طریقہ پر دوسو افراد میں سے ہر ایک فرد نے بیس بیس روپیہ جمع کیا، یہ تمام رقم ایک شخص کے پاس ہی ان دوسو افراد میں سے رکھدی گئی اور ہر ماہ وہ ہر شخص سے بیس بیس روپیہ جمع کرائے یہ طے ہوگیا اور ہر مہینہ قرعہ اندازی ہوگی جس میں دوسو افراد کے ناموں کی پرچی ہوگی جسکا نام نکلے گا اس کو ایک ہیرو سائیکل دی جائے گی، اب یہ انعام پانے والا سائیکل حاصل کرنے کے بعد چاہے اس اسکیم میں شامل رہے اور چاہے شامل نہ رہے اگر شامل رہنا چاہتا ہے تو پھر سے اس کو ہر ماہ کے حساب سے بیس روپیہ جمع کرنے پڑیں گے، اس طرح اگر اس کا نام ابھی اسکیم شروع ہونے کے دوماہ بعد نکلا تو اس نے سائیکل حاصل کرلی گویا کہ اس ۴۰ روپیہ میں چارسو کا مال حاصل کرلیا اب پھر وہ اسکیم میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو ان دوماہ کے پیسے جو کہ وہ جمع کر چکا تھا، ازسر نو جمع کرنے ہوں گے اور اگر پھر انعام نہیں نکلا تو آخر میں بیس ماہ پورے ہونے کے بعد ایک سائیکل ملے گی، خلاصہ اسکیم دوسو افراد کی ہر ماہ بیس روپیہ جمع ہر ماہ قرعہ اندازی انعام اور جس کا انعام میں نام نہ آئے تو بیس ماہ پورے ہونے کے بعد سبکو سائیکل مل جائے گی ہیرو، اب جس کے پاس پیسے رہیں گے وہی سائیکل کا ذمہ دار ہے اور انعام تو وہ بیس ماہ تک اس رقم سے کاروبار بھی کرتا ہے معلوم کرنا ہے کہ یہ طریقہ اسکیم کا کیا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کا اس رقم سے کاروبار کرنا کیسا ہے۔

مولانا خلیل الرحمن (مہتمم مدرسہ مرادیہ مظفر نگر یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

اگر دوسو افراد نے بیس بیس روپیہ جمع کئے تو ایک ہی مرتبہ میں چار ہزار روپئے ہوگئے اگر بیس ماہ تک یہ طریقہ رہا تو اسی ۸۰ ہزار روپئے ہوگئے، پہلا سوال یہ ہے کہ یہ روپئے خواہ چار ہزار ہوں یا اسی (۸۰۰۰۰) ہزار کس کے شمار ہوں گے، اگر سب کے شمار ہوں گے اور اس سے مشترک کاروبار ہوگا (۱) پھر اس قرعہ اندازی میں جسکا قرعہ نکلے اس کو انعام میں سائیکل دینے کے کیا معنی؟ اگر کوئی فرد چند ماہ بعد قرعہ میں نام آئے ہوئے نکلے تو اس کے لئے کیا قاعدہ رکھا ہے پھر کوئی شخص درمیان میں آجائے تو اس کے لئے کیا قاعدہ ہے وغیرہ وغیرہ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کے لئے ضابطہ مقرر کئے بغیر

۱- ''وحکمها الشركة في الربح'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۴۷۵)۔

یہ معاملہ خالص قمار اور ربو محرم کی ایک شکل ہوگی اور قطعاً حرام و ناجائز ہوگی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۲/۱۴۰۰ھ

چوری کے مال سے قرض کی ادائیگی:

سلیمان زید کا مقروض تھا، اپنی قرض کی ادائیگی کے لئے سلیمان نے زید کو مال (متاع) تجارت دیا، زید نے اس مال میں سے بعض اپنی دوسری دکان میں بھیج دیا اب چند ماہ کے بعد زید کو علم ہوتا ہے کہ وہ مال جو سلیمان نے ان کو دیا تھا وہ مال سرقہ ہے، زید کو کیا کرنا چاہیے کہ اگر مذکورہ صورت میں زید نے پورے مال کو فروخت کرلیا تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

محمد ابراہیم افریقی (متعلم دار الافتاء، دار العلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) سلیمان نے جو مال تجارت زید کو اپنے قرضہ کی ادائیگی میں دیا تھا، اس مال کے بارے میں اگر سلیمان نے منع کر دیا تھا کہ اس کو کسی دوسرے کے ذریعہ مت فروخت کرانا جب تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر واجب ہوگا۔ اور اگر سلیمان نے زید کو منع نہیں کیا تھا تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر شرعاً واجب الاداء نہیں ہے۔ باقی اگر زید خود نقصان کی تلافی کردے تو یہ اس کا تبرع واحسان ہوگا (۲)۔

(۲) اگر زید نے اس پورے مال کو فروخت کرلیا تو اپنے قرض کی مقدار خود رکھ کر بقیہ سلیمان کو واپس کردے اور اگر کل مال فروخت کرنے پر بھی سب قرض وصول نہیں ہوا اور فروخت کیا مناسب قیمت پر تو باقی ماندہ کا مطالبہ سلیمان سے کرسکتا ہے بشرطیکہ کل قرض کے عوض میں یہ لیا ہوا مال محسوب کر کے نہ لیا ہو ورنہ اگر کل قرض میں محسوب کر کے وہ مال لیا تھا تو

۱- عن أبي هريرة قال: "نهى رسول الله ﷺ عن بيع الغرر وبيع الحصاة" (سنن الترمذي ۳/ ۵۲۳ كتاب البيوع باب ما جاء في كراهية بيع الغرر حديث ۱۲۳۰)، "يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون" (سورہ مائدہ ۹۰)۔

۲- "ويجب على المرتهن أن يحفظه بنفسه وعياله كما في الوديعة وضمن إن حفظ بغيرهم كما مر فيها وضمن بإيداعه وإعارته وإجارته واستخدامه وتعديه كل قيمته فيسقط الدين بقدره (الدر المختار) وفي الشامي: "وتعديه" عطف عام على خاص أي كالقراءة والبيع.... الخ" (رد المحتار علی الدر المختار ۱۰/ ۹۱)۔

اب زید باقی کا مطالبہ نہیں کرسکتا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱۲/۲۰ھ

غیر مسلم کمپنی سے شیئرز لینا:

ایک غیر مسلم کمپنی غیر مسلم ممالک میں سودی کاروبار کرتی ہے اور مسلمان اس کمپنی کو روپے دے کر شیئرز لیتا ہے، تو شیئرز لینا مسلمان شخص کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ نیز کمپنی کو نفع زیادہ ہونیکی صورت میں شیئرز دار کو نفع زیادہ ملتا ہے اور کمپنی کو نفع کم ہونے کی صورت میں شیئرز دار کو بھی نفع کم ملتا ہے اور کمپنی کو نقصان ہونے میں نفع نہیں ملتا، نیز ایک مسلمان دوسرے مسلمان کمپنی سے شیئرز لے تو جائز ہے یا نہیں؟ مدلل ومکمل جواب عنایت فرمائیں، نیز اگر شیئرز لینا جائز ہے تو اس پر زکوۃ ہے یا نہیں؟

رشید احمد موسیٰ فریقی (متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

غیر مسلم کمپنی سے شیئرز لینا جائز ہے اگرچہ یہ کمپنی دوسری کمپنی یا کسی بینک وغیرہ سے سودی معاملہ کرتے ہوں، لہذا ہمارا کاروبار اس کمپنی سے جائز ہے، کیونکہ ہمارے اور کمپنی کے مابین سودی معاملہ نہیں ہے، باقی رہا مسلمان سے مسلمان کا شیئرز لینا اگر دونوں کے مابین سودی کاروبار نہیں ہے اور کسی غیر شخص وغیرہ کا کاروبار بھی سودی نہیں جس سے اس کا تعلق کاروبار میں ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، لہذا اس شیئرز کے مال تجارت میں زکوۃ ہے اور ادا کرنا ضروری ہے۔

"وفي المبسوط (۲۲/۱۲۵) يكره للمسلم أن يدفع إلى النصر اني مالا مضاربة وهو جائز في القضاء"۔

"وإن كان غالب مال المهدى من الحلال لا باس بأن يقبل الهديه، ويأكل مالم يتبين عنده أنه حرام لأن أموال الناس لا تخلوا عن قليل حرام فيعتبر الغالب"(۲)۔

۱- "فيسقط الدين بقدره أي يسقط الدين جميعه بقدر ما ضمن وإلا رجع كل منهما على صاحبه بما فضل" (رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۹۱)۔

۲- كتاب الحظر والإباحة ما يكره أكله وما لا يكره وكذا في مجمع الانہر ۴/۲۹۵ كتاب الكراهية فصل في الأكل وكذا في الفتاوى العالمگیریہ ۵/۳۴۳

"اذا خلط الوكيل دراهم الربوا بعضها ببعض الدراهم اللتي أخذ ها من حلال يجوز اخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكا عند الإمام لاسيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مطهر عندنا، كما إذا بال البقر في الحنطة وقت الدياسة فاقتسمها الملاك حل لكل واحدا كلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أورثت احتمالا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا إذا اربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم "والله اعلم(۱)۔

مال تجارت پر زکوۃ ہے جب کہ بقدر نصاب ہو اور جو نقد پس انداز ہو اس میں بھی زکوۃ ہے جب کہ بقدر نصاب ہو اور حولان حول ہو گیا ہو اور جو رقم منافعہ میں آئی ہے اس پر بھی زکوۃ ہے جب کہ مال تجارت اور منافع مجموعہ بقدر نصاب ہو یا خریدار کے پاس پہلے سونا یا چاندی یا نقد بقدر نصاب موجود ہو اور اثنا حول میں یہ بھی اس کے ساتھ مل جائے تو مجموعہ ہر سال تمام پر زکوۃ واجب ہوگی "ولعل هذا الظاهر "والله تعالىٰ اعلم (۲) مال تجارت سے مراد مشتری وعمارت نہیں ہے بلکہ مال تجارت سے مراد میٹریل اور سامان تجارت ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مضاربت کی مختلف صورتیں اوران کے احکام:

زید نے ایک کمپنی حکومت کی اجازت سے بنائی جو کہ عمانی ہے، اس کمپنی کو چلانے کے لئے اس نے ایک آدمی ہندوستان سے ویزہ پر بلایا تا کہ وہ کمپنی اس کی نگرانی میں چلائی جا سکے، لیکن بعد کو زید اس کے نگراں سے یہ کہتا ہے کہ تم مکمل ہماری کمپنی کو چلاؤ میں تم کو تنخواہ نہ دے کر پوری کمپنی سپرد کرتا ہوں بصرف تم مجھ کو منافع کا دس فیصد یا جو بھی مقرر کر دے دیا کرو، ایسا کرنا زید کا درست ہے اور منافع کی وہ رقم جائز ہوگی یا ناجائز؟

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا ٹھیکہ زید کو اس کی کمپنی کی معرفت ملتا ہے جس میں کچھ رقم زید اپنی دے کر نگراں سے کہتا ہے کہ تم اس رقم کی مقدار سے مجھکو نفع دے دو تو کیا یہ جائز ہے؟

کتاب الکراهیۃ الباب الثانی عشر۔

۱- امداد الفتاوی ۳/ ۹۲ ۴۔

۲- امداد الفتاوی ۳/ ۹۸ ۴۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ زید اپنے نام پر ٹھیکہ لے کر اپنے نگراں کو دے دیتا ہے اور اس میں اپنی کوئی رقم نہیں لگاتا اور کام کی تکمیل سے پہلے ہی اس سے اصل ٹھیکہ کی رقم کا بیس فیصد یا دس فیصد لے لیتا ہے اور نگراں کے نقصان کا وہ شریک نہیں ہوتا تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی؟

۴۔ زید نے حکومت سے تجارت کی اجازت حاصل کی جو عمانی ہے، دوسرے کسی آدمی سے زید نے کہا کہ تجارت کے لائسنس پر جو بھی تجارت کروگے بغیر کسی رقم کے ذمے میں اس میں بیس ۲۰ فیصد یا دس فیصد منافع لونگا، تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی جو صرف لائسنس کی وجہ سے مل جاتی ہے۔

۵۔ زید اپنے کام کے نام پر ایک آدمی کو ہندوستان سے بلاتا ہے، اس آدمی کے آجانے کے بعد زید اس سے کہتا ہے کہ تم کو اختیار ہے کہ تم جہاں چاہو ملازمت کرو تو کیا یہ کمیشن زید کے لئے جائز ہے یا ناجائز؟

۶۔ زید اپنی تجارت کے لائسنس پر ایک ٹھیکہ لیکر بکر کو دے دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرے پاس چونکہ رقم نہیں ہے تم اپنی رقم اس پر خرچ کرو بعد کو جو اس ٹھیکہ سے نفع حاصل ہوگا اس نفع میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں یا دونوں فیصد مقرر کر لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس میں نقصان ہو تو ہم دونوں اس کنٹیکٹ (معاہدہ) کے اعتبار سے نقصان میں بھی برابر کے شریک ہیں، تو کیا زید کا اس طرح سے نفع کمانا جائز ہے؟ جبکہ نفع اور نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوں۔

واضح ہو کہ یہاں حکومت عمان میں قانوناً اس طرح کی کوئی مشارکت خارجیوں کے ساتھ کرنا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنا ہے اور اگر کوئی قانون یا معاملہ شرعی طور پر جائز ہے اور حکومت اس کے خلاف اپنا الگ الگ ملکی قانون بناتی ہے تو کیا اس کی پابندی وہاں کے رہنے والوں پر شرعاً عائد ہوتی ہے یا نہیں؟۔

مولانا محمد تحسین اشرف صاحب (جعلان عمان)

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ اس معاملہ کا حاصل یہ نکلے گا کہ سرمایہ ٹھیکہ دار کا ہوگا اور عمل نگران کا ہوگا اور نفع میں دونوں مثل عقد مضاربت کے شریک ہوں گے، اس لئے یہ معاملہ اس تاویل سے جائز رہے گا اور منافع کی رقم کو حسب معاہدہ وشرائط لینا دونوں کے لئے جائز رہے گا(۱)۔

۱-　　”ولو قال: خذ هذا المال واعمل به على ان مارزق الله عز وجل من شئ فهو بيننا على كذا ولم يزد على هذا فهو جائز“ (بدائع الصنائع ۱۰۹/۵، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲۔ یہ معاملہ بھی بہ تاویل جائز ہو سکے گا اور تاویل یہ ہوئی کہ ٹھیکیدار کو تو حق و اختیار ہونا ظاہر ہے کہ وہ اپنا سرمایہ لگائے اور اپنا ہی عمل کرے اور نفع خود لے، اسی طرح ہر انسان کو اختیار ہے کہ اپنا حق بالکل سوخت کر دے یا دوسرے شخص کو محض عمل کا اختیار بطریق مضاربت دیدے جیسا کہ مسئلہ ا۔ میں مذکور ہے یا اپنا حق بالکل سوخت کر کے اپنا حق و اختیار اور عمل سب دوسرے کو تفویض کر دے پس جب ٹھیکیدار یہ کل حق و اختیار نگراں کو تفویض کر دے، تو شرعاً یہ بھی جائز رہے گا اور یہ فعل ٹھیکیدار کا بحق نگراں تبرع ہوگا اور وہ جائز رہے گا۔

پھر ٹھیکیدار نے جو چیز سرمایہ کی مقدار نگراں کو دیا ہے، اگر بطور قرض دے جب تو اس پر نفع لینا ''**کل قرض جو نفعاً فھو ربوا**'' کے مطابق ربا ہوگا اور نا جائز ہوگا اور اگر بطریق مضاربت دے تو یہ دینا درست رہے گا اور بحکم مضاربت اس مقدار کے نفع میں دونوں حسب معاہدہ شریک ہوں گے، لیکن جب مضارب اپنا حصہ نفع بھی ٹھیکیدار کو دے دیگا تو یہ مضاربت کا تبرع اور اپنا حق سوخت کر دینا ہوگا اور چونکہ بطیب خاطر ہوگا، اس لئے یہ تبرع اس کے تبرع کا بدل ہو کر دائرہ شرع میں داخل ہو کر جائز ہو سکے گا۔

اگر ٹھیکہ کی نوعیت معلوم ہو جائے کہ کس کام کا ٹھیکہ ہے اور کیا کرنا ہوگا اور کل سرمایہ کتنا لگے گا تو تھوڑے تغیر کے ساتھ عقد و شرکت کا معاملہ بھی ہو سکے گا۔

۳۔ یہ صورت شرعاً نا جائز ہوگی۔

۴۔ یہ بھی اس مذکور طریقے سے نا جائز ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دو یا تین یا چند آدمی ملکر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق تجارت کرنا چاہیں اور قانونی مجبوری سے لائسنس صرف ایک آدمی کے نام لے لیا جائے، پھر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق وہ سب مشترک تجارت کریں۔

۵۔ یہ صورت بھی نا جائز ہے۔

۶۔ یہ بھی شرعاً درست نہ ہوگا۔

نوٹ:۔ کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو مگر خارجی ہونے و نہ ہونے کی قید خلاف شرع یا کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو اور خارجی وغیر خارجی ہونے کی قید کے بغیر خلاف قانون حکومت ہو تو فی نفسہ اگر چہ مباح ہو لیکن قانون حکومت کے خلاف ہونے کی وجہ سے عزت آبرو یا مال خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو چونکہ مال و عزت و آبرو کی حفاظت واجب ہے اور کسی خلاف قانون معاملہ کا کرنا واجب نہ ہو بلکہ صرف اباحت کی حد تک ہو تو اس مباح کے لئے واجب کو نہیں چھوڑا جاتا ہے اور اجازت نہیں دی

جاسکتی۔

اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنی عزت وآبرو وغیرہ بچاتا ہے تو عند اللہ مواخذہ نہ ہوگا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/ ۱۴۰۴ھ

مقروض کا ادائیگی قرض کے وقت اپنی خوشی سے کچھ رقم زائد دینا:

۱-بینک اور ڈاکخانہ میں جمع کردہ رقم پر ملنے والے سود کے بارے میں یہ مسئلہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے لے لینا چاہئے اور بلانیت ثواب غریب مسلمانوں پر تقسیم کردینا چاہئے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کی رقم کسی کافر پر باقی تھی عرصہ کے بعد وہ ادا کرتا ہے اور اپنے دستور کے مطابق اپنی خوشی سے سود بھی دیتا ہے تو آیا اس سے بھی سود کی رقم لے کر غریب مسلمانوں پر صرف کردینا چاہئے، اسی طرح مالدار مسلمان یا کافر پر زید کی رقم باقی تھی جس کو وہ نہیں دیتا تھا، چنانچہ زید نے بذریعہ عدالت اس پر ڈگری حاصل کی اور عدالت نے تجویز کیا کہ زید کو فلاں کافر کا فلاں مالدار مسلمان اتنی رقم اور اتنا سود ادا کرے تو زید سود کی رقم اس کافر یا اس مالدار مسلمان سے لے کر غریبوں پر تقسیم کرسکتا ہے یا کہ نہیں یا صرف اصل رقم لے اور سود چھوڑ دے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک وغیرہ کے سود پر جو مسئلہ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے اور اگر کوئی غیر مسلم بلا کسی دباؤ یا مقدمہ وغیرہ کے محض اپنی خوشی اور رضامندی سے کچھ زائد رقم دیتا ہے تو موجودہ بھارت میں اس پر سود کا حکم ہے ہی نہیں وہ بالکل حلال وطیب ہے، البتہ کسی مسلمان سے اس طرح بھی لینا جائز نہیں۔اگر کوئی مسلمان نادھند ہو اور بلاعدالت ومقدمہ کے وصول نہ ہو اور عدالت میں سود سے مفر نہ ہو تو پہلے اس کو اطلاع دے کر متنبہ کردے کہ ہماری اصل رقم اگر تم نے اتنی مدت میں ادا نہیں کی تو غیر مسلم کے حوالہ تمہارا معاملہ کردوں گا پھر وہ تم سے مع سود در سود کے بھی وصول کرسکتا ہے اور تم خود اس سود دینے دلانے کے ذمہ دار ہوگے مجھ سے مطلب نہ ہوگا، اب اگر وہ اس تنبیہ کے بعد بھی مدت مقررہ کے اندر نہ دے تو اسکے ساتھ بھی وہی صورت اختیار

کر لے جائے جو اوپر گذرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند سہارنپور ۱/ ۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیو بند

مشترکہ کاروبار سے متعلق ایک اہم فتویٰ:

۱۔عمر اور بکر نے پچیس پچیس ہزار روپے جمع کر کے کپڑے کی تھوک تجارت کرنا طے کیا، جس میں عمر کے صرف پچیس ہزار روپے لگیں گے، اور عمل ومحنت، خرید فروخت وغیرہ کچھ نہیں لگیں گے، اور بکر کے پچیس ہزار اور خرید فروخت وغیرہ میں ہر قسم کی محنت اور عمل لگے گا، عمر کا چونکہ صرف روپیہ ہے اور بکر کا روپیہ اور عمل دونوں ہیں، نفع کی تقسیم اس طرح پائی کہ عمر کو نفع کا ۳۰ رفیصد اور بکر کو ۷۰ رفیصد ملے گا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح دونوں کو از روئے شرع معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں، اور بصورت نقصان کس نسبت اور حساب سے دونوں کے حصہ میں نقصان آئے گا؟

۲۔یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ بکر اس مشترک مال کو دوسرے گاہکوں کو بیچے گا، تو کیا وہ خود اپنی خوردہ فروش دکان کے لیے بھی اسی قیمت پر جس میں دوسرے گاہکوں کو بیچ رہا ہے، اس مال میں سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔صورت مسئولہ میں ''الربح علی ما اشترطا'' کے حکم سے ایک کا نفع ستر فیصد اور دوسرے کا یعنی جس کی محنت نہ ہوگی، صرف بضاعۃ و پونجی میں شرکت ہوگی اس کا محض تیس فیصد نفع لینا صحیح رہے گا۔ باقی نقصان میں حکم یہ ہے کہ ہر ایک کا نقصان اس کے راس المال (پونجی) کے مطابق ہوگا، پس جب دونوں کے ۲۵/ ۲۵ رہزار (برابر، برابر) لگے ہوئے ہیں تو نقصان دونوں پر برابر رہے گا(۱)۔

۲۔یہ معاملہ اپنے شریک کے اذن حال یا مقال کے ذریعہ طے ہوسکتا ہے اور بغیر اذن حالی یا مقالی کے نہیں

۱۔ ''ولا خلاف أن اشتراط الوضیعة بخلاف قدر رأس المال باطل، واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحیح'' (فتاویٰ شامی ۷/ ۳۳۴/ ۳ بحث شرکۃ العقد) وهکذا الیضاً فی صفحہ، ۳۰۴ مطلب شرکۃ العنان، (مرتب)۔

لے سکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور، ۹/۸/۹/۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

تقسیم شئی مشترک کا ایک خاص فیصلہ:

دو بھائیوں کے درمیان ایک مکان ارث میں آیا۔ مکان کی پوزیشن اس طرح واقع ہوئی ہے کہ مکان کے دو حصے ہیں، ایک حصہ دوسرے حصہ سے عمدہ اور اچھا ہے اور اس کی قیمت بھی دوسرے سے زیادہ ہے، چنانچہ عمدہ حصہ لینے والے کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسرے حصہ والے کو بارہ ہزار زائد دے گا اور اچھے حصے کے ایک کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے، آفس بدستور رہے گا، بلکہ کرایہ اس کو دیا جائے گا جس نے اس اچھے حصہ کو خریدا ہے وہ اس کو کبھی اس کمرہ سے نکلنے کے لئے نہیں کہے گا، اس شرط پر دونوں بھائی راضی ہوگئے اور معاملہ طے ہوگیا۔ اس طرح مکان تقسیم ہوگیا۔ اب جس نے اچھا حصہ لیا تھا دوسرے بھائی کو آفس سے نکلنے کے لئے کہہ رہے ہیں، حالانکہ وہ کرایہ برابر دیتا ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں اس طرح نکالنا جائز ہوگا یا نہیں، اور جو معاملہ طے کیا گیا تھا وہ صحیح تھا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس معاملہ کا تعلق دو جزء سے ہے، ایک جز وکا تعلق تقسیم سے ہے، خواہ تقسیم وراثت ہو یا تقسیم شئی مشترک ہو اور دوسرے جز وکا تعلق عقد اجارہ سے ہے اور عبارت استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم عند الفریقین ہے اور نافذ بھی ہو چکا ہے۔ خواہ ثالث کے فیصلہ کے ذریعہ سے ہو یا آپس کے مصالحتی معاہدہ کے ذریعہ سے ہو، اور یہ نزاع نفاذ فیصلہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

نیز فیصلہ کے اس جملہ (اچھے حصہ کے کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فیصلہ وتقسیم دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا۔ پس اگر اس وقت دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا اور اب بھی مشترک ہے تو اس صورت میں اس کمرے سے نکالنا درست نہیں ہے، ہاں اگر حالات ووقت کی تبدیلی کی وجہ سے سابق کرایہ (تمیں روپیہ) موجودہ عام کرایوں کے اعتبار سے بہت کم رہ گیا، تو اس میں مناسب اضافہ ہو سکتا ہے اور اگر اب دونوں

بھائیوں کا کاروبار جدا جدا ہوگیا ہو یا کمرہ ہی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہو چکا ہو کہ قابل رہائش باقی نہ ہو تو نکال بھی سکتے ہیں۔ اور یہ الگ بات ہوگی۔

اور بوقت فیصل وتقسیم دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ اور جدا تھے تو پھر اس کمرہ (آفس) میں دونوں کے مشترک رہنے اور کرایہ داری کا فیصلہ دینے کا کیا منشاء وسبب تھا، جواب کے لئے اس کا واضح ہونا بھی ضروری ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیٹے کی ملازمت کی رقم کا مالک بیٹا ہے یا باپ؟

باپ اور بیٹا، دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں، کھانا پینا ساتھ ہے، بیٹے کو کسی اسکول یا اسپتال میں بیرون ملک یا ملک میں ملازمت دلوادی، سوال یہ ہے کہ بیٹے کو جو کچھ آمدنی اس ملازمت سے ہوگی اس کا مالک بیٹا ہے یا باپ ہے، اگر مالک باپ ہے تو کب، تنخواہ بیٹے کے ہاتھ میں آتے ہی یا باپ کو دینے کے بعد، اس پر یہ مسئلہ بھی متفرع ہوگا کہ بیٹے کے پاس دوسری جائیداد ہے وہ صاحب نصاب ہے بیٹے کی جو سابق ملکیت ہے بیٹا اس کی زکوۃ تو نکالے گا ہی تنخواہ کی رقم جو کئی ہزار ہے ابھی بیٹے کے ہی ہاتھ میں ہے، باپ کو دیا نہیں ہے، کیا اس کی بھی زکوۃ نکالے گا اس سلسلے میں فتاوی شامی کی باب الشرکۃ الفاسدۃ اور فتاویٰ دارالعلوم مبوب قدیم ۲۲۶/۵، ۳۶۱/۷، ۶۹/۷ کو سامنے رکھ کر جواب عنایت فرمایا جائے۔

محمد ادریس چورو راجستھان

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ اس صورت میں بیٹے کی جو آمدنی ہوگی یا بیٹے کو جو تنخواہ ملے گی اس کا مالک بیٹا ہی ہوگا باپ نہیں ہوگا (۱)، ہاں باپ کو جو رقم بیٹا بطور تملیک دے دے گا، اس رقم کا باپ البتہ مالک ہوجائے گا، ملازمت وتنخواہ کی آمدنی کا یہی حکم ہے، باپ کی تجارت میں بیٹا مل کر کے جو بڑھاؤ وترقی دیتا ہے اسکا حکم دوسرا ہے (۲)، اس مسئلہ سے اس میں مغالطہ و دھوکہ نہ ہونا

۱- یہ اجارہ کا معاملہ ہے جو بیٹے کے ساتھ طے ہوا ہے، باپ کا اس میں کوئی عمل نہیں ہے اس لئے اجرت کا مالک بیٹا ہوگا (اجارہ کی بحث کے لئے دیکھئے ردالمحتار ۹/۳، فتاوی عالمگیریہ ۴۰۹/۴)۔

۲- ’’أب وابن یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما مال فالکسب کلہ للأب إذا کان الابن فی عیال الأب لکونہ

چاہئے، اور جب بیٹا ہی مالک رہے گا تو بیٹے ہی پر اس کی زکوۃ بھی دینی واجب رہے گی اور یہ ظاہر ہے،"**وسببه أي سبب افتراضها ملک نصاب حولي**.....قام" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۰ھ

سودی کاروبار کرنے والی فیکٹری کا شیئر ہولڈر بننا:

مقام وانی میں ایک فیکٹری قائم ہونے کا پلان کیا جارہا ہے۔ اس میں ایک شیئر ہولڈر کا پانچ سو روپیہ ہے، اب ایسی صورت میں جب ایک بڑی رقم ہوجائے گی تو اس رقم کو بینک میں جمع کر کے لون لیا جائے گا تا کہ ایک بڑی رقم ہوجائے پھر اس کے بعد فیکٹری چالو ہوگی جو بھی شیئر ہولڈر ہوں گے اس کو نفع اور نقصان میں بھاگیدار کیا جائے گا، اس فیکٹری کے چالو کرنے میں لون کا روپیہ بیاج کے ساتھ شامل ہورہا ہے اور جو شیئر ہولڈر والے ہیں ان کو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ اور اس کے بغیر بھی روزی چلتی ہے تو ایسی حالت میں جو نفع ہوگا وہ ہمارے لئے جائز ہوگا یا نہیں اس صورت میں اس طرح کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

افتخار احمد (تکی منزل ضلع بلسار، گجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

اس فیکٹری کے نفع کے جواز میں تو کوئی کراہت نہیں ہے اور اس کا نفع لینا تو جائز رہے گا (۲)، البتہ یہ بات توضیح طلب ہے کہ جب بڑی رقم ہوجائے گی تو اس کو بینک کو دیکھا کر بینک سے لون کون لے گا آیا یہی شیئر خرید نے والے خود لیں گے یا یہ شیئر ہولڈر شیئر خرید کر اپنا روپیہ فیکٹری میں دیدیں گے اور پھر فیکٹری والے خود بینک سے لون لیں گے۔ اگر شیئر ہولڈر خرید نے والوں کو خود اپنا روپیہ بینک کو دکھا کر اس پر سودی قرض لینا پڑتا ہے جب تو ان لوگوں کو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، ان

معبا له" (فتاوی عالمگیریہ ۲/۲۹، ۳۰، رد المحتار علی الدر المختار ۹/۵۰۲ عن القنیہ)۔

۱- الدر المختار ۲/۴،۱۷۵،۱۷ا۔

۲- "لو دفع ألفاً إلى رجل وقال: أخرج مثلها واشترو ما كان من ربح فهو بيننا وقبل الآخر وأخلطها وفعل انعقدت الشركة" (البحر الرائق ۵/۲۸۲)۔

کے پاس اپنا دوسرا جائز کاروبار ہے اور وہ مجبور نہیں ہیں (۱)، اور اگر شیئر ہولڈر خریدار خود بینک کو دیکھا کر لون نہیں لیں گے بلکہ فیکٹری کا عملہ یہ سب کام خود انجام دیتا ہے اور وہ اکثر غیر مسلم ہے یا کل غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں یہ شیئر خریدنا بھی جائز رہے گا منع نہ ہوگا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۱/۱۴۰۱ھ

فیکٹری ملازم کی بیوہ کے لئے فیکٹری سے ملنے والی رقم کا حکم:

بی۔ ایچ ای۔ ایل کا ملازم ہے اور انتقال ہو جاتا ہے فیکٹری کی طرف سے اس کی بیوہ کو رقم دے دی جاتی ہے اور اس رقم کے لئے فیکٹری کی طرف سے جو اسکیم بنائی ہے بیوہ اس اسکیم میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ رقم اس طرح اسکیم میں محفوظ رہتی ہے، اسکیم تیس ۳۰/ سال یا اس سے زائد ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی کے بعد کچھ فی صد بڑھا کر سود کے ساتھ فیکٹری دیتی ہے، اس رقم کو حاصل کرنے کے بعد وہ کسی دھندہ تجارت میں لگاتی ہے یا کسی کو دیتی ہے اس رقم کی سودی نوعیت کے بارے میں تفصیل سے فرمائیں اور اس کو استعمال میں لانا بیوہ کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

عبد الحق (صاحب جنرل ملٹی آدم بلڈنگ پیلان بھوپال)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر وہ رقم بیوہ کو دیکر اس کے قبضہ دخل میں فیکٹری دیدیتی ہے تو وہ رقم بالکل حلال و جائز ہے، البتہ پھر اس رقم کو جمع اسکیم میں داخل کرنے کے لئے یا اس اسکیم میں حصہ لینے کے لئے کسی قسم کی قانونی ہدایت یا پابندی نہیں ہے، بلکہ بیوہ اس معاملہ میں بالکلیہ خود مختار اور آزاد رہتی ہے، پھر اس کے باوجود بیوہ اس جمع اسکیم میں حصہ لے اور یہ رقم اس میں داخل کر دے تو

۱- ’’الضرورات تبیح المحظورات‘‘ (الاشباہ والنظائر طبع کراچی/ ۱۱۸)، ’’عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکلہ وشاھدیہ وکاتبہ‘‘ (سنن الترمذی ۳/ ۵۰۳ کتاب البیوع باب ماجاء فی آکل الربا حدیث ۱۲۰۶)۔

۲- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ایسی کمپنیاں جو اگرچہ سودی کاروبار میں ملوث ہیں مگر ان کا مجموعی کاروبار حلال ہے ان کے شیئرز کی خرید کو دو شرطوں کے ساتھ جائز لکھا ہے اول یہ کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائے، دوم یہ کہ آمدنی کا جتنا فیصد حصہ سود ہے اپنے منافع سے اتنا فیصد صدقہ کر دے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہی مقالات ۱/ ۱۵۰، ۱۴۹)۔

درست نہ ہوگا اور جو رقم اس جمع کردہ رقم سے زائد ملے گی وہ سود شرعی ہوگی، اس کا حکم وہی ہوگا جو کہ بینک کے دوسرے سود کا ہے، اسے لیکر غرباء و مساکین کو اس کے وبال سے بچنے کے لئے دے دینا ضرور رہے گا اور اگر صورت واقعہ اس طرح نہ ہو تو حکم بھی دوسرا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

سدا پھولی اسکیم میں شرکت:

صوبہ مہاراشٹر میں ایک بینک ہے جس کا نام بینک آف مہاراشٹر ہے، اس بینک نے عوام کی سہولت کے لئے اسکیم نکالی، جس کی مرضی آئے جاری کرے کوئی سختی نہیں، اس میں ایک اسکیم ہے اور اس اسکیم کا نام صدا پھولی SADA FULI رکھا گیا ہے، اس میں اگر آپ پانچ سو روپیہ جمع کرنا چاہیں تو ہر مہینہ بینک میں جمع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر دس سال تک جاری رکھیں گے تو دس سال کا عرصہ ختم ہونے کے بعد ہر ماہ ایک ہزار روپیہ مع پنشن کے طور پر حیات تک میاں بیوی اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہے گا تحریری طور پر ایسی اسکیم ہے مثال اس اسکیم کی ایک پھل لگنے والے درخت سے دی ہے کہ کسی درخت کو لگانے کے وقت پانی دیتے رہو تو بعد میں وہ درخت ہمیشہ پھل دیتا رہے گا۔ اور سبکو اس کا فائدہ حاصل ہوگا، اس بناء پر انہوں نے یہ اسکیم بنائی ہے تو کیا ہم ایسی اسکیم میں شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بیان فرمائیں۔

کمپنی کا شیئر ہولڈر بن کر نفع حاصل کرنا:

اگر کسی کمپنی میں شیئر ہولڈر بن کر اس کا نفع حاصل کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ڈیونٹ DEVINT کی رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ابھی یہ سوال نامکمل اور ادھورا ہے اس لئے ان باتوں کے بارے میں اگر قانون معلوم ہو جائے تو کوئی حتمی و قطعی جواب دیا جائے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دس ۱۰ رسال پورا ہونے سے پہلے اپنا جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینا چاہے یا دس سال مسلسل جمع نہ کرے یا جمع نہ کر سکے یا مرجائے تو اس کے بارے میں کیا قانون ہے، اس کا جمع کیا ہوا روپیہ کیا ہوگا، واپس ملے گا ان دونوں باتوں کا جواب آنے پر اس نمبر کا جواب دیا جا سکے گا۔

تجارتی کمپنی میں شیر ہولڈر بننا اور اس کا نفع لینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۴/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے، دارالحرب کی کتنی قسمیں ہیں؟

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۴۷ء کے پہلے بھی دارالحرب تھا اور بعد میں بھی دارالحرب ہے، اور دارالحرب کی کئی قسمیں ہیں ان سب صورتوں میں حکم علیحدہ علیحدہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امداد باہمی کی ایک صورت کا شرعی حکم:

فرض کرو کہ میونسپل کمیٹی مالیر کوٹلہ کے بیس ملازمین اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک صد روپیہ کٹوا کر مبلغ دوہزار روپے جمع کرتے ہیں، اور روپیہ اکٹھا ہونے پر اس روپئے کو انہیں ممبران میں کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، یعنی جس ملازم ممبر کو ضرورت ہوتی ہے دوسرے ضرورت مند ملازم کے مقابلہ میں دوہزار کی لاٹری ہزار یا بارہ صد میں لے لیتا ہے اور جو فالتو رقم ہوتی ہے باقی ممبران حصہ کے مطابق منافع سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح ہر ماہ چلتا رہتا ہے جب تک کہ تمام ممبران پورے نہ ہو جائیں۔

کیا یہ فالتو فروخت کی گئی رقم جو کہ بانٹی جاتی ہے کسی غریب ملازم سے ضرورت کے پیش نظر فائدہ اٹھا کر بانٹنا کسی بیاج کی زد میں آتی ہے یا کہ نہیں، شرعی طور پر یہ سسٹم جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱- اس مسئلہ کے لئے محدث فقیہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے مقالہ ''دارالاسلام اور دارالحرب'' کا مطالعہ کیا جائے، انہوں نے ایک مقام پر تحریر فرمایا ہے: جہاں تک ہماری نظر وفہم کا تعلق ہے ہندوستان اسی آخری قسم میں شامل ہے ''الوطن القوی'' کے باوجود دارالاسلام کے حکم میں ہے (دارالاسلام اور دارالحرب مطبوعہ مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ص/ ۴۸)۔

الجواب وبالله التوفيق:

یہ سسٹم شرعی طور پر کئی وجوہ سے نا جائز وغلط ہے، مثلاً:

الف-تنخواہ کا یہ جز ونقدین ہوتا ہے، نقدین کا تبادلہ (بیع) زیادتی کمی کے ساتھ نا جائز ہے، حدیث شریف میں: "مثلا بمثل یدا بید" ہونا ضروری ہے، اس کو شرعی اصطلاح میں بیع صرف کہیں گے، اس میں جو نفع ہوگا یا زیادتی ہوگی وہ سود ہوگی۔"و الفضل ربوا"۔

ب- اس معاملہ میں (ربوا) سود کے ساتھ قمار (جوا) بھی ہے، مثلاً ربوا تو یہی کہ دوہزار کو بارہ سو یا تیرہ سو میں فروخت کر کے آٹھ سو یا سات سو نفع کے نام پر وصول کیے۔ یہ سات سو یا آٹھ سو بھی "الفضل ربوا" کا مصداق ہے اور سود ہے اور بیاج ہے، اور قمار مثلاً یہ ہے کہ جو لوگ ۲۰ قسطیں دینے سے پہلے نمبر آجانے کی وجہ سے دوہزار وصول کر کے ۲۰ قسطیں پوری کرنے سے پہلے ہی مرجائیں تو حسب حصہ بقیہ تمام ممبروں کا حصہ ضائع ہوا۔ اور مثلاً کوئی آدمی چند قسطیں دینے کے بعد وصولی کا نمبر آنے سے پہلے مرجائے تو اس کی داخل کی ہوئی رقم ضائع ہوئی اور بیس قسطوں کی ادائیگی میں ہر شخص کا زندہ رہنا ضروری نہیں، بلکہ ضیائع کے ایسے واقعات بعید از وقوع بھی نہیں۔ لہذا اس طرح سے مال کا دینا موضع خطر میں مال کا ڈال دینا ہوا، اور یہ بھی قمار کی ایک شکل ہے۔

ج- یہ معاملہ مفضی الی النزاع بھی ہوگا، اس لئے کہ جو رکن چند قسطیں دینے کے بعد اور دوہزار وصول کر کے درمیان سے نکل جانا چاہے گا تو بقیہ ارکان ان کو نکلنے نہ دیں گے، جبر ہوگا یا دی ہوئی رقم کی واپسی کرنے کے لائق نہ ہوگا، اور وہ مطالبہ جاری رکھیں گے تو نزاع کا ظن غالب ہوگا۔

اسی طرح چند قسطیں دینے کے بعد دوہزار کی رقم وصول کرنے سے قبل الگ ہوگا تو اپنے دیئے ہوئے روپیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور یہ صورت بھی مفضی الی النزاع ہوگی اور جو معاملہ اپنے نوعیت کے اعتبار سے مفضی الی النزاع ہو، فاسد و ممنوع ہوگا۔

ہاں اگر ایثار و ہمدردی اور نفع رسانی کا جذبہ ہے تو صحیح ہے اور بطور امداد باہمی جائز طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں، دوہزار کی رقم جس کو دی جائے بذریعہ قرعہ اندازی کے جس کا نام نکلے اس کو پوری رقم بطور ہبہ کے دیدی جائے، ہر رکن بطور ہبہ اس کو دے دینے کی تصریح کردے اور جس کا نام ایک مرتبہ قرعہ میں نکلے رقم اس کو مل جائے دوبارہ قرعہ اندازی میں اس کا نام نہ رکھا جائے۔

اور جو رکن قرعہ میں نام نکلنے اور روپیہ پانے کے بعد الگ ہو جائے اس سے واپسی کا مطالبہ بقیہ ارکان نہ کریں اور نہ اس پر کوئی گرفت کریں۔

اسی طرح جو رکن کچھ قسطیں دینے کے باوجود قرعہ میں آنے کے قبل نکل جاویں وہ اپنے دیئے ہوئے روپیہ کا مطالبہ نہ کریں اور نہ کوئی گرفت کریں۔ اور ان سب باتوں کا ضابطہ وقاعدہ پہلے تسلیم کر لے تو اس طرح یہ معاملہ درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور